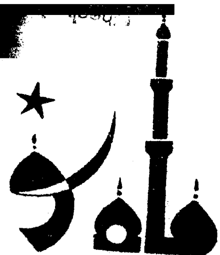
UnEven Page Numbers within the book only

TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY



عاصمہ حسین

سید ضمیر جعفری　ضیاء الحسن موسوی　اقبال حامد

حشمت فضلی　ضمیر علی بدایونی　سلیمان پاشا

شیر افضل جعفری　احمد سعدی　شفیع صابر

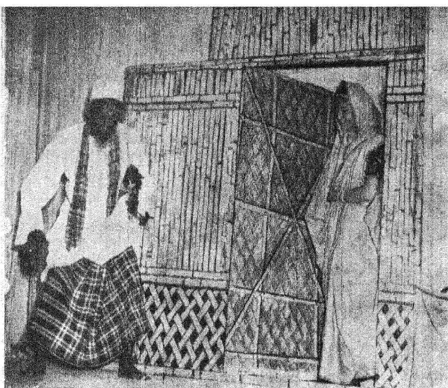
جنوری ۱۹۶۱ء　۵۰ پیسہ (۸ر)

فن برائے زندگی

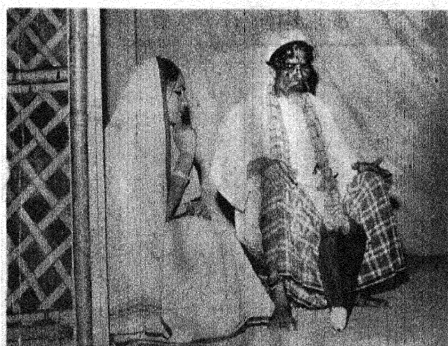
(رامش و رنگ)

حیدرآباد (مغربی پاکستان) میں بلبل اکاڈمی آف فائین آرٹس (ڈھاکہ) کا فنی مظاہرہ جس کا مقصد طوفان زدگان مشرقی پاکستان کی امداد تھا۔

اس مظاہرہ میں کوی جسیم الدین کی منظوم داستان ''نقشی کا تھر ماٹھ'' کو ایک دل آویز تمثیلی روپ میں پیش کیا گیا۔











جی ہاں - بہت ہی پیارا اور نہایت تندرست! کیوں نہ ہوتا - ماں کی ممتا؛ اس کی نگہداشت اور آسٹر ملک کی خوبیاں کارگر ہیں - دانشمند مائیں اسی لئے اپنے بچوں کی پرورش آسٹر ملک سے کرتی ہیں - خواہ ماں کا دودھ چھٹ جانے پر دیا جائے یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے آسٹر ملک ماں کے دودھ کا بہترین بدل ہے -

آسٹر ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے - اس میں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے ، اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن 'ڈی' بھی شامل کیا گیا ہے -

جی ہاں! یہی وجہ ہے کہ مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹر ملک دیتی ہیں -

آسٹر ملک

ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل



OM 5-60.UD





ہمارے نئے اعشاری سکے

ایک اور انقلابی اصلاح

اہم خصوصیات:۔ ایک پیسہ، پانچ پیسے اور دس پیسے کے نئے سکے یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے جاری کئے جا رہے ہیں۔

موجودہ سکے ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔

پچیس پیسے، پچاس پیسے اور سو پیسے (ایک روپیہ) کے نئے سکے بعد میں جاری کئے جائیں گے۔ فی الحال موجودہ چونی اور اٹھنی علی الترتیب چوتھائی اور نصف روپے کے برابر شمار ہوں گی۔

روپیہ کے دام یا قیمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ادائیگی دونوں طرح کے سکوں میں کی جا سکتی ہے۔ پرانے سکوں کی قیمت نئے سکوں میں ظاہر کرتے وقت جہاں کہیں چھوٹی کسریں واقع ہوں بالمقابل نقشوں کے مطابق دور کی جا سکتی ہیں جو حکومت نے متعین کر دیئے ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے جاری کئے جا رہے ہیں

تبدیلی کا نقشہ

پرانے سکوں کی رقمیں حسب ذیل نقشہ کے مطابق تبدیل کی جا سکتی ہیں۔

آنے	پائی	۳	۶	۹
۰	۰۰۰	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۶	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۸	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵

آنے	پائی	۳	۶	۹
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۲	۶۴	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۳	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰

مثال: ایک آنہ تین پائی = آٹھ نئے پیسے

جاری کردہ - وزارت مالیات حکومت پاکستان

بتقریب یوم پاکستان
"ماہِ نو" کی اشاعت خاص
مارچ ۱۹۶۱ء

● یوم پاکستان کی تقریب سعید پر "ماہِ نو" اپنی سابقہ روایات کے مطابق ایک وقیع اور ضخیم شمارۂ خصوصی اس سال بھی شائع کر رہا ہے جسے معنوی اور صوری اعتبار سے بہمہ وجوہ ایک قابل قدر پیشکش کا درجہ حاصل ہوگا۔

● انقلاب نو کے بعد سے ملک ترقی و اصلاح کی جن راہوں پر گامزن ہوا ہے اور ترقی و کمال کی جو منازل اس وقت اس کے سامنے ہیں ان کا تازہ ترین مکمل جائزہ اس شمارہ میں پیش کیا جائے گا۔

● ادب، فن، ثقافت اور ملت و معاشرہ کا ہر ہر گوشہ نیّر انقلاب کی نئی کرنوں سے دمک اٹھا ہے۔ اس روشن صبح کی دلیلیں بہت ہیں اور ہماری نظریں ان کی تابانیوں سے منوّر۔ شمارۂ خاص ان تمام گوشوں کو ایک دستاویزی فلم کی طرح آپ کے سامنے لا رہا ہے جو تزئین و آرائش اور ترتیب و معنویت کے اعتبار سے ایک یادگار اشاعت ہوگی۔

● ملک کے نامور ادباء و شعرا اور فنکار اس شمارۂ خصوصی کو ایک مھتم بالشان شمارہ بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ اشاعت خاص اپنی ادبی اور ثقافتی روایات اور زینت و آرائش کے اہتمام میں ایک یادگار پیشکش ثابت ہوگی۔

یہ پیشکش بہمہ وجوہ ایک ملی پیشکش ہوگی۔ اسلئے تمام افرادِ ملت کو جو ادب و فن کا شغف رکھتے ہوں لازم ہے کہ اس شمارہ کو آب و تاب عطا کرنے میں شریک ہوں۔

اشاعت خاص کے لئے جملہ مضامین نظم و نثر وسط فروری تک ہمارے پاس پہنچ جانے چاہئیں۔

ایجنٹ اور مشتہرین حضرات:

اپنی ضرورتوں سے ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

جلد ۱۴



شمارہ ۱

چندہ سالانہ: پانچ روپے ۵۰ پیسہ

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

جنوری ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

بیادِ رفتگاں:

ایک تاریخی شخصیت — ایک استفہام

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم)

سلطان اشرف

مشاہیرِ سلف کا ذکرِ جمیل ایک سُنّتِ حسنہ ہے۔ بالخصوص جب کوئی اتفاق، جسے حسنِ اتفاق ہی سمجھنا چاہیئے، ان کی یاد تازہ کرنے کا پرلطف بہانہ پیدا کر دے۔ ایک خدا ساز اتفاق۔ اور پھر ایسا نامِ گرامی، ملّتِ اسلامیہ کا ایسا مایۂ ناز فرزند، اور معرکۂ آزادی کا علمبردار و مجاہدِ آزادی جیسے مولانا محمد علی جوہر — زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ وہ عظیم المرتبت سیاست داں، مدبّر، شاعر، ادیب، صحافی جس کی جلیل القدر شخصیت کے ساتھ پیکارِ حریت کی کتنی ہی شاندار اور ولولہ انگیز داستانیں وابستہ ہیں۔ ایک منفرد ہستی، ایک تاریخی شخصیت۔ واقعہ کتنا ہی معمولی سہی، جب اس کی نسبت ایسی یگانۂ روزگار شخصیت سے ہو جائے تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو جاتی ہے ؎

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرّۂ آفتاب تابانیم

آمدم بر سرِ مطلب۔ یہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایک معاصر رسالہ "نقوش" (لاہور) نے نومبر ۵۷ء میں اپنا "مکاتیب نمبر" دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اس کی جلدِ اوّل میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے دس خط بھی شائع ہوئے تھے۔ بہ ایں تفصیل:

نواب سیّد علی حسن	۱ خط
مولانا غلام رسول مہر	۲ خط
مولانا شوکت علی	۲ خط
محمود احمد عباسی	۱ خط
خواجہ غلام بھیک نیرنگ	۱ خط
اکبر الملک	۱ خط
مولوی محمد عمر خاں	۱ خط
نامعلوم	۱ خط

ان میں سے جو خط اکبر الملک کے نام ہے، اس میں صاحبِ مکتوب کا مکتوب الیہ ہونا قابلِ وثوق نہیں۔ یہ خط مولانا نے چھندواڑہ جیل سے اپنے نامور ہمعصر و ہم مسلک رفیقِ راہ اور پرستارِ آزادی مولانا حسرت موہانی مرحوم کو لکھا تھا۔ اس خط کا پیرایۂ آغاز ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھندواڑہ ۲۶ راپریل ۱۹۱۷ء

برادرِ واجب الاحترام

السلام علیکم ۸ راپریل ۱۷ء کے محبت نامہ کا جواب دیتا ہوں اور محجوب ہوں کہ اس عرصے میں برابر غم و غصّے کا شکار رہا۔ ۸ راپریل کو میرے چند دوست نظر (نذر) اجل ہو گئے اسلئے میرا غم و غصّہ بے جا نہیں۔ مگر موت جسمانی نہیں اسلئے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مُردوں کو جن کی ہڈیوں تک کا پتہ نہیں چلتا علی احیا میں شامل کرتا ہوں مگر ان جیتی جاگتی کٹ پتلیوں کی جو قومی اسٹیج پر نچائی جاتی ہیں مُردوں سے بدتر سمجھتا ہوں، کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آتی بلکہ اُن کی روحوں کو، تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو ؎

"محروم ہوں مجبور ہوں بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزہ میرے لئے ہے"

یہ شعر "کلیاتِ حسرت" مکتبۂ اشاعت اردو دہلی مطبوعہ ۵۹ء کے صفحہ ۲۲۲ پر موجود ہے۔ اس سلسلہ میں یہ الفاظ کہ "تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو" شاہدِ ناطق ہیں۔ طرزِ تخاطب صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب کون ہے۔

آگے چل کر اس خط میں لکھا ہے:—

"دعا کرو کہ یہ حال اپنا نہو۔ بلکہ آخر تک ایمان اور عمل صالح پر قائم رہیں تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی اول تو تم آلِ رسول ہو اور پھر تقلیدِ سنتِ یوسفی سے مشرف ہو چکے ہو اب چونکہ تم نے مجھے بھی اپنے زمرہ میں جو ہمارے دادا جان کا ہے شامل کر لیا ہے اور خود لکھ چکے ہو ؎

"خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے"

یہ مصرع بھی کلیاتِ حسرت میں صفحہ ۲۲۴ پر موجود ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد علی کا ایک شعر تمام تر حسب حال ہے اور صورت حالات کا شارح بلیغ ؎

آج تک ہے ایک کنعانی سے شہرت مصر کی
فیض سے حسرت کے ہوگا نام فیض آباد کا

"تقلید سنت یوسفی" اور "ایک کنعانی سے شہرت مصر کی" ایک ہی بات کے دو مختلف روپ ہیں۔ خط کے اس حصّے سے بھی صاف واضح ہے کہ مکتوب الیہ حسرت موہانی کے سوا اور کوئی نہیں۔ ان قرائن کے بعد خط کو پڑھا جائے تو اس میں اور بھی قطعی شواہد دستیاب ہوں گے۔ لکھتے ہیں:۔

"اچھا اب رخصت ہوتا ہوں، تمہارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے ارتقائے سخن ظاہر ہے تم میری غزلیں منگواتے ہو اچھا بھیج دوں گا مگر بھائی تم شاعر تھے میں شاعر نہ تھا، البتہ عنایت ایزدی نے تمہیں تین دیوانوں والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت سے مجھ سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں، پہلے بھی تک بندی کر لیتا تھا، مگر کاغذ کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی اب اگر کچھ بوباس آنے لگی ہے سو بقول تمہارے:

"ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل"

اس وقت نظر بندی کی پہلی غزل لکھ بھیجتا ہوں:۔

سوچنے کی باتیں یہ ہیں "تم آلِ رسولؐ ہو، تقلید سنت یوسفی سے مشرف ہو چکے ہو" "بقول تمہارے، خود لکھ چکے ہو" "تم تو پہلے ہی لکھ چکے ہو......" ایسے جملے کیا اس امر کی نشاندہی نہیں کر رہے ہیں کہ یہ خط قطعی طور پر مولانا حسرت موہانی ہی کو لکھا گیا تھا؟ پھر حسرت کے دواوین کے سنہ تصنیف دیکھئے۔ پہلا دیوان ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۲ء ــــ، دوسرا ۱۹۱۲ تا ۱۹۱۶ اور تیسرا ۱۹۱۶ تا ۱۹۱۷ء کے کلام پر مشتمل ہے۔ بڑی ہی قوی شہادت ہے۔ کیونکہ مولانا نے خط ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو لکھا تھا۔ حسرت کے تینوں دیوان ۱۹۱۷ء تک کے کلام پر مشتمل ہیں۔ تمام اشعار اور مصرعے انہی کے کلیات میں ہیں اور انہی کی تصنیف ہیں!

اکبر الملک کے متعلق اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ حیدرآباد دکن میں کوتوال شہر تھے۔ کوئی ادیب نہ تھے۔ شاعر تو قطعی طور پر نہ تھے۔ پھر مولانا محمد علی جیسے حکومتِ وقت کے باغی کی کسی سرکاری ملازم سے خط وکتابت سمجھ میں نہیں آتی۔ مولانا کی حریت پسندی کے پیش نظر یہ بات وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ کسی سرکاری آدمی سے دوستانہ روابط رکھیں گے۔ ان کی حالت تو یہ تھی کہ ؎

ہے یہاں نام عشق کا لینا
اپنے پیچھے بلا لگا لینا

ظاہر ہے کہ رئیس الاحرار سے وہی شخص دوستی رکھ سکتا تھا جو حکومت سے ٹکر لینے کو ہر وقت آمادہ اور سر بکف رہے۔

امید ہے کہ ان گزارشات کے پیش نظر حق اسی کو پہنچنا چاہیے جو حقدار ہے۔ اور زیر بحث خط کو ایک غیر شاعر، غیر ادیب، غیر حریت پرست شخص کی بجائے ایک شاعر، ایک ادیب، ایک صاحبِ ذوق، ایک زندہ دل انسان ہی سے منسوب کرنا چاہئے جو تمام تر پیکرِ حریت تھا ـــــ مولانا حسرت موہانی ÷



خطّاطی کا ایک نمونہ

تصویری صفحات میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے ورودِ مکّہ مکرمہ کی چند تصاویر اس شمارہ میں بھی پیش کی جا رہی ہیں جن سے عوام مکّہ کے دلی جذبات، ان کے تپاک اور خیر سگالی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس تصویری صفحہ پر کلمۂ طیبہ بھی تبریک و تکریم اور خطاطی کے ایک نادر نمونہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ جو فن کی ندرت کاری سے قطع نظر اس ضمن میں ایک علاماتی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ کلمہ کی کتابت کا مایہ الامتیاز خطاطی ونقاشی کا نہایت لطیف وبدیع امتزاج ہے۔ اسمائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابت جو حاشیہ میں بطور زینت دے گئے ہیں نمونۂ فن کو اور بھی ممتاز بنا دیتی ہے۔ یہ بدیعۂ فن ایک باکمال خطاط، حافظ غلام رسول یار محمد صاحب کے حسنِ قلم کا شاہکار ہے جو انہوں نے ہمیں ناسک (ہند) سے بطورِ خاص اشاعت کے لئے روانہ فرمایا۔ (ادارہ)

بابِ حرم پر

چوں عشقِ حرم باشد سہل است بیاباں ہا

صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے حال ہی میں سعودی عرب اور متحدہ عرب جمہوریہ کا دورہ کیا، جس میں انہیں عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ بابِ حرم کے سامنے اکابرِ بلدیہ مکہ مکرمہ واہالیٔ حرم شریف کا ایک اجتماع بھی ہوا تاکہ پاکستان کے اس مہمانِ عزیز اور زعیم شہیر کو اہلاً وسہلاً کہا جاسکے۔ اس موقع پر مکّہ مکرمہ کی مشہور دینی درسگاہ "مدرسۂ صولتیہ" کے ناظم، مولانا محمد سلیم نے ساکنانِ حرم کی طرف سے جو تقریرِ استقبالیہ فرمائی، یہاں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

مولانا نے اُن خیالات وجذبات کا ہی اعادہ کیا ہے جو خود صدرِ محترم کو شروع ہی سے اس قدر عزیز رہے ہیں اور فی الحقیقت ان کے جہانِ اسلام کے حالیہ دورہ کا اصل محرّک بنے ہیں یعنی روابط عالمِ اسلام کو از سرِ نو استوار کرنا، مسلمانوں کی دینی اخوت ویکجہتی کے رشتے پیوند دینا اور ان کی مشترک ثقافتی اقدار کی دریافتِ نو۔ تاکہ ہر جگہ کے مسلمان باہمی تعارف، اخوت اور احیائے روابط کے باعث ایک دوسرے کے نزدیک تر ہوتے چلے جائیں اور ان میں وہ استحکام وقوت پیدا ہوسکے جو حقیقی معنوں میں بُنیانِ مرصوص ثابت ہو۔

عالی مقام صدرِ محترم جمہوریت اسلامیہ پاکستان :

آج کا یہ پُرمسرت دن ساکنانِ حرم محترم کے لئے ہمیشہ یاد رہنے والا دن ہے۔ اس کے لئے خلوص محبت سے وہ مکہ معظمہ کے دروازہ پر اپنی سب سے بڑی اسلامی جمہوریت پاکستان کے عظیم المرتبت صدر کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ نقوش صفحاتِ دل سے مٹنے والے نہیں۔

یہ کعبۂ مقدس کی پاک سرزمین، یہ ولادت گاہِ رحمۃ للعالمین، یہ اسلام کا روحانی مرکز جہاں سے آفتابِ ہدایت طلوع ہوا اور جہاں سے فاتحِ اوّل محمد بن قاسم پیغامِ توحید لے کر بحرِ عرب اور بحرِ ہند کے اس پار پہنچا۔ جس کے نتیجہ میں آج سے تیرہ سال قبل دوبارہ سب سے بڑی اسلامی ریاست وجود میں آئی — ایمانی اور روحانی عظمتوں کے اس لبریز ماحول میں آپ کی آمد پر ساکنانِ حرم محترم کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

صدرِ محترم : ہم سب کو اس کا یقین ہے کہ ایک جانباز خادمِ اسلام کی حیثیت سے آپ نے مسلمانوں کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور ایک کلمہ گو مسلمان کی حیثیت سے آپ کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور فلاح و بہبود کے جو بے لوث جذبات موجزن ہیں ان کے پیشِ نظر اس مقدس ماحول میں آپکی تشریف آوری یقیناً ایک انعامِ الٰہی ہے جس کو اگر دنیاوی زندگی میں انسانی خوش بختی اور تکمیلِ سعادت کہا جائے تو بیجا نہیں۔

صدرِ محترم ! ابھی چند لمحات کے بعد آپ خدائے ذوالجلال والاکرام کے واجب الاحترام گھر "کعبہ معظمہ" کے سامنے اور اسکے دروازے پر زندگی میں پہلی بار کھڑے ہوں گے۔ ایک سچے مسلمان کیلئے یہ خوش قسمتی کی معراج ہے کیونکہ آخرت کی ہر نعمت اور دنیا کا ہر راج اسی معراج میں پنہاں ہے۔ اور رب العالمین سے قرب وتعلق ہی سرمایۂ تخت وتاج ہے۔

یہی در ہے جہاں شاہانِ دنیا سر جھکاتے ہیں سوالی بن کے آتے ہیں مرادیں لے کے جاتے ہیں

وذالِکَ فضل اللّٰہِ یوتید من یشاء ؕ

صدرِ محترم ، دلوں کی مسرت، جذبات کا یہ جوش اور اسلامی اخوت کے یہ شاندار اور دلنشیں مظاہرے یقیناً ان مضبوط اور مستحکم روابط و تعلقات کا اثر ہیں جو مملکتِ سعودیہ اور جمہوریت پاکستان کے درمیان قائم ہیں جغرافی اعتبار سے پاکستان اور مملکت کے تعلقات کی عمر گو تیرہ سال سے زیادہ نہیں، مگر ہمہ گیر اسلامی رشتۂ اخوت ومحبت کی عمر تیرہ سو سال ہے۔ الحمد للہ! قیامِ پاکستان سے اب تک دونوں ملکوں اور دونوں حکومتوں کے باہمی روابط انتہائی خلوص اور باہمی احترام ومحبت کے ساتھ دو حقیقی بھائیوں کی طرح نہ صرف قائم بلکہ روزافزوں ترقی پر ہیں۔ اس کا سب سے روشن ثبوت خود جناب والا کی تشریف آوری ہے جس پر میں جلالۃ الملک سعود المعظم ولیعہد محبوب امیر فیصل کی جانب سے، نیز اہلِ حرم اور ان تمام پاکستانی بھائیوں کی طرف سے جو جلالۃ الملک سعود کے زیرِ سایۂ عاطفت ان کی عادل حکومت کے زیرِ امن واحسان مقیم وآباد ہیں اور مکہ معظمہ کے لارڈ میئر عالیجناب شیخ عبد اللہ عریف کی طرف سے آپ کے قدم رنجہ فرمانے پر ہدیۂ تہنیت ومبارکباد کو سب کی دلی دعاؤں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ختم کرتا ہوں "ادخلوھا بسلام آمنین"۔

(مکہ معظمہ، ۱۴ ر جمادی الاوّل ۱۳۸۰ھ / ۳ر نومبر ۱۹۶۰ء)

اِس کنارسے اُس کنار تک

عاصمہ حسین

اِس دیار سے اُس دیار تک - اِس کنار سے اُس کنار تک
تیرا طیارۂ تیز رفتار سرگرمِ پرواز ہے
ایک سیارۂ نغمہ گر، ایک شاہیں نما ساز ہے
تختِ شعلہ کار، طشتِ شعلہ بار - سر سے پشت تک ایک شعلہ زار
جوہری دور کا شعشعہ ریز کوندا لپکتا ہوا
ایک جوہر بھڑکتا ہوا، ایک پیکر بھبکتا ہوا
یہ خدائے رزم، ناخدائے بزم - انتہائے شوق، انتہائے عزم
شرق سے غرب اور غرب سے شرق تک اسکی جولانیاں
قاف تا قاف تکتی ہیں شام و سحر جس کو حیرانیاں
صبح ناصبور، شام ناصبور - برق بے قرار، دور دور دور
جیسے محور بہ محور ہوں گردش میں برقے رواں
جس طرح ابر تا ابر ہوں جست زن دمبدم بجلیاں
یہ جہانِ شوق، حد ہے نے کراں - پا بہ گِل کہاں پیکرِ جواں؟
خطۂ پاک سے تا بہ مصر و عرب یہ سفر ہی سفر
یہ جزیرے جزیرے اڑان اور گلگشت رومانی بحر و بر
خون تیز رو، روح گرم جوش - جان شعلہ پوش، تن شعلہ نوش
ہے انہی سے وہ ہستی کے سینے میں ہنگامۂ ہاؤ ہو
ہے یہی جوہر آتشیں جس سے گردش میں ہے زندگی کا سبو
دل سے تا بہ دل، تا بہ ہر بشر - مدعائے شوق، مقصدِ سفر
ایک ہوں ایک تا اس دیارِ کہن، اس زمیں کے مکیں
اپنا گہوارۂ خاک، یہ مسکنِ زندگی، غیر انسانیت کچھ نہیں
خاکِ پاک سے اک نئی نمود - تازہ کار ہے بزمِ ہست و بود
اک نئی شعلہ زن ذات سے ایک پیغام ہے نزد و دور
اک عظیم انقلاب، اک تپاں زندگی، اک توانا شعور

جوہری دور کا آہنگ

سیّد فیضی
ضیاءالحسن موسوی

قِرانِ السعدین: سیّد فیضی

"جوہری دور کا آہنگ بن جائیے"۔ یہ مشورہ ہے جو صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، نے اپنے ایک حالیہ دورہ کی تقریر میں دیا، خصوصاً اقوامِ مشرق کو جنہیں موجودہ زمانہ کی برق سے تیز تر رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی شدید ضرورت ہے۔ صدرِ پاکستان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس حقیقت کا ادراک بھی کیا اور اعلان بھی کہ موجودہ تیز رفتاری کے زمانہ میں ہمیں ایسا ہی طوفانی آہنگ پیدا کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس برق رفتاری کی حیرت انگیز مثال ہمیں اس وقت نظر آئی جبکہ ہمارے ہر دلعزیز صدر نے "پاک جمہوریہ اسپیشل" میں مغربی و مشرقی پاکستان کا تاریخی دورہ کیا تاکہ وہ جمہوریں بھی اپنے جیسا ذوقِ عمل پیدا کریں۔ یہ سرگرمی قومی پیمانے پر تھی۔ ایک اہم تجربہ، ایک تیاری، ایک عالمگیر مشن پر روانگی کی تمہید۔ تاکہ جو سرگرمی پہلے قومی و مقامی تھی، اب بین الاقوامی اور عالمگیر بن جائے۔ چنانچہ یہ جوہری دور کا آہنگ پیدا کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ صدرِ پاکستان ابھی مغرب میں مصروفِ تگ و تاز تھے تو ابھی مشرق میں محبت و خیر سگالی کے دورہ پر روانہ ہیں۔

صدر ایوب کا دورۂ عرب و مصر پاکستان کی حالیہ تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہی نہیں بلکہ جوہری دور کی توانائی کا ایک ایسا آئینہ ثابت ہوا ہے جس کی بروقت افادیت سے مجالِ انکار نہیں۔ آج اگر ایک طرف عصرِ جدید کے گوناگوں تقاضے دامن کش ہیں تو دوسری جانب زمان و مکاں کی تسخیر بھی انسانی دسترس سے باہر نہیں۔ آدمِ خاکی کے عروج سے انجم کا سہم جانا اس لحاظ سے قابلِ مواخذہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ٹوٹتے ہوئے تاروں کا مہِ کامل بن کر چمکنا بھی آج ممکنات میں سے ہے۔ زندگی کی اس تگ و دو میں جن قوموں نے بھی حصہ لیا ہے، وہ حالات کی برق رفتاری کے مقابل مردانہ وار جمی رہی ہیں۔ مصائب و شدائد کو برداشت کیا ہے۔ لیکن عزم و حوصلہ پر آنچ تک نہیں آنے دی۔ اس طرح یہ قومیں نہیں بلکہ دنیا کی باعزت طاقتوں کی شکل میں اپنے ماحول کی دہکتی ہوئی بھٹی سے کندن بن کر نکلی ہیں اور عرصۂ حیات میں اپنی جولانیوں کے لئے ایک قابلِ رشک جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ جوہری توانائی کے دور سے ان کی ہم آہنگی نے جہاں منازلِ ترقی کو ان سے قریب تر کر دیا ہے وہاں بیرونی دنیا کے تجارب سے بھی مستفید ہونے کا موقع دیا ہے تاکہ اپنے آپ کو ایک خاص نہج پر ڈال کر زندہ قوموں کے دوش بدوش جگہ حاصل کی جائے۔ اس طرح انہیں اپنی ہر اس خامی کو دور کرنے کا موقع ملتا رہا جس سے نہ تو انسانیت داغدار ہو سکتی تھی اور نہ شرفِ آدم پر کوئی دھبہ آ سکتا تھا۔

اخوت اور دوستی کا جذبہ نیا نہیں۔ صدیوں سے انسان اسی زنجیر میں جکڑا چلا آیا ہے۔ باہمی تعلقات کی استواری سے اُسے مفر نہیں اور وہ مجبور رہے کہ پہلے اپنے ماحول کو سازگار بنا لینے کے بعد اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالے، فکر و نظر میں وسعتیں پیدا کرے اور صرف ذاتی مفاد کے حصول پر ہی نظریں نہ جمائے بلکہ اپنی ذات سے دوسروں کے لئے بھی سرچشمۂ فیض ثابت ہو۔ یہی انسانیت کا منتہائے کمال ہے اور ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ صدرِ پاکستان نے اس حقیقت کو آج سے بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں ان کا طوفانی دورہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ خلوص کے ساتھ عزم راسخ ہو تو کوئی طاقت راستے میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ انسان ہر مشکل پر غالب آ سکتا ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں پر ظاہر کر کے رہتا ہے اس میں اس کی اپنی بھلائی بھی مضمر ہوتی ہے اور دوسروں کی فلاح کے راستے بھی متعین ہوتے رہتے ہیں۔

یہی وہ نظریہ تھا جس کے تحت صدر ایوب نے مسلسل چودہ روز مملکتِ پاکستان سے باہر رہ کر سعودی عرب اور متحدہ عرب جمہوریہ کے

سربراہوں سے ملاقات کی۔ اُن کے مسائل کو سمجھا، اپنے مسائل کو سمجھایا، عالمی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا اور اس طرح دونوں ملکوں میں برادرانہ اور دوستانہ تعلقات مستحکم کرنے کے لئے خوشگوار فضائیں تیار ہوتی رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صدرِ پاکستان نے عرب عوام کے دلوں پر اپنے اس دورے کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتے۔ پاکستان کی انقلابی حکومت کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو کسی اور سربراہِ مملکت سے شاید آج تک سرانجام نہیں پا سکا۔ جدّہ کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی اپنے استقبال کا منظر دیکھ کر اور اس کے ساتھ ہی حرم قدس میں حاضری دینے کے نیازمندانہ احساس سے مغلوب ہو کر صدر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے تھے۔ یہ کیا چیز تھی جس نے ایک فوجی جرنیل کو اتنا رقیق القلب بنا دیا؟ یہ اس کا قلبِ سلیم تھا اور عالمِ عرب سے اس کا فطری و ازلی رشتہ۔ اسی رشتے کی وجہ سے اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ درخشاں دستاویز بنکر آج بھی دنیا کی نگاہوں میں جگمگا رہی ہے یوں تو پاکستان نے سعودی عرب کے معاملات و مسائل میں ہمیشہ برادرانہ دلچسپی لی ہے اور سعودی عرب نے بھی نہ صرف اپنے موجودہ حکمران کے زمانے میں بلکہ ان کے والدِ محترم جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز کے عہد میں بھی پاکستان کے لئے ہمیشہ دوستی اور اخوت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن سچی اور حقیقی بہی خواہی کا وجود صرف صدر ایوب کے حالیہ دورے ہی سے عمل میں آیا ہے۔ دونوں سربراہ اپنی ملاقاتوں کے دوران خانگی اور بین الاقوامی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمان ممالک کے درمیان مفاہمت اور تعاون ناگزیر ہے۔ اسلامی نصب العین کا تقاضا بھی یہی ہے تاکہ یگانگت کے احساسات میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔ صدر ایوب اور سلطان سعود کے سیاسی مذاکرات تین روز تک جاری رہے اور ان تمام مسائل کی افہام و تفہیم جو ہر دو ممالک کو درپیش ہیں ایک نہایت خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں صورت پذیر ہوتی رہی۔

ظاہر ہے کہ صدر کے اس دورے نے تعلقاتِ اخوت کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا ہوگا اور اس کا نتیجہ دونوں سربراہوں کے اس کُلی اتفاق میں ظاہر ہوا ہے کہ اپنے عوام کی فلاح اور مقاصدِ اسلامی کے فروغ کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اسلامی ممالک ایک دوسرے سے بے حد قریب ہوں۔ سیاسی روابط کی حمایت اور استحکام کے لئے تجارتی اور اقتصادی تعلقات کی مضبوطی پر بھی زور دیا گیا۔ فکرِ اسلامی کے تحت روحانی قدروں کا احیاء صدرِ پاکستان کا وہ محبوب نظریہ تھا جس کی ترویج و اشاعت کو ہر قدم انہوں نے ملحوظ رکھا اور واضح الفاظ میں مشہور برطانوی مورخ ٹائن بی کے اس خیال کو دہرایا کہ اسلام ایک بار پھر مغرب کے مقابلے میں ڈٹ چکا ہے لیکن اس بار اس کے دشمنوں کی تعداد صلیبی جنگوں کے نازک دور سے بھی زیادہ ہے۔ مقابلہ سخت ہے لیکن اسلام کو بہرحال غالب آنا ہے، اور اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اسلامی ممالک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر عصرِ حاضر کے چیلنج کو قبول کریں اور اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیں۔

اس سلسلہ میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ اسلامی ممالک کا یہ اختلاط اب پہلے کی طرح منفی و بے نتیجہ اختلاط نہیں ہے بلکہ مثبت و نتیجہ خیز اختلاط ہے۔ جب کہ وہ مجبور و مقہور، مغرب سے مرعوب ممالک نہیں بلکہ آزاد ممالک ہیں۔ اور خالصتاً جدید احوال میں ایک دوسرے کے ساتھ نئے نئے عزائم و مقاصد لئے ہوئے مل رہے ہیں۔ وہ موجودہ تخریب کے زمانے میں پھر اسلام کا علم بلند کر رہے ہیں جو اقوامِ عالم کی نجات کے لئے نسخۂ کیمیا اور دوائے جملہ علّت ہائے ما کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے مقابلے میں اسلامی اشتراکیت جس میں تمام خرابیوں کا حل موجود ہے۔

اور پھر مصر نہ وہ پرانا مصر ہے نہ پاکستان پرانا پاکستان۔ دونوں اسلامی افکارِ جدیدہ سے مالامال ہو چکے ہیں۔ پاکستان نے حکیم ملت علامہ اقبالؒ کے تخیلات سے اسلام کو عجمی، یونانی اور دیگر غیر اسلامی اثرات سے نجات دلا کر اس طرح تجدید کی ہے کہ وہ اپنے حقیقی معنوں میں حرکی و ارتقا پذیر روح کے ساتھ سرگرم کار ہو رہا ہے۔ اقبالؒ کے یہ حیات افروز تصورات تمام دنیائے اسلام بلکہ دنیائے مغرب میں بھی دور دور تک پھیل چکے ہیں، اور مصر و عرب تو ان سے بالخصوص سرشار ہیں۔ اقبال کے فکرِ فلک اس کی معجز آفریں نوعیت موجودہ جوہری دور کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ اور اس کی بصیرت افروز روشنی و اثر میں مسلم سینہ چاکانِ چمن کا دیگر سینہ چاکوں سے آ ملنا خاص معنی رکھتا ہے۔ صدرِ پاکستان نے ربط و تعلق کا یہ سلسلہ پیدا کر کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھ دی ہے۔

صدر ایوب کے اس دورے کا اہم ترین مقصد بھی یہی تھا کہ نہ صرف سعودی عرب بلکہ متحدہ عرب جمہوریہ کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا جائے۔ آج یہ دونوں ممالک پاکستان سے ہم آغوش ہیں۔ اس ہم آغوشی سے فکر و نظر کی وہ تمام خلشیں دور ہو چکی ہیں جو آج سے قبل دونوں کے درمیان افتراق

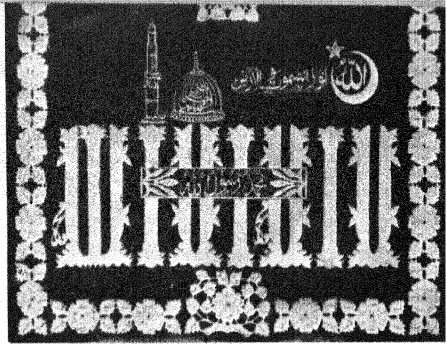
کے بیج بو رہی تھیں۔ عرب جمہوریہ کے صدر اور مصری عوام کے خلوص و محبت سے متأثر ہو کر صدر ایوب نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ "غیر ملکی اقتدار کی چھوڑی ہوئی لعنتوں کے سلسلے میں پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کو ایک ہی جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کرنے اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لئے تیز تر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے وقت کے ساتھ چلنے میں کوتاہی کی تو آزادی سے ہاتھ دھو کر پھر غلامی کی زنجیریں پہننا پڑیں گی!" صدر کے یہ الفاظ اسلامی جد و جہد کا وہ آئینہ ہیں جس سے ایک سچے مسلمان کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ امن چاہتے ہیں اور امن پرور فضاؤں میں آگے بڑھنے کے آرزو مند ہیں۔ موجودہ عالمی کشیدگی اور اعصابی جنگیں انہیں پسند نہیں کیونکہ انکی موجودگی میں ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور بین الاقوامی بد اعتمادی کا سلسلہ بڑھتا رہتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلے کو ختم کیا جائے تاکہ اسلحہ کی دوڑ کا یہ بھیانک تماشہ خود بخود کالعدم ہو کر رہ جائے جو انسانیت کو ایک تباہ کن ایٹمی جنگ کے دہانے کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔

دیکھا جائے تو اسلام کا ہی وہ مقدس رشتہ ہے جس نے دنیا بھر کے مسلمان کو حبل اللہ میں جکڑ رکھا ہے اور یہ ایسا رشتہ ہے جس میں کبھی لچک نہیں پیدا ہو سکتی۔ قاہرہ یونیورسٹی میں صدر ایوب نے اسی ایک رشتے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا: "جب تک اسلام کا رشتہ باقی ہے مسلمانوں کے مصائب پر خواہ وہ الجزائر، فلسطین، کشمیر یا کسی اور جگہ ہوں، تمام دنیائے اسلام میں ان کا درد محسوس کیا جائے گا۔ جدید دور کی ضروریات کی روشنی میں ایک دوسرے کی قومی پالیسیوں اور بین الاقوامی معاہدوں میں مداخلت کئے بغیر اسلام کے مطالبہ کے مطالعہ اور اس عمل کے لئے اسلامی ممالک میں قریبی تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ پاکستان کا وجود نظریۂ اسلام کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ مادی ترقی و خوشحالی کے لئے جدید علوم و سائنس کی روشنی میں قرآن کو صحیح طور پر سمجھیں اور اس کے لئے ہمیں قاہرہ اور دمشق کا تعاون بھی درکار ہے جو صدیوں سے اسلامی روایات و علوم کے مرکز ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہماری وفاداری صرف اللہ کے لئے ہے اور یہی وہ رشتہ ہے کہ جس میں بیرونی اثرات، سیاسی تنازعات وغیرہ کے باوجود دنیا کے تمام مسلمان منسلک ہیں۔"

کراچی اور قاہرہ سے بیک وقت شائع ہونے والے مشترکہ اعلامیہ میں بھی یہی کہا گیا تھا کہ دونوں حکومتیں تمام اقوام کے حق خود اختیاری پر یقین رکھتی ہیں۔ عالمی امن و انصاف اور انسانی حقوق کے احترام کی خاطر ضروری ہے کہ تمام ممالک اقوام متحدہ کے منشور اور بانڈونگ کانفرنس کی قرار دادوں پر عمل کریں۔ اس کے علاوہ دونو سربراہوں نے افریقہ اور دوسرے علاقوں میں آزاد ہونے والے نئے ملکوں کا خیر مقدم بھی کیا اور جنوبی افریقہ کی نسلی پالیسی کی مذمت کی۔ دونوں ملکوں نے اپنے باہمی اقتصادی اور ثقافتی رشتوں کو مضبوط تر بنانے کا اعلان بھی کیا۔ اس طرح دوستانہ فضا جو ایک عرصے سے دھندلی ہوتی جا رہی تھی ایک بیک صاف ہو گئی۔ پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے مقتدر صدروں کا یہ قران السعدین اس لحاظ سے بھی کافی اہم ہے کہ باہمی غلط فہمیوں کے ازالے سے تاریخ کا ایک پرانا اور ناخوشگوار ورق الٹا جا چکا ہے۔ اور محبت و اتحاد سے پیدا ہونے والے ان تعلقات کا باب کھل گیا ہے جن پر دونوں ملکوں کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان کے صاف صاف اور واضح بیانات سے ہر وہ خدشہ دور ہو چکا ہے جو اس سے پہلے تشویش انگیز تھا۔ نہر سوئیز کے قضیئے کے متعلق صدر ناصر کی شکایت سن کر صدر ایوب نے کہا تھا: "مصر نے جب نہر سوئیز کو قومی ملکیت بنایا تو میں نے سمجھ لیا کہ اسکے خلاف اب جارحانہ کارروائی ہوگی۔ چنانچہ پاکستان کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے میں نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ نہر سوئیز مصریوں کی ہے۔ پاکستان کے ہر معقول آدمی کی بھی یہی رائے تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت پاکستان کے نمائندوں نے پاکستانیوں کے جذبات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کی جس کی وجہ سے مصریوں کو ہمارے مؤقف کے بارے میں غلط فہمی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ مصر پر اس وقت زبردست دباؤ تھا اور پاکستان پر بھی حالات کا بہت بڑا بار تھا تاہم پاکستانی فوج سوئیز پر جارحانہ کارروائی کے خلاف تھی۔" کشمیر کے جھگڑے کا ذکر کرتے ہوئے صدر پاکستان نے کہا: "آپ خود اندازہ لگائیے کہ فلسطین سے جب صرف ساڑھے سات لاکھ عربوں نے ہجرت کی تو عرب ممالک کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پاکستان میں تو نوے لاکھ مہاجرین آئے تھے۔ بہر حال جو واقعات تھے انہیں دیکھتے ہوئے پاکستانی مسلمانوں کی یہ شکایت غیر فطری نہ تھی کہ عالم اسلام نے انکی کوئی خاص اور قابلِ ذکر حمایت نہیں کی۔" یہی وہ سادہ سادہ اور غیر مبہم سے الفاظ تھے جنہیں سن کر صدر ناصر نے پاکستان کے مؤقف کو اچھی طرح سمجھ لیا اور پہلی بار کشمیر کے لئے حق خود اختیاری اور رائے شماری کی حمایت کا

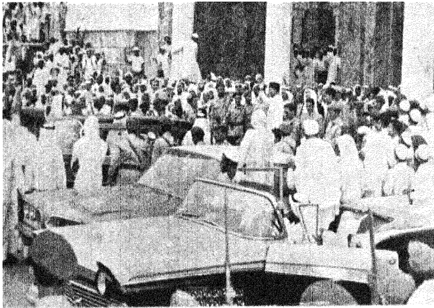


ہم قدم و ہم شعار



نقش دوام

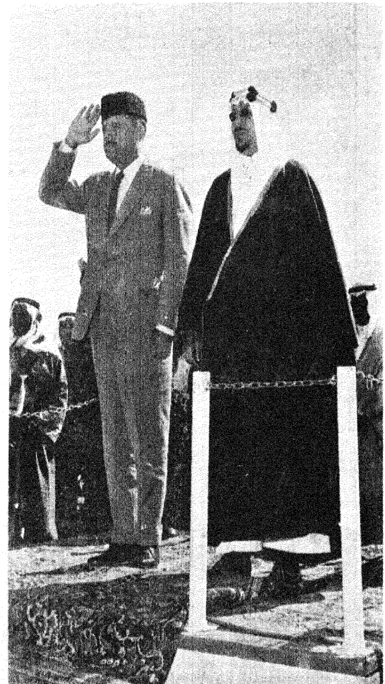
غرب



''طریق من عربیست'' (عامتہ المسلمین سے خطاب)



'' اھلا و سہلا ''



اتحاد اسلامی کے نقیب



''بیا تا گل به افشانیم'': مہمان گرامی کے اعزاز میں ایک جشن رقص (برما)

شرق



بطل عظیم آزادی، بہادر شاہ ظفر کے مزار پر (رنگون)



ہمہ ذوق و ہمہ شوق: صدر سوئیکارنو (انڈونیشیا)
اور صدر ایوب تپاک سے بغلگیر

مہمان کی خوشنودی کے لئے خاص قومی تزئین و آرائش
(انڈونیشیا)

وسیع شاہراہیں فرش راہ ہیں (جکارتا، انڈونیشیا)





یقین دلایا۔ پاکستان کی انقلابی قیادت کے اس سنہری کارنامے کو تاریخ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سچ پوچھئے تو انہی حقائق کی پردہ کشائی نے پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان لازوال محبت و اخوت کی فضا پیدا کر دی ہیں۔ صرف باہمی دلچسپی کے معاملات میں ہی نہیں بلکہ عالمی مسائل میں بھی ان کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے اور یہ اتحاد و اشتراک یوں بھی قابل قدر ہے کہ اس کی وجہ سے افریقہ اور ایشیا کے دیگر ممالک بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں اور سامراج کا طلسم ٹوٹ کر امنِ عالم کی کوششوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

مشرقِ بعید: ضیاء الحسن موسوی

مشرقی ممالک کے عوام کو اشتیاق تھا کہ وہ اس عظیم شخصیت کو اپنی محفلوں میں بلائیں اور قریب سے دیکھیں جس نے پسماندہ مشرق کو حقیقت پسندی کی ایک نئی راہ دکھلائی ہے۔ صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں یہی جذبہ و احساس کی رو ہے جس نے پاکستان کے اس فرزندِ جلیل کے دل میں بھی ایسی ہی والہانہ رو پیدا کی اور وہ مشرقِ بعید کے دور و دراز ممالک کے سفرِ شوق پر روانہ ہو گیا۔

غیر ملکی اقتدار کے "مزے میٹھے اثر خواب آوری" کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہ ممالک بری طرح مغرب کی تقلید کر رہے تھے۔ زبان سے تو وہ مغرب کے استعمار کو برا کہتے اور سیاسی آزادی کے لئے جد و جہد کرتے مگر احساس کمتری اس حد تک سرایت کر گیا تھا کہ وہ اپنے نظام اجتماعی کے قیام میں مغرب ہی کی تقلید کرتے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ پسماندہ نہیں ہیں ایسے طرز اختیار کرتے رہے جو ان کے اپنے حالات ان کی تاریخ اور ان کے عوام کی تعلیمی و ذہنی صلاحیت سے دست و گریباں تھے۔ اگرچہ یہ طرز ناکام ہوتے رہے اور اجتماعی زندگی کی الجھنیں بڑھتی رہیں مگر مشرقی عوام اور ان کے قائدین نے اس ناکامی کا اعتراف کرنے یا حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کو اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھا۔

یہ صورتِ حال تھی جب ہمارے ہر دلعزیز صدر، قائدِ انقلاب بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے بڑی اخلاقی جرأت سے کام لے کر قوم اور وطن کے صحیح حالات کا اعتراف کیا اور ان کی درستی کے لئے حقیقت پسند اقدامات کئے۔ ہمسایہ ممالک کی نگاہیں اس نوطلوع ستارۂ مشرق کو دیکھنے لگیں۔ اور پاکستان میں جو طوفانی رفتار سے پے در پے حیرت انگیز تجربوں پر تجربے ہو رہے تھے، ان کا بغور مطالعہ کرنے لگے۔ چونکہ سارے مشرق کے مسائل بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں اس لئے یہ ممالک ہر تجربے اور اس کے نتائج سے بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ ہمارا بین الاقوامی وقار کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اور ہمسایہ ممالک کی توجہ ہماری طرف اور بڑھ گئی۔ ہمارے نئے تجربات میں "بنیادی جمہوریتوں" کے نظام کو بے حد اہمیت حاصل ہے جس نے مشرق کی ان تمام قوموں کو چونکا دیا ہے۔ آخر وہ یہ بار بار نئے تجربے تو نہیں کر سکتیں یہی وجہ ہے کہ ماضیٔ قریب میں بیرونی تسلط سے آزادی حاصل کرنے والے سارے مشرقی ممالک کو پاکستان کے ہمارے نئے نظام سے گہری دلچسپی ہے۔

تصویر کا ایک اور اہم پہلو جس کے باعث مشرقی ممالک پاکستان کے صدرِ مملکت کی قدر کرتے ہیں، یہ ہے کہ قومی مسائل کو سلجھانے کی کوششوں میں وہ بین قومی مسائل سے غافل نہیں رہے بلکہ اپنی مخصوص حقیقت پسند پالیسی اور طرز عمل سے انہوں نے دوسرے ممالک اور پاکستان کے تعلقات کا جائزہ لیا ہے اور جن ممالک سے چھوٹے یا بڑے مسائل پر اختلافات یا شکایات تھیں ان کو سلجھانے کے لئے روایاتی انداز کے بجائے صاف گوئی اور خلوص کا سہارا لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نہری پانی جیسا مسئلہ یوں حل ہو گیا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی اور جو مسائل باقی رہے ان میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان کے قائدین کی ذرا سی بھی کوتاہی کو ان میں دخل ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم صدرِ پاکستان کے دورۂ مشرقِ بعید کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ واقعی ان ممالک نے ہمارے صدر کا جو استقبال کیا ہے اس میں کیا جذبہ کار فرما ہے۔

اگرچہ صدرِ پاکستان کا یہ دورہ ہم کو طویل معلوم ہوتا ہے مگر مشرقِ بعید کے وسیع و عریض علاقے کے پیش نظر اس کی مدت بہت ہی کم رہی۔ ذرا تصور کیجئے ان کے دورے میں برما اور انڈونیشیا سے لے کر جاپان تک کے ممالک کا طویل طویل زنجیرہ ہے۔ یہ ممالک ثقافت کی گہرائی کے علاوہ صنعت و تجارت کے اہم مرکز ہیں۔ یہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ اور پاکستان سے ان کے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔

برما میں صدر کا جو استقبال ہوا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس ملک کے عوام اور وہاں کی حکومت پاکستان سے اقتصادی اور ثقافتی تعلقات بڑھانے کے کتنے مشتاق ہیں۔ صدرِ پاکستان اور وزیر اعظم برما کے مشترکہ اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملک آپس کے مسائل کو دوستانہ طریقے

پر حل کرنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے سے تعاون کے خواہاں ہیں اور بین الاقوامی امور اور عالمی سیاست کے متعلق دونوں کے اندازِ فکر میں بڑی مماثلت ہے۔ عالمی امن کی خواہش کے علاوہ دونوں ممالک استعمار کے ہر روپ کو ناپسند کرتے ہیں اور تمام اقوام کے لئے حق خود ارادی کے مؤید ہیں۔ یہ وہی حق ہے جس کے لئے پاکستان گزشتہ بارہ سال سے جدوجہد کر رہا ہے، وہ مُصر ہے کہ اہلِ کشمیر کو بھی یہ حق دیا جائے تاکہ وہ اپنے مستقبل اور اپنی ریاست کے پاکستان یا ہندوستان میں انضمام کا آزادی سے فیصلہ کر سکیں۔ برما اور پاکستان کے تعلقات ابتدا ہی سے خوشگوار رہے ہیں اور بعض معاملات میں اختلاف بھی ہوا تو دونوں ممالک نے کوشش کی کہ اس کو طول نہ دیا جائے اور ان کو مفاہمت کی فضا میں سلجھایا جائے۔ گزشتہ مالی سال میں دونوں ملکوں کے درمیان آٹھ کروڑ روپے کا لین دین ہوا اور چند ماہ قبل برما کے تجارتی وفد نے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کا سامان خریدا ہے۔ مشترکہ بیان میں اس صورت حال پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے، اور یہ عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ تعاون میں مزید اضافہ ہونا چاہئے۔ سرحدی تجارت اور اراکان کو مشرقی پاکستان سے ایک شاہراہ کے ذریعے ملانے کے امکان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ سرحدی تنازعات کے متعلق بھی یہ طے کیا گیا کہ جلد ہی دوستانہ فضا میں ان کو طے کر لیا جائے۔

برما کے دورہ کے بعد ۳ دسمبر کو صدر ایوب انڈونیشیا گئے اور ۱۱ دسمبر تک مشرق بعید کے اس عظیم اسلامی ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ ہزاروں جزیروں پر مشتمل یہ ملک وہ ہے جہاں اسلام کا پیغام بغیر کسی فاتح کے پہنچا ہے۔ مشرق بعید میں فقط علماء و فقراء کی مساعی سے اسلام کی اشاعت دشمنانِ اسلام کے اس بہتان کا تشفی بخش جواب ہے کہ "اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے"۔ سچے مسلمانوں نے تلوار کا استعمال فقط اس وقت کیا ہے جسے علامہ اقبالؒ نے "تیغ بہر حفظ آئین ست و بس" سے تعبیر کیا ہے۔

انڈونیشیا نے پاکستان سے دو برس قبل یعنی ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو آزادی حاصل کی۔ انڈونیشیا کی تحریک آزادی بھی ہم سے ملتی جلتی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں پہلی آزادی خواہ جماعت "بودی اوتومو" قائم ہوئی جس کے رہنما ڈاکٹر ستومو مرحوم تھے۔ یہ دراصل دانش وروں کی جماعت تھی اور ہماری تاریخ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے ملتی جلتی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حاجی شمس ہُدیٰ نے "شرکت اسلام" (بالکل ہماری مسلم لیگ کی طرح) قائم کی جو بہت جلد مقبول عوام ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں ولندیزی استعمار نے متعدد قومی رہنماؤں کو گرفتار کر کے ملک پر آمرانہ قوانین مسلط کر دیئے کچھ دنوں بعد ڈاکٹر سوکارنو نے ایک اور جماعت بنائی جس کا نعرہ تھا "انڈونیشیا مردیکا" یعنی آزاد انڈونیشیا۔ ڈاکٹر سوکارنو نے تمام جماعتوں کو آزادی کی جدوجہد کے لئے متحد کر دیا۔ اس طرح ڈاکٹر سوکارنو انڈونیشیا کے لئے "قائد اعظم" کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے انڈونیشی عوام کو متحد کر کے ملک کو آزادی کی منزل تک پہنچایا۔ اور ۱۹۵۰ء تک مکمل آزادی حاصل کر لی جس میں سولہ خود مختار ریاستیں وحدانی طرز حکومت میں متحد ہو گئیں۔ اب یہ ملک انتظامی حیثیت سے دس صوبوں میں منقسم ہے۔ یہاں سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ جولائی ۱۹۵۹ء سے انڈونیشیا میں پرانا سیاسی نظام ختم کر کے انقلابی حکومت قائم ہے۔ انڈونیشیا کا دار السلطنت جاکارتا، جہاں صدر پاکستان کا پہلا استقبال ہوا، مشرق کے بڑے حسین اور عظیم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ جاکارتا میں صدر ایوب کا ایسا استقبال ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ جاکارتا ہی پر کیا منحصر ہے، وہ اس ملک میں جہاں بھی گئے ان کا خیر مقدم اس جوش و خروش سے ہوا جو دونوں ملکوں کی دوستی کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

صدر ایوب ۷ دسمبر کو مغربی جاوا کے مشہور شہر بندونگ گئے جو ۱۹۵۵ء کی مشہور افریشیائی کانفرنس کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہو چکا ہے۔ یہ بڑا رنگین اور صحت افزا شہر ہے اور یہاں کے باشندوں کی نفاست اور خوش مزاجی کی وجہ سے اس کو جاوا کا "پیرس" کہا جاتا ہے صدر ایوب انڈونیشیا کے مشہور جزیرہ "بالی" بھی گئے جو شاداب حسن اور قدرتی مناظر کی وجہ سے مشہور عالم ہے۔ بالی کی آبادی گیارہ لاکھ ہے۔ جزائر شرق الہند میں یہ واحد جزیرہ ہے جہاں ہندو مت موجود ہے مگر یہ ہندو دھرم ہندوستان کے ہندو دھرم سے مختلف ہے اور بدھ مت کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ بالی کے لوگ فنون لطیفہ کے عاشق ہیں۔ یہاں کا ہر شخص مجسمہ سازی اور رقص کا شائق ہے جس کا پس منظر پرانے دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں ہیں۔ اس جزیرہ میں لوگوں نے اپنے روایتی انداز سے صدر ایوب کا عدیم النظیر استقبال کیا۔ وہ اس شخصیت کا استقبال کر رہے تھے جو ایک بڑے اسلامی ملک کا سربراہ اور قائد انقلاب ہے اور جس کے عہد میں پاکستان کی اقلیتیں انہی شہری حقوق سے فیضیاب ہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں۔ بالی کی چھوٹی

چھوٹی لڑکیاں ہاتھوں میں نقرئی پیالیاں اور پیالیوں میں گلاب کا عرق لئے کھڑی تھیں۔ صدر کے ورود کے بعد انہوں نے راستے میں گلاب چھڑکا، صدر پر گلاب کی پتیاں برسائیں اور ان کے قدموں پر لوبان ڈالا۔ اس کے بعد بیشمار ہار پہنائے گئے۔ بالی کا جزیرہ جاوا کے مشرق میں واقع ہے اور چھوٹا جاوا کہلاتا ہے جاوا کے مسلمان بڑے عقیدت مند مسلمان ہیں۔ جاوا کے اکثر نوجوان حج سے مشرف ہوتے ہیں۔ شادی سے قبل کسی نوجوان کا حج کر لینا اس کے لئے ایک اضافی صفت سمجھا جاتا ہے۔ حجاز میں جو انڈونیشی طلبا دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اُن میں جاویوں کی اکثریت ہوتی ہے۔

صدر ایوب اور صدر سوکارنو کا مشترکہ اعلامیہ مشرق کی تاریخِ حریت و اتحاد میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ انہوں نے بندونگ کانفرنس کے اصولوں پر استقامت کا اعلان کرتے ہوئے اقوام متحدہ کو نئے زمانے کے مطابق بنانے کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انڈونیشیا سے رخصت ہوتے ہوئے صدر ایوب نے اس سلسلہ میں تاریخی بیان دیتے ہوئے اخباری نمائندوں سے کہا کہ اقوام متحدہ کا منشور پندرہ برس پرانا ہے۔ اس عرصے میں دنیا بہت بدل گئی ہے، اس لئے یہ عالمی ادارہ اور اس کی تنظیم نظرِ ثانی کی محتاج ہے تاکہ بڑی اقوام کے ساتھ چھوٹی اقوام کے مفاد بھی اس کے پیشِ نظر رہیں اور انہیں مختلف اداروں میں خاطر خواہ نمائندگی مل سکے۔ جاپان کی پریس کلب میں صدر ایوب نے اس مسئلہ کو دوبارہ وضاحت سے بیان کیا۔ صدر ایوب نے اس مطالبہ سے اُن عالمی حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی بدولت الجزائر اور کشمیر جیسے اہم اور واضح مسائل "سیاسی اقتدار کی رسہ کشی" کی وجہ سے اب تک الجھے ہوئے ہیں۔ صدر ایوب اور صدر سوکارنو کا یہ متفقہ مطالبہ اُس تجویز سے بالکل الگ ہے جو مسٹر خروشیف نے پیش کی تھی اور جس کی بدولت اقوام متحدہ کا سکریٹریٹ معطل ہو کے رہ جائے گا۔ وہ تجویز بڑی طاقتوں کی سرد جنگ کا ایک محاذ ہے اور یہ تجویز چھوٹی اقوام اقوام اور دنیا کی اکثریت کے حقوق کی نمائندگی ہے۔

انڈونیشیا سے صدر ایوب جاپان تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے آٹھ دن اُس ملک کا دورہ کیا جو اپنی صنعت و حرفت اور ذہانت کے صحیح استعمال کی بدولت ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہے اور جس نے گزشتہ جنگ عظیم میں بے انتہا نقصان اٹھانے کے باوجود نہایت قلیل عرصے میں اپنی تعمیرِ نو کے مراحل اتنی تیزی سے طے کئے ہیں جس کی مثال جرمنی کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

جاپان سے ہمارے تعلقات کی سب سے مضبوط کڑی تجارت اور صنعت ہے۔ جاپان میں ہمارے صدر کا جو استقبال ہوا ہے وہ اس کی تاریخ میں ایک نادر مثال ہے۔ جاپانیوں نے بڑی گرم جوشی سے اس قائدِ انقلاب کا خیر مقدم کیا جو ایک عظیم اسلامی مملکت کا سربراہ، انسانیت کا خیر خواہ، اور ایک قوم کو جگانے اور اس کو تعمیرِ نو کی راہ پر لگانے میں کامیاب ہو چکا ہے' دنیا نے اب تک صدر ایوب کو ایک عظیم قومی قائد کی حیثیت سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے مگر اب وہ ان کو ایک بین الاقوامی شخصیت کی حیثیت سے محبوب ہوتے دیکھ کر یہ محسوس کر رہی ہے کہ بناوٹی باتوں اور پرانی سیاست بازی کا زمانہ گیا۔ زبان سے امن کا پرچار کرنے اور عملاً امن پسند ملکوں کی آزادی چھیننے والی سیاست ختم ہو رہی ہے اور سچے صاف گو اور پرخلوص قائدین بین الاقوامی صفوں میں آگے بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔

اس دورہ میں ہر کہیں عوام کے پُرجوش خیر مقدم سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ زبان دل سے یوں گویا ہوں ؎

وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

صدر پاکستان نے اپنے دورہ کے شروع ہی میں ایک نہایت اہم بات کہی تھی جو دورِ جدید میں اقوام مشرق کے لئے سب سے اہم بات ہے۔ یہ کہ "جوہری دور کا آہنگ بن جائیے"۔ یعنی اپنے اندر وہی برق رفتاری پیدا کیجئے جو دورِ جدید کے لئے لازم ہے۔ ہمارے تمام مسائل کا حل خود ہمارے برق منش بن جانے پر ہے۔ چنانچہ صدر پاکستان نے خود اندرون و بیرونِ ملک اس کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ وہ بذاتِ خود "جوہری آہنگ" کا شاندار مظہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے ہیں انہوں نے اپنی شخصیت کی براقی سے چکا چوند پیدا کر دی ہے اور اپنی مقناطیسی کشش سے گوناگوں اقوام کو مسحور کیا ہے۔ وہ بے تکلف، بے ساختہ، حقیقت پسندانہ گفتگو اور وہ بے باکی جو ان کا جوہر کامل ہے، کس کو متاثر نہیں کرے گا؟

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نبخشد خدائے بخشندہ

اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اس دورہ اور صدر پاکستان کی متحرک شخصیت نے پاس اور دُور کے مشرقوں میں پہلی بار گہرا ربط اور نیا رشتہ پیدا کیا ہے۔ جس سے دنیائے مشرق میں ایک نئے دور کے آغاز کی توقع کی جا سکتی ہے۔

افکار جدیدلا:

ادب میں اُشاریت کی تحریک

ضمیر علی بدایونی

ایڈگر ایلن پو نے جب یہ کہا تھا کہ شعری موسیقی کو غیر واضح اور معنی خیز ہونا چاہیئے اور ابہام کا عنصر اس کی موزونیت کا لازمی جز ہے، تو وہ غیر شعوری طور پر شاعری کے اشاریتی نظریہ کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ بادلیر کی شاعری اور نظریۂ شاعری پر ایڈگر ایلن پو کے خیالات کا اثر صاف ظاہر ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ہی پو کے تراجم سے کیا۔ واگنر کی اسرار زا موسیقی اور پو کے فکر افروز نظریۂ شاعری کے تحت ہی اس نے دنیا کو "علامتوں کا جنگل" (FOREST DE SYMBOLES) سے تعبیر کیا تھا۔ اور بقول تھامس مین، بودلیر زندگی بھر انہیں دو فدایانِ شعر و نغمہ کی پرستش کرتا رہا۔ ۱۸۴۹ء کے ایک خط میں بودلیر نے واگنر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "میں تم میں ایک ایسے عظیم انسان کی جھلک دیکھ رہا ہوں جسے مستقبل اکابرین میں سب سے عظیم خیال کرے گا۔"

پو اور واگنر کے لئے بودلیر کا جذبۂ ستائش ہی آخر کار "اشاریتی شاعری" کی بنیاد ثابت ہوا۔ پروست نے بودلیر سے متعلق ایک مکتوب میں اسے جدید شاعری کا سرچشمہ کہا ہے۔ بودلیر کی عظمت و اہمیت کے متعلق ہمارے ایک مردِ نکتہ داں نے بہت درست لکھا ہے:-

> "پچھلے سو سال سے فرانسیسی شاعری میں جتنے رجحانات ظاہر ہوئے ہیں، ان سب کی ابتدا بودلیر سے ہوتی ہے۔ وہ رجحانات مثبت ہوں یا منفی، ان کا سرچشمہ بنا ہوا ہے..... بودلیر کی شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو عدم پرستی ہے، اور دوسری طرف وجود پرستی۔ میلارمے اور والیری نے عدم پرستی کے رجحان کو ترقی دی۔"

بودلیر کی شاعری نے جسے پال والیری نے "جدید دنیا کی شاعری" کہا ہے، فرانسیسی شاعری میں بڑے وسیع امکانات پیدا کر دیئے تھے۔ اشاریت اسی امکان کا بھرپور اور مکمل اظہار ہے۔ بعض حالتوں میں یہی امکانات مختلف بلکہ متضاد صورتوں میں نمودار ہوئے۔ ریں بو نے شاعری میں "ہر ایک چیز" کو سمیٹنے۔ اور میلارمے نے اپنی شاعری کی دنیا سے "ہر ایک چیز" کو خارج کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۹۴ء میں میلارمے نے آکسفورڈ لیکچر میں کہا تھا:

> "جی ہاں، ادب واقعی موجود ہے۔ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ادب ہی صرف موجود رہے تو اس میں سے ہر چیز کو خارج کر دو۔"

میلارمے کے یہ الفاظ فرانسیسی ادب میں تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ ان لفظوں میں اشاریتی نظریۂ شاعری کی پوری روح موجود ہے۔ اور میلارمے کی جملہ تصریحات اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ میلارمے زبان و الفاظ کی "خالصیت" کو ہر چیز سے بچانا چاہتا تھا، لیکن زبان و الفاظ کی اس "خالصیت" کو کس طرح بچایا جا سکتا ہے۔ اس سوال کے میلارمے اور والیری نے اس قدر گوناگوں جوابات دیئے ہیں کہ اکثر اوقات اس نظریہ کی پوری روح کو سمجھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

اشاریتی نظریۂ شاعری قبل رفائلی (PRE - RAPHAELITE) انگریزی نقاشوں اور واگنر کی عمیق اور پیچیدہ موسیقی سے متاثر ہے۔ اشاریتی تحریک کو اپنانے اور آگے بڑھانے میں فرانسیسی ادب کے بیشتر ادباء اور شعرا نے حصہ لیا ہے۔ اور ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب کسی اہلِ قلم کے لئے اشاریت سے دامن بچا کر گزرنا ممکن نہ تھا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کم و بیش تمام فنکاروں نے کسی نہ کسی حد تک اشاریتی عنصر کو اپنے فن میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ پال والیری نے آندرے زید کو مارچ ۱۸۹۱ء کے ایک خط میں مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اشاریت کا بلغ اپنی تمام خوشبوؤں اور اپنے

تمام پھولوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھل رہا ہے اور
اب اس سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ؟"

میلارمے نے شعر و ادب سے چند ایسی خصوصیات منسوب کی ہیں جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کی تھیں۔ بقول گستاو کاہن (KAHN) میلارمے نے جو نظریۂ شاعری پیش کیا ہے دنیائے ادب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

میلارمے نے اشاریت کے لئے ایک مابعد الطبیعاتی جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ الفاظ کی ماہیت کے متعلق ایک خاص نظریہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ۱۸۶۶ء کے ذہنی بحران میں کہا تھا کہ اشیاء اس لئے موجود ہیں کہ وہ شاعرانہ تعبیرات سے اپنی معراج کو پہنچ جائیں۔ اس کے نزدیک "دنیائے واقعی" فن کار کی دنیا کے سامنے ایک نفرت انگیز انتشار سے زیادہ نہیں۔ جس دنیا کا ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں، وہ حقیقی دنیا کی پراگندہ و مسخ شدہ شکل ہے۔ یہ حقیقی دنیا ہی در اصل ابدی ہے اور اسی ابدی کی بازدریافت شاعری کا مقصد ہے۔ عقلی دنیا میلارمے کے نزدیک نامکمل اور پراگندہ ہے، کیونکہ یہ حقیقی دنیا کی مسخ شدہ شکل ہے۔ اشیاء کے عقلی مشاہدہ میں ہمیں جو خلا محسوس ہوتا ہے، شاعری اسی خلا کو پُر کرتی ہے۔ اور کائنات کے گم شدہ اجزاء کا سراغ لگاتی ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ عالمِ شہود کی کاذب نمود کا پردہ چاک کر کے براہ راست حقیقت سے رابطہ پیدا کرے لیکن ہم اشیاء کے قلب میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ میلارمے نے اس کا سب سے عجیب و غریب جواب دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ صرف الفاظ کی مدد سے اشیاء کے دُرون تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اشیاء قلبِ ماہیت کے بعد الفاظ میں تبدیل ہو جاتی ہیں خیالات کو تو وہ جہانِ کاذب کی منطق سے تعبیر کرتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں ہمیں خیالات سے گزر جانا چاہیئے۔ اور الفاظ کی مدد سے تخلیق کرنا چاہیئے۔ ہیئت کی مدد سے وہ مخفی دروازہ کھولنا چاہیئے جو اشیاء کے قلب تک پہنچا سکے۔ اشیاء اور موجودات کی حقیقی دنیا کو فہم اپنی گرفت میں نہیں لا سکتی کیونکہ یہ اپنی ماہیت ہی میں محدود اور نارسا واقع ہوئی ہے۔ صرف شاعری ہی ایک ایسا طریقِ کار ہے جس کی مدد سے اشیاء اور موجودات کی اصل ماہیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فلسفہ کی ادراکی کوششیں حقیقی دنیا کے خدوخال کو مسخ کر دیتی ہیں۔ لیکن شاعری اس حقیقی و ابدی دنیا کا ایک عکس تخلیق کرتی ہے جو خود حقیقی و ابدی ہوتا ہے۔ اور جس کی صداقت کا بین ثبوت یہ ہے کہ تم اسے سمجھ نہیں سکتے لیکن اسے محسوس کر سکتے ہو۔

میلارمے کے نظریہ کے مطابق کائنات کے وجود کا مقصد اظہار میں تبدیل ہو جانا ہے۔ یعنی فن کار کی کائنات میں بدل جانا ہے کیونکہ کائنات کے انتشار و بدنظمی کو دُور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کو فن کار کی کائنات میں بدل دیا جائے۔ یعنی اس کا جمالیاتی اظہار میلارمے کے نزدیک لفظ "شے" کا آغاز نہیں بلکہ منتہا و اختتام ہے۔ اشاریت الفاظ کا ایک ایسا استعمال ہے جو انہیں قابلِ تفہیم اور فنا ہونے سے بچا سکے۔ کیونکہ میلارمے اور اس کے تابعین قابلِ فہم ہونے کو نہ ہونے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ الفاظ کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے وہ انہیں علامتوں (SYMBOLS) کے خول پہنا دیتے ہیں اور پیچیدہ ہیئت کی دیواریں ان کے گرد کھڑی کر دیتے ہیں۔ اشاریت الفاظ کے تحفظ پر بے حد زور دیتی ہے اور ان کا ایک رفیع تر تصور پیش کرتی ہے۔ میلارمے کے نزدیک شاعری صرف الفاظ کے استعمال سے وجود میں آتی ہے۔ مشہور مصور دیگاس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرصت کے لمحات میں سانیٹ لکھ کر خود کو محظوظ کیا کرتا تھا۔ ایک بار جب اس کی تحریکِ ذہنی سست پڑ گئی تو ناامیدی کے عالم میں اپنے دوست میلارمے کے پاس پہنچا اور کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں بہترین خیالات سے لبریز ہوں لیکن شعر نہیں کہہ سکتا۔" "میرے پیارے دوست"۔ میلارمے نے جواب دیا۔ "شاعری خیالات کے ذریعہ نہیں کی جاتی بلکہ الفاظ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ میلارمے نے جو نظریۂ شاعری پیش کیا ہے وہ الفاظ کے علامتی استعمال کو فن کا مقصود قرار دیتا ہے۔ پال والیری کے نزدیک تو شاعری اور نثر کا فرق ہی الفاظ کے استعمال کا فرق ہے۔ الفاظ کا استعمال تو شاعر بھی کرتا ہے اور صحافی اور فلسفی بھی لیکن شاعر اور دوسرے افراد میں وہی فرق ہے جو نغمہ و انتشار نغمہ اور بے ہنگم صداؤں میں ہے۔ پال والیری اپنے مخصوص والہانہ اسلوب میں نثر اور شاعری کے اس نمایاں اور بنیادی فرق کی وضاحت کرتا ہے:

> "نثر کا مقصود غائب ہو جانا، قابلِ تفہیم ہونا، تحلیل
> ہو جانا اور کاملاً فنا ہو جانا ہے اور لسانی روایت کے
> مطابق اس تصور یا جذبہ کے لئے جگہ خالی کر دینا جس کا
> اس میں اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ نثر ہمیشہ عمل و تجربہ کی دنیا
> کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ ایک ایسی کائنات کی طرف"

> جس میں ہمارے مشاہدات۔ ہمارے اعمال و جذبات
> کا اسلوبِ اظہار تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے۔ عملی دنیا
> "مقاصد کے مجموعہ" کی تعبیر میں محدود کی جا سکتی ہے"

برخلاف اس کے شاعری کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ شعراء الفاظ کا استعمال ایک مخصوص انداز سے کرتے ہیں۔ شاعری میں الفاظ کا فنا (ANNIHILATION OF WORDS) نہیں ہوتا۔ اس میں الفاظ بطور ذریعۂ اظہار کے استعمال نہیں ہوتے بلکہ میلارمے۔ والیری نظریہ کے مطابق شاعری کو کبھی بھی اظہارِ خیال کی حد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بڑی معنی خیز تمثیل کی مدد سے والیری نے شاعری اور نثر کے اس بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ نثر چلنے کی مانند ہے۔ جس کا ایک طے شدہ مقصد ہوتا ہے اور ہر حرکت، مابعد کی نمود کے بعد بالکل ختم اور فنا ہو جاتی ہے۔ شاعری رقص کی مانند ہے جو بجائے خود اپنی غایت اور اپنا مقصود ہے۔ اس کا کوئی خارجی مقصد نہیں بلکہ ایک کیفیت کو پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ اور شعر و رقص اپنے اختتام کے بعد غائب نہیں ہوتے (QUESTION DE POESIE) والیری کے نزدیک شاعری زبان کے معمولی اعمال کو پایۂ تکمیل و اتمام کو نہیں پہنچاتی۔ وہ اپنے اوپر نئی ذمہ داریاں عاید کر لیتی ہے۔ یہ وہ زبان نہیں ہے جو عموماً تقریروں، خطوط، فلسفہ طرازی اور داستان گوئی میں استعمال ہوتی رہتی ہے اور جسے شاعر تکمیل کو پہنچا کر ممتاز و منفرد کر لیتا ہے۔ بلکہ شاعری ایک ایسی ہمہ گیر چیز ہے جو کئی نوعیتوں کی زبان کا احاطہ کرتی ہے شاعری ممتاز و بے مثل خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ ایک "UN LANGAGE DANS LE LANGAGE" ہے۔ اشاریت کا مقصود میلارمے کے الفاظ کی ان تمام صلاحیتوں پر زور دینا، محفوظ کرنا اور تکمیل کو پہنچانا ہے جن کی وہ اہل ہے۔ اشاریت نگاروں کے نزدیک رومانیت اور فطرت نگاری دونوں زبان کے ایسے استعمال ہیں جو حقیقت کے ماسکہ کو زبان کی حدود سے پرے رکھتے ہیں۔ اشاریت ان سارے مکاتبِ فن سے بغاوت کا اعلان کرتی ہے جو زبان و ہیئت کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ میلارمے اور اس کے متبعین نے الفاظ کو مقصود بالذات قرار دے کر ان کو کانٹ کی "شے بذاتہٖ (THING IN ITSELF)" کا درجہ دے دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشاریت کا سارا فلسفہ الفاظ کا فلسفہ ہے۔ اشاریتی شاعر کا سارا مسئلہ ایک ایسی ہیئت کی تخلیق کرنا ہوتا ہے جو الفاظ کو خیالات کی تحتی سے آزاد کر دے۔ اور ان کے بقاء و تحفظ کی ضامن ہو۔ دیکارت نے کہا تھا "CORGITO ERGO SUM" (میں سوچتا ہوں، اس لئے میرا وجود ہے) لیکن میلارمے ہمیں بڑے عجیب و غریب انداز سے کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ یہ زبان ہی کا فیضان ہے جس سے میں موجود ہوں زبان و فن اس کے نزدیک ایسی چیزیں ہیں جن کے آگے ارتقاء ناممکن ہے اور زبان کے حدود ہماری دنیا کے حدود ہیں۔

اشاریت سے میلارمے کا مقصود یہ نہ تھا کہ بحدِ امکان کسی مکمل، زندہ اور مفید کارنامۂ فن کی تخلیق کی جائے بلکہ اس نظریہ کو پیش کرنے سے اس کا مقصود یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو فرانسیسی شاعری کو مطلقیت کی طرف ڈھکیلا جائے۔ اس نے پیرناسی این ازم (PARANASSIANISM) کی واقعیت نگاری میں فرانسیسی ادب کو دم توڑتے دیکھا۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے اسی واقعیت نگاری کے خلاف بغاوت کی۔ وہ قارئین کی ذہنی کم مائیگی سے کسی حالت میں سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ جس قسم کے ادب کی تخلیق کے لئے وہ جد و جہد کر رہا تھا وہ کبھی بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ ہمارے غالب کی طرح زندگی بھر بڑے فخر سے کہتا رہا ؎

> آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
> مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اشاریتی تحریک کبھی مقبولِ عام تو نہ ہو سکی۔ البتہ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کا ایک بہت بڑا حصہ اشاریتی نظریۂ ادب سے متاثر ہوا ہے۔ میلارمے کے بعد یورپین ادب میں جتنے بڑے ادیب و شاعر ہوئے ہیں۔ ان سب نے کسی نہ کسی حد تک اشاریت کو ضرور اپنایا ہے۔ انگریزی ادب میں ییٹس اور ایلیٹ کی شاعری اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیمس جوائس تو سراسر اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ییٹس کی طویل تمثیلی نظم "SHADOWY WATER" اور ایلیٹ کی "BURNT NORTON" اس سلسلہ میں بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔

اردو ادب میں اشاریت کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ جب دوسری زبانوں کے ادب میں میلارمے کے نظریۂ شاعری کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں، اس وقت میرا جی نے اردو ادب میں اشاریت کو روشناس کرایا ہے۔ جس زمانے میں میرا جی نے اردو میں پہلی بار میلارمے

کی کچھ نظموں کا ترجمہ شائع کیا تھا، اس سے پہلے ییٹس اعلان کر چکا تھا کہ ہاں میں بہت دیر میلارمے کے ساتھ چلتا رہا۔ بہر حال اردو ادب میں اشاریت کا آغاز میراجی کی نظموں سے ہوا۔ میراجی نے روشِ عام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ ڈھونڈھ نکالا تھا۔ یہ راستہ صرف علامتوں اور اشاروں کی مدد سے طے کیا جا سکتا تھا۔ گو میراجی فطری طور پر یہ رجحان لے کر پیدا نہیں ہوئے تھے، لیکن میلارمے نے زبان کا فانوس روشن کرنے کے لئے ساری کائنات میں اندھیرا برپا کر دیا تھا، اس لئے میراجی بھی اشاریت کے دائرۂ جذب و کشش میں آگئے۔ اس سلسلہ میں خود میراجی کا بیان ملاحظہ ہو:

"یہ شاید ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے کہ مغرب کے شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے فرانسیسی شاعر اسٹیفنے میلارمے کے کلام سے شناسائی ہوئی میلارمے مغرب کے ابہام پسند شاعروں میں سب سے نمایاں ہے۔ مجھے اس کی کچھ نظموں کا مجموعہ انگریزی میں ملا۔ یہ ترجمہ آرٹ کے مشہور نقاد راجر فرائی نے اپنے فرصت کے لمحات میں کیا تھا۔"

میراجی نے راجر فرائی کے مترجمہ مجموعۂ نظم کا گو بالاستیعاب مطالعہ کیا لیکن انہوں نے اشاریت کی پوری مابعد الطبیعات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ابہام کے وسیع تر پہلوؤں پر ان کی نظر پڑی۔ ان کی ایک مشکل یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ذوقِ جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی روایت کا ساتھ نہ دے سکے۔ انہیں نہ تو الفاظ پر وہ حیرت انگیز قدرت حاصل تھی جس کی اشاریتی ہیئت مطالبہ کرتی ہے اور نہ نظریاتی طور پر وہ میلارمے اور والیری سے متفق نظر آتے ہیں "خیال" کو میلارمے نے جس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، وہ سطورِ بالا سے واضح ہے۔ لیکن میراجی رقم طراز ہیں:

"خیال ہی میری نظر میں بنیادی شے ہے۔ اس میں اگر کوئی نئی بات نہیں۔ اس میں اگر کسی کو دو قدم آگے بڑھانے کی صلاحیت نہیں تو اظہار کی کوشش بے مصرف اور بیکار رہے"۔

میلارمے نے تو خیال کو لفظوں کے "تار و پود" سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دی۔ میلارمے کے یہاں اظہار کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ خیال تو قدرِ دوم کی چیز ہے۔ شاعری صرف ہیئت کی تخلیق سے وجود میں آتی ہے۔ خیالات کو تو وہ منطقی دنیا کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اور شاعری کو اظہارِ خیال کی حد تک محدود کرنے والا شاعر تو یقیناً ہو سکتا ہے۔ لیکن اشاریت نگار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میراجی کی اس سلسلہ میں تمام کوششیں "جرأتِ رندانہ" سے زیادہ نہیں۔ ییٹس جیسے بھاری بھرکم شاعر نے بھی اس راہ کی مشکلات سے فرار کی صورت اختیار کی تو بیچارے میراجی کی حیثیت ہی کیا۔ الفاظ پر مکمل قدرت حاصل کرنے کے بعد ہی علامتوں کی طرف قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن میراجی کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ بھی نہیں ع

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

میراجی کے یہاں ابہام موجود ہے۔ لیکن ان کا یہ ابہام میلارمے اور والیری کے ابہام کے مقابلہ میں کئی درجہ پست اور غیر اہم ہے۔ ان کی شاعرانہ ہیئت میں اشاریت کافی حد تک ان کی لاشعور سے وابستگی اور پیچیدگی سے پیدا ہوئی ہے۔ فرائڈ تو پہلے ہی انسانی ذہن کو "علامتوں کی دنیا" کے نام سے پکار چکا تھا۔ میراجی نے اشاریت کو اپنا کر ابہام کو کہیں زیادہ ژولیدگی سے اپنے فن میں جذب کر لیا۔ اگر غالب غزل گو نہ ہوتا تو اس کی شاعری کا ابہام بہ نسبت میراجی کے ابہام کے اشاریتی شعراء کے ابہام سے کہیں زیادہ قریب ہوتا لیکن غزل کے منفرد اشعار اس ابہام و اشاریت کے متحمل نہیں ہو سکتے جو میلارمے کے نظریۂ شاعری کا مقصود تھا۔ پال والیری سے جب یہ پوچھا گیا تھا کہ وکٹر ہیوگو کے کلام میں آپ کو کونسا بند سب سے زیادہ پسند ہے تو اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔ کیونکہ اشاریت کا تعلق نظم کے مجموعی تاثر سے ہے۔ تمام اشعار کو آخری شعر پر مرتکز ہونا چاہئے۔ کیونکہ اشعار کا باہمی تعامل خود ایک نغمہ زا کیفیت پیدا کرتا ہے۔ غزل کے اکثر اشعار منفرد ہوتے ہیں، اس لئے اشاریتی نظریۂ شاعری کے مطابق یہ صنفِ سخن بالکل توجہ کے قابل نہیں رہتی۔ لیکن منفرد اشعار کی غزل اشاریت کے لئے جس قدر ناموزوں ہے غزلِ مسلسل اسی قدر یقیناً موزوں و مناسب ہے۔ غالب کے بعض اشعار میں مکمل اشاریت موجود ہے۔ یہ اشاریت اس کی الفاظ پر قدرت کاملہ اور اسلوبِ اظہار کی پیچیدگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تو اور آرائشِ خمِ کاکل!
میں، اور اندیشہ ہائے دور و دراز

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

اور اس طرح کے بہت سے اشعار غالبؔ کی ایک مخصوص اشاریت اور ابہام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالبؔ کا ابہام میراؔجی کے ابہام سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم ہے۔ ژولیدگیٔ بیاں غالبؔ کی شاعری کا فطری اسلوب ہے۔ لیکن میراؔجی کی بعض نظمیں اس سلسلہ میں کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ قاری کی کوششِ تفہیم سے مکمل مدافعت کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم "بعد کی اڑان" قابلِ ذکر ہے۔ اندازِ بیاں بہت پیچیدہ ہے۔ لیکن سعیٔ تفہیم نامشکور نہیں ہوتی۔ لکھتے ہیں:—

چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوا!
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا
کلموا، کالا کلوٹا کاجل
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے

. . . .

وہ تو اک رات کے طوفان کا اعجاز تھا طوفان مٹا
کیسا طوفان تھا! اندھا طوفاں
جس کے مٹنے پہ مجھے نوحؔ کی یاد آتی ہے۔
اور پھر نوحؔ نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا، اسے چھوڑ دو۔ اس فاختہ کو
جا کے خشکی کا پتہ لے آئے

چند لمحوں ہی میں وہ فاختہ لوٹ آئی مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
او پھر کوّے کو چھوڑا، یہی خشکی کا پتہ لائے گا
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا

. . . .

یہ پوری نظم بڑی خوبصورت ہے۔ اس میں ان تمام کیفیات کا بڑے دلنشیں اسلوب میں اظہار کیا ہے جو شاعر کے شعور و تحت الشعور میں شبِ وصال کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ شبِ وصال گزر چکی ہے۔ شب کی بدمستیوں نے محبوب کی آنکھوں کے کاجل کو رخساروں پر پھیلا دیا ہے۔ اسی کاجل کی لکیر کو جو صبیح رخساروں پر پھیلی ہوئی ہے، وہ کالے کلوٹے کوّے کے نام سے پکارتا ہے۔ ماتھے کی بندی منتشر ہو کر مدار ستارے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ وہ اس مدار ستارہ کو قدرے تعجب سے دیکھتا ہے کہ یکایک اسے غسل خانہ میں انگلی پہ سرخ نشان کی یاد آتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ "بندی" کو انگلیوں کے لمس نے مدار ستارے کی شکل دے دی ہے۔ وہ انگلی کا سرخ نشان تو غائب ہو گیا۔ لیکن اپنے پیچھے یادوں کے نقوش چھوڑ گیا ہے۔ "تان" جذبات کے تلاطم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ پھر شاعر سوچنے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ گیسو بکھر گئے ہیں، کاجل رخساروں پر پھیل گیا ہے اور بندی کا سُرخ نشان بھی پراگندہ ہو گیا ہے۔ وہ گزری ہوئی رات میں جذبات کی متلاطم کیفیت کو طوفان سے ایک اندھے طوفان سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اسی اندھے طوفان کا اعجاز تھا جو ہر چیز بکھر گئی ہے۔ لیکن اب وہ طوفان مٹ چکا ہے۔ اسی طوفان کے مٹنے پہ اسے طوفانِ نوحؔ کی یاد آتی ہے۔ طوفانِ نوحؔ کی یاد سے رخساروں پر کاجل کی سیاہ لکیر سے آتی ہے۔ جسے اس نے کوّے سے تشبیہہ دی ہے کیونکہ نوحؔ نے طوفان مٹنے کے بعد کوّے کو خشکی کا پتہ لانے کے لئے چھوڑا تھا۔

یہ نظم اندازِ بیان کے اعتبار سے اشاریتی نظریۂ شاعری سے قریب ہے۔ میراؔجی کی شاعری پر ہیئت اور مضامین دونوں اعتبار سے سخت تنقید کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا یہاں موقع نہیں۔ اردو ادب میں ان کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ وہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس میں

اشاریت نے جنم بھی لیا اور دم بھی توڑ دیا۔ گو مختار صدیقی، قیوم نظر اور اختر الایمان اور دوسرے شعراء نے بھی اس راہ پر چلنے کی کوشش کی ہے لیکن جلد ہی انہوں نے مختلف راہیں اختیار کر لیں۔ مختار صدیقی کی نظم "مغل عمارتیں" اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم میں اس نے محبت کو ایک "نادرہ کار خالق" کے نام سے پکارا ہے۔ جس نے محبوبہ اور "تاج محل" دونوں کی تخلیق کی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو اپنے جذبۂ عشق کی تخلیق کہتا ہے۔ اور تاج محل کو شاہ جہاں کے جذبۂ محبت کی تعمیر کہتا ہے۔ پھر وہ اپنی محبوبہ اور "تاج محل" کی باہمی مماثلت کو نمایاں کرتا ہے۔ اور آخر میں خود کو شاہ جہاں کے نام سے پکارتا ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جذبۂ عشق ہی حسن کا خالق ہے۔ نظم بڑی خوبصورت ہے اور اشاریتی لب و لہجہ لئے ہوئے۔ اردو ادب میں اشاریت باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکی بلکہ رجحان کے طور پر نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اشاریت غائب ہو رہی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن عسکری "نئی شاعری کا پہلا اصول ہے میلارمے اور والیری سے بغاوت" اس کی وجہ انہوں نے یہ بتلائی ہے کہ میلارمے اور والیری کی شاعری میں تجریدی عنصر کی فراوانی اور ٹھوس حسیاتی تجربے کے فقدان نے نئے شاعروں کو اشاریت سے منحرف کر دیا۔ لیکن اشاریت نے فرانسیسی ادب میں جو روح پھونکی تھی، وہ اب بھی پژمردہ نہیں ہوئی گو اپنی تاثیر کسی حد تک کھو چکی ہے۔ لیکن اشاریت کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ سوریلزم اور "وجودیت" دونوں اشاریتی عنصر سے خالی نہیں۔ آندرے بریتوں نے اشاریت ہی کے زیرِ اثر کہا تھا کہ "انتشار کو تحیر" میں بدل دو۔ سارتر نے کیرک گارڈ سے براہِ راست اثر نہیں لیا تھا بلکہ اشاریت کے مداحوں کے زیرِ اثر اس نے "وجودیت" تک رسائی حاصل کی۔ آج کا شاعر اس لئے بھی اشاریت کو نہیں اپنا سکتا کہ اشاریت غایت و مقصد سے دستبردار ہو جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور آج کا شاعر بغیر کسی مقصد کے میلارمے کے بحری سفر میں شریک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی کوئی منزل نہیں جیسا کہ آرتھر سیمنس نے کہا ہے۔ یہ معلوم کرنا تو آسان ہے کہ میلارمے نے کس چیز سے فرار کیا لیکن وہ کس چیز کی طرف بھاگا یہ معلوم کرنا بے حد مشکل ہے۔ اور آج کا شاعر اس لئے لکھتا ہے کہ بقول سارتر وہ "ایک مطلق" کی ضرورت کو پورا کرتا ہے یا پورا کرنا چاہتا ہے۔



ہمارے ملک نے صنعت و حرفت، کاروبار تجارت، رسل و رسائل، مواصلات ہر میدان میں جو غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس سے ایک رنگا رنگ تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے۔ تصویری صفحات میں ہم قومی نمائش ۱۹۶۰ء منعقدہ کراچی کے چند اہم مناظر پیش کر رہے ہیں جن سے اس نمائش کی خوبصورتی اور افادی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور پچھلے دنوں اس نمائش کے ساتھ ہی ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی کراچی میں ہوئی جو اہل تجارت و کاروبار کا ایک بڑا اہم اجتماع تھا۔ اس میں مختلف ممالک کے تقریباً ۵۰۰ نمائندگان نے شرکت کی۔ یہ ایشیائی اور مشرق بعید کے مسائل اور بین الاقوامی ایوانِ تجارت کے نمائندے تھے جن کا نواں اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ یہ مذاکرات ۵ دن تک جاری رہے۔ اس تقریب کا افتتاح قائم مقام صدر پاکستان، لفٹیننٹ جنرل، جناب واجد علی برکی نے فرمایا۔ اور اہم اجتماعات سے ہمارے وزیر مالیات جناب محمد شعیب نے بھی خطاب کیا۔ ملک کے کاروباری حلقوں کے کئی سربراہوں نے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کا نقطۂ نظر اور اقتصادی و تجارتی کوائف پر روشنی ڈالی۔ کانفرنس کے مذاکرات میں سب سے اہم دیہی ترقی اور فلاحِ عوام پر خصوصاً زور تھا۔ جو انقلابی حکومت کا شروع ہی سے مطمحِ نظر اور خصوصی مرکزِ توجہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ زرعی اصلاحات، بنیادی جمہوریتوں کے قیام اور دوسرے حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل پنجسالہ منصوبے کے ذریعہ اس پالیسی پر عمل بھی شروع کر چکی ہے۔ تجارت و کاروبار کے اس اہم اجتماع کی چند تصاویر اس شمارہ میں پیش کی جا رہی ہیں۔

غزل

سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

میں رہِ عشق میں بچتا ہوا رہبر سے چلا
پاؤں سے چلنے کی تقلید نہ کی سر سے چلا

رفعتوں کا مری گلشن میں نہیں کوئی حریف
کون یہ میرے نشیمن کے برابر سے چلا

طُور دیدار گہہِ دوست بنا، دل نہ بنا
جو نہ انساں سے چلا کام، وہ پتھر سے چلا

دل کی دھڑکن میں سُنی رات کو تیری آواز
کچھ پتہ تیرا چلا، تو دلِ مضطر سے چلا

کیا کوئی میرے سوا اور رہے شایانِ نشاط؟
ابر اُٹھ کر یہ کدھر چشمۂ کوثر سے چلا؟

آخرِ کار رہوا خستم شگفتِ دل پر
رنگ و بو کا وہ شگوفہ جو گلِ تر سے چلا

سرفروشی تھی خطا سرمدؔ و منصورؒ کے بعد
میری ملّت میں یہ دستور نئے سر سے چلا

تھا میں وہ مہرہ بساطِ عدم و ہستی کا
آگیا پھر اُسی گھر لوٹ کے جس گھر سے چلا

پیکرِ خاک کو بدنام نہ کر عالم میں
کہ ترا نام اسی خاک کے پیکر سے چلا

تھا تو انسان، مگر رفعت سدرہ تھی نصیب
دمِ پرواز میں جبریلؑ کے شہپر سے چلا

ہو گئے خود ہی یہ سب میرے مقدر میں دخیل
میں تو بچ بچ کے نظامِ مہ و اختر سے چلا

دیکھ اے حجرہ نشیں، قافلۂ اہلِ جمود
تیری باتوں سے چلا یا مری ٹھوکر سے چلا

میں کہ پیغمبرِ تہذیبِ سخن تھا سیماب
سلسلہ شعرِ مہذّب کا مرے گھر سے چلا

افسانہ:

بہار جلتی رہی!

(ایک طنز ایک حقیقت)

سلیمان پاشا

"سردی کی سرد راتیں بھی عذاب بن گئی ہیں، میرے لئے۔ اب میری زندگی کا کوئی آسرا نہیں۔ پیلے پان اور پکے آم کا کیا اعتبار۔ ہوا کا ایک جھونکا زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے" عبدل نے حقے کی نلی پرے کرتے اور کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ کھانستے کھانستے بیدم ہو گیا۔ چوپال پر بیٹھے ہوئے کسانوں نے اس کا سینہ سہلایا۔ سامنے الاؤ پر جلتی ہوئی آگ اب اس کے جسم کی حرارت کو قائم نہ رکھ سکتی تھی۔ نورا الاؤ سے مٹی کی پیالی ہاتھ میں لئے بھاگا تاکہ عبدل کے جسم کو سرما کی سرد ہواؤں سے بچا کر عارضی گرمی پہنچا سکے۔ نورا نے پیالی عبدل کو دیتے ہوئے کہا "گرم گرم چائے پی لو تاکہ تمہیں سکون ہو بابا" رحمن نے اپنی میلی پرانی صدری جس سے پسینہ کی بدبو آ رہی تھی، اتار کر بابا کو پہنا دی۔ لیکن بابا کا جسم ان چیزوں سے عارضی گرمی ہی تو حاصل کر سکتا تھا۔ زندگی تو نہیں! اور زندگی بغیر روح کے ممکن نہیں۔ لیکن جو جینا ہی نہ چاہے اسے کون گرمی اور روح دے سکتا ہے؟

الاؤ کے چاروں طرف بابا کی کھانسی اور سانس کے دورے سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ عبدل بابا کوئی اسّی کے لگ بھگ ہو گا۔ کبھی یہ بہت بڑا زمیندار تھا لیکن اب فقیر تھا۔ اور گذر اوقات صرف گاؤں کی روٹیوں پر تھی۔ دن رات سے لیکر گرمی، سردی، بارش سب ہی اس چوپال پر گذرتے تھے۔ دن بھر کھیتوں میں جانکاہ محنت کرنے کے بعد جب شام کو کسان کھانے پانی سے فارغ ہوتے تو چوپال پر جمع ہو جاتے۔ جب عبدل ہوش میں نہ ہوتا تو بڑی عقلمندی کی باتیں کرتا، نصیحتیں کرتا اور بیج بونے، فصل کاٹنے اور مناسب جگہ محفوظ کرنے اور مناسب وقت پر فروخت کرنے کی ہدایتیں دیتا۔ پھلوں کی دیکھ بھال کرنے، ان کو کیڑوں سے بچانے اور کھاد بنانے اور وقت پر ڈالنے کی ہدایات بھی سب کسان اس سے حاصل کرتے تھے۔ لیکن جب عبدل ہوش میں ہوتا تو بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا جس پر کبھی کبھی کسان اسے پاگل خیال کرنے لگتے تھے۔ اب کون جانے اسّی سالوں میں اس نے کیا کیا گرم و سرد نہ دیکھے ہونگے، کتنی مصیبتیں نہ جھیلی ہوں گی اور کتنے دکھ نہ اٹھائے ہوں گے۔ لگان نہ دینے پر کبھی کبھی تو اسے پوری پوری فصل سے ہاتھ دھولینا پڑا ہو گا۔ اس کے مویشی تھانیدار کے گھر ہوں گے اور اس کی بیٹی تحصیلدار کے یہاں برتن مانجھنے پر مجبور۔ کتنے دن ایسے حوالات کاٹنی پڑی ہو گی۔ کبھی کبھی تو لگان نہ دینے پر اس کے سر پر جوتے بھی پڑے ہوں گے۔ اور صرف لگان کی خاطر اس کے گھر کے برتن، لوٹا تھالی تک بھی نیلام کر دئے گئے ہوں گے۔ کون جانے کیا کیا نہ ہوا ہو گا یہی وجہ تھی کہ اب وہ صرف بے ہوشی میں ہوش کی باتیں کرتا تھا، نصیحتیں کرتا تھا، کسانوں کو کہتا تھا "میرے بچوں! یہ تحصیلدار، تھانیدار، پٹواری وغیرہ سب بادشاہ ہیں ان کے قہر اور عذاب سے ہر وقت پناہ مانگتے رہو۔ ان میں اور خدا میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ رزق پہلے دیتا ہے، پھر رحم کرتا ہے اور آخر میں قہر کرتا ہے۔ لیکن ان کے پاس نہ رحم ہے نہ روزی! صرف قہر ہی قہر ہے۔ ان کے اور ہمارے درمیان صرف اناج ہے اور اناج کی وہی صورت ہے جیسے دو بھوکوں کے درمیان صرف ایک روٹی کی ہو۔ ظاہر ہے جو طاقت ور ہو گا، وہ روٹی کھائے گا۔ اور جو کمزور ہو گا وہ ننگا بھوکا رہے گا۔ ہمارا کام صرف غلہ پیدا کر کے ان کے سپرد کر دینا ہے، اپنے لئے صرف جوتا، لات، برہنگی اور فاقہ رکھ لینا ہے۔"

جب عبدل ہوش کی باتیں کرتا تو پاگل کہلاتا ہوش میں ہوتا تو کہتا "نورا بھاگ، وہ تیری لڑکی تحصیلدار بھگا کے لئے جا رہا ہے، چوٹی پکڑ لے۔ دوڑ دوڑ! نورا کی لڑکی بھاگ گئی" پھر وہ زور زور سے قہقہے لگاتے لگاتے خاموش ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ کہتا "مجھے معاف کر دو، میرا گھر نہ اجاڑ دیں لگان کی ایک ایک پائی دیدوں گا۔ میرا سامان نیلام نہ کرو میری لڑکی کا جہیز نہ تباہ کرو۔ میری لڑکی کا سہاگ نہ اجاڑو مجھے چھوڑ دو، مجھے زندہ رہنے دو۔ میں ایک ایک پائی لگان کی ادا کروں گا"...

آج چوپال پر شام ہی سے سب کسان جمع تھے۔ گاؤں میں قومی میلہ تھا۔ اور کچھ عبدل بابا بھی خدا کے شکر سے صبح ہی سے بے ہوشی کے عالم میں تھے۔

کھانستے کھانستے بابا نے جا لی۔ اور چند منٹ خاموش ہو گئے سب منتظر تھے کہ آج ضرور کوئی اچھی سی بات کہیں گے۔ جوان کی زندگی کی طرح انشی سال پرانی ہوگی۔ پرانی چیز یا بات بھی جب بہت پرانی ہو جائے تو نئے انسانوں کے لیے بڑی عجیب غریب ہو جاتی ہے۔ اور لوگ اسے بڑے اشتیاق سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔

بابا نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں اور ذرا تن کر بیٹھ گئے۔ اپنی بنجر اور خزاں رسیدہ ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرا۔ ان کی بارعب آنکھیں پُر وقار بن گئیں۔ انہوں نے اپنے سر کو کھجایا اور کوئی چیز سر کے بکھرے اور الجھے ہوئے بالوں سے نکالی اور دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں پہ مارتے ہوئے کہا۔

"اب اس چمن میں کبھی بہار نہ آئے گی۔ چاہے تم پسینہ کے بجائے اس دھرتی کو خون ہی کیوں نہ پلا دو۔ اپنے دلہن کے تمام انسان ہی کیوں نہ اس پر قربان ہو جائیں۔ آج سے چالیس سال قبل یہ دھرتی مسکراتی تھی۔ جب دھرتی مسکراتی تو ہر چیز مسکرانے لگتی تھی۔ زمین کی مسکراتی اور اٹکھیلیاں کرنے لگتی تھی۔ ہوا کے مسکرانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگتا تھا۔ اس زمین کا ریزہ ریزہ، اس پر آگنے والا دھان، دھان پر چہچہانے والی چڑیاں مسکرانے لگتیں اور مسکراتے مسکراتے ناچنے لگتی تھیں۔ کبھی ایک نازک کونپل پر تو کبھی دوسری ننھی ننھی نازک ٹہنی پر بیٹھتی، اچکتی، کودتیں اور مسکراہٹوں کو ایک شاخ سے دوسری شاخ تک بکھیر دیتیں ایک سمت سے دوسری سمت پہنچا دیتیں۔ یہ مسکراہٹ جب جوانی میں سماتی تو تاثل بن جاتی۔ بن پٹے جھومنے لگتے۔ ہم سب اپنے گھروں سے نکلتے، کھیتوں میں پہنچتے۔ کسی کے پاس ڈھول ہوتے تو کسی کے پاس نقارے اور سنکھ ہوتے، کوئی البیلا بانسری اور اک تارہ لئے آتا۔ ہم سب جوانی اور خوشی سے مست ہو جاتے اور خوب جھوم جھوم کر گاتے اپنی دھرتی کے لوک گیت۔ سہیں کلو دھوبن بھی ہوتی، اور منا چمار بھی۔ آشا سنارن بھی ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان نوجوان لڑکیوں کے سینوں میں مسرت، مسکراہٹ اور خوشی اب سما نہ سکے گی، پھوٹ نکلے گی یہ جوانی! ۔ دودھ کی دھاروں کی طرح۔ اور پھر یہ جوانی کئی ایک معصوم روحوں کو جنم دے گی۔ آکاش مسکرانے لگتا! دھرتی ناچنے لگتی"۔

"فصل بوتے، فصل کاٹتے۔ ایک بوتے سات کاٹتے کتنی فیاضی تھی قدرت کی کتنی فراوانی تھی غلہ کی، اجناس کی، دودھ کی گھی کی اور پھلوں کی۔ پھلوں سے ڈالیاں جھک کر زمین چومنے لگتی تھیں، پھولوں سے پودوں کے تنے چھپ جاتے تھے، فضا مہک اٹھتی، دھان بوتے تو کاٹتے کاٹتے تھک جاتے، رکھنے کی جگہ نہ ہوتی۔ کپاس بوتے تو ہر جگہ یہ ریشمی ریشے اڑتے نظر آتے جس کا جی چاہے حاصل کرے۔ پٹسن بوتے تو فضا میں ریشمی تاروں کا جال بن جاتا۔ دودھ دہی اور مکھن ہر گھر میں ہوتا۔ اس کا کوئی مول نہ ہوتا۔ دودھ شہد کو پیسے سے بیچنا پاپ تھا پاپ"۔

"بابا یہ اس دھرتی کی بات تو نہیں جس میں ہم رہتے ہیں"

نورا نے تعجب سے پوچھا۔

"بیٹا! یہ اسی دھرتی کی بات ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب تم نہ تھے اور یہ کھیت ہمارے کھیت تھے۔ ہمارے باغوں پر ہماری بادشاہت تھی۔ ہمارے مویشی ہم کو پیارے تھے۔ ہم دھرتی کے مالک تھے اور جب زمین کا بیچنا بھی گناہ تھا۔ ہمارے گاؤں میں کوئی بھوکا نہ رہتا تھا۔ کوئی ننگا نہ تھا۔ اور دوا کی تو ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ سب چیزیں قدرت کی بنائی ہوئی کھاتے تھے۔ اپنی بنائی ہوئی نہ کھاتے تھے"۔

رحمان جو اب تک چپ بیٹھا، بابا کی باتیں سن رہا تھا۔ بولا اب بھی تو ہم سب چیزیں قدرت کی بنائی ہوئی کھاتے ہیں۔ انسان نے کیا بنایا ہے جو کھایا جا سکے"۔

بابا ذرا سنبھلے اور انہوں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "ہاں میرے بچے! انسان نے بہت سی چیزیں بنا دی ہیں جو آج ہم کھاتے ہیں۔ دودھ کے بجائے سنگھاڑا کھاتے ہیں گھی کے بجائے بنولہ کھاتے ہیں مکھن کے بجائے ہم وہ کھاتے ہیں جو موٹریں کھاتی ہیں۔ گیہوں کے بجائے ہم آٹا کھاتے ہیں وہ آٹا جو سرکنڈوں اور بھوسے سے تیار کیا جاتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں۔ ہاں بیٹا!" بابا نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "مرچ کے بجائے ہم سرخ رنگ کپڑے رنگنے کا کھاتے ہیں۔ اور دھنیئے کے بجائے ہم برادہ کھاتے ہیں۔ سب کچھ کھاتے ہیں، دھوکہ ہی دھوکہ کھاتے ہیں۔ فریب ہی فریب

کھلتے ہیں؟

"مگر تم میں سے کسی نے کبھی سوچا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس حسین وادی اور اس خوبصورت گاؤں سے قدرت نے اپنی بہار کیوں چھین لی؟ یہ چمن کیوں اجاڑ ہوگیا؟ یہ بہار کیوں جلنے لگی۔ باد صبا کے بجائے یہ لو کیوں چلنے لگی؟ اصلیت کے بجائے دھوکہ کیوں کھانے لگے؟"

چالیس سال میں چار سو سال کا کیوں فرق ہوگیا، صرف اسلئے کہ انسان نے چار سو میں کچھ اور شامل کر دیا۔ یہ دھرتی، سونا اور چاندی اگلنے والی دھرتی، یہ امرت کی ندیاں، یہ پھولوں میں رنگ ہی رنگ بھرنے والی کرنیں، یہ پھلوں میں رنگ، مزہ اور خوشبو پیدا کرنے والی ہوائیں سب کیوں بدل گئیں؟ یہ زندگی کا سویرا رات کی تاریکی میں کہاں کھو گیا؟ اور جب آنکھ کھلی تو ہم در در بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے! ہم روٹی، پانی، کپڑے اور دُکھی دوا تک خیرات مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمیں زندگی کی ہر سانس کیوں غیروں سے بھیک مانگنی پڑی؟ وہ غلہ جس کی کوئی قیمت نہ تھی کیوں ناپ کر تول کر ملنے لگا؟

آج بھی وہی زمین ہے، وہی آسمان ہے۔ وہی ہوا اور وہی پانی ہے۔ میرے بچو! اُتو را۔ رحمان کیا تم محنت نہیں کرتے؟ کیا تم زمین کے سینہ کو چیر کر اناج نہیں بوتے؟ انگریزی کھاد، انگریزی بیج نہیں ڈالتے؟ انگریزی دیوزاد مشینیں تمہاری دھرتی کو کمر کمر چیر کر اس کے سینہ کے دونوں بلڑوں کو الگ نہیں کر دیتیں، کیا اُودے اُودے نیلے نیلے آسمان کے تلے ہمارے دیس کی کنواریوں کے بالوں کی رنگت کے بادل ہماری زمین کی پیاس نہیں بجھاتے؟ کیا تمہارے چوڑے چکلے سینے اپنی زمین کو اپنا خون نہیں پلاتے؟ تمہارے جسم سے نکلتے ہوئے سینہ کے قطرات شبنم کی طرح جذب نہیں ہوتے؟ مگر دیس بھوکا ہے ننگا ہے۔ کیوں؟ آؤ، آج میں تمہیں تمہارے دشمنوں سے ملا دوں ـــ دوست نما دشمن، کالے ناگ جو تمہاری زمینوں کا سہاگ تم سے چھین لیتے ہیں، تمہاری محنت کی کمائی لوٹ لیتے ہیں۔ اور تمہیں بھیک مانگنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تمہارے دھان کی بالیں۔ دشمنوں کی غذا بن جاتی ہیں۔"

"ملو، ان سے ملو۔ کلو۔ رحمان دوڑو۔ تمہاری لڑکی کو تھیلا بھگا کر لے جا رہا ہے۔ پکڑ لو۔ دوڑ لو۔ وہ چوٹی پکڑے۔ رحمان۔ رحمان دوڑو۔ وہ گوداموں کا تالا ٹوٹا۔ وہ دھان لاریوں پر لاد کر لے چلا۔ دوڑو دوڑو۔ ہم بھوک سے مر جائیں گے۔ یہ ہمیں بھوکا مار ڈالیں گے۔ لٹیرے ڈاکو کہیں کے۔"

"یہ چلے کپاس کے گالے۔ یہ سب قطار در قطار۔ دشمن کی طرف اُڑتے ہوئے۔ بھاگو طوفان آیا۔ بھاگو سیلاب آ رہا ہے۔ بھاگو۔ سیلاب آیا۔ یہ ریشمی ریشہ کے جال اُڑنے لگے۔ یہ سب جال اب ماہی گیر کے جال کی طرح دشمن کی ندی میں گر رہے گے۔ اب جالوں سے کوئی سنہری روپہلی مچھلی ماہی گیر کے ہاتھ نہیں لگ سکتی۔"

بابا گھبراہٹ اور خوف سے کانپنے لگا۔ مگر اس کی زبان چل رہی تھی۔ ایک گراموفون کی مشین کی طرح جس کی چابی ختم ہو رہی تھی، بابا کی آواز بکھر گئی: "اب ہماری زمین بیوہ ہو جائے گی۔ ہمارے گاؤں میں قحط آ جائے گا، لوگ دانہ دانہ کو محتاج ہو جائیں گے، لوگ بھوک سے مر جائیں گے۔ بھاگو۔ آگ لگ رہی ہے۔ ہر چیز سرحد پار جا رہی ہے بھاگو" بابا پر چلاتے چلاتے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ بیدم ہو گیا۔ بابا کا سانس رکنے لگا۔

کہیں دیر میں جا کر کچھ سنبھلا۔ اور اس کا چہرا چمک اٹھا۔ جیسے کوئی بجھتا ہوا دیا یکدم لو دے اٹھے۔ اس کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ چھا گئی۔ اور وہ بولا "ہاں ہاں۔ یہ سب کچھ ہے یہ سب کچھ تھا۔ مگر اب۔ اب۔ میری یہ بوڑھی آنکھیں کچھ اور بھی دیکھ رہی ہیں۔ دیکھ چکی ہیں۔ اور تم، میری آنکھوں کے نور، اور بھی بہت کچھ دیکھو گے۔ اب رُت بدل رہی ہے۔ تیزی سے، بڑی تیزی سے۔ گیا وہ زمیندار کا دور گیا۔ وہ تھانیدار، وہ تحصیلدار، وہ پٹواری سب کے سب لد گئے۔ چند ہی دن میں کیا سے کیا ہو گیا۔ اب وہ برسوں پہلے کی رت سے بھی اچھی، سہانی رت، چہکتی بولتی زندگی آ گئی۔ اب ہم ہی ہم ہیں۔ ہم ہی ہم..... یہ دھرتی، یہ غلہ، یہ پھل پھول، دھن دولت سب ہمارا اپنا ہے۔ خدا کرے۔ جو ہماری پرانی پود نہ پا سکی وہ نئی پود پالے۔ خوشی ہی خوشی۔ شادی ہی شادی..." شادی! اس لفظ پر بابا کا سانس رکنے لگا۔ جیسے وہ اس کی تاب نہ لا سکا ہو۔ پاگل ہو گیا ہو۔ جانے کیا بات تھی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ پاگل بابا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک روشنی، ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی ـــ پاگل بابا، پاگل ـــ مگر کتنے سیانوں سے زیادہ سیانا پاگل!

بنگلا افسانہ:

۸ = ۰

عبدالغفار چودھری

مترجم: احمد سعدی

"شہیلی! نہ معلوم کیوں آج تمہیں 'آپ' کہہ کر مخاطب کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل چاہتا ہے تمہیں تم، تم، 'تم' اور صرف 'تم' کہہ کر مخاطب کروں، آج میری دنیا میں جیسے صرف تم ہی تم دکھائی دے رہی ہو....."

چند سطریں لکھنے کے بعد رضوی اٹھ کھڑا ہوا، میز پر ایک زرد رنگ کا لفافہ پڑا ہوا تھا، اس پر نام تحریر تھا: "کے۔ رضوی، ۵/۲۲ بی، میمن سنگھ روڈ، ڈھاکہ" لکھا ہوا تھا اور اس کے اندر نیلے رنگ کے کاغذ پر لکھے ہوئے خط میں مکتوب الیہ کو رضوی صاحب کے القاب سے مخاطب کیا گیا تھا۔

خط پر ایک نظر ڈالنے کے بعد رضوی نے اسے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ میز کے قریب ہی ایک تپائی پر ایش ٹرے تھا جس میں بہت دیر سے پڑا ہوا سگریٹ جلتے جلتے ختم ہو رہا تھا اور دھوئیں کی پتلی سی بل کھاتی ہوئی لکیر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ پیچھے مہوگنی کی ایک بڑی سی الماری تھی، جس کے دونوں تختوں پر اسی سائز کا آئینہ لگا ہوا تھا۔ آئینہ میں رضوی کا عکس بالکل ساکت تھا۔ کمرے میں دو تین چکر لگانے کے بعد وہ الماری کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ شیو کافی بڑھ گیا تھا۔ سر کے سامنے کے حصہ میں اس کے خوبصورت گھونگریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کان کے قریب بالوں پہ گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی، سامنے دیوار پر اس کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ گھونگریالے بال پیشانی پر جھول رہے تھے، دونوں بھنویں جڑی ہوئی، ستواں ناک، ہونٹوں پر مونچھ کی پتلی سی لکیر۔ بیس سال کی عمر کی اس تصویر اور تیس سال کے عکس میں کتنا فرق تھا! کہاں دھان کے پودے کی طرح دبلا پتلا، تلوار کی دھار کی طرح تیز اور چمکیلا جسم اور کہاں موٹاپا لئے ہوئے بے ڈول جسم اور اداس، بے رونق چہرہ۔

میز کے قریب واپس آکر رضوی نے خط کو پرزے پرزے کر کے پھینک دیا، اس کے بعد بیٹھ کر پھر خط لکھنے لگا۔

"ڈیر مسز خان! آپ کا خط ملا، جواب دینے میں ایک دن کی تاخیر کیوں ہوئی، جانتی ہیں؟ مشتری کی تصویر کا شیشہ کل اچانک دیوار سے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اب دوبارہ اسے فریم بھی کرایا نہیں جا سکتا کیونکہ تصویر بھی برباد ہو گئی ہے۔ دیکھا تو معلوم ہوا کتنے کو بھی کیڑوں نے چاٹ کر جھرجرا کر دیا ہے، جانے دیجیے تم آپ کیسی ہیں؟ آپ تو لڑکیوں کی ایک جماعت کو ساتھ لئے تمنا کی عظیم کرسی پر بیٹھ کر پیچھے نیلگوں افق پر چھائے ہوئے سنہرے رنگ کو ضرور ہی بھول جاتی ہوں گی۔ ماضی کو آپ بھول چکی ہوں گی ـــ بالکل فطری بات، لیکن موجودہ زندگی میں کیا آپ کو اس کا ذرا بھی عکس نظر نہیں آتا؟

"آپ نے میری خیریت دریافت کی ہے۔ اچھا ہوں، لیکن یہ اچھائی بھی بڑی تکلیف دہ، بے کیف اور بے رنگ ہے۔ میمن سنگھ روڈ پر سورج طلوع ہوتا ہے اور سرنیٹائل بینک میں غروب ہوتا ہے، اس کے درمیان دفتر، فائل، ریکارڈ اور ریفرنس کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اپنے مقابلہ میں آپ کو بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کا اسکول ضرور کسی اونچے سے ٹیلے پہ ہو گا۔ چھوٹی بڑی، درمیانہ عمر کی بہت ساری لڑکیوں کے قہقہے گونجتے ہوں گے۔ محبت، ڈانٹ، شرارت اور فرمانبرداری کا بڑا میٹھا مدھر ماحول۔ کم از کم آپ تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہائی سے خوف نہ کھاتی ہوں گی۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر روز شام کو جب دھان کے پودوں کا بالائی سرا کشتی کے بادبان کی طرح ہوا کے جھونکے پر ہلکورے لیتا رہتا ہے۔" اس وقت دو رویہ سپاری کے درختوں کے درمیان سبزہ سے ڈھکے ہوئے راستے پر چل کر آپ اپنے کوارٹر میں واپس ہوں گی اور ممتاز کی تصویر کو بڑے پیار اور اہتمام سے صاف کرتی ہوں گی اور مغرب کی طرف کے کھلے ہوئے جنگلے سے افق پر چھائی ہوئی سرخی کا عکس کمرے میں آکر ممتاز کی تصویر کو اور بھی مدھر، خوابناک اور پیارا بنا دیتا ہو گا۔ بڑا رشک آتا ہے، جی چاہتا ہے اس زندگی کو تیاگ کر میں اسی تصویر

میں سما جاؤں۔"

خط کو لفافہ میں بند کر کے وہ دیر تک اصل پتہ پر لکھتا رہا "مسز سُہیلی ممتاز خاں، کرو ناگر گرلس اسکول، کرو ناگر۔"

تین دن بعد اس خط کا جواب آگیا: "آپ نے غلط لکھا ہے میرے پاس ممتاز کی کوئی تصویر نہیں۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک تصویر کھنچوائی تھی، وہ بھی کہیں گم ہو گئی ہے۔ دل کو ٹٹول کر تلاش کرنے کے باوجود اسے نہیں پاتی۔ وہ ناک، وہ آنکھیں، وہ چہرہ، جو کبھی مجھے اپنی پانچ انگلیوں کی طرح پیارے اور جانے پہچانے تھے، اب جیسے ایک ایک کر کے سبھی کچھ کھو چکی ہوں۔ آپ پھر بھی اچھے ہیں اور میں؟ تنہائی میں کوئی بھی تنہا نہیں ہوتا۔ اپنے دل سے باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، لیکن بہتوں کے مجمع میں بھی میرا دل لاپتہ ہے، میں سچ مچ تنہا ہوں۔

"معلوم ہے، کرو ناگر میں بہار آئی ہے۔ بڑا حسین موسم ہے۔ آسمان پر، زمین پر، درختوں کے پتوں اور ہواؤں میں حسن اور کیف بکھر گیا ہے۔ بڑا سہانا منظر ہے۔ اس وقت مرا یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر لیتا ہے، جب میں اسکول کی اونچے درجوں کی طالبات کو دیکھتی ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موسمی پھولوں کی طرح وہ سب ان گنت رنگوں میں کھل اٹھی ہوں۔ آنکھوں میں گہرے نیلے ستارے، جسم پر زرد، سرخ بینگنی ساڑیاں۔ گہرا رنگ، باتوں میں شوخی، لہجے میں گہرائی اور گیرائی۔ جب چلتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں اکثر اپنے آپ کو بھول جاتی ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری عمر بھی اٹھارہ سال کی ہو گئی ہو۔

"ایک بار آئیے نا۔ یہاں اسکول کا مہمان خانہ ہے۔ اگر آپ نے پہلے ہی خبر بھیج دی تو میں خود دربان کو اسٹیشن پر بھیج دوں گی....."

رضوی نے دھیرے سے مسکرا کر خط کو جیب میں رکھ لیا۔

پندرہ دنوں کے اندر اسے چار خط اور ملے۔ آخری خط میں رضوی نے لکھا تھا۔ "سُہیلی! میں آ رہا ہوں، لیکن اسٹیشن پر تم خود آنا۔"

ٹرین کرو ناگر صبح چھ بجے پہنچی تھی۔ پانچ بجے بستر سے اٹھ کر غسل کرنے کے بعد رضوی نے کرتا پاجامہ پہن لیا، ایک سگریٹ سلگایا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ بہت دنوں بعد ایک بار پھر وہ سُہیلی کو حیران کر دے گا۔

ٹرین آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچی۔ سُہیلی تھوڑی دیر پہلے ہی اسٹیشن آ گئی تھی۔ وہ اپنے سر پر چینی چھتری نچاتے ہوئے مسافروں کو دیکھ رہی تھی، رضوی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ آئی اور بولی۔ "تو آپ آ گئے، آئیے....."

پلیٹ فارم مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ سڑک پر آنے کے بعد جب بھیڑ بھاڑ ذرا کم ہوئی تو رضوی نے دھیرے سے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ "آئیے ـــ نہیں ـــ آؤ ـــ خط و کتابت میں کیا ہم دونوں 'تم' کی حد تک نہیں پہنچ چکے ہیں۔؟"

سُہیلی کے چہرہ پر دوشیزاؤں جیسا خوبصورت حجاب نہیں تھا، پھر بھی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا "یاد ہے، لیکن پہلے پہل کہنے پر شرم آ رہی تھی۔"

دائیں جانب دھان کا کھیت، بائیں جانب سپاری کے باغ اور درمیان ایک پتلا سا راستہ تھا۔ تھوڑی دور پر ایک نہر بہہ رہی تھی۔ اور اس کے اوپر بانس کا بنا ہوا پل جھکا ہوا تھا۔ رضوی نے پل دیکھ کر کہا "مار دیا! اب کس طرح پار ہوں گے؟ مجھے تو اس کی ذرا بھی عادت نہیں۔"

سُہیلی مسکرائی "لیکن مجھے تو عادت ہو گئی ہے۔ اگر گاؤں قریب نہ ہوتا تو میں ہاتھ پکڑ کر پل پار کرا دیتی۔" "گاؤں ہے تو کیا ہوا؟"

"ارے باپ! میں گاؤں کے لوگوں کی نظروں میں دیوی بنی ہوئی ہوں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کلنکی ہو جاؤں گی۔"

اس نے غور سے سُہیلی کی طرف دیکھا۔ نہیں، یہ وہ سُہیلی نہیں تھی۔ وہ سرو قد، نازک اندام چنچل لڑکی یہ نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ایک معمر اسکول مسٹریس جیسے اس کی راہنمائی کر رہی ہو۔ خط کی سُہیلی اور اس سُہیلی میں جیسے کوئی مماثلت ہی نہ ہو۔

پل پر چڑھنے کے بعد سُہیلی نے اپنی چینی چھتری اس کی طرف بڑھا دی ـــ "اسے تھام لو۔" پھر اسے پل کے دوسری طرف اتارتے ہوئے بولی "اب ہم لوگ تقریباً پہنچ گئے ہیں وہ دیکھو۔ تھوڑی ہی دور مہمان خانہ نظر آ رہا ہے۔ دکھائی دیا؟"

رضوی نے دیکھا۔ ناریل کے پیڑوں کے پتوں کی اوٹ سے ایک بنگلہ نما عمارت جھانک رہی تھی، چاروں طرف اینٹ کی چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی، بڑے دروازے کے دونوں جانب پام کے دو چھوٹے چھوٹے پیڑ تھے۔ بڑے دروازہ کے اندر داخل ہونے کے راستہ پر ایک پتھر کی مورتی تھی۔ عورت کی مورتی، بالکل بے زرد۔ ایک ہاتھ میں سمٹا ہوا دوپٹہ، دوسرا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

رضوی نے محویت کے عالم میں کہا "بہت خوبصورت ہے۔"

"ہاں" شہیلی نے جواب دیا "لیکن اس عمارت کا نام اور بھی خوبصورت ہے، کلوپٹیرا کیسل"

رضوی چونک پڑا "اچھا، مگر وہ کیوں؟"

عورت کی مورتی کو بائیں جانب چھوڑ کر شہیلی آگے بڑھ گئی۔

"ہاں یہی نام ہے۔ آؤ، میں تمہیں کلوپٹرا بھی دکھاؤں۔ کلوپٹرا ہی کی طرح اس کی زندگی بھی پُراسرار ہے"

زینہ سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اوپر جاتے ہی ایک وسیع اور کشادہ کمرہ تھا جس کے ہر جنگلہ کے اوپر نصف چاند کی شکل بنا کر اس میں سرخ، نیلے، زرد اور سبز، مختلف رنگوں کے شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ اور ان ٹکڑوں پر سورج کے سات رنگ بکھر کر کمرے میں تمام دن قوس قزح کا رنگ پھیلاتے رہتے تھے، دیوار پر ٹنگے ہوئے ہرن کے سینگ میں اپنی چھتری لٹکا کر شہیلی نے کہا "وہ دیکھو"

رضوی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دیوار پر ایک بڑی سی روغنی تصویر آویزاں تھی۔ ایک خوبصورت عورت کی تصویر، قدیم یونانی تصویروں کی طرح، کندھا کٹا بلاؤز، سڈول بازو، باریک ساڑی گردن پر سے خم کھا کر پھیلتی ہوئی جھول رہی تھی۔ ستواں ناک، بڑی بڑی کشادہ آنکھیں جیسے اس کی مست و معطر جوانی کے گرد گلابی رنگ کا جال پھیلا ہوا تھا۔ گویا یونانی مجسمہ میں کسی بنگالی لڑکی کی روح ڈال دی گئی تھی۔ تصویر کے نیچے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا: بیگم صورت النساء فردوس ملکہ شمس آرا فخر بانو، تاریخ پیدائش ۱۴ اجیت ۱۳۴۴ھ، وفات ۱۲ آسن ۱۳۶۶ھ

لوگوں کی آہٹ سن کر دربان آکر کھڑا ہو گیا۔ شہیلی نے کہا "بھوجو! انہیں سونے کا کمرہ، باتھ روم دکھا دو۔ کھانے پینے کا انتظام کر دو، یہ سات دن یہاں رہیں گے"

رضوی نے اس کی طرف دیکھا "اور اس کے بعد؟"

"اب مجھے اجازت دو۔ اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ شام کو تیار رہنا، میں آؤں گی۔ اس وقت اطمینان سے باتیں کروں گی، کچھ خیال مت کرنا"

شہیلی تیزی سے باہر چلی گئی اور ہرن کے سینگ میں اس کی رنگین چھتری جھولتی رہی۔

شہیلی کے چہرہ پر اب بھی بلاشبہ حسن اور ملاحت باقی تھی۔ صبح کے وقت اس نے جیسے شباب کی حد سے گزر جانے والی استانی سمجھا تھا

وہی شام کے وقت ایک حریص بھونرے کی طرح اڑ کر اس کے پاس آگئی تھی۔

رضوی گول برآمدے میں بیٹھا ہوا چائے کی چسکی لے رہا تھا۔ شہیلی پاتا بہار کے پیڑ کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ رضوی اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

سیاہ ساڑی میں وہ بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سیاہ ساڑی کے پیچ و خم میں کوئی خوبصورت سفید گلاب کھلا ہوا ہو۔ ویسے بھی شہیلی کا رنگ گورا تھا اور اس وقت اس کا گورا رنگ سیاہ ساڑی میں جگمگا اٹھا۔ شہیلی کی آنکھیں حجاب سے جھک گئیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں دیکھ رہا ہوں!"

"چھی! نظریں نیچی کر لو"

"کیوں؟"

"میری عمر کچھ کم تو نہیں۔ تقریباً ستائیس سال کی ہو چکی۔ اس پر سیاہ اور سفید کپڑوں کے علاوہ دوسرے رنگوں کے کپڑے پہن بھی تو سکتی"

شہیلی کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ رضوی اپنی کرسی کھسکا کر پاتا بہار کے پیڑ کے نیچے لے گیا اور بولا "بیٹھو"

ایک دوسری کرسی کھینچ کر شہیلی بیٹھ گئی۔

"یہیں کروں نا مگر کیوں آیا ہوں، جانتی ہو؟" رضوی نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ دی اور غور سے شہیلی کا چہرہ تکنے لگا۔

شہیلی یکایک جلدی سے بول اٹھی "دیکھو تو کتنی عجیب بات ہے۔ میں نے اب تک تمہیں اصل بات تو بتائی ہی نہیں"

رضوی کا دھیان بٹ گیا۔ اس نے پوچھا "کیا؟"

"مجھے ترقی مل گئی ہے۔ یقین نہیں آتا؟ یہ دیکھو، یہ مجلس انتظامیہ کا خط ہے"

"مبارک ہو!" رضوی مسکرایا۔ اس کے بعد جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگایا۔

شہیلی پاتا بہار کی اوٹ سے باہر آکر بولی "چلو ذرا گھوم آئیں"

"بہت اچھا" رضوی اٹھ بیٹھا۔

اب وہ گاؤں کے پتلے راستہ کی بجائے چوڑے راستہ پر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی ابھرا ہوا اینٹ کا کونہ راہ چلنے والوں کے لئے بڑا خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ دونوں جانب جھاؤ کے پیڑ کی قطاریں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

رضوی نے کہا "اب تم اپنی کلوپٹرا کی کہانی سناؤ"۔

"ان کی تصویر تم نے دیکھی ہے نا؟" سہیلی نے پوچھا۔ "یہ گاؤں، اس گاؤں کی زمینداری کلوپٹرا کیسل، اسکول، سب کچھ ان ہی کا ہے۔ ورنہ پس ماندہ گاؤں میں لڑکیوں کے اسکول کی تم توقع کر سکتے ہو؟"

رضوی نے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، اب تو کافی ترقی یافتہ ہے۔ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کبھی اصطبل میں گھوڑے، فیل خانہ میں ہاتھی اور حرم میں لاتعداد . . ."

سہیلی نے دھیرے سے مسکرا کر اسے ٹوکتے ہوئے کہا "نہیں، حرم میں صرف ایک، صورت النسا فخر بانو ہی تھیں"۔

"یقین نہیں آتا"۔

"اچھا تو پھر پہلے کہانی سن لو"۔

"بہت خوب" رضوی جھاؤ کے ایک پیڑ کے سایہ میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے پورا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ دور تک سنسان اور ویران کھیت نظر آ رہے تھے۔ فصل کٹے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے اور اب چند لڑکے اس میدان میں اپنے ہاتوں میں لوٹی ہوئی ڈور پتنگ اڑا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔

سہیلی نے کہا "تم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ایک اونچے سے ٹیلہ پر میرا اسکول ہے، سچ مچ ایسا ہی ہے۔ وہ دیکھو، مصنوعی پہاڑی کے اوپر میرا اسکول ہے۔ پگوڈا نما لکڑی کا گھر، چھت پر ٹائل کی چھت ہے۔ ہوسٹل بھی قریب ہی ہے۔ پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد کتنی ہے، جانتے ہو؟ ڈیڑھ سو"۔

"اچھا!" حیرت کے اظہار کے ساتھ ہی رضوی نے پھر سگریٹ کا دھواں فضا میں اگل دیا۔

سہیلی پھر چلنے لگی "میں غلط نہیں کہتی" پہلے پہل جب میں یہاں آئی تھی تو میں نے بھی اس گاؤں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں نے اسے محض ایک غیر ترقی یافتہ گاؤں سمجھا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد محسوس کیا کہ میں نے اس گاؤں سے متعلق جو کچھ خیال کیا تھا حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے"۔

سہیلی چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی پھر مسکراتے ہوئے بولی "اس گاؤں کے زیادہ تر لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور یہ محض فخر بانو کی وجہ سے ہے۔ اپنے گھر یعنی پیلس کو بھی وہ کالج بنانے کے لئے وقف کر گئی ہیں۔ اسی راستے پر تھوڑی دور جانے کے بعد ہم لوگوں کا اسٹاف کوارٹر ہے۔ پہلے وہ اسٹیٹ کے نائب گماشتہ کا محل تھا۔ زمینداری اب نہیں رہی، لیکن دوسری تمام چیزیں باقی رہ گئی ہیں"۔

رضوی چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ "اب اصل بات کی طرف آؤ۔ تم اپنی معزز بیگم صاحبہ کی کہانی سناؤ"۔

اس وقت سورج سپاری کے پیڑ کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔

سہیلی نے کہا "جب میں یہاں آئی تو میں نے سب سے پہلے کلوپٹرا کیسل کے دربان کی زبانی یہ کہانی سنی تھی۔ یہ نام خود فخر بانو ہی نے رکھا تھا۔ دراصل یہ عمارت زمینداری کے زمانہ میں مہمان خانہ تھی لیکن فخر بانو مرنے سے پہلے اسی عمارت میں آ رہی تھیں"۔

"کیوں؟" رضوی نے مڑ کر دیکھا۔

"مرنے کے لئے، انہوں نے اپنے پہلے شوہر سے بے وفائی کی تھی"!

سہیلی سنجیدہ ہو گئی۔ بولی "فخر بانو اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں، وہ اپنے خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح پردے میں رہ کر جوان نہیں ہوئی تھیں بلکہ شبھون میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آگرہ، دلی، کراچی اور لاہور کی سیر کرتی پھری تھیں، لیکن آخر میں کرونا نگر اسٹیٹ کے بارہ آنہ گیارہ پائی کے حصہ دار سے ان کی شادی ہو گئی جن کے خیالات پرانی وضع کے تھے۔ سوچنے سمجھنے کے انداز اور مزاج میں ایک جگ کا فرق تھا۔ شوہر کو شکار، سیاست، دولت، عزت، اور مقدمہ کا شوق تھا اور فخر بانو کو تصویروں، ناچ، گانے، مجلسوں اور پارٹیوں سے لگاؤ تھا۔ وہ جلد ہی اسٹیٹ کے لندن ریٹرن نوجوان منیجر کی طرف مائل ہو گئیں۔ ان کے شوہر سکندر خان کو اس کا علم ہو گیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے، اس عظیم زمیندار کا ایک دن اچانک انتقال ہو گیا"۔

"انتقال؟" رضوی چونک پڑا۔

"ہاں، اور اس کے چند ماہ بعد ہی نوجوان منیجر پیلس میں آ کر رہنے لگا۔ سکندر خاں کی کوئی اولاد نہ تھی، نہ کوئی وارث تھا۔ سب نے سمجھا بیگم صاحبہ نے دوسری شادی کر لی ہے، لیکن ہیں ما؟

بعد ہی منیجر کو پولیس سے نکال دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد ایک سال تک بیگم صاحبہ اسی مہمان خانہ میں رہیں اور بے شمار دولت خیرات کر دی، پہلے شوہر کے نام ایک لائبریری اور ایک کلب قائم کیا، راستہ بنوایا، تالاب کھدوائے، اور بقیہ تمام جائداد کو اس اسکول کے نام وقف کر دیا۔ اس کے بعد ایک دن یہ دیکھا گیا کہ اسی تصویر کے نیچے ان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا، انہوں نے خودکشی کی ہے۔" سہیلی خاموش ہو گئی اور جھاؤ کے پیڑ کی جھومتی ہوئی ڈالیوں پر لہراتی ہوئی ہوا کے شور میں اس کی گہری اور طویل سانس کی آواز ڈوب گئی۔

رضوی نے کہا "آج میں تم سے ایک بات دریافت کروں گا سہیلی۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو گی؟"

"بولو"

"کیا تمہیں بھی ممتاز سے محبت رہی ہے؟"

یکایک سمندر کے موجوں کی طرح سہیلی بپھر گئی۔ پھر راستہ پر کھڑے کھڑے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور روہانسی ہو کر بولی "نہیں، نہیں میں نے اس سے بے وفائی نہیں کی۔"

اس دن تمام رات سہیلی بڑے ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی ——

دوسرے دن اتوار تھا، اسکول میں چھٹی تھی اور صبح کے وقت رضوی سے ملنے کا وعدہ تھا، لیکن باہر بادل کی گرج سن کر وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج شاید دن بھر نہ نکلے گا اور بارش رکنے کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے اوپر سیاہ بادل چھاتے جا رہے تھے اور بادلوں کا سیاہ رنگ اور بھی زیادہ گہرا سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔

سہیلی نے بید کی کرسی پر لیٹ کر انگڑائی لی۔ اس وقت اپنے چھوٹے سے کمرہ میں وہ خود اپنے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ رضوی کا کوئی سوال ہی نہ تھا، لیکن اگر خود اس کا دل اس سے کوئی سوال کرے "کیا تمہیں سچ مچ ممتاز سے محبت رہی" سہیلی کہے گی "ہاں" لیکن دل اگر پھر اس سے سوال کرے "پھر تم نے رضوی کے بلانے پر کیوں آواز دی۔ اسے کیوں بلایا؟"

اسی کے بلاوے پر تو رضوی دوڑا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ آج وہ اسے کیا کہہ کر اپنے سے دور کر سکتی ہے؟ کیا سچ مچ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے، اسے اپنی زندگی سے نکال سکتی ہے؟

سہیلی یکایک کرسی سے اٹھ کر، دوڑتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے قریب گئی اور دراز کھول کر ایک فوٹو اسٹینڈ نکالا جس میں ممتاز اور اس کی اپنی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ تصویر شادی کے بعد کھنچوائی گئی تھی چھبیس سال کا مسکراتا ہوا جوان کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اٹھارہ سالہ سہیلی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کبھی اس کا چہرہ اتنا خوبصورت تھا کہ آج خود اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن آج اس کے چہرہ پر نہ جانے کس نے برسوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔

مگر چھبیس سال کی عمر کی یہ بے ریا مسکراہٹ زیادہ دنوں تک ممتاز کے لبوں پر قائم نہ رہ سکی تھی۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی جب اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ سہیلی کو خوش رکھنے میں ناکام ہے تو اس نے اس کے لئے جان توڑ محنت کرنی شروع کر دی تھی، لیکن اس غریب کو اس حقیقت کا کبھی علم نہ ہو سکا کہ آخر سہیلی چاہتی کیا ہے۔ اس کے سکھ کے راستے میں کون سی رکاوٹ حائل ہے۔

کیا سہیلی خود بھی اس کی وجہ معلوم کر سکی تھی؟ کیا وہ آج بھی اس کی وجہ جان سکی ہے؟ کبھی کبھی وہ ایسا محسوس کرتی ہے جیسے یہ اس کی ذہنی بیماری ہے، اس کے مریضانہ جذبات ہیں اور بلاوجہ کا روگ ہے، ورنہ شادی سے پہلے رضوی کے ساتھ اس کی معمولی سی جان پہچان تھی اور اس کو اپنے دل میں بسا کر وہ اپنی دوشیزگی اور شباب کے تصور کو رنگین بھی نہ بنا سکی تھی کہ ممتاز اس کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا، لیکن وہی رضوی پھر کس طرح اس کے اور ممتاز کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا؟

شاید وہ دیوار نہ بن سکتا، مگر ممتاز کی بزدل محبت نے ہی رضوی کے اندر کے نڈر مرد کو، موازنہ کرتے وقت سہیلی کے سامنے پرکشش بنا دیا تھا۔ ممتاز کی بزدل محبت نے سہیلی کو جتنا زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کی اس کی اداسی اور بھی بڑھتی گئی۔ اسے بار بار احساس ہوتا جیسے گھر کی چار پانچ دوسری جانی پہچانی پیاری چیزوں کی طرح ایک ممتاز بھی ہو، جیسے اس کے بارے میں سوچتے وقت اس کے خیالات مقید ہو جاتے ہوں، جوش اور ولولہ سرد پڑ جاتا ہو اور رضوی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہو۔

پھر بھی ممتاز کی اچانک موت پر سہیلی بہت روئی تھی۔ اس نے خود کو بہت مجبور اور بے سہارا محسوس کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی بادل کی اوٹ سے جس طرح یکایک بجلی کوند جاتی ہے ٹھیک اسی طرح ایک آزادی پانے کے احساس نے اس کے ذہن کو بارش ہونے کے بعد کھلے ہوئے آسمان کی طرح صاف اور روشن بنا دیا تھا۔ پھر وہ گرلس اسکول کی ملازمت پاکر کرونا نگر چلی آئی تھی اور اس کے تھوڑے ہی دن کے بعد رضوی اس کی زندگی میں دوبارہ داخل ہو گیا تھا۔ وہ چھٹیوں میں ڈھاکہ گئی تو اس کی ملاقات رضوی سے ہو گئی۔ ان ہی دنوں رضوی کی بیوی شتری کا انتقال ہو گیا تھا، اور یہ کتنی حیرت کی بات تھی کہ رضوی بھی اپنی ازدواجی زندگی سے کبھی خوش نہیں رہا تھا۔

باہر یخ بستہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے، بارش اب تک نہیں رکی تھی بغل کے کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا اور کبھی کبھی ادھی الاپ کی آواز اس کمرے میں بھی تیر جاتی تھی۔ آج سے پہلے فرصت کے دن سہیلی بھی ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ جا کر مل جاتی تھی، بلا وجہ شور مچاتی تھی، ناکام محبت کی داستان سناتی تھی اور کسی لڑکی سے متعلق ہونے والے اسکینڈل پر تبصرہ کرتی تھی، لیکن آج اپنا کمرہ چھوڑ کر کہیں جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک انجانے خوف، حجاب اور جھجک اور کمزوری کے احساس سے اس کا دل دھڑک رہا تھا جیسے آج وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہو۔ رضوی آج پھر وہی سوال دہرائے گا "بتاؤ تو، میں کرونا نگر کیوں آیا ہوں؟"

اور اب فخر بانو کی کہانی سن کر اس سوال کا جواب دیا بھی نہیں جا سکتا۔ سہیلی کو سر جھکا کر جواب دینا ہوگا "جانتی ہوں۔"

اس کے بعد تکمیل آرزو۔ پھر اسی بہت پرانے عظیم رشتے میں اُسے بندھ جانا ہوگا۔ سالی بیساکھی کے زور آور جھونکے کے ساتھ اسے اپنی ستائیس سالہ عمر میں اُڑنا پڑے گا۔ وہ اتنے دنوں سے یہی تو چاہتی تھی، اپنے تصورات کے لئے قوت بال و پر اور بلند پروازی کے لئے لامحدود وسعتیں۔

سوچتے سوچتے وہ اٹھ بیٹھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس دم گھونٹ دینے والے ماحول سے جتنی جلدی نکل بھاگے گی اتنی ہی جلدی اسے ذہنی سکون مل جائے گا۔ سہیلی نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور بال سنوارے۔ اس کے بعد کمرے سے باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ کسی نے اس کا آنچل پکڑ لیا۔۔ اس کی نظر پیچھے مڑتے ہی ممتاز کی تصویر پر پڑی۔ ممتاز مسکراتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے آنچل کا کونا دروازہ کی کنڈی میں اٹک گیا تھا اور ابھی وہ آنچل چھڑا رہی تھی کہ کسی نے اسے آہستہ سے پکارا "سہیلی!"

یہ آواز ممتاز کی تھی۔ سہیلی کے تمام جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تقریباً چیخ اٹھی: "کون ہے؟ کون ہے؟"

ممتاز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ فوٹو سے ابھر کر سارے کمرے میں پھیل گئی۔ "ڈر گئیں؟"

سہیلی کا رنگ فق ہو گیا۔ دروازہ پر رضوی کھڑا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا فوٹو اسٹینڈ اس نے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے ہی آواز دی تھی تم ڈر گئیں کیا؟"

سہیلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی، دراز میں چھپائی ہوئی تصویر کو باہر نکال کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ رضوی کے سامنے اس کا جھوٹ ظاہر ہو گیا۔

رضوی نے فوٹو پھر اسی جگہ رکھ دیا اور تھوڑی دور آگے بڑھ کر بولا "کرونا نگر سے کینو بیٹھے گیچھی جانو؟" (میں کرونا نگر کیوں آیا ہوں، جانتی ہو؟")

سہیلی نے مغموم چہرہ اور غمناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جانی!" ("جانتی ہوں!")

"تو پھر بتاؤ، اب کیا کرو گی؟"

سہیلی سے ممتاز کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا نہ گیا۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

رضوی نے آہستہ سے پوچھا "اس کا جواب کون دے گا، تم یا ممتاز؟"

سہیلی کو یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پھوٹ پڑے گی۔ رونے کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی، وہ کیوں رونا چاہتی تھی، یہ وہ خود نہ جانتی تھی۔ انجانے درد کے احساس سے اس کی آواز تھرا گئی۔ اس نے جواب دیا "آمی" ("میں!")

فوٹو کو اوٹ میں کر کے رضوی سہیلی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر بہت دنوں قبل کے بھولے ہوئے لہجہ میں بولا "تو پھر آج ہی استعفیٰ دے دو۔ چلو ڈھاکا کانٹے پھیرے جائی!"

(تو پھر چلو گی ڈھاکے؟")

"چلوں گی" سہیلی نے یوں دھیمے لہجہ میں کہا، جیسے موت کی کھائی سے بول رہی ہو۔

شام کا وقت تھا، دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کلو پیٹرا کیبل کے لان میں پانا بہار کے پیڑ ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے، افق پر پھر سیاہ بادل چھانے لگے تھے، سہیلی کا چہرہ اس وقت بشاش اور کھلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کسی انجانے درد اور تکلیف دہ خیالات کا عکس اس کے چہرے پر پھیل جاتا تھا۔ چائے کی خالی پیالی میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے رضوی کھڑا ہو گیا "دیکھ رہی ہو، کیسا اندھیرا چھا گیا ہے۔ دن ہی کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شام ہو گئی ہو۔ بارش ہونے لگی ہے"

"ہاں، اب میں جاتی ہوں" سہیلی اٹھنے لگی۔

"نہیں، ابھی ٹھہرو تو" رضوی مسکرایا

وہ کرسی اس کے قریب کھسکا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنا ایک ہات سہیلی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سہیلی نے پہلے ایک گوشت پوست کے نرم ہاتھ کا لمس محسوس کیا، پھر اس کا ہلکا سا گرم دباؤ پڑتے ہی بہت دنوں کے بعد سہیلی کے دل میں رکی ہوئی ایک ندی بند توڑ کر آزاد ہو گئی۔ رم جھم برستے ہوئے ٹھنڈے پانی کی بوندوں نے اسے خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ سہیلی نے رضوی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہم پھر کب چلیں؟"

"کل ہی"

بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان اور شام کے پھیلتے ہوئے گھنے اندھیرے میں سہیلی رضوی کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکتی تھی اتنا قریب ہونے کے باوجود جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس نہیں تھے، کہیں گم ہو گئے تھے۔ رضوی اٹھ کر قریب آ گیا۔ اور قریب۔ اور قریب سہیلی نے محویت و حیرت کے عالم سے نکلتے ہی محسوس کیا رضوی اس کی طرف سراپا طلب بڑھ رہا ہے.... اس نے ایک احساسِ سپردگی خود بھی محسوس کیا ــ مگر اچانک وہ چونک پڑی، سہم اٹھی۔ اس کے تصور نے لمبی سی ایک جست لگائی اور ان چند برق رفتار لمحوں میں اسے اپنے انجان (SUB-CONSCIOUS) میں یوں محسوس ہوا جیسے اس کے لبوں کو ممتاز کے لبوں نے چھو لیا ہو ــ تصور بھی کیا کیا عمل دے جاتا ہے ــ مگر نہیں ــ مگر ہاں ــ مگر خیر،

یہ لمس، یہ کیفیت ہاں شاید وہی تو تھی ــ سہیلی کا بدن تھر تھر کانپ اٹھا اور اس نے آگے بڑھتے ہوئے رضوی کو پوری طاقت سے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ چیخ پڑی: "تم کون ہو، کون ہو؟"

"میں ہوں مشتری!"

ایک آواز تھی مخمور سی، بے اختیار سی۔ مگر رضوی کہتا ہے نہیں یہ آواز تو اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی!

باہر یکایک بجلی چمکی اس کی روشنی میں کلو پیٹرا کیبل کا اندھیرا دھل گیا اور لمحہ بھر کی روشنی میں رضوی نے سہیلی کو دیکھا اور سہیلی نے رضوی کو۔ رضوی شرمندہ ہو گیا۔ اس نے ندامت بھرے لہجہ میں کہا "دیکھو تو کیسی بھول ہو گئی! تمہارا نام لینے کے بجائے میں نے مشتری کا نام لے لیا۔ لیکن تم اس طرح کیوں چیخ اٹھیں؟"

سہیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنا نگر کے تمام راستے آج پانی سے دھل گئے تھے اس میں کہیں تر ابور ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے بھاگ کر راستے پر چلنے لگی۔ اسٹاف کوارٹر قریب ہی تو ہے۔ اسے وہاں لوٹ کر جانا ہے۔ بارش اس کی لمحہ بھر کی بدنامی کا داغ دھو دے گی۔

پتہ نہیں آج بارش کی وجہ سے بھجو جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اسی لئے کلو پیٹرا کیبل میں کسی نے چراغ نہیں جلایا تھا۔ رضوی نے خود ہی ایک موم بتی جلا دی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ دیوار پر وہ بڑی سی روغنی تصویر آویزاں تھی۔ وہ اور بھی قریب پہنچا، وہ بیگم صورت النساء فخر بانو نہیں تھیں، مشتری تھی اور جیسے دیوار پر سر لٹکائے اندھیرے میں وہ اتنی دیر سے رو رہی رہی ہو!

فکاہیہ:

غسلِ صحت

باقر علیم

ہمارے اچھو کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اسے صحت یاب ہوئے اب مہینہ ہو چلا تھا، مگر غسلِ صحت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک آدھ ہفتہ تو میں نے عفت کو پھر نمونیہ ہو جانے کا خوف دلا کر گزار دیا۔ ایک دو ہفتے خود اچھو نے نہ نہانے کی ضد میں بسر کر لئے۔ اور ایک دو ہفتے یوں گزر گئے کہ عفت خود آسمان کے کسی گوشے میں دھواں یا ابر کا ایک آدھ ٹکڑا دیکھ کر سہم جاتی۔

آج منگل کا دن تھا اور نومبر کی پہلی تاریخ۔ مطلع بالکل صاف تھا اور موسمیات والوں نے دھوپ ہی دھوپ کی پیشین گوئی کر رکھی تھی۔ آج عفت نے اچھو کو نہلانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ ناشتے کے وقت سے اس کو آمادہ کرنے کی مہم میں لگی تھی۔ پہلے اچھو کو رو بیٹ کر آدھی پیالی چائے کی دستیاب ہوئی تھی۔ مگر آج اس نے حالات سے فائدہ اٹھا کر دو پیالیاں نوش جاں کیں۔ اس کی ساری ضدیں صبح سے پوری ہو رہی تھیں۔ عفت نے اس کے سارے قیمتی کھلونے چھپا کر رکھ دئے تھے مگر آج فرش پر دہلیزوں پر چاروں طرف کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ حیرت ہے کھلونوں کے معاملے میں بچوں کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ اچھو نے کچھ ایسے کھلونے عفت کو یاد دلا کر برآمد کرائے جن کو وہ عمل کر کے عفت فی الواقع بھول چکی تھی۔ مٹھائی، بسکٹ، ٹافی، چاکلیٹ۔ غرض جس چیز کے گھر میں موجود ہونے کا علم اچھو کو تھا، اس نے آج مانگ کر لی یا خود اٹھالی اور عفت کے ماتھے پر بل نہ پڑا کم از کم اس وقت تک اچھو بھی ہمہ تن اپنے غسلِ صحت کے حق میں نظر آتا تھا۔

آج ہی آٹھ بجے کی ٹرین سے عفت کے ابا نے ریلوے اسٹیشن سے گذرنا تھا۔ وہ پشاور سے لاہور جا رہے تھے۔ ان کا خط دو دن سے آیا ہوا تھا۔ ان کو لینے بھی جانا تھا۔ وہ ہمارے لئے پشاوری گڑ کی بوری لا رہے تھے۔ "عفت! میرا خیال ہے۔ تم آج اچھو کو نہلاؤ گی"۔

"جی ہاں...." اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا

"ابا جان کو لینے اسٹیشن پر نہیں جاؤ گی؟ میں نے سوچا شاید اسی بہلاوے سے اچھو کی جان آج پھر بچ جائے۔

"میں کیا کر دوں گی۔ ابا جان ایک ہفتہ پہلے یہاں سے گئے ہیں۔ رہی گڑ کی بوری.... مجھے یقین ہے اس کے معاملے میں آپ زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دیں گے......" اس نے مسکرا کر آخری فقرہ ادا کیا۔

"اچھو تم چلو گے۔ نانا سے ملنے...... کپڑے......" میں نے چھیڑ خوباں سے چلی جائے کے طور پہ کہا۔ مگر عفت نے میرا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔

"اچھو نہیں جاتا.... نہ میرے بیٹے۔ آج نہانا ہے".... پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "یہ آپ اس کو کیوں گمراہ کر رہے ہیں؟"

گمراہ پر مجھے ہنسی آگئی۔ مگر اب تک اچھو میری ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا اور مچل مچل کر اسٹیشن جانے کے لئے رو رہا تھا۔

میں نے عفت سے کہا۔ "اب آٹھ بجے تو تم اس کو نہلانے کا ستم نہیں کرو گی۔ ذرا دھوپ نکل آنے دو۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی چلو ریلوے اسٹیشن۔ ابا جان کو بھی مل لینا۔ پھر آکر اسے نہلا لینا"

اچھو کے بدلے ہوئے لب و لہجہ کی وجہ سے عفت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس نے تیل کا چولھا جلایا۔ پانی کا دیگچہ گرم ہونے کے لئے رکھ دیا۔ اور ہم تینوں ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔

پلیٹ فارم سے باہر ہی ایک وزن کرنے والی مشین عفت کو نظر آگئی۔ کہنے لگی: "اچھو کا وزن کریں۔ دیکھیں کتنا کمزور ہو گیا ہے"۔

اچھو وزن کرنے کے لئے مشین پر سوار ہو گیا۔ ایک چھوٹا آنہ سلیٹ میں ڈالا۔ اور جھٹ سے ایک ٹکٹ نکل آیا۔ ہم تینوں نے ٹکٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ مگر عفت نے ٹکٹ اٹھا لیا۔ اور وزن کی بجائے ٹکٹ کی پشت پر لکھا ہوا قسمتی جملہ پڑھنے لگی۔ اس کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔

"کتنا وزن ہے؟ تم کیا پڑھ رہی ہو؟"

عفت نے وزن پڑھے بغیر ٹکٹ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے بھی پچھلے ٹکٹ کی پشت دیکھی۔ لکھا تھا "تم پر بڑی بھاری مصیبت آنے والی ہے صبر کے بغیر چارہ نہیں" متوقع غسل کی نسبت سے کیسی برمحل پیشین گوئی تھی! میری بےاختیار ہنسی نکل گئی۔ عفت نے مارے غصے کے منہ دوسری طرف کر لیا۔

پھر میں نے وزن پڑھ کر عفت اور جملہ مسافران کو سنایا۔

اچھو کا وزن بیماری سے پہلے کے وزن سے کوئی دو پاؤنڈ زیادہ تھا۔ مجھے بڑی خوشی اور عفت کو حیرت ہوئی۔ مشین کو اس نے دروغ گوئی پر لعنت ملامت کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بیماری کے بعد اچھو نے جو ایک مہینہ گزارا تھا وہ سرکاری سانڈ کی طرح جو اس کی تواضع ہوئی تھی اسکو عفت بھول رہی تھی۔ ماؤں کو اپنے بچے نہ جانے کیوں پیلے پیلے نظر آتے رہتے ہیں۔

میں نے عفت کا ذائقہ بدلنے کے لئے کہا "اچھو تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا وزن البتہ کم ہوگیا ہے۔ ذرا جوتے اتار کر مشین پر چڑھو۔ دیکھیں"

عفت نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ اگرچہ یہ بات اور کسی نے نہیں سنی تھی۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔

میں پلیٹ فارم ٹکٹ لینے گیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے۔ عفت نے شکر کا کلمہ پڑھا اُس کو یقین ہو چکا تھا کہ ٹکٹ کی پیشین گوئی کسی حادثے کی صورت میں ضرور نمودار ہوگی اور اس کا ذہن بار بار اچھو ہی کی طرف جاتا تھا۔ ہم اپنا سا منہ لیکر واپس آگئے۔ عفت نے مزید حفاظت کے لئے اچھو کو جبراً اپنے پاس بٹھایا۔ ٹانگہ روانہ ہوا تو پھر اچھو کا غسل یاد آگیا اور وہ ایک بار پھر منحوس پیشین گوئی کو بھول کر اس کو غسل پر آمادہ کرنے لگی۔ یہ بچے بڑے ڈپلومیٹ ہوتے ہیں اچھو نے انکار نہیں کیا تو اقرار کی بات بھی اس کے منہ سے نہیں نکلی۔ ٹانگے والے نے سردی سے بچنے کے لئے رضائی اوڑھ رکھی تھی۔ اور اپنے حلیئے سے کل پاکستان انجمن مخالفانِ غسل سرما کا سرگرم ممبر معلوم ہوتا تھا۔ کافی دیر عفت کی تقریر نہانے کے فوائد پر سنتا رہا۔ اچھو کی خاموشی کو مبنی بر انکار سمجھ کر مظلوم کی حمایت میں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا:

"بیگم صاحبہ بچہ مارچ اپریل میں نہلیے گا۔ آج کل تو بڑی سردی ہے"..... عفت نے دو ایک بار ٹانگے والے کی پیٹھ کو گھورا اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی، مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

ہم گھر پہنچے تو پانی کھول رہا تھا۔ عفت نے برقع جلدی جلدی اتارا اور پیشتر اس کے کہ اچھو کچھ سوچ سکتا اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ سے اسے ساتھ ساتھ گھسیٹے پھر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے غسل کے ضروری آلات اکٹھے کر رہی تھی۔ ابھی اچھو نے رونے والا حربہ استعمال نہیں کیا تھا، البتہ بسورنا شروع کر دیا تھا۔ عفت نے ایک بڑی سی بالٹی دھوپ میں رکھی تو اچھو چلا اٹھا "میں بالٹی میں نہیں نہاؤں گا۔ چارپائی پر نہاؤں گا۔" اچھو کو دو سال پہلے کا زمانہ یاد آگیا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا اور عفت اسے چارپائی پر بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔ عفت نے غصے سے ایک بان کی بنی ہوئی چارپائی گھسیٹ لی۔ صابن اٹھایا تو اچھو چیخا "یہ صابن نہیں۔ میں اس سے نہیں نہاتا..." عفت نے وہ لکس کی ٹکیا اپنی جیب میں ڈال لی اور کپڑے دھونے والے دیسی صابن کی ایک لمبی سی بار چارپائی پر سجادی۔ اچھو نے تولیے پر اعتراض کیا کہ یہ ابا کا تولیہ ہے۔ تو وہ حسب حکم اس کا نیلا تولیہ لے آئی۔ دُھلے ہوئے کپڑے نکالے تو اچھو نے دوسرے کپڑے منگوائے حتیٰ کہ اس نے جھوٹ سچ عفت سے اپنے بوٹ بھی پالش کروائے اس طرح اچھو کوئی گھنٹہ بھر کنی کترانے میں کامیاب ہو گیا۔ عفت کے چہرے سے خوشدلی کے آثار کب کے غائب ہو چکے تھے۔ مگر سب کچھ برداشت کئے جا رہی تھی۔ تیاری مکمل ہوگئی۔ اب اچھو کے پاس بھی کوئی دلیل باقی نہیں رہ گئی تھی۔

عفت نے اچھو کو پکڑ کر چارپائی پر بٹھا لیا۔ اس کے کپڑے اتارے۔ بالٹی میں پانی لینے کے لئے مگ ڈالا۔ پانی بہت گرم تھا۔ اور ٹھنڈا پانی ملانے کے لئے جلدی سے اٹھی اور اچھو کو وہ ایک لمحہ نصیب ہوا۔ جب وہ اس کے چنگل میں نہیں تھا۔ اُٹھا، چارپائی سے چھلانگ لگائی اور دور بھاگ گیا۔

عفت کو اس کی اس گستاخی پر بڑا غصہ آیا۔ ٹھنڈا پانی ملانا بھول گئی۔ صحن کے عین وسط میں، بہت سی چارپائیاں اکٹھی کر کے عفت نے گھر کے سب گرم کپڑے دھوپ میں پھیلا رکھے تھے۔ اچھو نے عفت سے مقابلے کے لئے دوسری طرف پوزیشن لے لی۔ میں آرام کرسی پر نیم دراز ایک چارپائی پر پاؤں رکھے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس تماشے پر مجھے ہنسی آگئی۔ عفت نے زخمی شیرنی کی نظر سے مجھے

دیکھا" آپ ہنس رہے ہیں۔ اچھو کو ادھر بلائیں ورنہ میں پیٹ پیٹ کر اس کا برا حال کر دوں گی۔"

میں کسی انجمن کا رکن تو نہیں مگر میری ہمدردیاں عام طور پر سردیوں میں نہ نہلانے والوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ میں نے عفت کے انتباہ کا کوئی جواب نہ دیا۔

عفت کا غصہ دوبالا ہو گیا اس نے آستینیں چڑھائیں چوٹی کو گول کر کے پیچھے باندھا، دوپٹہ اتار پھینکا، پائینچے چڑھائے اور اچھو کے پیچھے سرپٹ بھاگی۔ اچھو بھی تیار کھڑا تھا۔ بھاگ کھڑا ہوا۔ اچھو آگے آگے، عفت پیچھے پیچھے۔ دونوں چارپائیوں کے گرد گول چکر میں دوڑ رہے تھے۔ دو تین چکر میں ہی عفت ہانپنے لگی۔ شاید اسے چکر بھی آ گیا۔ دیوار کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ عفت کے عین سامنے چارپائیوں کی دوسری دوسری طرف اچھو نے بھی بریکیں لگائیں اور کھڑا ہو گیا۔ ہانپ تو وہ بھی رہا تھا۔ مگر عفت کے غصے کے برعکس ہنس رہا تھا۔ عفت کافی دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ اچھو نے دو ایک بار "امی بس" کا چیلنج بھی پھینکا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر عفت کو ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے جس چارپائی پر پاؤں رکھے تھے آ کر وہ گھسیٹی کر دیوار اور ان چارپائیوں کے درمیان اسے کھڑا کر کے اچھو کا راستہ بند کر دے۔ میں نے چارپائی پاؤں سے دبالی۔

عفت! یہ فیئر نہیں ہے۔ فاؤل مت کھیلو....."

اس ثواب کے کام کا کھیل بننا اسے پسند نہ آیا۔ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ الگ کیا۔ اور چارپائی کو میرے پاؤں میں دبا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ اچھو کو کہ سے جا رہی تھی اور وہ ننگا ہنسے جا رہا تھا۔

کمرے میں اس کا جہیز والا اٹیرا پلنگ تھا۔ میرا خیال تھا اب اسکو باہر نکال کر اچھو کا راستہ روکے گی۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ وہ اس سے باہر نکلنے کا نہیں۔ اس گھر کے دروازے چھوٹے ہیں۔ میں اخبار رسالے پھینک کر دروازے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کوئی پانچ منٹ بعد عفت برآمد ہوئی۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں پلاسٹک کا بنا ہوا شاپنگ بیگ تھا۔ اچھو ہنستا ہنستا چپ ہو گیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو یاد آ گیا کہ وہ تو ننگا ہے اور اس طرح بازار جانا ٹھیک نہیں۔ مڑا، اپنے میلے کپڑے ہاتھ میں پکڑے اور پھر

عفت کے پیچھے دوڑ پڑا۔ عفت دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ اچھو روتا ہوا دروازے سے باہر نکلا۔ عفت دروازے کے باہر اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس نے اچھو کو جھپٹ لیا۔ گھسیٹتی ہوئی واپس آئی۔ برقع اتار پھینکا۔ اس کے ہاتھ سے کپڑے الگ کئے اور چارپائی پر گرا لیا۔ مجھے عفت کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی۔ "یہ ٹھیک نہیں مکار عورت..." عفت اس وقت میری بات کہاں سننے کے موڈ میں تھی۔ اس نے بالٹی میں ہاتھ ڈال کر پانی کی حرارت محسوس کی۔ پھر پانی کا لوٹا بھرا اور گرم گرم پانی اچھو کے سر پر انڈیل دیا۔ اچھو نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہائے پانی ٹھنڈا ہے، ہائے پانی ٹھنڈا ہے! عفت نے معاملہ مکمل طور پر طے کرنے کے لئے دو لوٹے اور اچھو کے سر اور جسم پر ڈال دیئے۔ جیب سے لکس کی ٹکیا نکالی۔ اچھو نے روتے روتے بہتیرے اشارے دوسرے صابن کی بار کی طرف کئے مگر عفت نے وہی صابن اسکے جسم پر گھسانا شروع کر دیا۔ پیٹ پر صابن لگاتی تو "پیٹ پر صابن نہیں" کی چیخ سنائی دیتی۔ اور ٹانگوں پر صابن لگاتی تو "ٹانگوں پر صابن نہیں" کا نعرہ بلند ہوتا۔ عورت غصے کے وقت اپنی سماعت کھو بیٹھتی ہے، عفت نے اچھو کی پر درد گزارشات کی طرف بالکل توجہ نہ کی اور صابن منہ اور سر پر گھسانا شروع کیا یہ دو مقامات صابن کے لئے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اب رقت کے مارے اچھو کی فریاد قابلِ فہم نہیں رہ گئی تھی۔ اس پر طرفہ یہ کہ عفت نے دو تین لوٹے اوپر تلے اچھو کے سر پر ڈال دیئے لڑکے کا سانس بند ہونے لگا مگر اس نے چیخنے میں کمی نہ آنے دی۔ صابن اتر گیا تو عفت نے اچھو کے پاؤں کا میل اتارنے کے لئے منجیاڑ جیب سے نکال لی، غسل کی تیاری کے وقت منجیاڑ کا پتہ عفت نے چلنے نہیں دیا تھا۔ وہ اسے بطور خفیہ ہتھیار کے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اچھو منجیاڑ کو دیکھ کر آنتا رو دیا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ یہ منجیاڑانہ ادا مجھے بھی پسند نہ آئی مگر جی ابھری ہوئی شیرنی کے منہ کون لگتا۔ بچے کی بے تحاشا چیخ پکار سن کر شمال والی بڑھیا ہمسائی نے دیوار پر چڑھ کر ہمارے گھر جھانکا۔

"ہائے کتنی ظالم اے۔ کیوں ذبح کر رہی اے بچے کوں۔ کوئی گھنٹے بھر سے رو رہا ہے معصوم....." بڑھیا نے یہ بات صورتِ حالات کا جائزہ لئے بغیر کہہ دی تھی۔ جب اس نے اچھو کو نہاتا اور اس سے بڑھ کر عفت کی خون آلود آنکھیں دیکھیں تو وہ بالکل مطمئن ہو کر اوجھل ہو گئی۔

اب اچھو بھی تقریباً تقریباً فارغ تھا۔ عفت نے ہر طرح سے اطمینان کر کے اپنی انتقامی کارروائی ختم کی۔ ایک بڑے سے نرم نرم تولئے سے پونچھا۔ اور اسی تولئے میں لپیٹ کر اسے چارپائی پر بٹھادیا خود اس کے دُھلے ہوئے کپڑے اٹھانے کے لئے چارپائی سے اتر آئی۔ اچھو کا رونا کم ہوتا ہوتا بالکل ختم ہوگیا۔ بس ذرا ضمیمے کے طور پر کبھی کبھی "ڈسک" لیتا۔ عفت نے اسے کپڑے پہنائے، تیل لگایا، کنگھی کی، بوٹ پہنا کر زمین پر اتار دیا اور میری طرف بڑے فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرائی۔ غسل کے دوران میں اچھو کی مذبوحی حرکات نے عفت کی وہ گت بنادی تھی کہ معلوم ہوتا تھا محترمہ کپڑے پہنے خود نہانے کی سعی فرماتی رہی ہیں۔ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ ہنسی کے ساتھ ہی مجھے یاد آگیا کہ اب تو لیٹ گاڑی کا وقت ہو نیا ہوگا۔ گھڑی دیکھی کوئی پون گھنٹہ باقی تھا۔

"عفت گاڑی کا وقت ہوگیا ہے۔ جلدی کرو، چلنا نہیں؟"

"میں نہیں جاتی اب کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ گاڑی کے لیٹ ہونے کی وجہ سے پتہ نہیں ابا جان آتے بھی ہیں کہ نہیں۔ اب چلے جائیں۔ اچھو کو بھی لے جائیں"۔

میں اور اچھو ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔ ابھی گاڑی کے آنے میں پانچ دس منٹ باقی تھے۔ ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ میں نے اچھو کی دلجوئی کے لئے اسے کیلے کھلائے، دیہ پھل بڑا دافع الصیات ہے) گاڑی کا سگنل ہوا تو ہم ایک جگہ پلیٹ فارم پر انتخاب کر کے کھڑے ہو گئے۔ وہیں وزن کرنے والی ایک مشین بھی پڑی تھی۔ میں نے سوچا۔ گاڑی میں ابھی کچھ سیکنڈ ہیں۔ چلو آج اپنا وزن کرتے ہیں۔ حالانکہ گھر کے مرد کا اپنا وزن کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وزن کیا پہلے اپنی قسمت پڑھی وہ تو "سٹیٹس کو" والی بات تھی یعنی جوں کا توں۔ وزن دیکھا تو اپنا وزن باقاعدہ کم ہونے کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ میں نے سوچا اپنے وزن کا ٹکٹ عفت کو دکھا کر ذرا اسے غیرت دلاؤں گا ٹکٹ میرے ہاتھ میں دیکھ کر اچھو مچلنے لگا۔

"ابا میں بھی وزن کروں گا۔ میں بھی ..."

"بھائی تم ابھی دو تین گھنٹے پہلے اپنا وزن کر چکے ہو" میں اپنی جیب میں اس کا ٹکٹ ٹٹولنے لگا۔

مشین کے سہارے ایک بیکار قلی کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "کوئی بات نہیں صاحب۔ ایک آنے کی بات ہے۔ بچہ رو پڑے گا۔" میں نے اس بیکار شخص کی طرف دیکھے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر اچھو کو دیا۔ وزن کا ٹکٹ نکلا تو اچھو نے جھپٹ لیا۔ پھر شاید اپنی عینکیں پاس نہ ہونے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ اتفاق سے ٹکٹ کا وزن سامنے تھا۔ میں ٹکٹ پر وزن دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ان تین گھنٹوں میں یعنی عفت والے غسلِ صحت کے بعد اچھو کا وزن دو پاؤنڈ کم ہوگیا تھا!

غزل

ضمیر جعفری

ایک اندازِ نظر جس کا کوئی نام نہیں
زندگی رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں

عمر بھر ایک تصور کی پرستش کی ہے
میں وہاں ہوں کہ جہاں گردشِ ایام نہیں

میری راحت طلبی سے کوئی کہدے کہ حیات
رقصِ بسمل ہے، تماشائے لبِ بام نہیں

لوگ ہر بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں
شوق کچھ جرم نہیں، عشق کچھ الزام نہیں

مرگ و ہستی میں محبت رہی حائل ورنہ
حشر کہتے ہیں جسے مہلتِ یک گام نہیں

اپنی راہوں کیلئے اپنی نگاہوں سے تراش
وہ ستارے کہ مقدر ہیں مگر عام نہیں

حُسن ہر لحظے کا اک اپنا نیا پن ہے ضمیرؔ
عشق ہو یا کہ ہوس کوئی طلب خام نہیں

پینگ ہلارے

شیر افضل جعفری

جب پینگ چڑھاتی ہے ساون میں کوئی ناری
جیون میں چٹکتی ہے رومان کی چنگاری

اُس گندمی چہرے کا جھلکار سنہرا ہے
چیکو نے عطا کی ہے افلاس کو زرکاری

اب تک مرے کانوں میں بجتی ہے غزل بن کر
اس سیلگجے گھونگھٹ میں تڑتی ہوئی کِلکاری

افشاں کی دل افروزی، مہرابیوں کے منہ پر
گالوں کی ترائی میں آکاش کی پھلواری

وہ بھاگ بھری جٹّی، وہ نور بھری ٹھمری
وہ میری پری جوگن، میں اس کا جٹا دھاری

چوپڑ تو بچھائی ہے ساندل کے جواری نے
جی جان کی بازی میں "اللہ تری یاری!"

فن:

رامش و رنگ

اقبال حامد

ایں در رہِ چشم افگن، آں زپئے گوش آور

مشرقی پاکستان کی عوامی و رومانوی زندگی نے کومی جسیم الدین کی تصنیف " نقشی کاتھر ماٹھ" میں جو منظوم روپ دھارا ہے وہ زندگی اور قدرت کے حسن و کیف کا ایسا دلآویز مجموعہ ہے جسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کو دیکھ لیا تو گویا مشرقی پاکستان کا سارا رنگ رس دیکھ لیا اور اس کا سارا مسحورکن سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ چنانچہ اس منظوم کتھا کو تمثیلی رقص کی شکل میں پیش کرنے کے لئے باکمال فن کاروں کا ایک طائفہ اس سرزمینِ کیف و رنگ، اس دیار سحر و افسوں سے مغربی پاکستان روانہ ہوا۔ "بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس ڈھاکہ" کی ۲۴ اداکار خواتین اور مددگار فن کار — جنہوں نے حال ہی میں مشرقی پاکستان کی زندہ علامات اور پیامی بن کر مغربی پاکستان کے تمام بڑے شہروں کا دورہ کیا اور جا بجا نہ صرف مشرقی پاکستان کے حسین و جمیل فنون اور ثقافتی و جمالیاتی ذوق کے پُرکیف و دلآویز مظاہروں سے مغربی پاکستان کے لوگوں کو روشناس کرایا بلکہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق اپنے ہم وطنوں اور بہن بھائیوں کی مدد و خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر مظاہروں کی ساری آمدنی مشرقی پاکستان کے تباہ کن طوفان کے مصیبت زدوں کی نذر کردی۔ اور اس طرح فن کو فن ہی نہیں رہنے دیا بلکہ تمام تر زندگی بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے فنی و ثقافتی مظاہرے اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے روابط سے نہ صرف دونوں حصوں میں محبت اور اخوت کا احساس بڑھتا ہے، بلکہ ملک کے دونوں حصے ایک دوسرے سے بہتر طور پر آشنا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ثقافتی سرمایہ کو اپنا ہی سرمایہ سمجھتے اور اس پہ ناز کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ان ثقافتی پیامیوں نے اپنے فنی مظاہروں سے ہمیں پھر یہ یقین دلایا ہے کہ ہمارا ملک فنی صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور اس نئے دور میں جس طرح ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے، اس سے یہ امید بڑھتی جا رہی ہے کہ ہمارے ملک کے ثقافتی سرمایہ میں روز بروز بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جائے گا۔

مشرقی پاکستان کے اس طائفہ رامش و رنگ نے ہمیں اس کی اصل روح تک پہنچنے کا موقع دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی تمثیل ہر جگہ پیش کی — بنگال کی جادو بھری دنیا کی دیہاتی کہانی، دھرتی کا روپ جو ناٹ اور سوانگ کی شکل میں پورے خلوص اور فنِ اداکاری و پیشکش کے بھرپور کمال کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آیا۔ کومی جسیم الدین کی یہ کہانی جسے بنگلا میں "نقشی کاتھر ماٹھ" اور انگریزی میں (FIELD OF EMBROIDERED QUILT) کہتے ہیں: ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے۔

تمثیلی رقص کی پیشکش کوئی اچھوتا تجربہ نہیں ہے کیونکہ رقص کے ساتھ ہی تمثیلی رقص نے بھی جنم لیا مگر "باقی" (بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس) نے یہ جدت کی ہے کہ پوری نظم کا ناٹکی روپ پیش کیا ہے اور اس اہم نظم کے اجزاء ذرا سی دیر کے لئے اسٹیج پر لانے پر اکتفا نہیں کیا۔ اس طرح یہ پوری نظم اپنے تمثیلی روپ میں ڈیڑھ گھنٹے اسٹیج پر جاری رہتی ہے اور ناظر کی آسودگیٔ طبع کا باعث بنتی ہے۔ بیچ میں کوئی وقفہ تعطل بھی نہیں آتا اور یہ ناٹک کہانی ایک بھرپور اور مسلسل دستاویزی فلم کی طرح نظر کے سامنے آتی چلی جاتی ہے۔

کسی اسٹیج پر پورے ڈیڑھ گھنٹہ جاری کا تسلسل سے ایک اہم نظم کے نکات، کہانی کی ترتیب، وتہذیب اور عوامی زندگی کے روپ پیش کرتے رہنا فن رقص اور اداکاری کی ایسی مشکل ادا ہے جو بڑی کاوش اور غیر معمولی کمالِ فن چاہتی ہے۔ داستان میں قحط کا حال، آغاز محبت، ہجر اور فراق کا دکھڑا، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، جرم، فرار اور جدائی، غرض زندگی

کے گوناگوں مظاہر، مناظر سامنے آتے ہیں۔ معاشری حالات، مثلاً سرپرستوں کی ذمہ داریاں، جذبات واحساسات، رسوم وقیود کے مناظر، ناظرین کو ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ روشنی اور ساز (آہنگ) کے تال میل سے اسٹیج پر یہ مناظر بہت ہی دلکش نظر آتے ہیں اور دیکھنے والے حسن وکیف کے اس امتزاج سے بے خود ہوتے جاتے ہیں۔

"نقشی کا تھرماٹھ" یا "منقّش رضائی کا کھیت" مشرقی پاکستان کے ایک مثالی کردار اور دیہاتی نوجوان، روپائے اور وہیں پر کسی گاؤں کی لڑکی ساجو کی داستانِ الفت ہے۔ جب تمثیل سامنے آتی ہے تو پہلا ہی نظارہ قحط کا مارا گاؤں ہے۔ کھیت کھلیان سب خشک اور اجاڑ پڑے ہیں۔ کسان، عورتیں اور جوان لڑکیاں بارش کی طلب ظاہر کرنے کے لئے ایک روایتی رقص پیش کرتی ہیں۔ اس موقع پر علاقہ کی سب سے حسین لڑکی ساجو بھی مجمع میں موجود تھی اور روپائے بھی۔ دونوں کے دلوں میں الفت راہ پالیتی ہے۔ اس کے بعد روپائے کا عزم یہ ہوتا ہے کہ وہ ساجو کو حاصل کر کے رہے گا۔ اور یہ کہانی دو اجنبی دیہاتی لڑکے لڑکی کی ایک دلکش تفسیرِ حیات بن جاتی ہے۔ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ منظر میں بادل اور موسلا دھار بارش ہے، اس کے بعد طوفان باد آتا ہے جس میں روپائے کا سرکنڈوں کا بنا ہوا مکان اڑ جاتا ہے اور یہ نوجوان بانس تلاش کرنے نکل جاتا ہے کہ پھر اپنا گھر بنا سکے۔ اس مہم میں اسے ایک دلچسپ انکشاف ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ساجو کی ماں سے اس کی اتفاقیہ ملاقات ہوتی ہے اور اس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساجو کی ماں اور روپائے کی ماں آپس میں سہیلیاں ہیں۔ اس سے روپائے کے دل میں کرن پیدا ہو جاتی ہے۔ ساجو کی ماں اسے اپنے ہاں آنے جانے کی دعوت دیتی ہے اور پہلی دفعہ اسے کھانے پر بھی مدعو کرتی ہے۔ اس کے بعد روپائے کا ساجو کے ہاں آنا جانا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے آنے جانے پر گاؤں کے لوگوں میں کانا پھوسی بھی شروع ہو جاتی ہے جس سے تنگ آ کر ساجو کی ماں روپائے کا آنا جانا بند کر دیتی ہے، اس سے روپائے کے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے مگر وہ بادلِ ناخواستہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ جدائی کے دن تڑپتے گزرتے ہیں۔ اور رات کو اگر کبھی نیند آ بھی جاتی ہے تو خواب میں وہ ساجو کو اپنی طرف آتا دیکھتا ہے۔ مگر ایک بار وہ دیکھتا ہے کہ کوئی قزاق ساجو کو راستہ سے اٹھا کر لے گیا۔ رقص میں خواب کی یہ کیفیت، الم، تڑپ اور سونے کی حالت میں بھیانک خواب کا منظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ــــ

غرض اس طرح کہانی چلتی رہتی ہے اور کہانی میں ایک خوشگوار موڑ جب آتا ہے کہ گاؤں کا ایک شخص جس کا نام دکھی ہے، اپنی مخلصانہ کوششوں میں کامیاب ہوتا ہے اور وہ روپائے اور ساجو کا رشتہ کرا دیتا ہے، اور یہ دونوں میاں بیوی بن کر خوش وخرم زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

فصلیں پک گئی ہیں۔ دیہاتی مسرت میں سرشار ہیں اور ہر طرف خوشی کی لہر ہے کہ ایک واقعۂ دلدوز حائل ہو جاتا ہے یعنی روپائے کسی جھگڑے میں پھنس جاتا ہے۔ یہ جھگڑا ملواں کھیتوں کی فصل پر ہوتا ہے۔ اور روپائے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتا ہے۔ روپوش ہونے سے قبل وہ ساجو سے آ کر ملتا ہے ــــ یہ ان کی ایسی ملاقات ہے جس کے بعد وہ کبھی نہ مل پائے۔ اس آخری ملاقات کا منظر بڑا ہی دلخراش اور غم انگیز ہے جسے اسٹیج پر پیش کرنے میں اداکاروں نے کمال کر دیا۔ اور لوگ عش عش کر اٹھے۔

روپائے کو روپوش ہوئے کئی سال گزر جاتے ہیں اور اس کی کوئی خبر نہیں آتی۔ ساجو مجبوراً اپنے میکہ آ جاتی ہے اور ایک رضائی کاڑھنا شروع کر دیتی ہے، اس کے ہر ٹانکے میں ایک ایک آنسو گڑھا ہوا ہے ــــ! جب رضائی مکمل ہو جاتی ہے تو ساجو جان دے دیتی ہے۔ گویا روپائے کے بعد اس کی زندگی کا مقصد اس یادگار کی تکمیل کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

روپائے کو بھی اس منقش رضائی کا علم ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی باوفا بیوی کے اس انوکھے فن پارہ کو دیکھنے کے لئے چھپ چھپا کر گاؤں آتا ہے۔ ساجو کی موت کے بعد اس کی بنائی ہوئی یہ رضائی اس کی قبر پر پھیلا دی جاتی ہے۔ روپائے جب اس رضائی کو آ کر دیکھتا ہے تو کرب والم سے تڑپ اٹھتا ہے ــــ اور اس نظارہ کا اس کے قلب پر ایسا گہرا چرکا لگتا ہے کہ وہیں دم توڑ دیتا ہے۔

جسیم الدین کی اس منظوم لوک کہانی میں خوبرو روپائے کا کردار منان نے ادا کیا ہے ساجو کا کردار رضیہ خانم نے۔ ان کے ساتھ جو دوسرے مددگار اداکار رہیں ان کی اداکاری اور کاموں کی خوبی معیاری ہے۔ اسٹیج پر مشرقی پاکستان کا گاؤں تک پیش کیا گیا ہے۔ کھیت بھی ہے اور گھر کا منظر بھی ہے۔ بادلوں کی گھن گرج کے لئے کنستر اور ڈھول سے کام لیا گیا ہے۔ اور بڑی خوبی سے منظر کے ساتھ اس کا آہنگ ملا دیا گیا ہے۔ رحمتی اللہ نے مختلف رنگوں کی برقی روشنی کو خوب ملایا اور ڈرامی دیر

میں بادل گھِر آنے کا منظر پیش کر دیا، جو بڑی مہارت اور چابکدستی کا کام تھا اور اسٹیج پر بالکل ایسا لگتا ہے کہ ہم مشرقی پاکستان میں ہیں اور بادل گھر کر آئے ہیں۔

رقص کے انچارج خود جی۔ اے منّان تھے ۔ ساز نوازی خادم حسین خاں نے کی۔ بدرالدین نے موسیقی کا سبھاؤ اپنے ذمہ لیا۔ سیٹنگ۔ اور کوسٹیوم (لباس و منظر) قمر الحسن نے ترتیب و تجویز کئے تھے کہانی کا ناٹکی مسودہ مجتبیٰ نے تیار کیا اور عبد السلام نے میک اپ کا انتظام کیا۔ غرض اس ٹیم کے ہر فنکار نے اپنی مہارت اور خوبی و کمال کو ایسا نبھایا کہ مغربی پاکستان کے دیکھنے والے عش عش کر اٹھے اور مشرقی پاکستان کے بھائیوں کے اس ثقافتی تحفے سے بیحد محظوظ ہوئے۔

"بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس" میں یہ اداکار شامل تھے:

بیگم نورالنہار، رضیہ خانم، شاہدہ احمد، لیلیٰ نرگس۔ نیلوفر چودھری، نرگس مرشدہ، زبیدہ محبوب، پتن دلو، اور جھرنا باسک، جی۔ اے منّان، انور حسین بھوٹیاں، کمال لوہانی، دلال تعلقدار، محی الدین چودھری، راجہ حسین خاں، امین الحسن خاں، یونس حسین خاں، محمد حمایت علی، عبدالقادر چودھری، سوبل داس گپتا اور اجیت ڈے۔

مغربی پاکستان کے اس دورے میں "بلبل اکاڈمی" ڈھاکہ کے فنکاروں نے نہ صرف ہمیں اپنے اس حصّہ ملک کی عوامی زندگی سے روشناس کرایا بلکہ فن رقص و اداکاری کے بھی وہ مظاہرے پیش کئے جو خالص فنّی صلاحیت و صداقت کے اعتبار سے بھی خاصے کی چیز تھے۔ نئے دور میں ملک کی عوامی صلاحیتوں کی ہمّت افزائی کرنے اور دونوں صوبوں کے درمیان روابط و تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں بلبل اکاڈمی کی اس پیشکش نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

پنجابی ادب

(مولانا محمد سرور)

اس کتاب میں سابق پنجاب کی سرزمین کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے بعد یہاں کی ترقی یافتہ زبان، اس کے ادب و انشا کی عہد بہ عہد نشوونما اور لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ ر

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ملتانی کافی:

محویت

(خواجہ غلام فریدؒ بہاولپوری)

مترجمہ حشمت فضلی

عشق ہوا گھر بھول گیا	زر اور شوہر بھول گیا
گذرے حسن کے ناز اور نخرے	جامہ و زیور بھول گیا
سرمہ سرخی منہدی بھولے	بولاؔ[1] بنیؔسر[2] بھول گیا
درد و غم دل کا سرمایہ	اور کل جوہر بھول گیا
دیر کنشت دوارہ مندر	مسجد و منبر بھول گیا
اس کی سوگند اس کی خاطر	سب خیر و شر بھول گیا
ہر دم اللہ یاد ہے ہم کو	اور اماں ہر[3] بھول گیا

جاؤں کیچ[4] فرید نہ لوٹوں

جنگل کا ڈر بھول گیا

[1] [2] ناک میں پہنے جانے والے زیورات

[3] ہمنی شر شئے۔ سب کچھ

[4] پنوں کے وطن کا نام

★

مقامات:

خُلد زار

(وادیٔ کرّم)

محمد شفیع صابر

وادیٔ کُرّم کا شمار سرحد کی خوبصورت ترین وادیوں میں ہے۔ اگر اسے سرحد کا کشمیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کُرّم خاص یعنی پاڑہ چنار کی وادی تو بالخصوص دلکش نظاروں کا ایک زندہ بہشت اور پھلوں پھولوں کا سرسبز و شاداب گلستاں ہے۔

کشمیر جنت نظیر کی طرح یہاں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں بھی ہیں اور سرو و شمشاد کے سرسبز درخت بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ جگہ جگہ پتھروں سے پھوٹنے والے چشمے بھی موسیقی نواز سُروں سے تماشائیوں کا دل لبھانے کو موجود ہیں۔ دریائے کرّم اور اس کے معاون بھی لہریں لیتے پیچ در پیچ راستوں اور گہری گھاٹیوں سے گذرتے، چٹانوں سے ٹکراتے اور شور مچاتے اپنا راستہ طے کرنے میں مصروف ہیں۔ جہاں سیاحوں اور مسافروں کے ٹھہرنے کو ڈاک بنگلے موجود ہیں، وہیں میووں اور سبزیوں کی بھی افراط ہے۔ اگر شکار کے لئے مرغابیاں، سِسی، چکور اور زرخورے عام ہیں تو سیر کے لئے قدرتی نظاروں کی بھی کمی نہیں۔ اگر یورپ کو اپنے سوئٹزرلینڈ پر فخر ہے، تو علاقۂ سرحد بجا طور پر کُرّم کی جنت نظیر وادی کو اس کے مقابلے میں پیش کر سکتا ہے۔

پھر قدرتی مناظر کی دلکشی کے ساتھ ساتھ وادیٔ کرّم کے لوگ بھی حسن و جمال اور صحت و تندرستی کے زندہ نمونے ہیں خصوصاً طوری اور پاڑہ لوگ بیحد چاق چوبند اور شکیل و وجیہہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوشنما ماحول میں رہتے رہتے وہ خود بھی اسی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ دوسرے قبائل کی طرح وادیٔ کرم کے لوگ مہماں نوازی اور رندی میں بھی خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ضروریاتِ زندگی بھی نسبتاً سستی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بھر میں سیاحوں کو اگر گرمیاں گذارنے کا سب سے سستا اور خوشگوار صحت افزا مقام نصیب ہو سکتا ہے تو وہ وادیٔ کرّم ہے۔ نہ صرف اس کا صدر مقام، پاڑہ چنار اپنے قدرتی حسن کے باعث مشہور ہے، بلکہ وادی کے کسی بھی گاؤں میں چلے جائیے، ہر جگہ ہفتوں ٹھہرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور ہر مقام پر ع "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کی کیفیت ہے۔

پھر یہاں کی زندگی بیحد امن و سکون کی زندگی ہے۔ گو یہ وادی آزاد قبائلی علاقہ ہی کا حصّہ ہے، لیکن اس کے رہنے والے تمام پاکستانی شہریوں کی طرح بلکہ قیام پاکستان کے بعد تو ان میں اُخوت و ہمدردی کے جذبات اور بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ ہر نووارد کو اپنا مہمان اور بھائی سمجھتے ہوئے اس کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اگرچہ اب بھی ہر سال ہزاروں لوگ گرمیاں گذارنے کرّم پہنچتے ہیں۔ لیکن اگر اس علاقے میں سیاحوں کی آمد و رفت پر توجہ دی جائے۔ اور فروغ سیاحت کا کوئی ادارہ قائم کر کے اہلِ پاکستان کو اس وادی کے قدرتی نظاروں سے متعارف کرایا جائے۔ تو کرّم دوسرا کشمیر بن سکتا ہے۔

وادیٔ کرّم کوئی ساٹھ میل لمبی اور دس میل چوڑی ہے۔ شمال میں سلسلۂ کوہِ سفید اسے شنواری علاقے سے جدا کرتا ہے۔ جنوب میں وزیرستان مشرق میں چکنی، زائی مشت اور اورک زائی کے علاقے اور میراں زائی کی وادی اور مغرب میں افغانستان واقع ہے۔

کرّم کی وادی اسی نام کے دریا اور درہ کے باعث مشہور ہے۔ یہ کوہِ سفید کے بلند سلسلوں کے درمیان پھیلتی چلی گئی ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی بیحد قدیم ہے۔

مالاکنڈ، خیبر، کرّم، ٹوچی، گومل اور بولان کے درے پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر بیحد سیاسی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ انہی سے ہو کر وہ شاہراہیں گذرتی ہیں جو صوبہ سرحد کو افغانستان اور وسط ایشیا کے باقی ملکوں سے ملاتی ہیں۔ وادیٔ کرّم بھی درّہ کرّم کے دہانے پر واقع ہونے کے باعث بیحد اہم دفاعی مقام ہے۔ پاڑہ چنار اور ٹل کی چھاؤنیاں اسی اہمیت اور حفاظتی نقطۂ نظر کے پیش نظر قائم کی گئی ہیں۔ کوہاٹ سے ٹل تک تو ریلوے لائن بھی موجود ہے۔ اور اس امر کے امکانات بھی ہیں

کہ اسے مزید چھپن میل تک بڑھا کر پاڑہ چنار کو بھی ریل کے ذریعے پاکستان کے باقی حصوں کے ساتھ ملا دیا جا دئے۔ پاڑہ چنار اس لحاظ سے بھی ایک کلیدی مقام ہے کہ یہاں سے پیواڑ کوتل کا مقام، جہاں افغانستان اور پاکستان کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں، صرف پندرہ میل دور ہے۔ پیواڑ کوتل سمندر کی سطح سے کوئی نو سوا نو ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں سے ایک راستہ افغانستان کی طرف نکلتا ہے جو پاکستان سے کابل پہنچنے کا نزدیک ترین راستہ ہے۔ پیواڑ کوتل سے چل کر یہ راستہ "شتر گردن" کے درّے اور لوگر وادی سے ہوتا ہوا کابل جا پہنچتا ہے۔ افغانستان کی دوسری اور تیسری جنگوں میں اس راستے سے کافی فائدہ اٹھایا جا چکا ہے ۱۹۲۰ء میں امان اللہ خاں نے بھی اسی راستے سے ٹل کی چھاؤنی اور قلعے پر حملہ کیا تھا۔ تاہم چونکہ یہ راستہ سال کے اکثر حصہ برف سے ڈھکا رہتا ہے اس لئے اسے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔ نہ یہ سڑک ہی اتنی بڑی ہے کہ اس پر موٹر لاریاں آجا سکیں۔ پھر چونکہ وادیٔ کرّم کے لوگ بھی پاکستان کے انتہائی وفادار ہیں، اس لئے آجکل اس طرف سے کسی خطرے کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔

کوہ سفید اور دریائے کرّم کی تہذیب بیحد پرانی بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ رگ وید میں دریائے کرّم کو "کورمو" اور کوہ سفید کو "سوا سپتا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ وادی میں اب تک جا بجا پرانے زمانے کے بُت اور سکے ملتے ہیں۔ اسی طرح کئی دیہات اور مقامات کے نام بھی ویدک زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔

دریائے کرّم افغانستان کے اونچے پہاڑوں سے نکل کر خرلاچی کے مقام پر کرّم ایجنسی میں داخل ہوتا ہے اور کوہاٹ سے پاڑہ چنار جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ ٹل تک بہتے ہوئے پھر وزیرستان کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ وہاں سے شیوہ، بنوں اور لکی مروت ہوتا ہوا میانوالی کے شہر کے بالمقابل دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ چونکہ یہ دریا کوہ سفید کی برفانی چوٹیوں سے نکلتا ہے اس لئے اُن دنوں جب پہاڑوں پر برف کافی پڑی ہو اس کے پگھلنے سے کرّم میں بھی اکثر طغیانی آجاتی ہے۔ بنّوں کے ضلع میں اس سے کچھ نہریں بھی نکالی گئی ہیں جو علاقے کی سرسبزی اور شادابی میں اضافہ کرتی ہیں۔ کچی کوٹ اور کرّم گڑھی کی نہریں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد حکومت کی طرف سے "کرّم گڑھی ہائیڈل سکیم" کے ماتحت دریا پر ایک بہت بڑا بند باندھا جا رہا ہے۔ جہاں سے نہ صرف متعدد نہریں نکالی جائیں گی اور اس طرح لاکھوں ایکڑ بنجر زمین سیراب ہونے لگے گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسی بند پر ایک قدرتی آبشار پیدا کر کے تین ہزار کلوواٹ برقابی قوت بھی حاصل کی جائے گی جو ضلع بنوں کے گھریلو اور صنعتی استعمال میں آکر اس علاقے کی خوشحالی کو چار چاند لگا دے گی۔ اس ساری سکیم پر ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ انقلاب اکتوبر کے بعد سے اس جگہ کام تیزی کے ساتھ جاری ہے اور اندازہ ہے کہ ایک سال تک آبپاشی کی نہریں کام کرنے لگیں گی۔

کافی تحقیق کے باوجود پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے کرّم کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خیال ہے کہ اُن دنوں یہ علاقے بھی مختلف قبیلوں کے مختلف سرداروں کے ماتحت تھے اور کوئی قابلِ ذکر حکومت یہاں موجود نہ تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ سارا علاقہ (وادیٔ کرّم، میران زائی اور موجودہ ضلع کوہاٹ) قبیلہ بنگش کے ماتحت آگیا۔ کہتے ہیں کہ بنگش لوگ عرب سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے تاہم اُن کا اقتدار بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہنے پایا اور کچھ عرصہ بعد طوری اور حمکنی لوگ وہاں وارد ہوئے تو بنگش کو کافی علاقے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسی طرح وقت کے ساتھ دوسرے قبیلے بھی یہاں پہنچتے اور آباد ہوتے رہے۔

آج کل یہاں کے بڑے بڑے قبیلے بنگش، طوری، زائی مُشت اور حمکنی ہیں، لیکن ان کے علاوہ آفریدی، علی شیر زئی، غلزئی، ہزارہ، حاجی، خوست وال، ماموزائی، لسیانی، داؤزئی، مقبل، شنواری، پاڑہ، ادرک زائی، یوسف زائی، وزیری اور سیّد بھی کچھ تعداد میں ملتے ہیں، اور ان سب کو ملا کر وادیٔ کرّم کی آبادی قریباً ستر چھتر ہزار ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ سوال قریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اب سبھی قبائل پاکستان کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں کیونکہ پاکستان کے حصول کے لئے دونوں نے ایک جیسی قربانی دی ہے۔ اس میں سرحدیوں کا بھی وہی حصہ ہے جو پنجابیوں کا، اور بنگالیوں کو بھی وہی مقام حاصل ہے جو سندھیوں کو۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی ملک کے فرزند ہیں۔

بانیٔ پاکستان قائد اعظمؒ نے اپنے آخری دورہ سرحد کے موقع پر آزاد قبائل کے ایک جرگہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: "ہمیشہ سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق و یکجہتی پیدا ہو اور مجھے

اُمید ہے اس عظیم مملکتِ پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے اسے دیکھتے ہوئے سب کو اس بات کا کامل احساس ہوگا کہ اس وقت اتحادِ باہمی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ہم مسلمانوں کا خدا ایک ہے، قرآن ایک ہے، رسولؐ ایک ہے۔ اس لئے ہمیں ایک قومِ واحد کی طرح متحد ہو کر رہنا چاہئے۔ ایک پرانی کہاوت ہے "اتفاق میں طاقت اور نا اتفاقی میں ہلاکت ہے"۔ (جرگہ جملہ قبائل سرحد، اپریل ۱۹۴۸ء)

میران زائی کی وادی ضلع کوہاٹ کے عمدہ علاقوں میں سے ایک ہے۔ اور دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ سدّہ ان دونوں حصوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ سدّہ سے شمالی علاقے کو کرّم یا پاڑہ چنار کی وادی اور جنوبی کو میران زائی کی وادی یا لوئر کرّم کہا جاتا ہے۔

ٹل سے گذر کر سڑک دریائے کرّم کے ساتھ ساتھ پاڑہ چنار پہنچتی ہے۔ ٹل سے آگے چھپری، مندوری، بادشاہ کوٹ، ارادلی اور ڈرّانی سے ہوتے ہوئے سدّہ آتا ہے۔

زیریں کرّم یا میران زئی کی وادی کا یہ آخری مقام ہے۔ سدّہ سے آگے بالائی کرّم یا پاڑہ چنار کی وادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ وادی نسبتاً کھلی ہے۔ جگہ جگہ ندی نالے بہتے ہیں اور اس طرح آبپاشی کی سہولتیں بیسر ہیں۔ سبز و شاداب اور سدا بہار درختوں سے گھرے ہوئے نشیب و فراز میں واقع پاڑہ چنار کے اونچے نیچے مکان سیاحوں کے لئے بہت دلچسپ نظارہ پیش کرتے ہیں۔ گورنر اور پولیٹیکل ایجنٹ کے بنگلے، کرّم ملیشیا کا ہیڈ کوارٹر، سول ہسپتال، ہائی سکول، لائبریری اور دوسری عمارتیں خاص طور پر قابلِ دید ہیں۔

پاڑہ چنار کی وجہ تسمیہ بھی عجیب و غریب ہے۔ "پاڑہ" وادی کرم کا ایک قبیلہ ہے۔ جو کوہ سفید کی انتہائی بلندیوں پر آباد ہے۔ یہ لوگ حجروں کی بجائے چنار کے کسی بڑے درخت کی چھاؤں میں اپنی مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور وہیں قومی معاملات کے متعلق مشورے ہوتے ہیں۔ چنانچہ چنار کا ایک ایسا ہی بوڑھا پیڑ اب تک کرّم ملیشیا کے قلعہ کے سامنے موجود ہے۔ جہاں پاڑہ قوم کے جانباز اکر ایک دوسرے سے مشاورت کرتے ہیں۔ قوم پاڑہ کی مناسبت سے چنار کے اس پیڑ کا نام بھی "پاڑہ چنار" پڑ گیا۔ اور بعد میں بسنے والا یہ شہر بھی اس طرح پاڑہ چنار ہی کہلایا۔ اگرچہ اب اس پیڑ کا تنا کھوکھلا ہو چکا ہے پھر بھی پاڑہ چنار کے لوگوں کو اس تاریخی "چنار" سے اتنا اُنس ہے کہ اس کے تنے کو مضبوط رکھنے کے لئے اس کے اردگرد سہارے کے طور پر سیمنٹ کا ایک چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔

چنار کے درخت کو یوں بھی اس وادی میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ جب بھی کوئی معزز مہمان یہاں آکر ٹھہرتا ہے، تو اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے یہ لوگ اس کے ہاتھوں چنار کا ایک درخت لگواتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ ہوا جب محترمہ فاطمہ جناح سرحد آئیں اور اہلِ کرّم کی مہمان بنیں تو انہوں نے بھی اپنے ہاتھ سے ایک خاص جگہ پر چنار کا ایک درخت لگایا۔ یہ درخت اب کافی بڑا ہو چکا ہے۔

پاڑہ چنار تک موٹروں اور لاریوں کی عمدہ سڑک موجود ہے۔ بلکہ سیاحوں کی سہولت کے لئے نہ صرف پاڑہ چنار بلکہ بہت سے دوسرے اہم مقامات، مثلاً مندوری، علی زئی، سدّہ، پیواڑ، من جمال وغیرہ میں ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں ریسٹ ہاؤس نہ بھی ہو وہاں ہر قبائلی کا مکان ہی مہمانوں کے لئے ریسٹ ہاؤس کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بیحد مہمان نواز اور خلیق ہیں، اور باہر سے آنے والوں کی بیحد قدر و حرمت کرتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں چلے جایئے غریب سے غریب آدمی بھی آپ کو چائے پیش کرے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ گڑ کی چائے ہو یا چینی کی۔ چائے نوشی کرّم میں اتنی عام ہے کہ ہر گھر ایک بے تکلف قہوہ خانہ ہے اور بلا مبالغہ ہر روز ہر گھر میں گڑ کی چائے کے سو سو پیالے لنڈھائے جاتے ہیں۔ یہی حال تمباکو نوشی کا ہے۔ اس "لعنت" میں بھی اہلِ کرّم سب سے آگے ہیں، سات سال کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے تک سب چلم پر جان دیتے ہیں، یہاں تک کوئی مدرسہ، کوئی مسجد، کوئی خانقاہ اور کوئی زیارت بھی چلم سے خالی نہیں!

کرّم کے باشندوں کی یہ مہمان نوازی اُن سیاحوں کے لئے بیحد حوصلہ افزا ہے جو صوبہ سرحد کی اس جنت نظیر وادی کے حسین قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ البتہ وادیٔ کرم کی سیر کا اصل لطف اکتوبر کے مہینے میں آتا ہے۔ یہ وہ دن ہیں جب کوہِ سفید کی نواحی چوٹیوں پر برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ اور کرّم کے تمام پھل بھی پک جاتے ہیں۔ یوں تو انار، سیب، خوبانی، ناشپاتی، زرد آلو، شہتوت، آلوچہ، کون سا میوہ ہے جو وادیٔ کرّم میں نہیں ہوتا، لیکن کرّم، خصوصاً زیڑان کے "شلیل" اس علاقے کا خاص میوہ ہیں۔ شلیل زرد آلو سے ملتا جلتا ہے لیکن اس کا مزا زرد آلو سے کہیں بہتر ہے۔ یہ میوہ ہفتوں تک خراب بھی

نہیں ہوتا۔ اس لئے دور دور بھیجا جاتا ہے۔

سیر و شکار کے شوقین لوگوں کے لئے یہاں کوئی کمی نہیں۔ پاڑہ چنار کے علاوہ نواحی دیہات بھی قدرتی نظاروں سے مالامال ہیں۔ شلوزان تو ایجنسی بھر میں خوبصورت ترین مقام ہے۔ اسی طرح احمد زائی، پیواڑ، تری منگل، ڈونڈر، عوز گڑھی، کرمان اور زیران بھی قابل دید مقامات ہیں۔ مؤخرالذکر کا پانی صحت کے لئے بہت ہی مفید ہے۔

شکار بھی ساری وادی میں بافراط ہے۔ پہاڑوں میں چیتے، مارخور، بنڈھے، سؤر، بھیڑیئے، گیدڑ، لومڑیاں، نیولے، خرگوش، ہرن اور جنگلی چوہے عام پائے جاتے ہیں۔ ادھر دریائے کرم اور دوسرے ندی نالوں پر کونجیں، کبوتر، مسی، چکور، بطخیں، اور مرغابیاں بھی کثرت سے ہیں۔ خاص طور پر بطخ کا شکار بہت عام اور بے حد پر لطف ہوتا ہے۔ اس کے لئے خاص قسم کے تالاب بنائے جاتے ہیں، جن میں گوبر سے بنائی ہوئی بطخیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ جب اصلی بطخیں ان پر اپنے ہم جنس ہونے کا گمان کرتے ہوئے نیچے اتر کر تالاب میں تیرنے لگتی ہیں۔ تو نہایت دلکش سماں بندھ جاتا ہے اور آسانی سے انہیں نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ تیسری قسم کا شکار ماہی گیری ہے۔ شلخ اور ڈونڈر کے قریب دریائے کرم میں مچھلی بہت ملتی ہے۔ اور لوگ جی بھر کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گو یہ مچھلی ذائقے کے لحاظ سے بیحد لذیذ ہے، مگر چھوٹی اور کانٹے والی ہوتی ہے۔

کوہ سفید کی مارخور بکری اور مرغ زریں بھی خاص طور پر مشہور ہے۔ ایک درخت "مارچوب" بھی یہاں ہوتا ہے جسکے متعلق مشہور ہے کہ اگر کسی گھر میں اس کی ٹہنی موجود ہو تو وہاں سانپ کا گذر نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی ساتھ مقامی لوگ اسے بیحد منحوس بھی خیال کرتے ہیں۔

منطقہ معتدلہ کے تقریباً تمام درخت بھی وادئ کرم میں پائے جاتے ہیں۔ اونچے پہاڑوں پر دیودار، چیڑ، زیتون اور بلوط وغیرہ کے گھنے جنگلات ہیں۔ جن کی لکڑی عمارتی کام میں لائی جاتی ہے۔

ان جنگلات میں طرح طرح کی ادویاتی جڑی بوٹیاں بھی ملتی ہیں جن میں سے آرٹیمیشیا، جسے مقامی زبان میں "ترخہ" کہا جاتا ہے، خاص طور پر بیحد قیمتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وادئ کرم کی خوشحالی کا دارومدار زیادہ تر اسی بوٹی پر ہے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہر سال ہزاروں من آرٹیمیشیا یورپ کے مختلف ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ جہاں یہ بے شمار انگریزی دوائیوں کا جزو بنتا ہے۔ گو وادئ کاغان، گلگت اور چترال میں بھی یہ تھوڑی مقدار میں ضرور پایا جاتا ہے۔ مگر کرم کا "ترخہ" بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔

اسی طرح کرم کے سیب، خوبانی اور ٹماٹر بھی خاص شہرت رکھتے ہیں اور صوبہ سرحد اور پاکستان کی منڈیوں میں ان کی بڑی مانگ ہے۔ اسی طرح "لال ماش" "گرخہ" بھی سال میں ہزاروں من ہندوستان کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ ہندو لوگوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر کرم کے چار خاص تحفے ہیں ـــ کرمان کے چاول، ملانہ کے پتھر، اور پیواڑ کے جنگلات۔

کرم کی خوشحالی کی ایک اور وجہ تجارت ہے۔ نہ صرف پاکستان کے مختلف علاقوں کے ساتھ تجارتی سلسلہ قائم ہے بلکہ افغانستان کی طرف یہاں سے کئی راستے نکلنے کے باعث افغان پاوندے ہر سال کرم کے شہروں میں لین دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ کپڑا، چینی کے ظروف، تانبے اور ایلومنیم کے برتن، گڑ، چاول وغیرہ کابل اور دوسرے افغانی شہروں کو لے جاتے ہیں اور وہاں سے قراقلی، خشک میوے انگور اور سردے وغیرہ یہاں لاکر بیچتے ہیں۔

اسی طرح علی زائی سے بھی ایک راستہ افغانستان کے صوبہ خوست کی طرف جاتا ہے علی زائی خاصا بڑا قصبہ ہے اور ٹل سے پاڑہ چنار جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

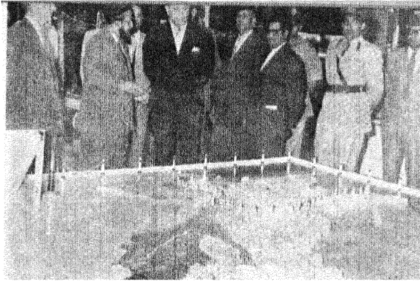
کرم کے قدرتی مناظر اور دلکشی کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندے بھی اپنے بانکپن کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا بانکپن عیدوں اور تہواروں پر اور بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ لوگ رنگین اور شوخ کپڑے پہنتے ہیں۔ منگل اور واوڑ قبیلوں کے نوجوان عید کی تقریبات پر ایک ابرو اور اس کے دوسری طرف کی ایک مونچھ منڈاتے اور ایک آنکھ میں سیاہ اور دوسری آنکھ میں سرخ سرمہ (گلنار) لگاتے ہیں۔ جن کے چہروں پر داڑھی ہوتی ہے، وہ داڑھی کا بھی ایک حصہ منڈا دیتے ہیں، ان دنوں وہ تلواروں کو بے نیام کر لیتے ہیں اور طرح طرح کے مردانہ کھیلوں سے شجاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کھیلوں کے ساتھ ساتھ ایسے ہی موقعوں پر حسن و رومان کی داستانیں بھی، پروان چڑھتی ہیں۔ یہاں انہی نوجوانوں کو پسند کیا جاتا ہے جو زیادہ طرحدار اور شجاع ہوں اور شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں دوسروں کو شکست دے سکیں۔

قبیلوں میں یہ بھی دستور ہے کہ شادی کے بعد جب دلھن

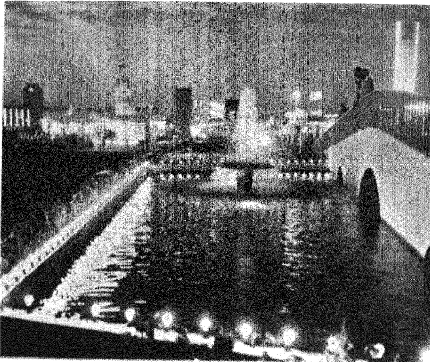
قومی نمائش (۱۹۶۰ء) :
ھماری ھرجہتی ترقی کے چند در چند مظاھر



چھوٹی دستکاریاں : بیش بہا قومی ورثہ اور سرچشمۂ دولت



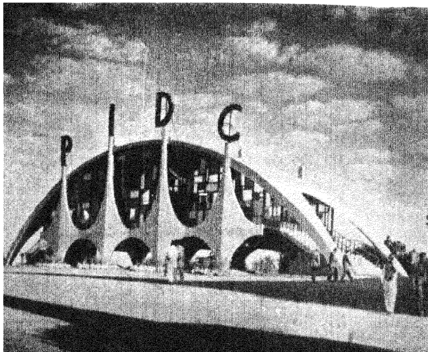
مواصلات کی برق رفتار ترقی
(صدر پاکستان پی اینڈ ٹی کے اسٹال پر)



نمائش : رات کے وقت ایک دل آویز منظر



دولت کی کان : ھماری بوقلموں دستی مصنوعات



ھماری ھرجہتی ترقی کا سرچشمہ (پی-آئی-ڈی-سی)



افتتاح : قائم مقام صدر پاکستان ، لفٹیننٹ جنرل واجد علی برکی

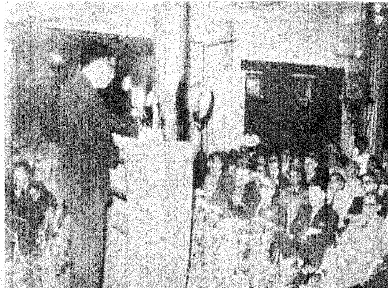


مندوب برطانیہ ، سر جرمی ریزمین کا خطاب



تقریر : رپورٹر ، بین الاقوامی ایوان تجارت

پاکستانی مندوب، مسٹر ایم۔ اے۔ رنگون والا کی استقبالی تقریر ↓



ترقی کی نئی سمتیں

صنعتی و معاشری سرگرمیوں کے علاوہ کاروبار و تجارت بھی ہمارا خصوصی مرکز توجہ ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی میں وسیع پیمانہ پر ایک اجتماع اہل تجارت ہوا جس میں ۳۰ ملکوں کے ۵۰۰ مندوبین نے شرکت کی

دولہا کے گھر پہنچتی ہے۔ تو کئی دن تک شرم و حیا کی گڑیا بنے کسی کونے میں دبکی پڑی رہتی ہے۔ جب یہ مقررہ دن گذر جاتے ہیں تو قبیلے کی دوسری دوشیزائیں دف بجاتی سر پر گھڑے اٹھائے دلھن کے گرد جمع ہو جاتی ہیں، اور اُسے ساتھ لے کر گاتی بجاتی، خوشیاں مناتی کسی دریا یا چشمے پر پہنچتی ہیں۔ جہاں سے گھڑوں میں پانی لے کر واپس گھر لوٹتی ہیں۔ دلھن بھی اس رسم میں شریک ہوتی ہے۔ جب یہ شگون پورا ہو جائے تو دلھن کی خلوت گزینی ختم ہو جاتی ہے اور وہ آزادی سے گھریلو زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔

طوری قبیلے کا لباس خصوصاً بیحد دلچسپ اور رنگین ہوتا ہے۔ اُن کی قمیص کی آستین عموماً نیلی ہوتی ہیں اور گردن کے اردگرد لال ڈوری یا کوئی سنہری فیتہ لگا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بہادری کے اظہار کے لئے عجیب عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا ہے اور پہلی بار باہر کے لوگوں سے متعارف کرایا جاتا ہے تو اس کے سر پر چند فائر کئے جاتے ہیں۔ اگر بچہ ان فائروں سے خوف زدہ نہ ہو، تو یہ شگون لیا جاتا ہے کہ آگے چل کر یہ بچہ قبیلے کا نامور سردار ثابت ہوگا۔

طوری اور منگل عام طور پر سر پر لمبے بال رکھتے ہیں جسے "جونڑے" کہتے ہیں۔ پاڑا اور مقبل کے سر گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ خٹکوں کی طرح اہلِ کرم کا بھی ایک قومی ناچ ہے "غرّہ"۔ جب لمبے لمبے بالوں والے، لمبے تڑنگے، بانکے نوجوان اس ناچ میں شریک ہوتے ہیں، تو عجیب منظر پیدا ہوتا ہے۔

"غرّہ" دراصل ناچ نہیں، بلکہ ایک جنگی لازمہ یا رزمیہ رجز ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو اس کی تمام حرکات اور مختلف مراحل جنگ کی کسی نہ کسی حرکت کے مظہر ہیں۔ ڈھول کا بجنا نوجوانوں کو ایک جگہ جمع ہونے اور حجم کر لڑنے کی دعوت دیتا ہے، اور لڑائی کا جوش پیدا کرتا ہے۔ "گتکا بازی" کی طرح اس سے شمشیر زنی کے مختلف کرتب بھی سیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح جسم میں چستی و چالاکی کی لہر دوڑا دینے میں بھی "غرّہ" کو خاص درجہ حاصل ہے۔

"غرّہ" کے علاوہ وادیٔ کرم کے رہنے والے موسیقی سے بھی ایک خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ شام کو جب ڈوبتے سورج کی کرنیں کوہ سفید کی برفانی چوٹیوں سے ٹکرا کر عجیب عجیب رنگ پیدا کرنے لگتی ہیں، تو وادی کے رنگین نوجوان بھی اپنے اپنے "ایکتارے" لئے کسی چشمہ کے پاس چناروں کے جھنڈ میں جمع ہو جاتے ہیں اور پہروں اُن کے نغمے سارے ماحول میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑاتے رہتے ہیں۔

کرم کے ان جوانمردوں نے بھی اپنے دوسرے سرحدی بھائیوں کے دوش بدوش جہادِ کشمیر میں شاندار حصہ لیا ہے، اور اب بھی وہ اپنے محبوب وطن پاکستان کی حفاظت کے لئے دن رات سینہ سپر اور سر بکف ہیں۔ حکومتِ پاکستان بھی ان کی بہتری کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ تعلیمی، اقتصادی اور مجلسی زندگی کے ہر شعبے میں شاندار ترقی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد متعدد نئے مدارس جگہ جگہ قائم کئے جا رہے ہیں۔ پاڑہ چنار میں گورنمنٹ کالج قائم ہو چکا ہے اور ایک اوّل درجے کا ہائی سکول موجود ہے۔ علی زائی کے مڈل سکول کو بھی ہائی سکول کا درجہ دیا جانا منظور ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ پیواڑ، شلوزان، عالم شیر، کڑمان، ناستی کوٹ، احمد زئی، سامیر، سدہ، زیڑان اور دوسرے اہم دیہات میں پرائمری سکول بھی جاری ہیں اور تعلیم بالغان کے مراکز بھی دن رات اس علاقے کے لوگوں کی جہالت ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ ایجنسی کے طلباء کو وظیفے دے کر پاکستان کے مختلف کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں بھی بھیجا گیا ہے، اور سرکاری ملازمت کے دروازے بھی ان کے لئے کھلے ہیں۔

دورِ انقلاب نے یہاں کے لوگوں میں تعمیر و ترقی کی نئی لگن پیدا کر دی ہے اور وہ دیگر فرزندانِ وطن کی طرح پاکستان کو سربلند کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

"ماہِ نو" کے لئے

غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

ادارے:

مہران جا ماٹک[۱]

(سندھی ادبی بورڈ)

امیر حسن سیال

مغربی پاکستان کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا ہوگا جس نے علم وفن اور تہذیب وثقافت کے فروغ میں حصہ نہ لیا ہو۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اچھوتے، انمول پارہ ہائے ادب کو جنم دیتے رہے ہیں بعض علاقوں خصوصاً سابقہ سرحد، پنجاب اور سندھ نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اب بھی بیش از بیش حصہ لے رہے ہیں۔ کچھ دھرتی کی تاثیر، کچھ لوگوں کا خمیر، ان مقامات نے علمی، ادبی اور ذہنی وثقافتی حیثیت سے زرخیز ہونے کا بہت عمدہ ثبوت دیا ہے۔ یہ نقش ہائے رنگ رنگ جو تاریخ ادب، عوامی شاعری، لسانیات اور دیگر علوم وفنون سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج پاکستان کا نہایت ہی بیش بہا ثقافتی خزانہ ہیں۔ اور ہم میں سے کون ہے جس کو اس پر ناز نہ ہو؟

غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی اور ملی وجود کی بنیادہی تہذیب وثقافت کے ان آثار کہن پر قائم ہے۔ اور ہم ان سے جس قدر قریب آئیں گے اتنا ہی اپنی خودی سے قریب تر آئیں گے۔ اور ہماری حیات ملیہ کی بنیادیں استوار تر ہوں گی۔ قومی زندگی کے ان مضبوط رگ ریشوں کو تلاش کرنا، ان کو بروئے کار لانا اور نشوونما دینا درحقیقت اپنے ملی وجود ہی کو اور مستحکم کرنا ہے۔ ہماری بولیاں، ہماری زبانیں، ان کا ادب، لوک شاعری، لوک گیت سب ہماری یکساں توجہ چاہتے ہیں۔ یہ پاکستان کی یکجہتی اس کی سالمیت کے محکم ستون ہیں۔ کیونکہ یہی ہمارے دیس کے مختلف حصوں اور اس باشندوں کو ایک دوسرے سے روشناس کرانے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا نہایت عمدہ ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے، حکومت اور عوام کی توجہ برابر انہی پر مرکوز ہے۔ حکومت نے تو بالخصوص اس کو اپنی پالیسی کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے کہ مغربی ومشرقی پاکستان ہی نہیں خود ان صوبوں کے مختلف حصوں کو بھی وحدت کے رشتہ میں منسلک کیا جائے جس میں ثقافتی وحدت کو نمایاں اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہماری موجودہ انقلابی حکومت نے تو خاص طور پر اس وحدت کو اپنا خاص مطمع نظر قرار دیا ہے۔ اور ایسے اداروں کے قیام اور ان کی تائید پر زور دیا ہے جو ہر علاقے کے تہذیبی وثقافتی دھاروں کو ابھاریں ان کو آپس میں ملائیں تاکہ ایک، پرزور قومی تحریک اور نیا، توانا شعور ملی وجود میں آئے۔

حالات کا یہ رخ آزادی کے پہلے ہی چند سالوں میں نمایاں ہو چکا تھا۔ اور مختلف علاقوں میں ایسے ادارے حکومت ہی کی تائید سے قائم ہو گئے تھے جنہوں نے یہ اہم قومی فرض ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہی میں سے ایک "سندھی ادبی بورڈ" ہے۔ بے حد سرگرم، تیز رفتار، براق — جس نے چند ہی سال کے عرصہ میں اس قدر کار نمایاں سرانجام دیا ہے جو قابل داد بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ اس کی بدولت وادی مہران ایک بار پھر خواب گراں سے جاگ اٹھی ہے۔ اور ہم اس کے خد وخال کو ان کی پوری کشش ورعنائی کے ساتھ دیکھنے لگے ہیں۔ یہ پاکستان کے مستقبل کے لئے نہایت خوش گوار علامت ہے۔

"سندھی ادبی بورڈ" دراصل پہلے سابقہ صوبہ سندھ کی حکومت نے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سندھی زبان اور اس کے ادب کو ترقی اور فروغ دیا جائے۔ تب سے یہ برابر ایک سرکاری ادارے کے طور پر کام کرتا رہا اور اس کو تمام تر مالی امداد سابقہ حکومت سندھ سے ملتی رہی۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۵۵ء میں اسے ایک آزاد اور خود مختار ادارہ بنا دیا گیا اور یہ اب تک اسی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اس کی

[۱]: مہران کے موتی [مہران = مہران = دریائے سندھ، جا = کا، ماٹک = مانک = موتی]

آزاد و خود مختار حیثیت نے اس میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑادی اور ایسے انسانوں کی زیر سرکردگی جو اپنے علاقے اور اپنی قوم کی زبان و ادب کی زبردست لگن لئے ہوئے ہیں۔ اس نے حقیقتہً بہت ہی عمدہ کام کیا ہے۔ جس سے ہم وادی مہرآن کی علمی و ادبی پہنائیوں کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگ گئے ہیں۔

بورڈ کی سرگرمیوں میں غیر معمولی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کے اس حصہ کو جو کبھی سندھ کہلاتا تھا ہر حیثیت سے سامنے لانا ہے، اسے پاکستان کے وسیع تر حلقۂ تہذیب و ثقافت کے ایک اہم عنصر کے طور پر اجاگر کرنا ہے۔ تاکہ اس قطعہ کے باشندوں کے علاوہ دیگر اہل وطن بھی اس ورثہ میں شریک ہوسکیں، اس خطہ اور اس کے باشندوں کو سمجھ سکیں، ان کی قدر کریں۔ اور ان سے ایک نئی جوت جگائیں۔ ایسا کام صدق دل سے کیا جائے تو اس سے کیا کچھ نتائج متصور نہیں؟

سندھ مدتوں آریائی، سامی، عجمی، مقامی اور ایک عرصہ مغربی قوموں اور تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ جس کی بنا پر اسے تمدنوں کا گہوارہ بھی کہا گیا ہے اور اسی لئے یہاں کے اہلِ کمال جامع اللسّان تھے اور انہوں نے اپنی مادری زبان، سندھی ہی میں جوہر نہیں دکھائے، بلکہ فارسی، عربی، اور اردو میں بھی گراں قدر نقوش یادگار چھوڑے ہیں اور آج بھی ان کی پرورش میں سرگرم ہیں۔ بنا بریں ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں بھی گوناگوں رہی ہیں۔ چنانچہ وادئ مہرآن کی ثقافت کتنے ہی عناصر اور کتنے ہی میدانوں کو محیط ہے۔ اور اگر ہم اس کی صحیح کیفیت کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں تو ہمیں ان سب کو نمایاں کرنا ہوگا۔ ذرا تصور کیجئے اس عظیم الشان ثقافتی ورثہ کو اجاگر کرنے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ اور وادئ مہران کی روح، اس کی تخلیقات کو کن کن صورتوں میں جلوہ گر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ظاہر ہے سندھی مصنفین کی طبع زاد تصانیف ہیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں۔ اور ان کا موضوع کچھ ہو، مذہب، تاریخ، ادب، السانیات وغیرہ۔ ان باقاعدہ علمی و ادبی کاموں کے ساتھ عوام کا خودرو ادب بھی ہے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ سندھ سے متعلق جملہ امور ہیں۔ اُسی قدر متنوع جتنے کسی بھی علاقے کے لئے متعلق امور ہو سکتے ہیں۔ زبان، تہذیب، فنون، تاریخ، حالات، واقعات، مشاہدہ وغیرہ آثار کہن۔ ایک اور دلچسپ عنصر ہے۔ جس میں مسودات و نایاب کُتب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

بورڈ اِن تمام امور پر بھرپور توجہ دینے میں کوشاں ہے۔ چنانچہ اس نے اب تک ۲۵ طبع زاد کتابیں شائع کی ہیں۔ ۱۲۔ زیر طبع ہیں، چالیس طباعت کے لئے تیار ہیں اور ۲۴ زیر تکمیل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان متعدد تصانیف کے موضوعات بھی اتنے ہی متنوع ہوں گے۔

ایک بہت بڑا کام اُس منتشر ادب کو فراہم کرنا ہے جو سارے سندھی لوگوں کا سانجھا ادب ہے۔ یعنی عوامی ادب۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس ادب کا ذخیرہ کس قدر وسیع ہے۔ ہم شاید اس کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ بورڈ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے یہ بیش بہا سرمایہ اس مقدار میں فراہم کر لیا ہے جو پوری ۴۷ ضخیم جلدوں میں شائع ہوگا۔ اس کی پہلی دو جلدیں منظر عام پر آ بھی چکی ہیں۔ ۲۴ چھپائی کے لئے تیار پڑی ہیں اور باقی زیر ترتیب ہیں۔ طبع زاد کتابوں کی طرح یہ عوامی ادب بھی ہمارے مجموعی ملی ادب کو ایک بہت بڑی دین ثابت ہوگا۔

ان کتابوں کی اشاعت سیدھے سبھاؤ نہیں کی جاتی بلکہ ممتاز ترین دانشوروں کی ایک سرگرم و مستند جماعت فرداً فرداً یا اجتماعاً ہر کتاب کے بارے میں پوری پوری تحقیق و تدقیق سے کام لے کر اس کی تصحیح کرتی ہے۔ حاشیے اور مقدمے لکھتی ہے اور اس طرح ہر کتاب ہر اعتبار سے جامع و کارآمد ہو کر سامنے آتی ہے۔

کسی زبان کا علمی و ادبی سرمایہ وسیع کرنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے ترجمہ کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس سے نئے نئے ذہنی افق آشکار ہوتے ہیں۔ اور زبان کے ساتھ قوم کو بھی محدود دائروں سے نکال کر ایک وسیع تر دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں طمانیت و جمود کے بجائے ارتقا ہی ارتقا ہوتا ہے۔ بورڈ نے سندھی میں اور سندھی سے تراجم کا دوگونہ اہتمام کرکے توسیع و ترقی کا راستہ تراشا ہے۔ اب تک سندھی میں ۳۰ تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ چار زیر طبع ہیں اور ۳۲ زیر تکمیل ہیں۔

ایک کام جس کی ہماری تمام زبانوں کو اشد ضرورت ہے زبان کا انفرادی و تقابلی مطالعہ ہے۔ جس کے لئے تحقیق۔ اور تدوینِ لغت از بس ضروری ہیں ہماری اکثر زبانیں اس لحاظ سے تہی دامن ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ کی نظر اس پہلو پر بھی رہی ہے۔ چنانچہ اس نے چار جلدوں میں سندھی کی ایک ضخیم لغت ترتیب دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جن میں سے ایک جلد چھپ چکی ہے۔ دوسری زیر طبع ہے۔ اور باقی دو منتظر طباعت ہیں۔ اگر ان میں جدید لغات کی فراہمی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اور

لغات کا مادہ و اشتقاق اور دوسری اہم تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں، جیسا کہ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ تو یہ واقعی بہت بڑا کام ہے۔ امید ہے رفتہ رفتہ گرامر اور عام لسانیات پر بھی ایسی ہی توجہ دی جائے گی۔

بورڈ کا مرکزِ توجہ تمام تر وادیٔ مہران ہی نہیں بلکہ تمام پہنائے ملک ہے۔ اسی لئے اس نے ملی موضوعات پر بھی توجہ مبذول کی ہے۔ جو تاریخ، ادب، تصوف، طب وغیرہ جیسے اہم اصناف کو محیط ہے۔

اس مقصد کے لئے اس نے ایک شاندار منصوبہ بھی مرتب کیا ہے۔ جس کے تحت یہ عربی میں ۴ فارسی میں ۷، ۸، اردو میں سات اور انگریزی میں چھ کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وزارت تعلیم نے اس منصوبہ کو منظور کر لیا ہے اور اب یہ اسی کی سرپرستی میں اور اسی کی مالی امداد سے روبہ عمل لائی جا رہی ہے اب تک اردو میں پانچ، انگریزی اور عربی میں دو اور فارسی میں ۲ کتابیں چھپ بھی چکی ہیں۔ ۸ کتابیں زیر طباعت اور باقی زیر تکمیل ہیں۔ انہی کارناموں پر قناعت نہ کرتے ہوئے بورڈ نے اس منصوبہ کا ایک دوسرا حصہ بھی تیار کر لیا ہے۔ جس پر پہلے منصوبے کی تکمیل کے بعد عملدرآمد شروع ہو جائیگا۔ بورڈ کا ارادہ ہے کہ دوسرے منصوبے کے تحت ایسی ۱۰۹ اور کتابیں شائع کی جائیں جن میں سے ۷۷ عربی اور باقی فارسی میں ہوں گی۔

یہ تو خالص ثقافتی کارنامے ہوئے۔ بورڈ نے بعض اور قدم بھی اٹھائے ہیں جو کچھ اہم نہیں۔ اور جو فراہمی وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اول، ایک عمدہ لائبریری خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو، زبان کی ہمہ گیر امداد، ہمہ گیر ترقی اور قارئین تک ہمہ گیر رسائل کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ بورڈ نے ایک ایسا کتب خانہ قائم کر لیا ہے جس میں مطبوعہ کتب بھی موجود ہیں اور مخطوطات بھی۔

ایسا ہی اہم و بنیادی اقدام ہے ایک مطبع کا قیام۔ بورڈ نے حیدرآباد (سندھ) میں ایک اچھا خاصہ آراستہ و پیراستہ مطبع قائم کر لیا ہے جس میں بورڈ کی اپنی کتابوں کے علاوہ علاقۂ سندھ کے ابتدائی مدارس کی سات سندھی ریڈریں بھی طبع ہوتی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ حیدرآباد ہی میں ایک بک اسٹال جہاں بورڈ کی تمام مطبوعات اور اس کی مطبوعہ ریڈریں دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک عظیم تر کوشش یہ منصوبہ ہے کہ سندھ یونیورسٹی ٹاؤن شپ ایریا میں جو کوٹڑی کے نزدیک واقع ہے، ۱۰ لاکھ روپے کے صرف سے بورڈ کے مرکزی عمارات تعمیر کی جائیں۔ یہ تمام لوازمات درحقیقت ضروری سہولتیں ہیں جن کے بعد تمام توجہ اور بھی شدت و کامیابی کے ساتھ اصل مقصد پر مرکوز کی جا سکتی ہے۔ جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زیر نظر ادارے نے چند ہی سال کے عرصہ میں جو گوناگوں اور قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ حیرت انگیز ہیں۔ ایسی کامیابی کے لئے سب سے اہم شرط پُر خلوص، دیانت دار، سرگرم اور قابل کارکن ہیں جو ذاتی اغراض سے بلند ہو کر متفقہ طور پر کام کے تمام امکانی پہلوؤں کا احاطہ کر سکیں اور ان تمام امور کا تصور کر سکیں جو متعلقہ زبان و ادب کی بیش از بیش توسیع و ترقی کے لئے ضروری ہوں۔ ایسے کہ وہ روایت کے ساتھ اجتہاد کا حق بھی ادا کر سکیں اور سکونیت کے بجائے حرکت پیدا کریں۔ ابھی اس دوسرے عنصر کی طرف توجہ کم معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ادب و فن کے جدید انداز میں جائزہ و تنقید کے ساتھ ساتھ انتقاد میں بھی نئی راہیں تلاش کی جائیں۔ اور یہ کچھ سندھی ہی نہیں ہماری تمام زبانوں کے لئے سب سے اہم و مقدم سوال بھی ہے۔ اور اسی پر ان کی قلب ماہیت کا دار و مدار ہے یعنی یہ کہ وہ ذہنی خط استوا کو پار کر کے جدید، حرکی دنیا میں داخل ہو جائیں یا روایت ہی کی دنیا میں گم ہیں۔

حسن اتفاق سے بورڈ کو ابتدا ہی سے شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم جیسے فاضل اجل کی رہنمائی حاصل رہی۔ اور اب پیر حسام الدین راشدی اس کی روح رواں ہیں۔ جن کی تمام زندگی علم و ادب ہی کی خدمت کے لئے وقف رہی ہے۔ بورڈ کے نظم و نسق کا بار محمد ابراہیم ایم جویو جیسے مستعد و سرگرم سیکرٹری کے شانوں پر ہے جن کے والہانہ شغف کو بورڈ کی کامیابی میں کچھ کم دخل نہیں۔ زیادہ دلخوشکن بات یہ ہے کہ بورڈ کی سرگرمیوں اور اپنے دیس کی ایک لطیف و شیریں زبان اور اس کے ادب کی توسیع و ترقی میں اردو کے بہت سے نامور اہل قلم بھی اتنے ہی ذوق و شوق سے حصہ لے رہے ہیں۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر، جناب ممتاز حسن وغیرہ۔

یہ تمام معلومات محض ارباب نظر کو پاکستان کے اس اہم ادارے کے ظاہری خد و خال سے روشناس کرانے کے لئے ہیں مگر اصل چیز تو بلاشبہ اس کی معنوی کارگزاری ہے اور یہ وہ حدیث تازہ ہے جس کا حق ایک علٰحدہ نگارش ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے ●

منزل کی طرف

(معاشرتی رفاہ و بہبود)

مصباح الحق

ایک طرف جبر دوسری طرف اختیار، ایک طرف استبداد دوسری طرف آزادی۔ ان میں جانے کب سے کشمکش برپا ہے۔ یہ چند صدیوں کی بات نہیں بلکہ ہزارہا سال کی بات ہے۔ جب سے نوعِ انسان وجود میں آئی ہے۔ اور اس دوران میں انسانی جدوجہد کا منتہائے مقصود ایک ہی رہا ہے۔ یہ کہ خدا کی بستی صحیح معنوں میں خدا کی بستی ہو۔ اور اس میں سب انسانوں کی بھلائی ہو۔ سب کو خوشی و خرمی اور خوشحالی میسر ہو۔ یہ بڑھتا ہوا آہنگ آخرکار ایک ایسی مملکت کے تصور پر منتج ہو جس کا مقصد کل معاشرہ کی رفاہ و بہبود ہو۔ اور آج جب کہ سلطانیٔ جمہور کا دور ہے ہر مملکت کا رفاہی ہونا لازم ہے۔ خواہ وہ ملوکانہ ہو یا جمہوری، آمرانہ ہو یا اجتماعی۔ اس طرح نوعِ انسان کا یہ ہزار سال پرانا خواب بالآخر شرمندۂ تعبیر ہو ہی گیا ہے۔

پاکستان کی بنیاد شروع ہی سے سلطانی جمہور پہ ہے۔ جس کا تصور علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ اس لئے اس کا مطمع نظر ابتدا ہی سے عوام کی رفاہ و بہبود رہا ہے۔ شومیٔ قسمت سے ناعاقبت اندیش قوم دشمن سیاست داں ایک عرصہ من مانی کرتے رہے۔ انہوں نے عوام کے حقوق کو پائمال کرنے کی کوشش کی اور انہیں برابر فریب پہ فریب دیتے رہے۔ لیکن تابکے! قوم کی قسمت کا ستارہ آخرکار روشن ہو کر ہی رہا۔ اور عوام نے اپنا محبوب مقصد پا ہی لیا۔

عوام کی حکومت، عوام کے لئے، عوام کے ذریعہ۔ لہٰذا جب سے انقلابی حکومت قائم ہوئی ہے، اس نے زندگی کے ہر شعبے میں پے درپے وسیع، دوررس اصلاحات صادر کرکے قومی رفاہ و بہبود کی رفتار بدرجہا تیز کر دی ہے۔ چنانچہ اب ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں کہ جس مملکت سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہ تمام تر ایک رفاہی مملکت ہے جس نے قومی رفاہ و بہبود کو خاص طور پر اپنا مطمع نظر ٹھہرایا ہے۔ اس پر بالخصوص زور دے رہی ہے، اس کو فروغ دینے کیلئے شدت سے کوشاں ہے اور ہر طریقے سے اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

سچ پوچھئے تو پاکستان میں معاشرتی رفاہ و بہبود کی سرگرمیاں کی غیر معمولی ترقی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے جس کا باعث اولاً ایک دوراندیش، مستعد، کارگزار حکومت ہے اور اس کے بعد وہ سرگرم کارکن جن کا دلی شوق و ذوق اور پُرخلوص تعاون حکومت کی رفاہی سرگرمیوں کو عملی جامہ پہننے میں مدد دیتا ہے۔ یہ دونوں عناصر اندرونی ہیں ــــ ملکی حکومت اور قومی خیرخواہ۔ جن کو رفاہ و بہبود کو ترقی دینے کی جدوجہد کرنی ہی چاہیئے۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کی تدابیر کو بروئے کار لانے کے لئے بعض مفید اور سازگار عناصر اور بھی پیدا ہو گئے۔ یہ تھے اقوامِ متحدہ اور دیگر بین الاقوامی ادارے جو ان دونوں کو برابر فنی امداد بہم پہنچاتے رہے ہیں۔ انقلابی حکومت کا والہانہ جوش و ولولہ ان سرگرمیوں کے لئے ایک زبردست مہمیز ثابت ہوا ہے۔

قدرتی طور پر رفاہی کارروائیوں کی نوعیت بتدریج ترقی کرتی رہی ہے۔ پہلے پانچ چھ سال تو اس سلسلہ میں کوئی ایسی منظم کوشش عمل میں نہیں آئی جن میں حکومت کو بھی دخل ہو۔ ان کوششوں کی نوعیت رضاکارانہ تھی جس میں مذہبی جذبہ اور ہمدردی کارفرما تھی۔ جیسے رفاہ و بہبود کی بنیاد محض خیرات اور خدمتِ خلق کے جذبہ پر ہو۔ بے شک حکومت کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امداد دیتی تھی لیکن سچ پوچھئے تو اس کو حکومت کا فرضِ منصبی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ باقی رہے کارکن تو وہ نیک دل قسم کے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ جو نیک کام کرنا ثواب جانیں یا ایسے مالدار لوگ جو غریبوں کو، محتاجوں کی خدمت کو مشغلہ خیال کریں۔ یہ کہ ایسے کاموں کے لئے بڑے تجربہ کار، تربیت یافتہ، پیشہ ور لوگوں کی ضرورت ہے اور وہی ان کو بطریقِ احسن انجام دے سکتے

ہیں، اس کا کوئی احساس نہیں پیدا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۲ء تک سارے ملک میں کل ۲ سماجی کارکن موجود تھے۔

آج صورتِ حالات اس سے بالکل مختلف ہے، اور ۲ کی بجائے ۵۰۰ تربیت یافتہ کارکن کام کر رہے ہیں۔ انقلابی حکومت نے جو معاشری فلاح و بہبود کو ملی زندگی کا نہایت محکم ستون خیال کرتی ہے، دوسرے پنج سالہ منصوبے میں مزید تین سو پوری طرح تربیت یافتہ کارکنوں کا اہتمام کیا ہے۔ جن کے ساتھ کتنے ہی امدادی کارکن بھی شامل ہوں گے۔

انقلابی حکومت سے پہلے رفاہِ عامہ اور صحت کا بندوبست بھی سرسری تھا۔ اب ان امور کے لئے ایک مستقل وزارت قائم کی گئی ہے جس کا نام "وزارت صحت و معاشری بہبود" ہے اور مرکز و صوبجات دونوں میں معاشری بہبود کے محکمے قائم ہیں۔ یہاں تک کہ نیشنل پلاننگ کمیشن میں بھی معاشری بہبود کا ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ہمارے ملکی معاملات میں معاشری بہبود کو پوری پوری اہمیت دی گئی ہے۔ اور دوسرے پنج سالہ منصوبے میں اس کو اس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سرمایہ کی قلت اور دیگر اشد ضروریات کے باوجود معاشری رفاہ و بہبود پر ڈیڑھ کروڑ روپے سے زائد رقم صرف کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اقدام کس قدر حوصلہ مندانہ ہے۔

پاکستان جن معاشری مسائل سے دوچار ہے ان میں روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ صرف پاکستان ہی تک محدود نہیں اور دنیا کے بڑے ترقی یافتہ ممالک بھی اس سے دوچار ہیں۔ لیکن پاکستان جیسے نئے ملک میں جس کے وسائل یوں بھی محدود ہیں اور ان کو ترقی پذیر ہونے کے مواقع بھی فی الحال کم ہی میسر ہیں، اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ آبادی میں اضافہ کی رفتار شہری حصوں میں خصوصیت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ کراچی، حیدرآباد، لائلپور، ڈھاکہ اور چاٹگام کی آبادی میں دس سال (۱۹۴۱-۵۱ء) کے عرصہ میں ۲۰۰ - ۳۰۰ فیصد کی حد تک اضافہ ہوا ہے اور اگر یہی حالت رہی تو کچھ عجب نہیں کہ اگلے دس سال میں یہ آبادی بڑھ کر دوگنی ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس بے پناہ اضافہ سے بڑے ہی خطرناک نتائج کا احتمال ہے۔

بے شک ملک کی اقتصادی و صنعتی ترقی کو فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس طرح اندھا دھند نہیں کہ معاشری بہبود کے تقاضے نظر انداز کر دیئے جائیں۔ اگر ہم اس سلسلہ میں محض اقتصادی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھیں تو اس سے لازماً معاشری نقصانات کا اندیشہ ہے۔ کچھ تھوڑے عرصہ کے لئے اور کچھ زیادہ عرصہ کے لئے۔ مثلاً یہی دیکھ لیجئے کہ لوگ کارخانوں میں نوکر ہونے کے لئے گاؤں سے شہروں میں دھڑا دھڑ چلے آ رہے ہیں۔ اس سے صنعتی ترقی کی فوری ضرورت تو پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن شہروں میں جا بجا غریب و نادار لوگوں کی غلیظ آبادیوں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ جس سے بیماریاں پھیلتی ہیں، صحتیں گر جاتی ہیں، طبیعتوں میں سستی و کاہلی پیدا ہوتی ہے۔ نہ تہذیب باقی رہتی ہے نہ شائستگی۔ لوگوں کے اخلاق گر جاتے ہیں اور آخرکار یہ خرابیاں اقتصادی حیثیت سے بھی بڑی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں اور انسانوں کی حالت بڑی ہی عبرتناک ہو جاتی ہے۔ اس طرح اقتصادی ترقی ایک گھناؤنا روگ بن جاتی ہے۔ آبادی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ خاندان پریشان، خستہ حال۔ ایک ہی جگہ رہنے سہنے اور سکھ چین سے زندگی بسر کرنے کی اچھی بھلی روایت برباد۔ اس طرح وہ نازک رشتے، وہ سوسائٹی کا نظم و ضبط جس پر چین آرام کی عمارت قائم ہے، ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ خوفناک بیماریاں جو روز بروز بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی اور شہریت اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ہم مشرق کے لوگ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ان خرابیوں کے باعث اہلِ مغرب کا کیا حشر ہوا ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں ابھی سے معاشرے کی مناسب تنظیم اور رفاہی امور پر توجہ دی جا رہی ہے۔

کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ زندہ و توانا نہ ہو۔ اور اس کی زندگی و توانائی ایک صحت مند معاشرہ ہی پر موقوف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ناموافق حالات کی وجہ سے کس قدر بگڑ چکا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس کی پوری پوری اصلاح کرنے کے لئے اس کی از سرِ نو تنظیم کی جائے۔ معاشرہ میں نئے سرے سے جان ڈالی جائے۔ اس لئے انقلابی حکومت نے شروع ہی سے اس کو اپنا مقصدِ اولین قرار دیا ہے۔ اور اس بات پہ زور دیا ہے کہ بڑی ہی کارگزار، رضاکارانہ جماعتیں پیدا کی جائیں۔

شہریوں کی خاطر خواہ تنظیم ہو یہی باتیں چاق چوبند حکومت کی معاشرتی
پالیسی اور منصوبہ بندی کا سنگ بنیاد قرار پائی ہیں۔

حکومت اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہے کہ شہری آبادیوں
کے اندھا دھند بڑھنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوں گی اس لئے وہ احتیاطی
تدابیر بروئے کار لا رہی ہے۔ اس طرح نہ صرف فوری طور پر فائدہ ہوتا
ہے بلکہ آگے چل کر بھی مضرت رساں نتائج سے بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے
کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ ایسے منصوبوں پر دینی چاہئے جو
کم خرچ بھی ہوں اور بالانشین بھی یعنی ان سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو
فائدہ پہنچے۔ اور دوسری ضرورتیں بھی رکی نہ رہیں۔ اور ہمارے محدود
وسائل پر زیادہ بوجھ بھی نہ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ہر شہری کو سماج کا
ایک کارآمد رکن بنانے کے لئے جماعتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی
جارہی ہے۔ بیماروں اور معذوروں کی بحالی پر خاص توجہ
دی جارہی ہے۔ کیونکہ یہ معاشرہ پر بوجھ ثابت ہوتے ہیں اور اس کی
ترقی کو روک لیتے ہیں جبھی ہمارے دوسرے پنج سالہ منصوبے میں
معاشرتی امداد کی سرگرمیاں کچھ محدود پیمانے پر شروع کی جارہی ہیں۔

آجکل کا زمانہ تربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ ہے۔ جس میں
تجربہ کار، ماہر لوگ بدرجہا بہتر کام کر سکتے ہیں۔ پہلے پانچ چھ سال تو
پاکستان میں تربیت کی کوئی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اس لئے جدید نہج پر
معاشرتی بہبود کے کام کا آغاز نہ ہوسکا۔ البتہ ۵۱-۱۹۵۲ء میں کراچی
اور ڈھاکہ میں چھوٹے عرصہ کے چار تربیتی کورسوں کا بندوبست کیا گیا۔
جن میں کوئی ۱۰۰ مرد عورتوں نے تربیت حاصل کی۔ اگلے چار سالوں
(۱۹۵۵-۵۸ء) میں ایسے ہی دو اور کورسوں کا بندوبست ہوا جن میں
۳۲ سماجی کارکنوں نے تربیت پائی۔ یہ تربیت کافی کامیاب اور سودمند
ثابت ہوئی۔ مگر یہ تو وقتی بات تھی کوئی مستقل بندوبست نہ تھا۔ لہذا اس
سلسلہ میں مزید کوشش یہ تھی کہ معاشرتی بہبود کی تربیت دینے کے لئے
باقاعدہ درسگاہیں قائم کی جائیں۔

اس قسم کی پہلی درسگاہ "شعبۂ معاشرتی بہبود، دارالعلوم
پنجاب" ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی جس کا کورس دو سال کا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں
یہ سلسلہ بی اے سے ایم اے تک پہنچ گیا۔ اس طرح سند یافتہ معاشرتی
کارکن بروئے کار آنے لگے ہیں۔

ادھر ڈھاکہ میں اس غرض سے معاشرتی بہبود اور ریسرچ کا
مرکز ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا۔ جس میں دو سال کی تربیت سے سلسلۂ تعلیم
ایم اے تک پہنچتا ہے۔

یہ تو خالص تعلیمی بات ہوئی حقیقی تربیت تو شہری خود دیتے ہیں
چنانچہ مشرقی پاکستان میں امدادی کارکنوں کی محلہ وار تربیت کی
داغ بیل پڑ چکی ہے۔ جس میں معاشرتی بہبود کے علاوہ گھریلو دستکاریوں
تعلیم بالغاں، صحت و صفائی، امداد باہمی وغیرہ جیسے گوناگوں مقاصد
شامل ہیں۔ ایسا ایک تربیتی کورس تو پورا ہو چکا ہے اور دوسرا جاری ہے۔
اس کے ساتھ ہی امدادی کارکنوں کی تربیت کے لئے ڈھاکہ میں ایک
مستقل ادارہ بھی قائم کیا جارہا ہے۔ یہ کارکن سند یافتہ کارکنوں
کے ساتھ مل کر شہری اجتماعی ترقی کے کام میں حصہ لیتے ہیں۔

ان دو تربیت گاہوں کی طرح ایک اور تیسری تربیت گاہ
بھی ۱۹۶۱ء میں قائم کی جارہی ہے جو یونیورسٹی کراچی سے وابستہ
ہوگی۔ ان کے علاوہ ڈگری سے کم درجہ پر کتنے ہی تربیتی کورس موجود ہیں۔

ہمارے ملک کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ آج غالباً دنیا کا
واحد ملک ہے جس میں شہری اجتماعی ترقیاتی منصوبوں کا قومی پروگرام
موجود ہے۔ چنانچہ اس وقت پاکستان بھر میں ایسے ۵۴ منصوبوں
پر عملدرآمد ہو رہا ہے جن کا تعلق ۱۰ لاکھ شہری باشندوں سے ہے۔

جو سماجی کارکن ان منصوبوں کے سلسلے میں کام کر رہے
ہیں وہ کسی خاص مقصد کے تحت، منظم طور پر، کام کرنے والی
جماعتوں کو ان کی سماجی ضرورتیں سمجھنے اور ان کو پورا کر کے وسائل
تلاش کرنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ ان جماعتوں نے رضاکارانہ
طور پر اپنا وقت اور وسائل پیش کئے ہیں تاکہ اپنے اپنے علاقوں
میں رہن سہن کا معیار بلند کیا جائے۔ ان کی آمدنی کتنی ہی کم سہی پھر بھی
انہوں نے بڑی بڑی مہمیں جاری کی ہیں، اسکول بنائے ہیں اور اجتماعی
مرکز قائم کئے ہیں۔ غرضیکہ ان کی سرگرمیاں بے شمار کاموں پر مشتمل
ہیں۔ شہروں میں اجتماعی ترقی کے منصوبوں نے تو خصوصاً حب الوطنی کا
ایک نیا عملی احساس پیدا کر دیا ہے۔

طبی خدمات نے بھی اس دوران میں نمایاں ترقی کی ہے۔
اب اگر ایک طرف ڈاکٹر اور ان کا عملہ ہسپتالوں میں مسائل صحت
سے نبٹ رہا ہے تو دوسری طرف سماجی کارکن روزگار، رہائش،
مکانات وغیرہ جیسے اہم مسائل کو نبٹانے کی کوشش کر رہے ہیں

یہ بھی بندوبست کیا جا رہا ہے کہ کراچی اور لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی سماجی کارکن مقرر کئے جائیں۔

حکومت نے رضا کار اداروں کو مالی امداد دینے کے لئے ایک "نیشنل کونسل آف سوشل ویلفیئر" اور دو صوبائی کونسلیں قائم کی ہیں۔ جنہوں نے متعدد مقاصد مثلاً بچوں کی حفاظت اور دیکھ بھال، نوجوانوں، عورتوں اور معذوروں کی بہبودی، سماجی کام میں تربیت وغیرہ کے لئے ۲۲ لاکھ روپے کی رقم تقسیم کی ہے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگوں نے خود ہی اس سے چار گنی رقم اپنی ذاتی کوششوں سے جمع کر لی ہے۔

معاشری تحقیق کی مرکزی ڈائریکٹریٹ میں ایک تحقیقی یونٹ قائم کیا گیا ہے۔ جو مختلف معاشری مسائل کی چھان بین کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان بھر کی اولیں فقیر شماری خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیم، صحت، رہائش اور لیبر کے مسئلوں پر بھی خصوصی توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔ اسی طرح معاشری قوانین وضع کرنے پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ کچھ ہی عرصہ ہوا کہ خاندان اور ازدواج سے متعلق ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس کی سفارشات زیرِ غور ہیں۔

حکومت کئی رضا کارانہ اداروں مثلاً یتیم خانوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ٹی بی کے مریضوں کے لئے ایک رفاہی ادارہ قائم کیا گیا ہے جو حکومت کی امداد سے بڑا ہی کارگزار ثابت ہوا ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اپوا (آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن) جو ملک بھر میں خواتین کی سب سے بڑی انجمن ہے۔ جس نے رضا کارانہ سماجی رفاہ و بہبود کو بہت مدد دی ہے۔ اس کے تحت کئی عام اور زچہ و بچہ کے ہسپتال، لڑکیوں کے اسکول اور کالج، ماؤں کی انجمنیں، صنعتی ہوم وغیرہ کام کر رہے ہیں۔

معاشری خدمات کا ایک نہایت خوشگوار اور قابلِ قدر پہلو بیرونی فنی امداد ہے۔ جس میں اقوام متحدہ کو خاص دخل رہا ہے۔ چنانچہ یونیسف نے حکومت پاکستان سے ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے یہ ادارہ پاکستان میں شہری اجتماعی ترقی کے لئے ۳۷۵۰۰ ڈالر کا سامان مہیا کرے گا۔ اسی طرح فورڈ فاؤنڈیشن اور آئی سی اے نے بھی خاص امداد بہم پہنچائی ہے یا اس کا وعدہ کیا ہے۔ اندرونی طور پر سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ معاشری امداد کا سلسلہ نہ صرف جاری رہے گا بلکہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل کے دوران اس کی توسیع بھی عمل میں آئے گی۔ اس منصوبے میں کتنے ہی نئے منصوبے بھی شامل کئے گئے ہیں جس سے آئندہ معاشری خدمات کی نوعیت اور رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ دیگر اداروں کے علاوہ میونسپلٹیوں پر سابقہ معاشری خدمات کے علاوہ نئی نئی خدمات انجام دینے کی ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے۔

اس طرح ان گوناگوں کوششوں سے مجموعی صورتِ حال بدرجہا بہتر ہو گئی ہے۔ ہم زور شور سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔ اور ہمارا ہر قدم تیزی سے منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے جو ہمیں یقیناً بہت جلد عروج و ترقی سے پوری طرح ہمکنار کر دے گا۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔ (ادارہ)

س، خ

نقد و نظر

"یورپ نامہ"

مصنف : حکیم محمد سعید دہلوی
ناشر : ہمدرد اکیڈمی بنیوٹاؤن کراچی
ضخامت : ۴۹۶ صفحات
قیمت : آٹھ روپے

یہ باتصویر سفری دستاویز حکیم محمد سعید، متولی 'ہمدرد' وقف، کراچی نے مرتب کیا ہے۔ اور تحریر و پیشکش کی کئی اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ گو یہ ہے تو سفرنامہ مگر مقامات، کوائف، لطائف، واقعات اور عجائبات و غرائب سفر کا ایک رنگارنگ مرقع بھی ہے۔ حالات سفر کے بیان میں قاری کو اپنا ہمسفر بنا لینے کا وصف کم ہی سفرناموں میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس نامۂ یورپ سے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے قاری خود بھی حکیم صاحب اور ان کے برادر حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ سفر کر رہا ہے اور ان ہی کی آنکھ سے دیکھتا، ان ہی کی فکر کے ساتھ سوچتا اور طعام و فواکہ کے لذائذ بوقلموں سے خود بھی لذت یاب ہوتا جاتا ہے! ممالک سفر کے سیاسی حالات اور تاریخی پس منظر، نیز ان کے تاریخی و ثقافتی جزئیات بھی جابجا نظر آتے ہیں، گویا یورپ نامے کے مذہّب صفحات پر ورقِ نقرہ کی چمک بھی آمیز ہے۔ یہ سفر چونکہ طب مشرق کی چھان بین اور یورپ میں "کتابیں اپنے آبا" کی تلاش کے لئے بھی کیا گیا تھا، اس لئے سفر کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ پھر تحریر ایک طرح سے کنز المجربات بھی بن گئی ہے اور پڑھنے والے کی بصیرت کے لئے گویا کحل الجواہر کا کام کیا ہے۔

کتاب میں بہت اچھی تاریخی و ثقافتی تصاویر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مگر رنگین تصاویر کی طباعت میں شاید کسی آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ "یورپ نامہ" ایک خوش ذوق راہی کی حکایتِ سفر ہے، دل آویز بھی اور لذیذ بھی، جسے پڑھنے کے بعد آدمی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے مطالعہ میں جو بھی وقت صرف کیا وہ اس کا مستحق تھا۔

(ظ۔ ق)

ہمارا پاکستان ۱۳ سال

مرتب و ناشر : زیڈ اے تمنائی
شائع کردہ : مطبوعات مشرق۔ ہرمزجی اسٹریٹ، کراچی
صفحات : (۴۰)
قیمت : ۵۰ پیسہ (۸/)

یہ کتابچہ "مطبوعات مشرق" کا "پس منظر پمفلٹ" نمبر ۳ ہے۔ یہ پمفلٹ بین الاقوامی اور قومی اہمیت رکھنے والے حالات حاضرہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہماری زندگی پر اِن کے اثرات کا اندازہ ہو سکے۔

ایسے پمفلٹ عوام کو ملکی و عالمی حالات سے باخبر رکھنے کے لئے نمایاں اہمیت رکھتے ہیں اور حکومت ہی نہیں نجی اداروں کو بھی اس قسم کے معلوماتی رسالے بہم پہنچانے میں حصہ لینا چاہئے۔ اور وہ جس قدر کثرت سے شائع ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ زیرِ نظر "پس منظر پمفلٹ" میں بہت ہی سیدھی سادی اور دلکش زبان میں پاکستان کے تیرہ سالہ حالات پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً موجودہ دورِ انقلاب پر جس سے ایک غیر معمولی "روشن مستقبل" کی نشان دہی ہوتی ہے۔ سرورق سے لے کر آخر تک پیشکش اور متن میں سادہ پُرکاری کی ایک ہی کیفیت نظر آتی ہے۔

ایران : ایک تعارف

صفحات : ۱۰۴
قیمت : ۲/۸

اسی نفاستِ ذوق کے ساتھ جو مطبوعات مشرق کراچی کا طرۂ امتیاز ہے، جناب تمنائی نے ایک خوش گوار سرزمین کے اس خوش آیند تعارف کو بھی مرتب اور پیش کیا ہے۔ وہی صاف سلیس زبان اور وہی ہر دلعزیز پیرایہ جس سے پڑھنے والا بہ آسانی اور جلدی جلدی پڑھ بھی لے اور سمجھ بھی لے، اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے جو مختصر ہوتے ہوئے سیر حاصل بھی ہے۔ اور ایران کے متعلق تاریخ و جغرافیہ سے لے کر جملہ کوائف حاضرہ (نظام حکومت، لوگ، تہذیب و ثقافت، ترقیات، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ)

تک مکمل معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ جیسے یہ بھی مختصر پیمانے پر "جام جہاں نما" ہو۔ فاضل مؤلف نے بجا طور پر ایران و پاکستان کی دوستی و یکجہتی پر زور دیا ہے۔ اور ان کے گوناگوں باہمی روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ ملک الشعرا بہار مرحوم نے برملا فرمایا کہ

دور حاضر خاصۂ اقبال گشت

واحدے کز صد ہزاراں برگذشت

یہ تعارف ہر لحاظ سے ایک نہایت عمدہ تعارف ہے۔ البتہ شروع میں بعض تفصیلات کی صحت محل نظر ہے۔ "پارسیوں" سے ذہن لازماً موجودہ پارسیوں کی طرف جاتا ہے۔ اول الذکر کو ہمیشہ "پارتھیوی" کہا جاتا ہے۔ جو ایران قدیم کی ایک نامور شہسوار اور قدر انداز قوم تھی۔ اور جس نے دو بار رومنوں کے جرار لشکروں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ وہ اس قدر ماہر تیر انداز تھے کہ انگریزی میں "پارتھین شاٹ" (تیر حکمی) ضرب المثل بن چکا ہے۔ "تاریخ ان کو" ملوک الطوائف" کے نام سے یاد کرتی ہے جس سے خود "طوائف الملوکی" کی اصطلاح یادگار رہی ہے۔ ان جری سورماؤں ہی نے "پہلوان" کا سا دنتی لفظ بھی ہمیں دیا ہے۔ پہلوی بھی انہی کی دین ہے جس پر ایران کی شاہانہ سطوت آج بھی نازکناں ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر کے قدیم جنگ آزما قبیلہ "پاہلوں" کا دامن بھی ان ہی پارتھیوں سے وابستہ تھا۔ پارتھیوی کتنا ہی عرصہ بعد میدان میں آئے جب کہ رومنوں کا بول بالا تھا۔ فارس یا پارس کا جنوبی صوبہ ایران کے اولین نامور شاہی خاندان ہخامنشی کے ساتھ ابھرا تھا جس کی ٹکر اہل یونان سے ہوئی تھی۔ جو پارس کو پرسس کہتے تھے۔ اور انہی نے سارے ملک کو "پرشیا" کا نام دیا تھا۔ سائرس اعظم اور دارا ہخامنشی خاندان کے رکن رکین تھے۔ پارتھیوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ سب پارسی اور ہخامنشی میں التباس کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب کی مجموعی افادیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور یہ بات صرف برسبیل تذکرہ، جملۂ معترضہ کے طور پر کہدی گئی ہے۔

ایران کے متعلق یکجا طور پر اتنی معلومات شاید ہی کسی اور کتاب میں دستیاب ہوں۔

(ر۔خ)

چینی نظمیں

مترجمہ:- ابن انشا

ناشر

لاہور اکیڈمی لاہور

صفحات۔ (۱۷۲) قیمت:- تین روپے

چین سے ہمیں بھی اتنی ہی نسبت ہے جتنی ابن انشا کو۔ یعنی ہمارا ادب خصوصاً شاعری لعبتانِ چین سے بھرا پڑا ہے۔ گو ان سے بھی ہم سب کو بڑی دور ہی کی نسبت رہی ہے۔ اور تو اور وارث شاہ نے بھی "ہیر رانجھا" میں "پتلی چین کی" کا ذکر کیا ہے۔ یا پھر تھوڑی سی نسبت اس طرح پیدا ہو جاتی ہے کہ برصغیر "چین و جاپان کا حرم" ہے۔ گوتم بدھ شاک منی نے یہیں جنم لیا اور۔ فاہیان اور ہیوان سانگ جیسے سیاحوں نے یہاں قدم رنجہ کیا۔ اور گندھارا آرٹ کا گہوارہ بھی خطۂ پاک ہے۔ یا پھر آج کل برصغیر کی شمالی پہاڑی سرحدوں پر چینی منڈلا رہے ہیں۔ اور اس سے پرے کمیونزم کا دور دورہ ہے اور سرخ پھریرا لہرا رہا ہے مگر ہمارا سروکار تو لال چین سے نہیں پہلے چین سے ہے۔ کیونکہ مترجم بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے ساری پہلی نظمیں ہی چنی ہیں۔ لال نظموں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس لئے کہ یہ لعبتانِ چینی وہ ہیں کہ ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے! لہٰذا اس نے "آہنی پردہ" کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اور دریچۂ چین جھروکے ہی سے تاک جھانک کی ہے۔ جو "پہلے چین کے وسیع کھیتوں، آنگنوں، گلیوں، بازاروں، ندیوں اور پربتوں کے بے ضرر منظروں" ہی پر کھلتا ہے۔

شاید اس نظربازی میں پہل ابن انشا ہی نے کی تھی۔ برسوں پہلے جب سبز پرچم کے لہرانے کا گمان بھی نہ تھا۔ ان کی اس کوشش کو "نیا ادب لاہور" نے بہت پسند کیا اور ذوق کی ایک اچھی خاصی چینی رو جاری ہو گئی۔ سید فیاض محمود اس "نقش امرنگ" کے بہت ہی دلدادہ تھے اور انہوں نے اس موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون بھی لکھ ڈالا جو حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھے جانے کے بعد "ہمایوں" میں بھی شائع ہوا "چینی نظموں

کی بہت بڑی خوبی جس کی بنا پر لوگ انہیں سراہتے تھے۔ ان کی غیر معمولی سادگی و صفائی تھی۔ اور ایسا اختصار کہ چند ہی لفظوں میں بہت کچھ کہہ جائیں۔ چند سیدھے سادے نقوش میں ایک مکمل اور بھرپور تصویر کھینچ کر رکھ دیں۔ بعض مغربی شعرا مثلاً ایذرا پاؤنڈ کو بھی اسی چینی کوتہ قبائی نے لبھایا اور ایک مدت انگریزی شاعری میں اس کا اچھا خاصا چرچا رہا بلکہ اس کا تتبع کیا گیا۔ اور بعض لوگ بے قافیہ شاعری کے مآخذ کی تلاش میں چین تک بھی پہنچے ہیں۔ وہی اطلبوا العلم ما فی السین کی آن جانے، آن بوجھے پیروی۔

اردو میں چینی شاعری کی جو وقتی لہر آئی تھی اس میں میراجی، حامد علی خاں اور مہدی علی خاں جیسے بزرگ بھی بہہ نکلے تھے۔ گو ان کی کاوشیں یا سراسر نظم تھیں یا سراسر نثر بے رس۔ سپاٹ، میکانکی۔ ابن انشا "چاند نگر" کا باسی ہونے کی وجہ سے طبعاً اس قسم کی ہلکی پھلکی شاعری سے بہت ہی قریب ہیں۔ اور ان کا دھیما ذوق انہیں چینی پتلیوں کو اسی طرح اردو کے سانچے میں ڈھالنے میں مدد دیتا ہے جیسی کہ وہ حقیقتہً ہیں۔ اس قدر ہلکی پھلکی کہ ہاتھ میں ان کا وزن ہی محسوس نہ ہو۔ جیسے چاند کی کرنیں ہی نرم و نازک پتلیاں بن گئی ہوں۔

ابن انشا کے مزاج، ان کے ذوق اور زبان میں کچھ ایسی بات ہے جو انہیں ہلکی پھلکی، سجل سڈول چیزوں کو اپنانے میں مدد دیتی ہے۔ کہیں کہیں اصل کی لے، اس کا روپ انوپ، اور رس بھاؤ اسے نئے نئے رمنوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جس سے ایک انوکھی تراش خراش کا احساس ہو۔ جیسے وہ کوئی نیا اچھوتا تجربہ ہے۔ نظم 'جوانی' اس کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ جس کی طرح کو دوسروں نے اڑانے کی کوشش بھی کی ہے۔

دریا کے کنارے
گھاس اُگی ہے ـــ ہری ہری
اور باغ کے اندر
بید کے پیڑ ہیں ـــ گھنے گھنے

ابن انشا اس بنیادی زبان کا رسیا ہے جس میں کوئی ثقل نہیں۔ اسی لئے اس کی طرز تحریر کو انداز کہتے بھی بن نہیں پڑتی۔ اس کی لکنت بہت ہی نکھری ہے، بہت ہی کومل:

لہسن کے پتوں کی شبنم
پل پل سوکھی جائے
بیر پک بھی چکے
اب اناروں کے پھلنے کے دن آگئے
ہر طرف ہر کہیں
بالیاں نرم پودوں کی لہرا گئیں،

یہی کیفیت شروع سے آخر تک۔ جیسے مترجم بھی افیون کی پینک میں پیلے چینیوں کے ساتھ بہکا چلا جا رہا ہو۔ وہی مدھر لَے، وہی بچپنے کی دھیمی دھیمی چال۔ جس سے یوں لگتا ہے کہ انشا چاند نگری نے لاہور میں ایک چینی کاریگر کی دکان پر جو سپنا دیکھا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اور اس نے سچ مچ عمدہ، نفیس جوتے کا ترجمہ کر ہی ڈالا۔ اور بڑے سلیقے، بڑے سبھاؤ سے۔ ایسے کہ اس پہ ان کی اپنی چھاپ بھی ہے اور یہ کاریگری اس کی اپنی کاریگری معلوم ہوتی ہے۔

ایک بات اور ـــ کئی نظموں سے ایلیٹ کی رندھی رندھی لے سُنائی پڑتی ہے۔ کہیں پاؤنڈ کی طرح اس نے بھی تو اس غمگین چینی راگنی سے اثر نہیں لیا؟

تاریخ معصومی

ناشر: سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی
ترجمہ: اختر رضوی
صفحات: (۵۷۰)
قیمت: ۱۰-۸-۰

برصغیر ہند و پاک نے ایک عرصۂ دراز تک فارسی زبان و ادب کو نشوونما دینے میں حصہ لیا۔ اور نظم و نثر کی وہ مایۂ ناز فصل پیدا کی جو "بہارِ ہند" کے نام سے موسوم ہے۔ ایسے گوناگوں اوصاف کی حامل کہ اسے بجا طور پر بہارِ عجم کی حریف کہا جا سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب جو "چچ نامہ" کے بعد سندھ کے متعلق پہلی تاریخ ہے۔ اسی دریائے بے کراں کا ایک قطرہ ہے، وہ جز جس سے کُل کی کیفیت نمایاں ہے۔ اس کے مصنف میر معصوم بھکری، عہد اکبری کے جلیل القدر امراء میں تھے۔ اور انہوں نے محمد بن قاسم کے عہد سے اکبر کے عہد تک کے حالات بالتفصیل رقم کئے ہیں۔ اس سے کتاب کی اہمیت ظاہر ہے، یہ ان کتابوں کے سلسلہ کی تیسری کڑی ہے جن کو سندھی ادبی بورڈ نے ترجمہ کروا کے تصحیح و حواشی کے ساتھ شائع کرنے اور ہمارے علم و ادب کے مخفی خزانوں کو بروئے کار لانے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

ہماری ڈاک

ہم ذیل کا دلچسپ خط اور تحریر
اس کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر
بجنسہ پیش کر رہے ہیں۔ ذمہ داری
بہر حال گردن راوی پر ہے۔ (مدیر)

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب۔ میں نے آپ کا رسالہ ماہ نو دسمبر ۱۹۵۹ء کا دیکھا چونکہ یہ رسالہ میرے پاس نہیں آتا اس لئے میں بروقت نہیں دیکھ سکا میرے ایک دوست نے حال ہی میں مجھے دکھایا جس میں میں نے ایک مضمون فضلی صاحب کا پڑھا جسکو پڑھ کر میری حیرت و استعجاب کی کچھ حد نہ رہی۔ .... کیا سارق یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسری دنیا ہے۔ اس دنیا کی اوس دنیا میں کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی یہ غلط ہے کوئی بات یہاں کی وہاں سے اور وہاں کی یہاں سے کتابت میں آنے کے بعد پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ معاف فرمائیے یہ میرا آپ سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ اعتراض میرا عام ہے۔ آپکو کیا خبر کہ یہ کلام کسکا ہے (ہماری اس بلاغت کا شکریہ (مدیر) اشک کون تھے اور افضل الشعرا حضرت محمود کون تھے اس مضمون کے بعد آئندہ کیلئے آپ پیچ اپنے بغرض احتیاط میں نے ایک جلد دیوان حضرت محمود المدعو جذبات محمود حکیم محمد اسمٰعیل خاں جوہر مقیم لالوکھیت ۴۴/۵ کراچی ۱۹ آپکو بھیجی ہے وہ آپکو پہنچا دینگے۔
(ہم اس جنس گرانمایہ سے ابھی تک محروم ہیں۔ مدیر)
آپکو اس سلسلے میں کافی مدد ملیگی چونکہ فضلی صاحب کا مضمون سب سے پہلے آپکے پرچے ماہ نو میں طبع ہوا ہے ...... اس لئے اسکی ضرورت ہے کہ یہ تحقیقاتی مضمون بھی آپ کے پرچے میں طبع ہو جائے اور ادبی دنیا میں اس سلسلے میں جو شبہات ہوں وہ دور ہو جائیں۔ میں اپنے ادبی فرض کو ادا کر رہا ہوں آپ کا بھی ادبی فرض ہے کہ آپ اس سلسلے میں امداد فرمائیں ..... رامپور۔

۲ نومبر ۱۹۶۰ء۔ محمد ابراہیم علیخاں قہر رامپوری

”چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد“

جذبات محمود پر ایک محققانہ نظر

آئے دن مجھ سے لوگ یہہ پوچھتے رہے کہ یہہ اشعار یا غزلیات مُفصلۂ ذیل افضل الشعرا حضرت محمود کے ہیں یا اشک کے۔ چونکہ بعض ناسمجھ اور ناعاقبت اندیشوں نے اشک کی ہوا خواہی میں ناظرین کو اس شبہہ میں مبتلا کرنیکی کوشش کی کہ یہہ غزلیں جنکے یہہ اشعار ہیں ۔

ـــ میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ ــ آپ للہ چلے جائیے میخانے سے۔
ـــ جسے دیدار اوسکی نصیب ہے وہ نصیب قابلِ دید ہے ــ جو شب برات ہے رات اوسے تو دن اوسکے واسطے عید ہے۔
ـــ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ہم وحشت میں ــ ہائے دامن نہوا ہائے گریبان نہوا ــ اشک کی ہیں

چنانچہ ماہِ نو مورخہ دسمبر ۱۹۵۹ء میں میں نے ایک مضمون فضلی صاحب کا بھی اس کے متعلق پڑھا جس میں اونہوں نے ان اشعار کے متعلق ظاہر کیا کہ یہہ اشعار اشک نے اونہیں بھی خود راولپنڈی میں سنائے جس پر مجھے اسکی تحقیقات ناظرین کے سامنے پیش کرنی پڑی اور کہنا پڑا کہ یہہ اشعار اور یہہ غزلیں اشک کی نہیں ہیں بلکہ اونکے استاد افضل الشعرا حضرت محمود کے ہیں جو موصوف کے مطبوعہ دیوان جذبات محمود میں موجود ہیں جسکا ثبوت پیش نظر مضمون میں ناظرین کو ملیگا۔ ماہ نو میں میں نے پڑھا ہی تھا کہ نیا دور مورخہ نومبر ۱۹۵۹ء نظر پڑا جس میں راز صاحب رامپوری اشک صاحب کے دوست کا ایک مضمون میں نے پڑھا .... کہاں حضرت محمود اور کہاں راز صاحب اور کہاں اونکا توہین آمیز تخیل۔ گو راز صاحب کا یہہ گناہ ایسا ہے کہ خدا بھی معاف نہ کریگا۔ راز صاحب نے اس معاملے میں اپنی ذاتیات کو دخل دیکر خود اپنی شہادت کو غیر آزاد اور غیر واقعیح کر لیا۔ میں بھی اس کا جواب ترکی بترکی دے سکتا تھا لیکن مجھے یہاں دوسرے خیالات میں الجھکر صحیح راستہ چھوڑنا نہیں ہے بلکہ اس معاملے کو صاف کرنا اور حقیقت کو واضح کرنا ہے یہہ میرا مقام نہیں کہ ادب کے نام پر بے ادبی کی رو میں بہہ جاؤں، یہاں اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں (تیر شرح بما فیہ انا) یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ......

خیر خدا راز صاحب کو معاف کرے حالانکہ خدا حق العباد معاف نہیں کرے گا۔ میں اصل مطلب سے دور نہ ہوتے ہوئے ناظرین کو اصل معاملہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ راز اشک کے جذبۂ ہوا خواہی میں کچھ بہک گئے اور اپنی جگہہ سے ہٹ گئے۔ اساتذہ کے پاس جو غزلیں اصلاح کو آیا کرتی ہیں وہ شاگردوں کے قلم کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں اور ان پر اساتذہ اصلاح دیتے ہیں۔ یہاں یہ چیز ہے کہ جو غزلیں حضرت محمود کے مسودات میں ملی ہیں وہ مطلع سے لیکر مقطع تک حضرت محمود کے قلم کی لکھی ہوئی

ہیں۔ یہاں راز صاحب کا فارمولا سر تا سر غلط ہو جاتا ہے کیونکہ مسودہ اگر اشک کے قلم کا لکھا ہوا ہوتا اور اس پر حضرت محمود کے قلم کی اصلاح ہوتی یا کوئی اور شعر دوران اصلاح میں حضرت محمود کے خیال میں آیا ہوتا اور وہ خود اشک کے مسودے میں لکھدیا ہوتا تو راز صاحب کا قول کچھ قابل توجہ ہوتا۔ اب رہتا ہے کسی غزل کا اپنے نام سے کسی رسالے مین طبع کرا دینا اس طباعت سے وہ غزل کسی سارق کی نہیں ہو جاتی چنانچہ راز صاحب نے نگار مورخہ اپریل ۱۹۵۹ء مین حضرت محمود کے یہہ اشعار کہ

(مین نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑکے ہاتھ = آپ للہ چلے جایئے میخانے سے)

(بات تاڑی تھی جو ہمنے تیرے شرمانے سے = اور بھی جم گئی دل میں وہ قسم کھانے سے)

اشک سے منسوب کئے ہیں حالانکہ یہہ اشعار حضرت محمود کی اوس غزل کے ہیں جس غزل کا عکس حضرت محمود کے قلم کا جذبات محمود میں موجود ہے اور اس غزل کی عمر اشک کی عمر سے آٹھہ سال زیادہ ہے۔ یہہ غزل حضرت محمود نے جے پور سے رامپور حضرت فصیح الملک کو ۴ مئی ۱۸۸۷ء کو اصلاح کے لئے بھیجی تھی یہہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت محمود جے پور تھے اور حضرت فصیح الملک رامپور مین اور بقول راز صاحب کے اشک ۱۸۹۵ء مین پیدا ہوئے اور ۱۹۵۸ء مین انتقال کر گئے اس طرح اشک کی عمر ستر سٹھہ سال ہوتی ہے اور غزل کی پچھتر سال دوسری غزل (جسے دید اونکی نصیب ہے وہ نصیب قابل دید ہے = جو شب برات ہے رات اوسے تو دن اوسکے واسطے عید ہے) اور (ہاتھہ پر ہاتھہ دھرے بیٹھے ہیں ہم وحشت مین = ہائے دامن نہوا ہائے گریبان نہوا) ان دونوں غزلوں کی عمر اڑسٹھہ ۶۸ سال ہوتی ہے جو اشک کی عمر سے ایک سال زیادہ ہے۔ آخر الذکر یہ دونوں غزلیں حضرت محمود نے ۹ رجب ۱۳۱۱ھ کو بغرض اصلاح فصیح الملک کو بمقام حیدرآباد بھیجی تھیں راز صاحب کے اس طرح کہدینے یا لکھدینے سے یہہ تینوں غزلین اشک کی نہیں ہو سکتین۔ حضرت فصیح الملک کی تحریرین ان غزلونکے ساتھہ آ گئے ہیں اور ان تحریرونکے عکس ناظرین کو جذبات محمود مین ملینگے۔ مین نہین چاہتا کہ اشک کے مرنیکے بعد اونکے پراگندہ حالات صحافت یا تحریر مین آئین لیکن راز صاحب نے مجھے مجبور کیا اسلئے مین قابل الزام نہین جو شبہہ سخن فہمون اور راہ ادب کے صحیح راہ پر چلنے والونین پیدا کیا جا رہا ہے اوسے دور کرنا میرا فرض ہے مین یہان یہہ کہنے پر مجبور ہون کہ اشک صاحب نے اپنے نام و نمود کیلئے اپنے استاد حضرت محمود کے کلام کو اپنا کہکر اور سنا کر لوگونکو مغالطے میں ڈالدیا اور یہہ موقع اونہین پاکستان جا کر ہاتھہ آیا چونکہ پاکستان کے لوگ حضرت محمود کے حالات اور اونکے دیوان سے مستفید نہو پائے تھے اسی وجہہ سے فضلی صاحب نے بھی دھوکا کھایا جو قابل الزام نہین۔ میرے پاس ہر زیر بحث غزل کا ریکارڈ اور حضرت فصیح الملک کی تحریرونکے عکس موجود ہین تحریری ثبوت کے مقابلے مین راز صاحب کا یہہ کہدینا کہ یہہ غزل یا یہہ شعر اشک کا ہے بالکل غلط ہے جتنے قریب سے میں نے اشک کو دیکھا ہے راز صاحب کیا جانین راز صاحب کی ایک غلط چیز پر ضد اور اونکی محض زبانی شہادت غیر صحیح ہے۔ اب جبکہ راز صاحب کے قول کی تحریری ثبوت سے تردید ہو جاتی ہے تو اس معاملے مین جو کچھ راز صاحب فرماتے ہین قابل اعتبار نہین رہتا۔ حضرت محمود کے متعلق راز صاحب کیا جانین یہ ہمارے گھر کی باتین ہین (صاحب البیت ادری بما فیہا) راز صاحب اپنے گھر کو دیکھین یہ مثال تو ملتی ہے کہ شاگردوں نے استاد کا کلام چرا لیا ہو جیسے اشک نے مگر ایسی مثال کہیں نہیں ملتی کہ استاد شاگرد کا کلام چرا لے (مشتے نمونہ از خروارے) اشک کی دو تحریریں بھی پیش کرتا ہوں جس سے زیر بحث واقعات پر کافی روشنی پڑیگی اور ثابت ہو جائیگا کہ اشک ایک مجبور اور سہارے کے شاعر تھے اگر غزلیات و اشعار زیر بحث کا اشک کیلئے اپنی پیدائش سے آٹھہ سال یا ایک سال پہلے کہکر عالم ارواح سے عالم وجود مین پہنچنا ممکن ہے تو ناظرین اس طرف کچھ غور فرما سکینگے۔

(تحریر اشک)

جناب استاد مدظلہ، تسلیم آج شب مین دلی جا رہا ہوں ۱۸ تاریخکو مشاعرہ ہے جو ابراہیم صاحب کلیم کے یہاں ہے۔ طرح یہ ہے (تمکو مرا خیال نہیں ہے نہیں سہی) خیال حال وغیرہ قافیہ نہیں سہی ردیف مجھے اتنا وقت نہیں کہ غزل لکھوں لہذا جناب ایک آٹھہ ۹ شعر فرما کر رکھ لین مین آکر لیلونگا مگر معرکہ کے اشعار ہوں اور ایک شرط یہ ہے کہ مطلع ایسا ہو جو دولخت نہو۔ بصد حد ادب واجد۔

(دیگر) جناب استاد مدظلہ۔ آج سے مشاعرہ کے چار روز باقی ہین اور مجھہ سے کچھ بھی نہ کہا گیا ایسی حالت مین سخت پریشانی ہے لہذا آپ ایک اکیس ۲۱ شعر کی غزل فرما دیجئے مشاعرہ چونکہ عظیم الشان ہے اس واسطے یقین ہے کہ جو آپ غزل مرحمت فرمائینگے وہ ضرور بانکی ہوگی اور یہ سب مدعی بھی جا رہے ہین اگر خدانخواستہ غزل نہیں ملی تو بڑی ذلت ہوگی مین تو ایک مبتدی ہون میرا کیا مگر آپ سے امید رکھتا ہون۔ والادب (آپ کا اشک)

موجودہ حالات و واقعات کی روشنی مین خود ناظرین فیصلہ کر لینگے کہ زیر بحث اشعار یا غزلیات قبلہ حضرت محمود کی ہین یا اشک کی۔ * (باقی آئندہ)

(نوٹ) اشک کا نام واجد علیخاں تھا پہلے واجد تخلص کرتے تھے اس کے بعد اشک تخلص کرنے لگے۔

(نوٹ) چونکہ رسالہ ماہ نو اور نیا دور دیر سے میری نظر سے گذرے اسلئے مضمون ہذا کی اشاعت و طباعت مین بہت دیر ہوی۔

اعشاری سکّہ

ملک میں ایک بڑی اصلاح

چند ضروری باتیں

۱۔ پاکستان میں نئے اعشاری سکے یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے جاری ہو جائیں گے۔

۲۔ اس نظام میں ایک روپیہ کو ۱۰۰ برابر حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر جزو کا نام "پیسہ" ہے یعنی ایک روپیہ میں ۱۰۰ پیسہ ہوں گے۔

۳۔ روپیہ کی قیمت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

۴۔ اس وقت صرف ۱ پیسہ، ۵ پیسہ اور ۱۰ پیسہ کے نئے اعشاری سکے جاری کئے جا رہے ہیں۔

۵۔ رقم کی ادائیگی یا وصولی کے لئے نئے پرانے یا دونوں، سکے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

۶۔ پرانے سکے کو نئے سکّے میں تبدیل کرنے کے لئے بعض اوقات کسریں آ جاتی ہیں ان کا حساب پورا کرنے کے لئے صرف ان شرحوں سے کام لیا جائے گا جو سرکاری طور پر شائع کر دی گئی ہیں۔ کسر پورا کرنے کے اس عمل کو صرف ایک مرتبہ کیا جائے گا۔

نقشہ شرح تبدیلی، استعمال کیسے کیا جائے؟

اس نقشہ کو صرف اس وقت استعمال کیجئے جب آپ کو واقعی کوئی ادائیگی کرنی ہو۔ یہاں جو شرح دی گئی ہے وہ موجود سکّے کے حساب میں پیسہ کے مساوی سکوں کو ظاہر کرتی ہے جو کسی واحد معاملہ ادائیگی کے وقت منہا کئے جائیں۔

بالکل صحیح مساوات نکالنے کے لئے درج ذیل شرح سے حساب معلوم کر لیجئے:

۱۰۰ پیسہ برابر ہے ایک روپیہ یا ۱۶ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیاں۔

حساب کا سہل نقشہ:

۱ روپیہ — ۱۰۰ پیسہ	۸ آنے — ۵۰ پیسہ
۴ آنے — ۲۵ پیسہ	۳ آنے — ۱۹ پیسہ
۲ آنے — ۱۲ پیسہ	۱ آنہ — ۶ پیسہ
½ آنہ — ۳ پیسہ	۱ پیسہ (موجودہ) — ۲ پیسہ

شرح نامہ تبدیلی

ذیل میں جو نقشے دیئے گئے ہیں ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ چلنے سکوں کو نئی کرنسی یعنی اعشاری سکوں میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان نقشوں کو کاٹ کر رکھ لیجئے۔ خود اور اپنے اہلِ خانہ کو ان سے مانوس بنایئے۔

پرانے اور نئے سکے دونوں یکم جنوری ۱۹۶۱ء کے بعد جاری رہیں گے۔ ادائیگی اور وصولی رقوم کے لئے نئے پرانے یا دونوں سکوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے بعض اوقات پرانے سکوں کو نئے سکوں میں تبدیل کرتے وقت حساب میں کسروں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ان کا حساب پورا کرنے کے لئے سرکاری طور پر جو شرحیں بنائی گئی ہیں، انہیں کو برتا جائے گا۔ یہ بات یاد رکھئے کہ حساب پورا کرنے کا یہ عمل ایک معاملہ میں صرف ایک مرتبہ ہی کیا جائے گا۔ مثلاً:

اگر آپ کسی دن سے ایک چیز خریدتے ہیں تو اسے ایک معاملہ سمجھا جائیگا اگر آپ نے کسی موقع پر ۴، ۶، یا ۱۰ چیزیں کسی ایک دکان سے خریدیں تو اسے بھی صرف ایک معاملہ سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں ہر چیز کی قیمت لگا کر پورا جوڑ لگا لیا جائے اور آخر میں جو کسر آئے اس کو ازروئے شرح پورا کر دیا جائے۔ ہر ہر چیز کی قیمت کی کسر پر یہ عمل نہیں کیا جائے گا۔

پائیاں	آنے	پیسہ	پائیاں	آنے	پیسہ
۱	۰	۱	۷	۰	۴
۲	۰	۱	۸	۰	۴
۳	۰	۲	۹	۰	۵
۴	۰	۲	۱۰	۰	۵
۵	۰	۳	۱۱	۰	۶
۶	۰	۳	—	۱	۶

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۳	۱	۱۹	۳	۷	۲۲
۳	۲	۲۰	۳	۸	۲۳
۳	۳	۲۰	۳	۹	۲۳
۳	۴	۲۱	۳	۱۰	۲۴
۳	۵	۲۱	۳	۱۱	۲۴
۳	۶	۲۲	۴	۰	۲۵

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱	۱	۷	۱	۷	۱۰
۱	۲	۷	۱	۸	۱۰
۱	۳	۸	۱	۹	۱۱
۱	۴	۸	۱	۱۰	۱۱
۱	۵	۹	۱	۱۱	۱۲
۱	۶	۹	۲	۰	۱۲

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۴	۱	۲۶	۴	۷	۲۹
۴	۲	۲۶	۴	۸	۲۹
۴	۳	۲۷	۴	۹	۳۰
۴	۴	۲۷	۴	۱۰	۳۰
۴	۵	۲۸	۴	۱۱	۳۱
۴	۶	۲۸	۵	۰	۳۱

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۲	۱	۱۳	۲	۷	۱۶
۲	۲	۱۴	۲	۸	۱۷
۲	۳	۱۴	۲	۹	۱۷
۲	۴	۱۵	۲	۱۰	۱۸
۲	۵	۱۵	۲	۱۱	۱۸
۲	۶	۱۶	۳	۰	۱۹

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۵	۱	۳۲	۵	۷	۳۵
۵	۲	۳۲	۵	۸	۳۵
۵	۳	۳۳	۵	۹	۳۶
۵	۴	۳۳	۵	۱۰	۳۶
۵	۵	۳۴	۵	۱۱	۳۷
۵	۶	۳۴	۵	۰	۳۷

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۶	۱	۳۸	۶	۷	۴۱
۶	۲	۳۹	۶	۸	۴۲
۶	۳	۳۹	۶	۹	۴۲
۶	۴	۴۰	۶	۱۰	۴۳
۶	۵	۴۰	۶	۱۱	۴۳
۶	۶	۴۱	۷	۰	۴۴

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۷	۱	۴۴	۷	۷	۴۷
۷	۲	۴۵	۷	۸	۴۸
۷	۳	۴۵	۷	۹	۴۸
۷	۴	۴۶	۷	۱۰	۴۹
۷	۵	۴۶	۷	۱۱	۴۹
۷	۶	۴۷	۸	۰	۵۰

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۸	۱	۵۱	۸	۷	۵۴
۸	۲	۵۱	۸	۸	۵۴
۸	۳	۵۲	۸	۹	۵۵
۸	۴	۵۲	۸	۱۰	۵۵
۸	۵	۵۳	۸	۱۱	۵۶
۸	۶	۵۳	۹	۰	۵۶

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۹	۱	۵۷	۹	۷	۶۰
۹	۲	۵۷	۹	۸	۶۰
۹	۳	۵۸	۹	۹	۶۱
۹	۴	۵۹	۹	۱۰	۶۱
۹	۵	۵۹	۹	۱۱	۶۲
۹	۶	۵۹	۱۰	۰	۶۲

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱۰	۱	۶۳	۱۰	۷	۶۶
۱۰	۲	۶۴	۱۰	۸	۶۷
۱۰	۳	۶۴	۱۰	۹	۶۷
۱۰	۴	۶۵	۱۰	۱۰	۶۸
۱۰	۵	۶۵	۱۰	۱۱	۶۸
۱۰	۶	۶۶	۱۱	۰	۶۹

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱۱	۱	۶۹	۱۱	۷	۷۲
۱۱	۲	۷۰	۱۱	۸	۷۳
۱۱	۳	۷۰	۱۱	۹	۷۳
۱۱	۴	۷۱	۱۱	۱۰	۷۴
۱۱	۵	۷۱	۱۱	۱۱	۷۴
۱۱	۶	۷۲	۱۲	۰	۷۵

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱۲	۱	۷۶	۱۲	۷	۷۹
۱۲	۲	۷۶	۱۲	۸	۷۹
۱۲	۳	۷۷	۱۲	۹	۸۰
۱۲	۴	۷۷	۱۲	۱۰	۸۰
۱۲	۵	۷۸	۱۲	۱۱	۸۱
۱۲	۶	۷۸	۱۳	۰	۸۱

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱۳	۱	۸۲	۱۳	۷	۸۵
۱۳	۲	۸۲	۱۳	۸	۸۵
۱۳	۳	۸۳	۱۳	۹	۸۶
۱۳	۴	۸۳	۱۳	۱۰	۸۶
۱۳	۵	۸۴	۱۳	۱۱	۸۷
۱۳	۶	۸۴	۱۴	۰	۸۷

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱۴	۱	۸۸	۱۴	۷	۹۱
۱۴	۲	۸۹	۱۴	۸	۹۲
۱۴	۳	۸۹	۱۴	۹	۹۲
۱۴	۴	۹۰	۱۴	۱۰	۹۳
۱۴	۵	۹۰	۱۴	۱۱	۹۳
۱۴	۶	۹۱	۱۵	۰	۹۴

آنے	پائیاں	پیسہ	آنے	پائیاں	پیسہ
۱۵	۱	۹۴	۱۵	۷	۹۷
۱۵	۲	۹۵	۱۵	۸	۹۸
۱۵	۳	۹۵	۱۵	۹	۹۸
۱۵	۴	۹۶	۱۵	۱۰	۹۹
۱۵	۵	۹۶	۱۵	۱۱	۹۹
۱۵	۶	۹۷	۱ روپیہ		۱۰۰



کُفر ٹوٹا خُدا خُدا کرکے!

احسان ملک

”ٹرام کا ٹکٹ پانچ پیسے میں ملتا ہے۔ آئیے دیکھیں یکم جنوری سے نئے سکوں میں کتنے کا ملے گا۔ موجودہ پانچ پیسے برابر ہوتے ہیں ۸۱۲۵ء نئے پیسوں (پیسہ) کے یا موٹے حساب میں پونے آٹھ نئے پیسے (پیسہ) ہوں گے۔ پورا پیسہ ہم کہاں سے لائیں؟ کوئی بات نہیں۔ آٹھ نئے پیسے دے دیں گے مگر پرانے سکوں ہی میں ٹکٹ خریدیں گے اور پیسہ کے نقصان سے بچیں گے لیکن پرانے سکے تو دھیرے دھیرے غائب ہوتے جائیں گے اور ان کی جگہ نئے سکے لے لیں گے۔ پھر تو نقصان برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ ہم حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ ٹرام کا ٹکٹ آٹھ پیسوں کی بجائے ۷ نئے پیسہ (نیا پیسہ) کردے۔“

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان عظام بیچ اس مسئلہ کے جو یکم جنوری سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا ہے؟ مگر خیر، یہ جھگڑا تو دوسروں کو نپٹانے دیں۔ اتنے — ابھی تو نیا پیسہ چلنے میں کئی دن باقی ہیں — ہم آپ کچھ کام کی باتیں کر لیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ عقل بڑی یا بھینس۔ اب یہ تو وہ جانیں جنہوں نے سچ مچ اس کا اندازہ کیا ہے یا تول کر دیکھا ہے۔ دیکھنے میں تو بھینس ہی بڑی نظر آتی ہے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا — آدمی اکثر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ کوئی عقل کا دھنی کوئی بالکل کورا۔ مگر اتنا سب جانتے ہیں کہ کہاں عقل اور کہاں بھینس۔ خواہ ایک کی جگہ ہزاروں بھینسیں کیوں نہ جمع کر دی جائیں۔ اور عقل نے تو ماشاءاللہ وہ وہ بڑے بڑے کام کئے ہیں کہ اللہ میاں کی یہ اتنی بڑی بھاری بھر کم مخلوق اسکے سامنے کچھ بھی نہیں۔ سچ پوچھئے تو سیانوں کی بات کا مزا آنولے کی طرح کھانے کے بعد آتا ہے۔ بشرطیکہ آپ نے واقعی کبھی آنولہ کھایا ہو۔ اب دور کیوں جائیے۔ ذرا یہ پرانے اور نئے سکے ہی دیکھ لیجئے۔ ہم لوگ تھے کہ جگ پر

جگ بیتتے گئے، ان پرانے سکوں ہی پر ریجھے رہے۔ یہاں تک کہ ان کو برتتے برتتے زندگی اجیرن ہوگئی - وہی چھوٹی چھوٹی ننھی منی پائیاں جن کو ہاتھ میں لینا اور سنبھال کر رکھنا بھی کارے دارد ہو - وہی دھیلے، وہی پیسے— سوراخ دار یا بے سوراخ — وہی بڑے بڑے ادھنے، وہی آنے یا اکنیاں، دونیاں، چونیاں، اٹھنیاں، اور وہی چوڑا چکلا روپیہ— غرضیکہ ایک لامتناہی سلسلہ تھا - اور ان کی قیمت میں کوئی تک نہیں - لیجئے ۳ پائی کا ٹھہرا ایک پیسہ - کیوں؟ ۶ پائی یا ۲ پیسے کا آدھا - ۱۲ پائی کا آنہ - ۹۲ پائی کا روپیہ - اور ان کے بیچ دونیوں، چونیوں، اٹھنیوں - روپے کا اپنا اپنا حساب الگ - باپ رے باپ ! ہم کس چکر میں پھنس گئے !!

بیچارے بچوں کے لئے تو یہ اک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا - برسوں مغز مارتے رہیئے پھر بھی پتھر میں جونک نہ لگی ہے نہ لگے - ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان چھوٹے بڑے بھانت بھانت کے سکوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے - ہر قدم پر چکر ہی چکر - اور گھر سے نکل کر اسکول پہنچے تو اور بھی عذاب - دن دن بھر استاد کی مار پیٹ، کان پچی اور کیا کیا کچھ کہ ان سکوں کا ہیر پھیر مطلق سمجھ میں نہیں آتا - اور نہ ان کے کچھ لگتے حساب کا اور چھور ہی معلوم ہوتا ہے -

بوجھ وہ سر پہ گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے!

پہاڑوں کا پہاڑ بھی تو انہیں پائیوں، پیسوں کے کارن سر پر آن نازل ہوتا ہے - خوب یاد ہے یار لوگوں کی پائیوں، پیسوں، آنوں، روپوں کی بدولت کیا کیا جگ ہنسائیاں اور مار پٹائیاں ہوئی ہیں - اور مولا بخش ہو یا مشکلشا - اس سے کیا کیا مشکلیں حل ہوئی ہیں -

اور بچے ہی کیا - بڑوں کو اس سلسلہ میں کیا کیا پاپڑ نہیں بیلنے پڑے - کبھی ان نقدی گھروں یعنی بنکوں کی طرف جا نکلے، تو کیا کیا مظلوم شکلیں اونچی اونچی بنچوں پر سر جھکائے دکھائی دینگی جن کا دن بھر ایک ہی ورد ہے

نقش فریادی ہے کسکی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا!

مطلب یہ کہ کاغذ کے لمبے لمبے تختے اور بھاری بھرکم رجسٹر پائیوں پیسوں آنوں دونیوں سے پٹے پڑے ہیں - کالے سیاہ - ہر بار گنتے گنتے ایک دو پائی کی کسر رہ جاتی ہے اور پھر سے آوا گون کا چکر شروع ہو جاتا ہے - خیال کیجئے ان مصیبت کے ماروں نے پائیاں آنے بنانے والوں کو کیا کیا جی بھر بھر کر نہیں کوسا ہوگا - یہ حساب کتاب تو ایسی ضروری چیز ہے - اور پھر پائیوں کا حساب - جسے جہنم کی سزاؤں میں سب سے بڑی سزا قرار دینا چاہئے تھا - اس سے تو بڑے بڑوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے - وہ آئن سٹائن تھا نا - بہت بڑا ریاضی داں سمجھتا تھا خود کو - کسی بس کنڈکٹر نے اس کی ساری شیخی کرکری کردی - ارے بڑے صاحب! اتنا حساب بھی نہیں جانتے!! - اور یہاں ایک آئن سٹائن تو کیا - بقول لسان الغیب حافظ -

ہماں مرحلہ است ایں بیابان دور
کہ گم شد درو لشکر سلم و طور

کچھ عجب نہیں کہ ہم صدھا سال اور انہی دقیانوسی سکوں کے گورکھ دھندے میں پھنسے رہتے - مگر خوش قسمتی سے عقل نے بھینس کے مقابلے میں اپنی برتری کا ثبوت دیا اور بزرگوں کی لاج رکھ لی - ذرا غور کیجئے - مکسور اعشاریہ - ہماری اپنی چیز - ہمارے پرکھوں نے بنائی - اور لغاروم جس نے اعشاریہ کی بھی ہندی کی چندی کر دکھائی ہے - اس کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے؟ ہم، ہمارے آباو اجداد - یورپ نے یہ چیزیں کس سے حاصل کی تھیں؟ ہمیں سے - اور اب اینڈتے پھرتے ہیں کہ ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں - مگر ہم پر حیف ہے کہ

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی!
ہماری غفلت اور دانایان فرنگ کی ہوشیاری کہ انھوں نے پرانے، غیر سائنسی سکوں کے بجائے اعشاری سکے رائج کر ڈالے اور حساب کتاب کی کایا پلٹ دی - اسکولوں، بنکوں، منڈیوں کے سر سے بے ڈھب سکوں کی مصیبت ٹلی -

یہ ہماری انقلابی حکومت کی بڑی دانشمندی ہے کہ اس نے مال عرب پیش عرب کے مقولے پر عمل کرکے اصول اعشاریہ کو اپنایا - واہ واہ! کیا عمدہ طریق ہے - صفر، پانچ، دس، پچیس، پچاس، سو، ہزار - جیسے انسان برابر پایوں پر قدم رکھتا ہوا زینے پر بڑھتا چڑھتا چلا جائے اور اسے اپنی ہر ہر منزل کا ٹھیک ٹھیک علم ہو - یہ نہیں کہ ایک قدم کہیں پڑ رہا ہے، دوسرا کہیں - اب بھلا کسی چھوٹے سے چھوٹے بچے کو بھی گننے، حساب لگانے میں کیا دقت ہوگی - بس یہاں تو جو کچھ ہے پیسہ ہی پیسہ ہے - ایک پیسہ، دو پیسہ - دس پیسہ - اور چونی آٹھنی کا سیدھا حساب ہے - ۲۵ پیسہ - ۵۰ پیسہ - اور یکڑ بکڑ بھمبل بھو وغیرہ کچھ نہیں بلکہ روپے کا پورا سو پیسہ - اب کسی استاد کو کان بچی، مولا بخش یا مشکلکشا کی ضرورت نہیں رہے گی - اور نہ بچوں کو طرح طرح کی سزائیں بھگتنی پڑیں گی - رہے بنک اور منڈیاں تو دن بھر کا حساب منٹوں میں طے ہوجائے گا - نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری - رنگ چوکھا -

یہ تو ہے - مگر سچ پوچھئے تو اول اول یار لوگوں کو خاصہ جھمیلہ رہا ہے - اور بعض خداوندان عقل و ہوش تو اب بھی خوب چکرا اور جھنجھلا رہے ہیں - اور جہاں جاتے ہیں جیب میں ایک نقشہ، ایک جدول، ایک پرچہ لئے پھرتے ہیں - اس مائیس کی طرح جسے کسی رئیس نے نوشت پے ڈالی تھی - اور ٹٹول ٹٹول کر موٹے موٹے شیشوں والی عینک لگا کر، پرانوں کی جگہ نئے تلاش کر رہے ہیں یا پرانوں کو نیا بنا رہے ہیں - گویا گھر گھر اور در در کاغذی تبادلہ گھر کھل گیا ہو - ایک دن تو خوب مزا آیا - میری ایک بچی ہے - روز رو دھو کر ایک دونی ضرور لیتی - اور اس چوکور سکے کو خوب پہچانتی - جیسے مداری کا طوطا پہچانتا ہے - دو آنے یا آٹھ پیسے دونی کا کوئی بدل بھی دیں، ہر گز قبول نہ کرتی - اب جو حضرت پیسہ اور نئے سکے برا جمان ہوئے تو وہ کسی طرح منتی ہی نہ تھی - لوٹ پوٹ ہوئی جاتی - اسے نئے پیسہ اور نئے سکوں سے کیا؟ کئی دنوں میں اس اللہ کی بندی کو یہ پتہ چلا کہ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے یعنی اکنیوں دونیوں کا راج تھا - اسکے برعکس گلشن کا بندوبست برنگ دگر ہے آج - رفتہ رفتہ اسے پتہ چلا کہ پیسہ کی بھی اتنی ہی مونگ پھلیاں، چلغوزے یا ٹافیاں آتی ہیں جتنی دونی کی - اب ستم ظریفی ہے کہ وہ پیسہ کے بغیر بات ہی نہیں کرتی - اور شاید اسے پرانی دونی دے دی جائے تو اس پر ویسا ہی فیل مچائے گی جیسا اس نے نیا پیسہ پر مچایا تھا -

یہ تو ہوئی چھوٹی لڑکی کی بات - بڑوں نے بھی وہ وہ لطیفے کئے اور کر رہے ہیں کہ کسی زمانہ کے خاص خاص لطیفے گرد ہو کر رہ گئے ہیں - یہ لیجئے، ایک دکان پر ہلڑ مچا ہے - ایک بزرگ مع اپنی لمبی چوڑی ڈاڑھی کے جھگڑ رہے ہیں - لیں گے ۲ آنے. کے تیس پیسے اور دیں گے بیس! سبھی لوگ بیس پر چار سو بڑھا رہے ہیں - دے بحثا بحثی ہو رہی ہے - اور ساتھ جدول کی ڈھنڈائی - خدا خدا کرکے حساب برابر ہوا - مگر یہ کون جانے کتنوں کو پیسہ زیادہ گیا کتنوں کو کم - کوئی صاحب بس پر سوار بڑ بڑا رہے ہیں - اسلئے کہ وہ جدول اپنی پرانی شیروانی میں بھول آئے ہیں - اب دے ہاتھ نچا نچا کر اور زبان بڑھا بڑھا کر تکرار ہو رہی ہے - جسے یار لوگ ریڈیو کا مفت کا جھگڑا سمجھ کر بڑی دلچسپی سے سن رہے ہیں -

مگر ان باتوں کا کیا - یہ تو سب رفتنی و گذشتنی باتیں ہیں - کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی - اب تو یار لوگ نئے سکوں اور ان کی قیمتوں کو خوب پہچان گئے ہیں - اور دن رات

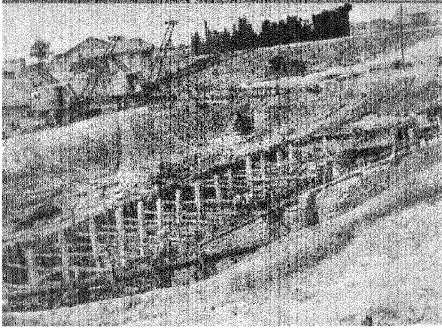
انہی کے گن گاتے ہیں ۔ بڑی بات یہ ہے کہ نئے سکوں سے حساب کتاب کتنا سرل ہوگیا ہے ۔ بلکہ طب یونانی کے متوالوں کی اصطلاح میں کھرل ہوگیا ہے ۔ مجھے یقین ہے ''ماہ نو'' والوں نے ان نئے چاند تاروں کو چمکانے میں ضرور حصہ لیا ہوگا ۔ اور یہ دانائی ضرور کی ہوگی کہ نئے سال کے پہلے شمارے میں، جسمیں غالباً یہ فکاھی چیز بھی چھپ رھی ہے، نئے سکوں کی بڑی عمدہ جدول بھی شائع کردی ہوگی جیسے رمضان شریف سے پہلے نقشہ سحری و افطار شائع کئے جاتے ہیں ۔ یار لوگ اس حسین جدول کو تراش کر یا سارے رسالے ہی کو جیب میں ٹھونسے پھریں گے تاکہ عندالضرورت اسے جھٹ سند کے طور پر پیش کر سکیں اور پرانے پیسوں کا نیا پیسہ بنا لیں ۔ کیونکہ پیسوں کے مقابلہ میں اب صرف 'پیسہ' ہی رہ گیا ہے 'پیسے' نہیں ۔ اس سے ہمارے سکوں کا نظام عالمی سکوں کے نظام سے مل جائے گا اور ہمیں اپنے مالیاتی نظام کو استوار کرنے کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرنے میں مدد ملے گی ۔

اب اس لے کو کہاں تک بڑھاؤں ۔ نظیر اکبرآبادی کا ہمنوا ضرور ہوں جس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ۔ پیسہ نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے ۔ اور اس پر ایک لمبی چوڑی نظم لکھ ڈالی تھی ۔ مگر میں نہ شاعر ہوں نہ مجھے شاعری سے مس ہے ۔ بالکل روکھا پھیکا نثرنویس ہوں ۔ یعنی پرلے درجے کا خشک انسان ۔ پھر بھی نیا سکہ چلنے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا اور خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ وہ پرانے سکے تو گئے ۔ یا آہستہ آہستہ چلے ہی جائیں گے ۔ جو بچوں، بوڑھوں، چھوٹوں بڑوں سب کو اسقدر ستایا کرتے تھے ۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے !



آباد دیار ما!

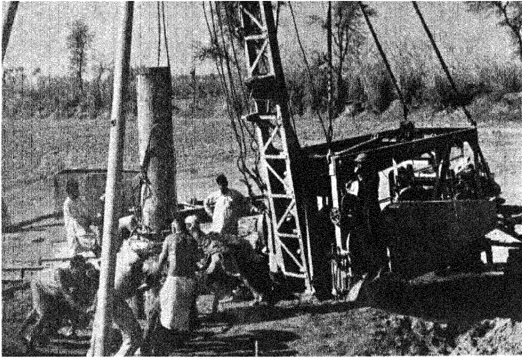
دور انقلاب میں ہمارے ملک کے دونوں حصوں، مشرقی اور مغربی پاکستان، میں صنعتی ترقی کے چند پہلو



گنگا کو باڈک کا مہتم بالشان منصوبہ، آبپاشی (مشرقی پاکستان)



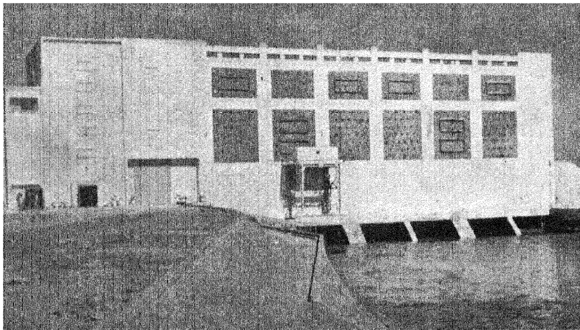
قومی صحت : وسیع پیمانہ پر احتیاطی تدابیر (رنگپور، مشرقی پاکستان)



ایک مسئلہ، ایک حل : سیم اور کلر کی روک تھام (مغربی پاکستان)



تربیت خواتین : مختلف ہنر سکھانے کے مرکز (مشرقی پاکستان)



ترقیاتی منصوبوں کے لئے بیش از بیش برقابی قوت (شیخوپورہ)

نوائے پاک

(طبع ثانی)

قیام پاکستان کے بعد جو نیا قومی شعور پیدا ہوا ہے، اس سے ایک نئے خلص ملی ادب کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس میں شاعری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ہماری آزاد زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو ہمارے حب وطن سے سرشار شعرا کی منظومات میں منعکس نہ ہوا ہو اور اس خوش اسلوبی سے کہ ہم اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

حصول آزادی کے چار ہی سال بعد قابل قدر ملی منظومات کا ایک وسیع ذخیرہ تیار ہوچکا تھا جن میں سے چیدہ چیدہ شہ پاروں کا ایک سیرحاصل مجموعہ '' نوائے پاک '' کے نام سے پیش کیا گیا تھا اور تمام حلقوں میں بے حد مقبول ہوا تھا۔

——— اور اب گوناگوں مرحلوں سے گزر کر ہماری شاعری کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ ایک نیا مجموعہ، جو ضخیم تر بھی ہے اور دیدہ زیب تر بھی، نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

مشمولات :

آزادی	مجاہدانہ منظومات	قائد اعظم رح
حکیم الامت رح	ہمارا وطن	کشمیر
	عہد نو	

چند لکھنے والے :

ابوالاثر حفیظ	احمد ندیم قاسمی	ڈاکٹر تاثیر (مرحوم)
فضل احمد کریم فضلی	قتیل شفائی	سیماب اکبرآبادی (مرحوم)
ش ۔ ضحیٰ	اثر صہبائی	مجید لاہوری (مرحوم)
نظر حیدر آبادی	حمایت علی شاعر	عبدالمجید سالک (مرحوم)
	عبدالعزیز فطرت، وغیرہم	

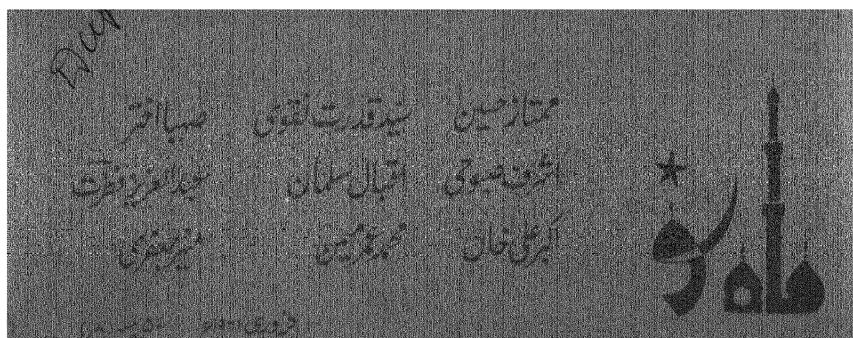
اس کتاب کی عام مانگ کے پیش نظر یہ ایڈیشن اضافہ و ترمیم کے باوجود نہایت کم قیمت مہیا کیا جارہا ہے۔

رنگین و نفیس سر ورق   ضخامت : سوا دو سو صفحات

قیمت صرف ایک روپیہ (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ، کراچی — مدیر : رفیق خاور


ماہِ نو
ممتاز حسین
سید قدرت نقوی
صہبا اختر
اشرف صبوحی
اقبال سلمان
عبدالعزیز فطرت
اکبر علی خاں
محمد عمر میمن
منیر جعفری
فروری ۱۹۶۱ء



پاکستان کی طرف سے ہزرائل ہائنیس ڈیوک آف ایڈ نبرا کو علمی اعزاز

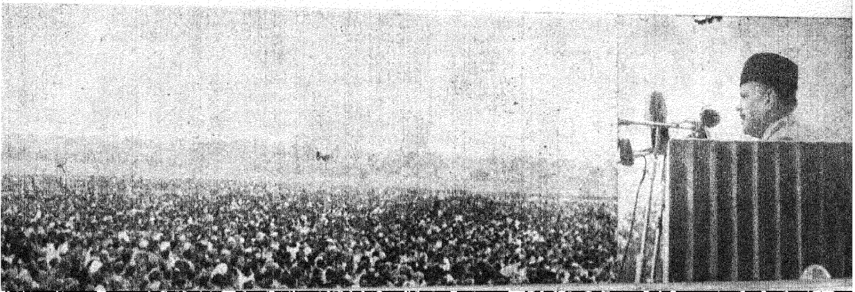


ملکہ الزبیتھہ ثانی اور صدر پاکستان
(ونڈسر کیسل لندن)

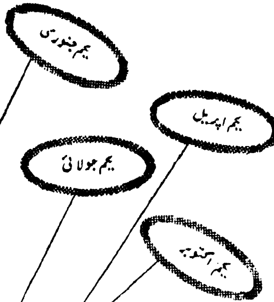


←
ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج (لاہور) میں اولین کورس
کا افتتاح

↓ بابائے ملت رح کے یوم پیدائش پر قوم سے خطاب



سال میں چار مرتبہ



ایک زرّیں موقع آپ کو پکارتا ہے...

قومی انعامی بونڈ نقد ادائیگی پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر اور اُس کے مقرر کردہ بینکوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔ بونڈوں کی فروخت سے حاصل شدہ سرمائے کو حکومت سماجی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرے گی۔ آپ کی رقم بہرحال محفوظ رہے گی اور جب چاہیں واپس مل سکتی ہے۔

انعامات کے لئے قرعہ اندازی ہر تین ماہ بعد یکم جنوری، یکم اپریل، یکم جولائی اور یکم اکتوبر کو ہوگی۔ پہلی قرعہ اندازی سرکاری نگرانی میں یکم جولائی ۱۹۶۱ء کو ہونے والی ہے۔ ہر ایک بونڈ تمام قرعہ اندازیوں میں انعام کا مستحق ہوگا، بشرطیکہ وہ تاریخ قرعہ اندازی سے چھ ماہ قبل خریدا گیا ہو اور بُھنایا نہ جائے۔

یہ انعامات انکم ٹیکس اور سُپر ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

پانچ لاکھ بونڈ کے ہر سلسلے پر
۵۰ ہزار روپے کے نقد انعامات

ایک انعام	۲۰۰۰۰	روپے کا
ایک انعام	۷۵۰۰	روپے کا
ایک انعام	۲۵۰۰	روپے کا
تین انعامات	۱۰۰۰	روپے کا فی انعام
دس انعامات	۵۰۰	روپے کا فی انعام
ایک سو بیس انعامات	۱۰۰	روپے کا فی انعام

قومی انعامی بونڈ میں امید اور اطمینان کے ساتھ روپیہ لگائیے

آپ جب چاہیں اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

جلد ۱۴ شمارہ ۲



فروری ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

غالبؔ — ایک تہذیبی قوّت

ممتاز حُسین

جب بھی غالبؔ کی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہماری نظر سب سے پہلے یا تو ان کے کلام کی آفاقیت پر جاتی ہے جہاں وہ پوری انسانیت کے ترجمان ہیں، یا پھر ان کے کلام کے ایسے حصوں پر جہاں انہوں نے انسان کے عنصری جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالبؔ کی یہ وسیع النظری اور نفسیاتی ژرف بینی دونوں ہی لائقِ صد تحسین وداد ہیں اور ان کے بقائے دوام کی ضامن لیکن تاوقتیکہ ہم ان کے کلام کی تاریخی اہمیت کو نہ جانیں، یا یہ کہ انہیں ایک مخصوص تاریخی تہذیبی ماحول میں رکھ کر نہ دیکھیں اس کا خطرہ باقی رہتا ہے کہ کہیں ہماری وہ تحسین، تحسین ناشناس بن کر نہ رہ جائے۔ کیونکہ کسی بھی شاعر کے کلام کی عمومیت اور آفاقیت اپنی قوم اور تاریخ، زندہ اور ہمعصر تاریخ سے بے نیاز ہونے میں نہیں، بلکہ اس سے دست گریباں ہونے، اس کی کشمکش کو سمجھنے اور پھر اسے عالمی تہذیب کے ارتقائی رجحانات سے نسبت دینے میں ہے۔

کیا ہمارے یہاں غالبؔ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں، جوں جوں ہمارا تاریخی تنقیدی شعور زیادہ سے زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا گیا ہے، کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ دی گئی ہے اور ہم نے غالبؔ کے کلام میں ایک تاریخی آدمی کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس موقع پر ہمارے بعض بزرگ، جو اگلے وقتوں کے ہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ تو ایک گزراں حقیقت ہے۔ وہ جو وقتی اور ہنگامی، گزشتنی اور گزاشتنی ہے وہ کب ہم جیسے سرمستِ ازل، مطلق پرستوں، پردہ درانِ تعینات کو، اپنے دام موج میں الجھا سکتی ہے، ہم تو اس کی اس دامگاہ سے ایک چشم زدن میں جست کر جاتے ہیں۔ کیا غلامی اور کیا آزادی۔ کیا راکٹ اور کیا ایٹم۔ ہم تو بے مَرکب اڑتے اور بے تیغ لڑتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بڑا خواب آور اور نشیلا فلسفہ ہے اور جب اپنے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس کا نشہ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

لیکن گزشتہ دو ڈھائی سو سال کی پیہم پسپائیوں اور زد و کوب نے اب ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ عالم کی ہستی نا قابلِ تردید ہے اور یہ ایک عالمِ اسباب ہے نہ کہ عالمِ معجزات۔ میں نے یہ بات اس لئے چھیڑی کہ اب یہ جو شعور، عالم کے وجود کے ماننے اور اس کے اسباب و علل کے دریافت کرنے کا پیدا ہو چلا ہے وہ ہماری گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخی تہذیبی جد و جہد ہی میں پروان چڑھا ہے۔ اور اس شعور کو فروغ دینے میں غالبؔ کا بھی ایک حصہ ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا نام نہیں لیا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہمارے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ مغرب کی روشنی نے ہمیں ۱۸۵۷ء کے بعد سے متاثر کرنا شروع کیا۔ جب سے کہ ہم انگریزوں کے بار امانت کو اپنے کندھوں پر اٹھائے یہ کہتے پھرے۔ "دیکھو اے مسلمانوں ان کی آمریت تم پر واجب ہے۔ اور ان کی حکومت تمہارے لئے امن و برکت کا باعث ہے۔ کہ یہ تم میں سے ہیں۔ صاحبِ کتاب ہیں"۔ یا پھر شاید اس لئے کہ غالبؔ کی روشن خیالی اور روشن ضمیری میں "احیاء دین" اور تہافتہ الفلاسفہ کا کوئی علم الکلام نہ تھا۔ لیکن ابن رشد کی روح کب تک تہِ تیغ رہتی۔ بالآخر یہ بات کھل کر ہی رہی کہ ہماری روشن خیالی اور ہمارے جدید ادب دونوں ہی کا آغاز غالبؔ ہی کی نظم و نثر سے ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اس عمل میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک شدید کشمکش ہے۔ ؎

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

لیکن اس کشمکش میں کبھی کبھی جدید قدیم پر اتنا غالب آ جاتا ہے کہ وہ سید احمد خاں کو ٹوک کر کہہ دیتے ہیں۔ ؏

مردہ پروردن مبارک کار نیست

مبادا آپ یہ کہیں گے کہ یہ واقعہ ۱۸۵۶ء کا ہے اور ۱۸۵۷ء میں کچھ بہت زیادہ بُعد زمانی نہیں ہے۔ اس لئے ہم آپ کو اس

زمانے سے بہت پہلے کی ایک فارسی غزل سناتے ہیں۔ جس میں مغرب کی روشنی کا خیر مقدم کیا گیا ہے ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رُخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند
گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارکِ تُرکانِ پشنگی بردند
بہ سخن ناصیۂ فرّ کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بُردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

اس امر پر سارے مؤرخین کا اتفاق ہے کہ انگلستان کا صنعتی انقلاب ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کا رہین منت رہا ہے۔ ہندوستان کا جب سونا لُٹ گیا تو مغرب سے علم و دانش کا ایک آفتاب طلوع ہوا۔ جس کی روشنی سے ہرچند کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے، مشرق کو محروم رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن جب ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل کے بعد دولتِ انگلشیہ میں تاجروں کا زور گھٹا اور صنعتی سرمایہ داروں کا زور بڑھا تو پھر اس کی روشنی یہاں بھی پھیلی۔ نہ صرف دخانی کشتیوں، ریل گاڑیوں، ٹیلیگراف اور دوسری سائنسی ایجادوں کی نمائش سے، بلکہ انگریزی تعلیم، سماجی اصلاحات (جس میں غلامی کی رسم کی منسوخی بھی شامل ہے) اور پریس کی آزادی کی صورتوں میں بھی۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء سے لے کر ۱۸۴۷ء تک کا زمانہ، باوجود اس کو لونیل حکومت اور شدید سرمایہ دارانہ استحصال کے جس سے ہندوستان دوچار ہوا، برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں اس پہلو سے تابناک بھی ہے کہ یہ ذہنی آزادی اور مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج قائم ہوا تھا جس کی اہمیت کے بارے میں ذکا ء اللہ لکھتے ہیں کہ سائنس اور نئے علم ہیئت کی باتیں گھر گھر میں پھیل گئی تھیں۔ غالب نے اسی خورشیدِ مغرب کا خیر مقدم اپنی غزل میں کیا ہے ؏ شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند اور پھر اس کی تان اس پر توڑی ہے ؏ ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند یعنی جو کچھ کہ مغرب ظاہر میں لے گیا اسے بہ باطن لوٹایا، جو موتی کہ انگریزوں نے ترکوں کے تاج سے توڑے انہیں علم و دانش کے ہار میں پرو دیا۔ سیاسی پہلو سے یہ خیر مقدم ناخوشگوار سہی، لیکن قدیم مشرق کے مبلغ علم اور مطلق العنان حکومتوں کے پس منظر میں یہ حور کرن کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن، بنتھم اور مل کی یقیناً قابلِ قدر تھی، غالب کا تشکک خود اپنے ہی قدیم عقیدے کو معرض شک میں لانے کا ؎

لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ:-

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اسی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ اور اسی فضا میں ان کے فلسفہ وحدت الوجود نے منفی اثرات کو ترک کر کے وہ مثبت پہلو اختیار کیا جو زندگی کو ایک عطیۂ الٰہی تصور کرنے کا اور اس خیال سے درگزر نے کا تھا کہ یہ زندگی گناہ ہے۔ وہ تمام تر نقد کے قائل تھے، نسیہ کے قائل ہی نہ تھے، کاش حالی کی سمجھ میں یہ بات آتی تو وہ انہیں حیوان ظریف نہیں بلکہ اردو ادب کا والٹیر تصور کرتے۔ لیکن وہ تو ساری عمر یہی کہتے رہے۔ "ہرچند کہ مرزا نے شاعری کی نسبت سے شراب کی مدح کی ہے۔ لیکن وہ اسے اعتقاداً برا سمجھتے تھے"۔ نہیں معلوم حالی کا خیال غالب کے عشق کے بارے میں کیا تھا! چھوڑیئے اس جملۂ معترضہ کو ؎

بامن میاویز اے پدر فرزندِ آ ذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

لیکن یہ واقعہ، مژدۂ صبح کے پانے، شمع کے بجھانے اور آفتاب کے طلوع کرنے کا اس رات کا ہے جو بڑی مہیب اور تاریک تھی۔ اور غالب اپنے اس روحانی سفر میں بڑا تنہا اور اداس تھا کبھی کبھی نا امیدیوں کے طوفان نے اس پر ایسا ہجوم کیا ہے کہ اس کے دل کی ساری شمعیں بجھ گئی ہیں، اور اس نے ایک زہرہ گداز احساسِ شکست سے دوچار ہو کر راہ فنا کی آرزو بھی کی ہے۔ ایسے لمحات شکست خوردگی، لمحاتِ غم، غالب کی شاعری میں کچھ کم نہیں ہیں لیکن وہ لمحات بڑے حسین ہیں کہ وہ کشتۂ آرزوئے زلیست ہیں ؎

نہ دانی کہ مینا شکستن بہ سنگ نہ بخشد بہ دل ذوقِ گلبانگ چنگ

یہ غالب جو آتش گبر کا پجاری (ز آتش نشانِ خدائی دہند شمع یونانیاں کا عاشق اور خورشیدِ باختر کا دلدادہ تھا۔ وہ میخانۂ مہر و وفا، صلح و آشتی اور وحدتِ انسانیت کا مے گسار بھی تھا ؎

یارب بہ جہانیاں دلِ خرّم دہ درد عوئے جنّتِ آشتی باہم دہ
شدّاد پسر نداشت باغش از تست آں مسکنِ آدم بہ بنیٔ آدم دہ

غالبؔ اور سرسیدؒ

سید قدرت نقوی

ابوالاثر حفیظ نے خوب کہا ہے کہ،

تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
کہ شاید یہیں ہو ترقی کا زینہ

اور یہ بالکل بجا ہے۔ ہمارے اپنے ملی انحطاط اور تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے۔ انیسویں صدی عیسوی سے زیادہ سیاسی تنزل و درماندگی کا زمانہ اور کیا ہوگا جب کہ فلاکت سماں اپنا اثر دکھلا رہی تھا۔ اور نحوست واقعی پس و پیش منڈلا رہی تھی۔ مگر یہی انحطاط، یہی زبوں احوال تھی جس نے قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ بقول حالیؔ:

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے یاد تو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

انسانی شعور جاگ اٹھا اور اس نے حالات و واقعات سے نبٹنے کی قوت کو ابھارا۔ اور طبیعتوں کے رجحان کو بدل دیا۔ طبائع خود بخود اس طرف مائل ہوئیں کہ اگر ایک اقتدار کی زمام چھن رہی ہے تو کوئی بات نہیں، اس کا بدل، ایک دوسرا اقتدار تو موجود ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کی جائے۔ خیالی باتوں کو چھوڑ کر حقیقت کے ساتھ پیمان وفا باندھا جائے۔

اس آخری دور کی حقیقت پسند، جلیل القدر ہستیوں میں غالبؔ بطور خاص نمایاں ہے، انہیں محض شاعر، صوفی، فلسفی سمجھنا غلطی ہوگی۔ کیونکہ انہیں زندگی ــــ عارفانہ و ماورائی نہیں بلکہ ارضی و مادّی زندگی۔ کے ساتھ گہرا انس تھا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

وہ طبعاً زندگی کے ہنگاموں سے مانوس تھے اور ابنائے جنس کے علاوہ حالات و واقعات سے شدید لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کا ہر بُنِ مو محرومیٔ حسن ہی نہیں محرومیٔ حیات کو بھی ترستا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح تیغ و تفنگ زیبِ تن کرتے اور میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے یا نہیں۔ بظاہر امکانات اس کے خلاف ہیں۔ فکر و عمل میں ہمیشہ منافات رہی ہے۔ اور فکر عموماً عملی حس کو ماؤف کر دیتا ہے۔ اور پھر غالبؔ جیسے سراپا خیال شاعر کا جید، پر زور فکر یہ گمان غالب یہی ہے کہ غالبؔ کے شعری و فکری میلان ہی نے ان سے سپہبدی کا دامن چھڑا دیا اور انہیں "رزم چنگ بہ شعر" کا ترانہ سنج بنا دیا۔ اور یہ سپہگری ہی نہیں بلکہ شاعری بھی تھی جو ان کے لئے سرمایۂ عزت بنی، مگر وہ طبعاً 'جماعۃ اتراک' ہی کے ذوقِ حیات سے سرشار رہے اور ان کی روح تمام تر عملی روح تھی۔

بیکاریٔ ما گدازشِ ماست
زخمے بہ تراوشِ اندر آور
پرافشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے!

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ ہمیں ہر کہیں اپنی طرز و روش، اپنے لب و لہجہ سے ایک زمانہ شناس اور دوربیں مدبر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اور شیخ محمد اکرام جیسے بالغ نظر نے ان کو "مرد دانا" کہہ کر بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ ان کا عملی رجحان، ان کا معاصرین، مقامی و اہل فرنگ، سے سروکار، میل جول، ان کے خطوط کی واقعات اور ناولوں سے ملتی جلتی وضع، غم روزگار کی طرف اعتنا اور ذاتی و اجتماعی تجربات کا ہجوم ــــ یہ سب ایک نہایت واقعیت پسند روح کی خبر دیتے ہیں۔ جیسے وہ سرسیدؒ، قائد اعظمؒ اور فیلڈ مارشل ایوب خان کا ابتدائی روپ ہوں۔ وہی اصلیت پسندی، وہی ولولہ و جوش، مگر غالبؔ کی جولانگہ میدان عمل ندارد! ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا ہے۔ اور غالبؔ خود بھی تو یہی کہتے ہیں۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

ایسی شخصیت، ممکن ہے خود تو کچھ نہ کر سکے کیونکہ اس کی

سرگرمئ عمل کے لئے کوئی جولاں گاہ ہی نہیں۔ مگر وہ اپنا ذوق و شوق، اپنی صاحب نظری، اپنا فیضان دوسروں کو تو پہنچا سکتا ہے۔ اور انہیں ہنگامہ زارِ عالم میں صبا رفتار کر سکتا ہے۔

سرسیدؒ کو غالب کے ساتھ خاندانی و ذاتی روابط کے باعث بے انتہا قرب تھا۔ جس پر ان کی طبعی ہم وضعی و ہم آہنگی مستزاد تھی۔ سرسیدؒ لکھتے ہیں:

"راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چونکہ 'دلہا را بہ دلہا راہ باشد' ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔"

سرسید احمد خاں غالب کو "چچا" کہا کرتے تھے۔ اور یہ اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی غالب کو اسی رشتہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ علی گڑھ والوں کا ایک قدیم دستور ہے کہ سرسیدؒ کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو ہندوستان گیر بنا دیا۔ سرسید کا قرب جسمانی و روحانی جس قدر بڑھتا گیا، غالب کی روح ان کے دل و دماغ میں سماتی گئی۔ تقلیداً نہیں، جو شخصیت کے ذیلی اور ادنیٰ ہونے کی علامت ہے، بلکہ اس قدرتی انداز سے جو دل سے دل کو راہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک عظیم شخصیت کسی دوسری عہد آفریں شخصیت سے اثر قبول کرتی ہے۔

سرسید احمد خاں کے خاندان سے مراسم کا ذکر سب سے پہلے ایک خط بنام میجر جان جاکوب میں ملتا ہے جنہوں نے غالب سے ان کا دیوان طلب کیا تھا۔ غالب نے اس کو جواب میں لکھ دیا کہ کاتب مل جائے تو نقل کرا کے بھیج دوں گا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد سید محمد خاں نے اردو دیوان چھاپنا شروع کر دیا۔ دیوان اور اخبار کے لئے غالب سے خریداروں کے سلسلہ میں مدد چاہی۔ غالب نے منجملہ اور ناموں کے میجر جان جاکوب کا نام بھی تحریر کر دیا۔ اخبار پہنچا تو اس نے خط کے ذریعہ اخبار اور مطبع کے متعلق پوچھا۔ مرزا جواب میں لکھتے ہیں:۔

"چہ شگرف بخشائش است، آنکہ در بارۂ سید الاخبار داد نگارش دادہ اند۔ منتے دیگر بر من نہادہ اند۔ نہاں مانا د کہ نقش مطبع سید الاخبار انگیختہ طبع یکی از دوستان روحانی منست۔ ہمانا کار فرمائے ایں نو آئین کدہ آں ہی سگالد کہ دریں کارگاہ نقشہائے بدیع انگیزد۔ و در ریختہ ہائے غالب بے نوا را بقالب الطباع فرو ریزد۔ از آنجملہ دیوان ریختہ کہ در ناتمامی تمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بتمامی و آنگاہ بنظر سامی رسد۔ ہم چنیں پنج آہنگ و دیوان فارسی کہ طرازش ہر یکے وابستہ بفراہم آمدن درخواستہائے خریداران است بہنگام خود بہیم بخدمت خواہد پیچید و اوراق اخبار خود در ہر ہفتہ میرسد۔ و ایں رشتہ را بیم گسستن نیست۔ کارپردازان مطبع نام نامی را آرائش عنوان فہرست خریداران ساختند و مرا از نظر یافتگان و الا نظر شناختند۔"

اسی طرح، غالب نے ممکن ہے اپنے دیگر احباب کو بھی خط لکھے ہوں، لیکن ایسا کوئی خط موجود نہیں۔ دیوان اردو اسی مطبع سے اکتوبر سنہ ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ یہ غالب نوازی کا سلسلہ، سرسید احمد خاں[1] سے آج تک وابستہ ہے۔ چنانچہ علی گڑھ والوں نے جو کام غالب کے سلسلہ میں کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ برلن سے دیوان غالب کا ایک اڈیشن اسی ادارہ کے ایک فرد نے شائع کرایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید بشیر حسین زیدیؒ وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اور موجودہ دور میں علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر اس کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری کتابیں اس محنت کے نتائج ہیں، جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک بھتیجے کے خلوص کا نتیجہ ہے۔

سرسید احمد خاں نے ۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۴۶ء کو "آثار الصنادید" مکمل کی، اور غالب سے تقریظ لکھوائی۔ غالب کو اگرچہ ابتدائے عمر سے تذکروں میں جگہ ملنے لگی تھی۔ لیکن سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں جس تفصیل کے ساتھ غالب کے حالات لکھے، وہ اور کسی نے اس وقت تک نہیں لکھے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کی کل تصانیف سرسید کے پیش نظر رہیں۔ فارسی و اردو دیوان کے علاوہ جو کتابیں غیر مطبوعہ تھیں ان تک دوسروں کو رسائی نہ تھی، نیز

---

[1]: آپ جب ریاست رام پور میں وزیر اعظم تھے تو مکاتیب غالب کی اشاعت آپ ہی کی تحریک سے عمل میں آئی۔ غالب کی قیامگاہ رام پور کو ایک یادگار مقام بنانے کا کام بھی آپ ہی نے انجام دیا۔

غالب سے خاندانی تعلقات کی بدولت جو حالات سرسید کو معلوم ہوسکتے تھے دوسروں کا اُن سے واقف ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مثنوی "ابرِ گہر بار" کا ذکر سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی دیوان مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں شامل بھی نہیں کی گئی تھی۔ مثنوی کے متعلق سرسید احمد خاں نے لکھا ہے:

"اور ایک مثنوی اوپر غزوات رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہوچکی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی، گلدستۂ بزمِ احباب ہوگی۔"

غالب "آثار الصنادید" کے بڑے مداح تھے، چنانچہ انہوں نے اس کی تعریف نہ صرف تقریظ میں کی بلکہ اپنے احباب کو تحفۃً بھی ارسال کی۔ ان کے ایک خط بنام مولوی سید رجب علی خاں ارسطو جاہ میر منشی گورنمنٹ پنجاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "آثار الصنادید" غالب کو پسند تھی اور خود خرید کر ارسطو جاہ کو بطور ارمغاں بھیجی تھی۔ یہ خط "پنج آہنگ" میں شریک نہیں۔ ارسطو جاہ کے پوتے سید آغا حسین کے پاس آج تک یہ خط موجود ہے۔ اس کا ترجمہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ القاب کے بعد لکھتے ہیں:

"اس سے پہلے ایک عرضداشت جو آپ کے خط کے جواب میں بھی ڈاک کے ذریعہ بھیجی، غالباً آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ آج کل دوستوں میں سے ایک دوست نے ایک کتاب دہلی کی نئی اور پرانی عمارتوں کے نقشوں کے ساتھ لکھی۔ گویا ایک چمن سجایا ہے۔ علاوہ ازیں چوتھے باب میں جو کتاب کا آخری حصہ ہے، اس شہر کے شاعروں کے اشعار رقم کئے ہیں۔ کیونکہ یہ نسخہ جامعیت کے سبب سے مجھے پسند آیا۔ ایک نسخہ چھپا ہوا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے مطبع سے خرید کر بطور ارمغاں بھیج رہا ہوں۔ اور اس حقیر نذرانہ کے قبول ہونے کی امید رکھتا ہوں۔ اس کے پہنچنے کی رسید اور سابقہ خط کے جواب کا امیدوار ہوں۔ والسلام

اسد اللہ۔ یکشنبہ ۵ دسمبر ۱۸۴۷ء

اس خط میں غالب نے اپنے تذکرہ کی طرف نہایت ہی عمدہ پیرایہ میں ارسطو جاہ کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ سرسید احمد خاں نے اس تذکرہ میں حالات کے علاوہ نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل کیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غالب کے کس قسم کے کلام کو اس زمانہ میں پسند کیا جاتا تھا۔

سرسید احمد خاں نے جب نہایت محنت و جانفشانی سے "آئین اکبری" مصنفہ ابوالفضل کی تصحیح کر کے اس کو چھپوانا چاہا تو دہلی کی قابل ترین ہستیوں سے تقاریظ لکھوائیں۔ غالب نے بھی تقریظ لکھی لیکن غالب کے نزدیک چونکہ یہ کام اہم نہ تھا۔ اس لئے تقریظ میں اپنے دل کی بات کہے بغیر نہ رہ سکے۔ بظاہر تعریف کی جگہ تنقیص نظر آنے لگی۔ سرسید نے تقریظ واپس کردی۔ اس تقریظ کو بعض حضرات نے رنجش باہمی کا سبب قرار دیا ہے۔ ہوسکتا ہے سرسید کو کچھ ناگوار گزرا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب نے سرسید احمد خاں کو ایسا صحیح مشورہ دیا تھا کہ سرسید کچھ عرصہ بعد اسی پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ غالب کی تقریظ کا خلاصہ یہ ہے:

"سرسید احمد خاں کا یہ کام فضول اور بیکار ہے۔ اس کی ہمتِ بلند کے لائق نہیں۔ میں ریاکار نہیں ہوں، وفادار ہوں۔ ایسے کام کی تعریف کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ اگر آئین کے متعلق بات کی جائے تو انگریزوں کی طرف دیکھو کہ انہوں نے کیسے آئین مرتب کئے ہیں۔ ان کی ایجادات کی طرف توجہ دو کہ کیسی کیسی چیزیں ایجاد کی ہیں۔ ان کے آئین کے سامنے پہلے زمانہ کے آئین تقویم پارینہ ہے اور اگر طرزِ تحریر کے متعلق کہا جائے تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر عمدہ تحریر موجود ہے۔ خدا کو بخیل مت خیال کرو۔ مردہ پرستی کوئی اچھا کام نہیں ہے۔"

مولانا حالی اور ابوالکلام آزاد کے نزدیک یہ تقریظ رنجش باہمی کا سبب بنی۔ ان حضرات کے بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ سرسید احمد نے اس کا اثر ضرور لیا تھا۔ یہ شکر رنجی اس وقت دور ہوئی جب مرزا ۱۸۶۵ء میں رامپور سے واپس آرہے تھے۔ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے:

"سرسید کہتے تھے کہ جب میں مرادآباد میں تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے رام پور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر

جب دلّی واپس جاتے تھے، تو میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا۔ بظاہر جب سے سرسید نے تقریظ چھاپنے سے انکار کیا تھا، وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے۔ دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا۔ اور اس لئے مرزا صاحب نے مراد آباد آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرسید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا آپ خاطر جمع رکھئے، میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے، مرزا نے کہا۔ " بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں لے جاکر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے۔" بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ! کس نے پی ہے؛ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی دور ہو گئی "

مولانا ابوالکلام آزاد بھی " الہلال " میں مراد آباد کے قیام کا مختصراً اسی نوعیت سے ذکر کیا ہے :

" سرسید اور غالب کے درمیان آئین اکبری کی تقریظ کے وقت سے ایک گونہ کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اور میل جول کے رسم ختم ہو گئے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ رامپور گئے تو سرسید اس زمانہ میں مراد آباد کے صدر الصدور تھے۔ اگرچہ ذہاب و ایاب میں مراد آباد سے گزرے لیکن سرسید کو اطلاع نہ دی۔ واپس ہوتے ہوئے وہ سرائے میں ٹھہرے تو سرسید کو کہیں سے خبر مل گئی۔ وہ فوراً سرائے میں پہنچے۔ بہ اصرار غالب کو مکان پر لے گئے اور ایک دو روز ٹھہرایا۔ اس کے بعد کشیدگی رفع ہو گئی "

رامپور سے واپسی پر مراد آباد کے قیام کی وجہ سے بعض حضرات کا خیال ہے کہ سرسید نے غالب کی صفائی حکومت برطانیہ سے کرانے میں کوشش کی۔ مولانا آزاد کا کہنا ہے :

" جن لوگوں نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لئے خاص طور پر کوشش کی تھی، مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سرسید مرحوم بھی تھے "

اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ذریعہ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن سرسید اور غالب کے دیرینہ تعلقات کے پیش نظر یہ بات بعید بھی نہیں کہ جہاں غالب کے اور مخلصین اس سلسلہ میں کوشاں تھے ان کی پریشانی دیکھ کر سرسید نے بھی یقیناً کوشش کی ہوگی۔ اگرچہ غالب نے خود اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ وہ اس کو خدا ساز بات کہتے ہیں۔ نواب رامپور کے دخل کو بھی نہیں مانتے، یوسف مرزا کو لکھا :

" خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والئ رامپور کو اس پنسن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خدا ساز ہے۔ بعلی ابن ابی طالب علیہ السلام "

شاید یہ کہنا مبالغہ تصور کیا جائے گا کہ اگر غالب نہ ہوتا تو سرسید سب کچھ بن جاتے، مگر سرسید نہ بن سکتے۔ اگرچہ ہر عظیم انسان میں جوہر خداداد ہی ہوتے ہیں اور وہ انہی کی بدولت شہرت و ناموری حاصل کرتا ہے۔ پھر بھی بعض خدا ساز اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جو اس کے جوہروں کو ابھرنے اور جلا پانے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر وہ خدا ساز اتفاقات نہ ہوتے تو ممکن ہے یہ جوہر خوابیدہ ہی رہتے یا اتنی جلد اور اتنی شدت سے ترقی پذیر نہ ہوتے اور نہ ان کی وہ کیفیت ہوتی جو اس حسن اتفاق سے پیدا ہو گئی۔ سرسید پر غالب کا اثر کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ کچھ تو وہ خود ہی مرد باعمل تھے۔ اور اصلیت و اقعیت کی طرف طبعاً مائل۔ اور کچھ غالب کی اصلیت پسندی سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی جس نے ان کا کتابی اور روایتی باتوں سے رُخ موڑ دیا اور پوری شدت سے حقائق زندگی کی طرف اعتنا کرنے اور ان سے نبٹنے کی تحریک دلائی۔ اس ضمن میں " آئین اکبری " کی تقریظ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ صرف سرسید ہی کے سلسلہ میں نہیں بلکہ اس تمام دور کے سلسلہ میں۔ کیونکہ اس سے قرون وسطیٰ کے بجائے دور جدید کی طرف رُخ بدلنے کا عمل بیّن طور پر دکھائی دیتا ہے جس کی روح عقل، عمل اور تجسس ہے۔

سرسید جن وجوہ سے اپنے بلند مقام پر پہنچے۔ ان میں سے ایک اصلاح جدید اور دوسرا سادہ و سلیس طرز نگارش ہے۔ ان دونوں باتوں کا سرچشمہ غالب کی ذات ہے۔ اصلاح جدید کے سلسلہ میں حسب ذیل حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"آئین اکبری" کی تقریظ کے سلسلہ میں مجملاً بیان کیا جا چکا ہے کہ غالب نے سرسید کے اس کام کی تعریف نہ کی اور ان کو ایک نیا راستہ دکھانے کی کوشش کی۔ غالب کلکتہ میں دو سال سے زائد عرصہ رہ کر انگریزوں کی ایجادات وغیرہ کا مطالعہ و مشاہدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ تقریظ میں غالب نے یہی مشورہ دیا تھا کہ مردہ پرستی چھوڑ کر آئین و ایجادات نو کی طرف توجہ مبذول کرو۔ ایجادات میں سے دیاسلائی، دخانی کشتی، موٹر، ریل، ٹیلیگرام، ٹیلیفون، گراموفون اور گیس کی روشنی کے متعلق ذکر کیا ہے۔ ان کے بعد آئین و شیوہ و انداز کی طرف اشارہ کرنے کے بعد مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہست اے فرزانۂ بیدار مغز
در کتاب ایں گونہ آئیں ہائے نغز
چوں چنیں گنج گہر بیند کسے
خوشہ زاں خرمن چرا چیند کسے

اور ابوالفضل کے طرز تحریر پر نکتہ چینی کرنے کے بعد طنز کا ایک تیز نشتر لگاتے ہیں ؎

مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالب کی اس تحریر اور مشورہ کا ناگوار اثر سرسید کی طبیعت پر اس وجہ سے ہوا کہ غالب نے یہ بات اپنی روشن طبعی اور بالغ نظری کی وجہ سے بہت پہلے محسوس کر کے لکھ دی تھی۔ ہم سرسید کے اصلاحی پروگرام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ غالب نے جو بات اپنی مثنوی میں مبہم طور پر بیان کی تھی وہی سرسید کے ہاں ایک اصلاحی پروگرام بن گئی ہے۔ غالب نے اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے عملاً اس کی تفصیل پیش کی ہے۔

غالب کے اس قسم کے افکار اس زمانہ کی روش کے خلاف تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اکثر لوگ قدیم تہذیب کے دلدادہ تھے۔ کورانہ تقلید لازمۂ تہذیب تھی۔ لیکن غالب کی نگاہ دور بیں اس دور اور اس تہذیب کو ختم ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ایک نئے دور کی آمد کا اس کو شدید احساس تھا۔ چنانچہ جنوں بریلوی نے جب کسی مشاعرہ کی طرح طلب کی تو قلعہ کے مشاعرہ کے سلسلہ میں یہ بات صاف لکھ دی۔ "یہ صحبت خود چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں! کیا معلوم اب کے نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو"۔ غالب نے اپنے خیالات کی بدولت قدامت پرستی کے خلاف ایک جہاد کیا اور ترقی کے نئے راستے دکھائے، ہمارے خیالات کو بدلا، نیا انداز فکر عطا کیا۔ غالب کی طبیعت ترقی کی طرف مائل تھی اور وہ ترقی کو بہر طور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سرسید کو بھی اسی ترقی کا راستہ دکھانا مقصود تھا۔

سادہ زبان و سادہ اسلوب کے سلسلہ میں بھی سرسید پر غالب کی بڑی چھاپ ہے۔ سرسید احمد خاں کو سادہ نثر نویسی کا امام خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی غالب کا فیضان صاف جھلکتا ہے۔ سرسید نے غالباً ۱۸۳۷ء سے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ۱۸۵۵ء سے کچھ عرصہ پہلے تک ان کی تحریر کا ڈھنگ وہی پرانا تھا جس میں عبارت کی رنگینی، الفاظ کی شوکت، تشبیہہ و استعارہ کی کثرت ہوتی تھی اور حرف معا صفر کے برابر۔ چنانچہ ان کی اور ان کے ہمعصروں کی تحریریں اس کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً غالب ہی کے ذکر میں "آثار الصنادید" کے یہ چند جملے:

> "بہ سبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور راس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور پیکر معنی پر احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ، دہن شکر اور ہر حرف زبان سپاس ہے ان کی نعت تربیت کا۔"

یہ عبارت تو بہت صاف ہے۔ ان کے معاصرین کی عبارتیں دیکھی جائیں تو بہت ہی گنجلک ہیں۔ جب "آثار الصنادید" دوسری مرتبہ ۱۸۵۵ء میں چھپی تو سرسید نے اس کا اسلوب نگارش بدل ڈالا۔ سادہ و سلیس نثر میں کتاب کو دوبارہ لکھا۔ غالب کے خطوط ۱۸۴۸ء تک کے دستیاب ہو چکے ہیں اور خیال ہے کہ وہ اس سے قبل بھی اردو میں خط لکھتے رہے ہوں گے۔ سرسید کا ان کے طرز سے متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں بلکہ یقینی ہے۔ چنانچہ مشاہیر اہل قلم اور مورخین، صغیر بلگرامی، مولانا شبلی، رام بابو سکسینہ وغیرہ کا یہی خیال ہے کہ سرسید کی سادہ نثر نویسی غالب کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے ہے۔ مولانا شبلی چونکہ سرسید کے ساتھی تھے، ان کا بیان سب سے وقیع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:



''گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج''
سر سید رح



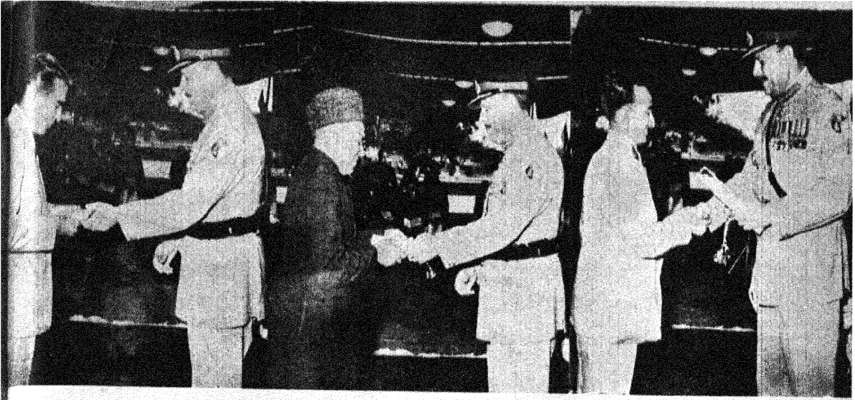
'' غالب نام اورم ''

دو شخصیتیں جنھوں نے تاریخ ملت میں ایک منفرد کردار ادا کیا ۔

'' گلشن نا آفریدہ'' جو کبھی صرف نشاط تصو تک محدود تھا آج ایک حقیقت ہے



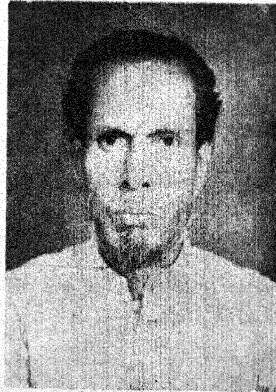
میر سید علی ' غمگین ' ملقب بہ 'خدانما
(ان چند خوش قسمت افراد میں سے ایک جن کے ساتھ غالب نام آورکی رسم مراسلت رہی)



آدم جی ادبی انعامات ، ۱۹۶۰ (رائٹرز گلڈ) : عبدالستار (بنگلا)، غلام عباس (اردو)، شوکت صدیقی (اردو)



ملت کے افق کے لئے سامان تب و تاب



روشن یزدانی (بنگلا)

بیگم زینت رشید احمد (پرنسپل ویمنز کالج کراچی) : تمغۂ قائد ا

"آثار الصنادید" جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اُردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر لیتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم مسرت و خوشی، حیرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہیں کہ اردو انشار پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سر سید مرحوم تھے اس کا سنگ بنیاد درصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سر سید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سر سید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔"

رام بابو سکسینہ کا بیان ہے :

"سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقش اول غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔"

صاحب "داستان تاریخ اُردو" (حامد حسن قادری) کا قول ہے :

"سر سید نے بعض مضامین "مکالمہ" کے طرز میں لکھے ہیں۔ اُردو میں یہ روش غالب کی ایجاد ہے۔ ان کے طرز مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غالب کا تتبع کیا ہے۔"

اختر جوناگڈھی کی بھی یہی رائے ہے :-

"۱۸۴۷ء میں جب "آثار الصنادید" ایسی معرکہ آرا کتاب لکھی جس کی بہت شہرت ہوئی۔ لیکن اس کے طرز تحریر میں کوئی خاص تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔ جب غالب کی سادہ نثر نے ان پر گہرا اثر ڈالا تو وہ بھی اس رو میں بہہ نکلے۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے آثار الصنادید کا دوسرا اڈیشن تیار کیا تو مقفٰی و مسجع نثر کے بجائے اس کی زبان بالکل سادہ و سلیس بن گئی۔"

سر سید نے غالب کے طرزِ نگارش کا اثر قبول کیا۔ مسجع و مقفٰی طرز تحریر کو ترک کر کے سادہ و سلیس زبان میں لکھنا شروع کیا اور اسی کو ترقی دے کر علمی و اصلاحی مضامین لکھے۔ بلاشبہ ان کی کوششوں نے اردو زبان کو بہت جلد دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ ان کے دور کے وہ ممتاز اہل قلم جنھیں اردو نثر کے عناصر خمسہ کہا جاتا ہے سب کے سب سر سید سے متاثر اور نئی پود تو کلیتہً ان کی متبع ہے۔

غالب کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے زبان و ادب پر احسان کرنے کے علاوہ اپنے عہد کی چند ہستیوں کو ایسا متاثر کیا کہ وہ مستقبل کے لئے عظیم کارنامے سرانجام دینے کے لائق ہو گئیں۔ اس سلسلہ میں سر سید اور حالی ممتاز نظر آتے ہیں۔ سر سید نے اصلاحِ ملک و قوم اور زبان و بیان کی جو خدمات انجام دیں ان کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ اگر غالب، سر سید کی توجہ دورِ جدید کے تقاضوں کی طرف منعطف نہ کراتے تو نہ معلوم ہمیں اس موجودہ منزل تک پہنچنا نصیب بھی ہوتا یا نہیں۔ اور اگر پہنچتے تو نا معلوم کتنے دشوار اور پُر پیچ راستوں سے گزرنا پڑتا اور کن سخت مراحل سے دوچار ہونا پڑتا کیونکہ دو قومی نظریہ کا نتیجہ پاکستان ہے اور دو قومی نظریہ کا مصدر و منبع سر سید کی ذات۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ براہ راست ہمارے موجودہ انقلاب اور اس کے سربراہوں تک پہنچتا ہے۔

شاعری میں مولانا حالی نے جو خدمات انجام دیں ان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ غالب نے علم و ادب میں کورانہ تقلید سے گریز اور شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنا اختیار کیا تھا اور کہا تھا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل ۔۔۔ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مولانا حالی نے شاعری کے پرانے بُت توڑ کر اہل قلم کو نئے راستہ پر چلنے کی جرأت بخشی۔

موجودہ دور کی سیاسی اور قومی بیداری، علمی اور ادبی ترقی، شعری اور فنی بلندی میں غالب براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز رہا ہے۔ آج جب کہ ہم ترقی کی ایک منزل پر پہنچ کر کسی واضح اور متعین راہ کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ ہماری یہ منزلِ ارتقا، ایک مقصد، ایک نصب العین کے سبب ہمیں حاصل ہوئی لیکن ہم اس منزل کو پا لینے کے بعد مقصد اور نصب العین کو کھو بیٹھے جس کے فقدان سے پیدا شدہ نتائج سب پر ظاہر ہیں۔ لہٰذا ہمارا ادب پھر کسی غالب کا خواہاں ہے ہمارا ملک، ہماری قوم، ہمارا معاشرہ، ہماری تعلیم پھر کسی سر سید کی طالب ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ ان عہد آفریں شخصیتوں کا یہ نظری و عملی فیضان ہمارے عہد میں بھی بیش از بیش تشکیل و تعمیر نو کا متقاضی ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلہ بلاشبہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

نشانِ زندگیٔ دل بود پذیرفت مالیست ۔۔۔ جلائے آئینۂ چشم دیدنست مغتنم

نقش ہائے رنگ رنگ ۔ ایک پہلو

(غالب کے چند نادر فارسی خطوط)

اکبر علی خاں

غالب کی کتنے ہی لوگوں سے مراسلت رہی۔ وہ تھے ہی اردو میں مکتوب نگاری کے امام۔ اور ان کی ساری زندگی شعر و سخن کے علاوہ اسی دشت کی سیاحی میں ہی گزری۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس معاصر کے نام بھی انہوں نے کوئی خط، رقعہ۔ یا رسید تک لکھ دی، وہ زندۂ جاوید ہوگیا۔ اگرچہ ان میں سے بعض اصحاب اس وصفِ اضافی نہیں بلکہ ہنرِ ذات کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انہیں میں سے ایک میر سید علی غمگین المعروف "حضرت جی" ملقب بہ "خدا نما" تھے۔ جن کے ساتھ غالب کے بہت گہرے مراسم رہے اور دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

یہ خطوط کتابی شکل میں کتب خانۂ فیض کاشانۂ حضرت جی غمگین، گوالیار میں محفوظ ہیں۔ یہ قلمی کتاب ۱۶ خطوط کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ اس میں دس خط غالب کے ہیں جو انہوں نے حضرت جی غمگینؒ کو تحریر کیئے تھے اور دو لکھنؤ کے دوسرے احباب کے نام ہیں۔ حضرت غمگین کے صرف ۴ جوابی خط ہیں۔ یہ تمام ۱۶ خطوط فارسی میں ہیں۔ تعداد صفحات ۴۹ اور تقطیع ۹/۶ ہے۔

حافظ بہاں ہدایت النبی قادری مرحوم نے انہیں اصل خطوط سے ۱۲۵۷ھ میں ایک مجموعے کی شکل میں نقل کیا تھا۔ یہ بھی ایک صاحبِ ذوق بزرگ تھے اور ان کا ذاتی کتاب خانہ بہت قیمتی تھا۔ جو ہنگامۂ ۵۷ء میں تباہ ہوگیا۔ ممکن ہے اس ذخیرے میں غالب کے اصل خطوط بھی ضائع ہوگئے ہوں۔

غالب شناسوں کے لئے حضرت غمگین کی شخصیت غیر معروف نہیں۔ "پنج آہنگ" میں ان کے نام غالب کا ایک خط شامل ہے (دیکھئے کتاب مذکور طبع ۱۸۵۳ء۔ صفحات ۳۶۴ ۔۔ ۳۶۶)۔ یہ خط "اسِ مجموعۂ مکاتیب" میں بھی شامل ہے۔ اس مطبوعہ خط کی تاریخ تحریر پنجم ربیع الاول ۱۲۵۵ھ ہے۔ لیکن "پنج آہنگ" میں تاریخ کا ذکر نہیں کیا گیا۔

یہ مراسلت ۱۲۵۳ھ کے درمیانی وقفے کی ہے۔ غالب کے صرف ۳ خطوط پر اندراجِ تاریخ ہے، باقی کسی پر نہیں۔

غالب کے ساتھ روابط کی بنا پر غمگین میں قدرتی طور پر دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے اور ذوقِ شناسائی اپنی تسکین چاہتا ہے۔ آیئے ہم اس بزرگ کو ذرا قریب سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

میر سید علی غمگین دہلی میں ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان دہلی کا ایک مشہور خاندان تھا جو اپنی خدا آگاہی اور درویشانہ طرزِ زندگی کے ساتھ حکومت میں بھی اثر و رسوخ رکھتا تھا اور دروقت کی سیاست سے بھی وابستہ تھا۔ غمگین آغازِ عمر میں عشقِ مجازی میں کھوئے رہے اور مومن کی طرح غم پردہ نشیں کی مستیوں سے دل بہلایا کئے لیکن فطری طور پر وہ اس کوچہ کی رہ نوردی کے لئے موزوں نہ تھے۔ چنانچہ انکی زندگی نے پلٹا کھایا اور وہ جادۂ مجاز سے شاہراہِ حقیقت کی طرف نکل آئے۔ یہی ان کے دہلی چھوڑنے کا سبب ہوا۔ انہوں نے تلاشِ حق کی خاطر شاہ ابوالعلا کے آستانے پر حاضری دی جو گوالیار کے قریب واقع ہے اور اس طرح ہمیشہ کے لئے گوالیار کے ہوگئے۔ چنانچہ یہیں ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۱ء) کو انتقال کیا۔ گلستانِ بے خزاں، عمدۂ منتخبہ، عیار الشعراء، مجموعۂ نغز، گلشنِ بے خار، سخن شعراء، آبِ حیات میں ان کا تذکرہ مل جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غمگین بلحاظ زمانہ اردو کے اہم شاعروں میں ہیں۔ ان کا کلام ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن جو کچھ بھی تذکروں وغیرہ میں ملتا ہے۔ اس سے شاعر کے صالح ذہن کے نقوش اجاگر ہوجاتے ہیں۔

تصوف اور عشقِ مجازی دونوں میدانوں میں انہوں نے نغمہ سرائی کی ہے۔ ہنگامۂ شوق کے زیرِ اثر ان کے اشعار میں بیباکی بھی ہے مگر مذہب کا اثر عشقیہ لطافتوں کے بیباک اظہار پر قادر نہیں ہونے دیتا

اس لئے تاریخی اہمیت کے باوجود ادب کا طالب علم ان کے کلام میں شعری لذت سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہاں حیات وممات کی عقدہ کشائی کے ساتھ رندی و بیباکی کے عناصر بھی جلوہ گر ہیں لیکن طریقِ ادا میں یکسر ازکم میر و سودا والی بات نہیں اور ان جیسے مزاج کے شعر گو سے یہ توقع کچھ زیادہ بھی ہے۔ پھر بھی غمگین کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

خود غمگین کے عہد میں ان کا جو مقام رہا ہو گا، اس سے واقفیت کے لئے ہمارے سب سے بڑے مددگار شیفتہ ہیں۔ انہوں نے اپنے تذکرہ میں غمگین کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اور ان کے شاعرانہ مرتبے کے مداح نظر آتے ہیں لیکن اس سب کے ہوتے ہوئے بھی غمگین کچھ زیادہ معروف نہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ وہ مرکزِ شعر و ادب سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ دلی کو خیرباد کہہ کر گوالیار میں اقامت گزیں ہونا ان کی ادبی شہرت میں مانع ضرور رہا ہو گا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ غالب سے ان کے تعلقات کا آغاز کب ہوا۔ وہ عمر میں غالب سے بہت بڑے تھے اور نواب الٰہی بخش خاں معروف سے قدیم روابط رکھتے تھے جس کا اندازہ دیوان معروف سے بھی ہو جاتا ہے، اسلئے بعید نہیں کہ اسی راہ سے غالب کو ان کی خدمت میں خُردانہ نیازمندی حاصل ہوئی ہو۔

حضرتِ غمگین نے اپنے دیوانِ رباعیات موسوم بہ "مکاشفات الاسرار" (۱۲۵۵ھ) کے دیباچہ میں غالب کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ غالب اور ان کے تعلقات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔

دنیائے شعر و ادب میں غالب کی اہمیت کا احساس اس دور کے بزرگوں کو بھی تھا۔ اس کے ثبوت میں غمگین کے دیوانِ رباعیات سے مندرجۂ ذیل تحریر ملاحظہ فرمایئے۔

بعد ازاں فقیر در بلدۂ گوالیار چند سال در صحبتِ شاہ ابوالبرکات صاحب و خواجہ ابوالحسین صاحب فایدہ ہا ربود۔ و از زمان سابق دیوان ریختہ گفتہ بودم، آں را دور کردم۔ والحال کہ عمر بہ ہشتاد و شش سالگی رسیدہ، آنچہ کہ وارداتِ برمن غالب بودند، موافق آنہا دیوان دیگر (مخزن الاسرار ۱۲۵۳ھ) در حالات و واردات و ذوق و شوق عشق حقیقی و مجازی خود ترتیب دادم، و بعض غزلیات مخصوصۂ دیوان سابق دریں دیوان لاحق مندرج ساختم۔ و چوں دیوان نو باتمام رسید و واردات و غلبات و کیفیات بر دلم استیلا داشت، خواستم کہ برائے برادر دینی عزیز از جان اسد اللہ خاں میرزا نوشہ متخلص بہ غالب و اسد کہ دریں زمانہ در نظم و نثر نظیر خود ندارد، و برائے برادرزادگان سید علی محمد عرف نواب شاہ جی و سید بدرالدین عرف فقیر صاحب و برائے فرزندان خود سید عبدالرزاق مشتہر بہ سید میرن علی و سید امیر حیدر رو میداں راسخ الاعتقاد اعطاہم اللہ محبتہٗ از ابتدائے سلوک حضرات قادریہ و نقشبندیہ تا انتہا در پیرایۂ رباعیات کہ بطور تصوف باشد، ترتیب دہم بنا علیہ از مضامین ادنیٰ تا اعلیٰ و تمامی آنچہ کہ معلوم یا غیر معلوم مردم باشد در رباعیات حسن اندراج پذیرفت کہ ہم مبتدی و منتہی ازاں بہرۂ کافی و حظے وافی بردارند، و از مسائل و اصطلاحات و اشغال و اذکار و عقائد صوفیۂ صافیہ و معانی بعضی آیات کریمہ و احادیث شریفہ و اقوال اولیاء اللہ و مشاہدات و مراقبات کہ مبتدی را ازاں گریزے و منتہی را گزیرے نباشد، در ضمن رباعیات غیر ردیف وار مندرج گردید۔ و در رباعیات ردیف وار مقامات و حالات و غلبات عشق حقیقی و مجازی و تجلیات صوری و معنوی خود تعلیمات مریدان و پند و نصائح و ترغیبات کہ در قلب رباعی گنجائش بیان داشت، بضبط انشا در آمد۔ و باقی را قابلِ طرز حکایت مثنوی دانستہ اغماض ازاں نمودہ شد۔۔۔۔۔"

حضرت غمگین نے مختلف اشعار میں بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(۱) دو چار شعر لکھ کے رہے بیٹھ ہمدمو
جو قصد اسد کی طرح کرے انتخاب کا

(۲) بہت سی سیر دواوین ہم نے کی غمگین
مگر اسد کے نہیں انتخاب سے نسبت

(۳) غالب کے انتخاب کو جو دیکھے غور سے
دیواں سے اپنے کیا وہ کرے انتخاب پھر

(۴) اسد کا انتخاب اپنی تسلّی کو کیا پیدا
جب آیا تنگ شعر شاعراں کی انتخابی سے

خود غالب کا رویہ غمگین کی طرف کیا تھا؟ یہ جاننے کے لئے غمگین کے نام اُن کے دو ایک خطوں کا طرز خطاب دیکھنا چاہیئے۔ غالب نے ہر موقع پر اظہار نیازمندی سے کام لیا ہے یہ عجز و انکسار جو غالب نے غمگین کے لئے برتا صرف اس حد تک نہیں تھا کہ وہ غمگین کو بلحاظ سن و سال قابلِ احترام جانتے تھے بلکہ اندازِ تخاطب سے ان کی علمی و ادبی اور دینی

بزرگی کا اعتراف بھی غالب نے کیا ہے۔

یہ خطوط اپنے موضوع کے لحاظ سے متنوع نہیں۔ لیکن اس لئے بہت اہم ہیں کہ غالب کے مذہبی عقائد میں سبائیت کا احساس دلاتے ہیں۔ بڑے حصے میں تصوف اور وحدت الوجود کے مسائل زیر بحث رہے ہیں۔ جن سے ایک طرف حضرت غمگین کی قابلِ احترام علمی شخصیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف خود غالب کے طباع ذہن کی بھی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے ان خطوط میں جہاں خصوصیت سے خلافت اور کار قضا کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے وہاں بڑی بہکی بہکی باتیں کی ہیں جن سے نہ کوئی شیعہ متفق ہو سکتا ہے نہ سنی۔

میں چاہتا تھا کہ غالب کے مذہب کے بارے میں تفصیل سے لکھتا اور غمگین کی بزرگ و برتر شخصیت پر بھی کھل کر بات چیت کرتا لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تمام خطوط مکمل شکل میں میرے سامنے نہ ہوں۔ اگر اس کا موقع مل سکا تو انشاء اللہ یہ گفتگو تفصیل سے کی جائے گی۔ اور چند خوشگوار تاریخ تک پہنچ جانا ممکن ہو جائے گا۔

یہ اقتباسات اور تفصیلات مجھے جناب محترم و مکرم رضا محمد حضرت جی نے فراہم کی ہیں۔ حضرت غمگین کی شبیہہ مبارک بھی موصوف ہی کا عطیہ ہے۔ میں اس علمی و ادبی تعاون اور دستگیری میں فراخ حوصلگی کے لئے ان کا بے حد ممنون ہوں۔

رضا محمد حضرت جی صاحب نے آئندہ بھی کرم فرمانے کا اقرار کیا ہے جو ان خطوط کی مکمل شکلوں کی صورت میں ہوگا۔ جب یہ مکمل خطوط دستیاب ہو جائیں گے تو غالب سے قریب تر آنے کے کچھ اور ممکنات پیدا ہو جائیں گے۔ فی الحال "غالب نام آورم" کے نقش ہائے رنگ رنگ کے اسی پہلو پر اکتفا کرتا ہوں جو اپنی تشنگی میں ایک گونہ سیرابی کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔

(غالب کے نقش ہائے رنگ رنگ خواہ وہ اردو نظم و نثر کی شکل میں ہوں یا فارسی نظم و نثر کی شکل میں، یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلئے ہم غالب اور غمگین کے چند فارسی خطوط، جو ادبی نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں، ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی اہمیت اسلئے بھی ہے کہ ان سے غالب کے امامت و خلافت کے بارے میں عقائد پر روشنی پڑتی ہے جن پر غمگین نے بہت عمدہ و مدلل بحث کی ہے۔ اور ساتھ ہی عین و غیر، اور باطل کا حقیقی مفہوم اور نازک فرق بھی ظاہر کیا ہے جس سے غالب کا حریف واقعی حریف غالب معلوم ہوتا ہے۔

اگرچہ فارسی اور وہ بھی غالب نکتہ داں کی فارسی ایسی جنس گرانمایہ ہے جس کی قدر دانی کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی ہم ان خطوط کو ان کی اہمیت کے پیش نظر تمام و کمال پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

(۱) مکتوب غالب بنام غمگین

حضرت پیر و مرشد برحق مدظلہ العالی

بسا روزہا بہ شب آمد و شبہا در شد تا صبح دولت من از افق اقبال دمید، و منشور لامع النور تعویذ بازوئے جاں گردید۔ نامہ موسومہ طالع یار خاں و حکیم قطب الدین خاں ہر دو بہ طالع یار خاں سپردہ شد، و فرمان جناب عالی رسانیدہ آمد۔ نامہ کہ بنام نامی فقیر صاحب بود بخدمت شاں رسید۔ اغلب کہ امروز یا فردا نزد من آیند تا پیام حضرت بزبان نیز برگزارم۔ می میرم از رشک کہ دیگراں آہنگ راہ گوالیار دارند، و مرا ہنگام آں قرار نیامدہ است کہ از دام بدر آئم جست۔ یارب زود باشد کہ کام دل برآید و زمان انتظار حکم ولایت در روزگار ہجراں بسر آید۔ و ایں روزہا غزلے در میانِ احباب طرح شدہ و در آں زمین دہ بیت گفتہ شدہ بود۔ بہ چشمداشت اصلاح دریں ورق نگارش می پذیرد۔ غزل فارسی[1]

در وصل دل آزاری اغیار ندانم ۔۔۔ دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم

زیادہ حد ادب۔ اسد اللہ نگاشتہ ہفتم دہم رجب ۱۲۵۵ھ

"ہمیں روز ورود والا نامہ۔ سید حیدر علی صاحب و سید امانت علی صاحب سلام نیاز خوانند و مشتاق دانند۔ بندہ شاہ شمائیم ثناخوان شما۔ مکرمی جناب حکیم رضی الدین حسن خاں نیز لا خدمت حضرت صاحب مراسم تسلیم و آداب می رسانند فقط"

(۲) مکتوب غالب بنام غمگین

قبلۂ دیدہ و دل سلامت

من دانم و دل کہ فیض ورود والا نامہ با من چہ کرد۔ با آتش آبے زد و چراغ آگہی برا فروخت۔ ہمانا آں قدسی صحیفہ شمع بود کہ ز درج برپروانگی آں ارزد۔ چکنم فرصت تنگ است و گفتگو فراواں۔ آدینہ روز بست

---

[1] "کلیات غالب" فارسی طبع سوم نولکشور لکھنؤ ۳۳ ۶ء صفحہ ۹۹ ۳ ملاحظہ ہو۔

ہفتم شعبان وہنگام بامدادست ومن ہنوز ازآنہا کہ مبتلائے آنم فراغ نہ یافتہ ام وآدم کمر بہ رہ روی بستہ رو بہ روی من نشستہ است۔ آنچہ در دیوان فیض عنوان دیدم کافر باشم اگر در مثنوی مولوی روم و دیگر کتب تصوف ایں ہا دیدہ باشم۔ خاصہ در رباعیات کہ ہر کوزہ دریای وہر ذرہ آفتابے دارد و اگر حیات باقی است زیں سپس حال رباعیات نگاشتہ خواہد شد...... بہ خاطر باشد کہ ما نیز بریں جادہ و بدیں اندیشہ دل نہادہ ایم تا پایان کار از کدام پردہ سر بر دن آوریم و در کدایں گروہ شمردہ شویم۔ دیوان بہ مخدومی و مکرمی سید بدرالدین علی خاں المشتہر بہ فقیر صاحب سپردہ و دیوان سابق از وشاں گرفتہ بہ آدم حضور دادہ شد۔ ایں نامہ بداں زودی کہ اندیشہ برنہ تا بد نگاشتہ می شود۔ در حقیقت پاسخ عنایت نامہ ہنوز نہ نوشتہ ام۔ زیادہ حد ادب۔

مشفقی میر حیدر علی صاحب پس از سلام مطالعہ فرمایند کہ پیر علی صاحب دریں روزہا بہ دہلی بودند۔ بعد عمرے ایشاں را دیدم امروز خود شاں بہ اکبرآباد روانہ شدہ اند می گویند ماہ روزہ بہ آگرہ بسر بردہ بہ گوالیار می روم اطلاعاً نوشتہ شد۔

عرضداشت اسداللہ روسیاہ

(۳) مکتوب بنام غمگین

قبلۂ حاجات! آنچہ نخست دل را بہ نشاط تونگر کرد.....

عنوان دیوان رباعیات شادماں تر ساخت۔ سرمایۂ آنم کو کہ آں مطالب عالیہ را نیک باز دانم و از کجا درخور آنم کہ آں ہمہ گہر بر رشتۂ نگارش از بہر من کشیدہ آید، وآں گاہ ایں مایہ مکرمت کہ خود می پرسند کہ اگر دستورے دہی دیباچہ را بنام تو نگاربندم۔ ایں پرسش خداداد لئے نوازشے دیگر است کہ زباں اندازۂ سپاس آں بر نتابد۔ قبلہ گاہا! فضولی می کنم و چوں فرماں چنیں است می گویم کہ گنجیدن نام من در آں نامہ نہ تنہا از بہر من بلکہ از بہر آبادی من سرمایۂ نازش جاودانی ست۔ لیکن ہمہ آں خواہم کہ مرید خود را بیش ازاندازہ درآں نگارش نستایند و کمترین بندۂ خود وانمایند کہ ہر آئینہ اندریں صورت ہم مدعائے خدام حاصل می شود، وہم خواہش ایں ننگ آفرینش روائی می پذیرد۔ و بالجملہ چشم براہم کہ دیوان رباعیات کے می رسد و من بداں کے می رسم۔ فرماں چناں است کہ آں نوشتہ را از نظر اغیار نہاں دارم۔ ہم چنیں خواہم کرد۔ اما غیر کو؟ پس از گذارش ایں بندہ کہ البتہ خلاف رائے دانش آرای نخواہد

بود، سخنے دلیر می گویم، تا حضرت را ذوق و مرا بہ اعتبار افزاید۔ بیتے از بیت ہائے فقیر داخل صحیفۂ منتخب است۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

من خود فرماں پذیرفتم۔ لیکن فرمان خرد اندریں باب آنست کہ ہر نگرندہ بدیدن آں الفاظ بہ کنہ معنی نہ می تواند رسید۔ وہر کہ معنی را نیک تواند فہمید، غیر نیست۔ چہ دریں عالم تفرقہ کعبہ و دیر نیست سخن ہائے دلآویز کہ گستاخانہ گزاردہ شد، خاطر نشاں و دل نشین باد۔

زیادہ حد ادب

عریضہ نگار اسداللہ روسیاہ روز نگارش نامہ دہم ذی الحجہ ہنگام شام (۱۲۵۵ھ)

(۴) مکتوب غمگین بنام غالب

جواب از طرف جناب حضرت صاحب شاہ غمگین دہلوی

مشفقا! آنچہ اعتراض بر لفظ غیر کہ باطل است حق فرمودہ اند، بسیار شادماں شدم۔ اللہ تعالیٰ باین جودت طبع و سخن زندانہ ملاقات جسمانی حاصل کناد۔ جوابش بشنوید۔ "غیر" لفظی است بے معنی چہ معنائی او "عین" است نہ "غیر" پس دریں صورت معنی ندارد۔ اگر عین گوئی حق را یابی۔ و اگر غیر گوئی نیز حق را یابی۔ و اگر غیر چنانچہ در حق و باطل ہر جا کہ ظہور صفت "مضل" می باشد آں جا استعمال لفظ باطل می کنند و ہر جا کہ شان ظہور "ہادی" می باشد آں جا استعمال لفظ "حق" و ایں ہر دو صفت یک ذات اند ہماں طور لفظ "غیر" بہ مرتبۂ تقید لفظ "عین" بمرتبۂ اطلاق خیال فرمایند و اگر انا و انت و ہو ہذا کہ ازیں دوئی بر می خیزد از عبارت دور کنند کہ معنی حاصل نہ شود و برائے فہمایش ہر چہ گوئی جائز است و از گفتن لفظ "غیر" غیر نہ می شود، و از گفتن "عین" عین نمی گردد۔ آنچہ ہست ہست بے نام و بے نشاں ہر جا نامے و نشانے دیگر دارد......

...... اگر حال چناں است از طرف ما نیز اختیار دارید، و الا فلا۔ مصرعہ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد۔ مشفقا! ایں قوم برائے خدا با خدا ہمیشہ در جنگ اند و ہر دم زنار می بندند و می شکنند تا بپایہ عالی کفر اسلام می رسند۔ خیال فرمایند کہ اکثر اسرار را پوشیدہ داشتہ اند و اگر رباعیات فقیر چہ دستے کسی تقلیدی افتد و دکانے برپا سازد و خود را اقرار دہد و خلق را گمراہ کند و ہم بعضے سخنان تقلیدیان نیز می انداید

کرد"۔ زمانے خواہد آمد کہ راز ایں رباعیات ہم افشا خواہد شد۔ حالا ایں
طور بدارید۔ من ناچارم کہ بزرگان دیں چنیں کردہ اند و مارا از ابتدائے
سلوک تا انتہائے جذب حضرات قادریہ و نقشبندیہ تحریر نمودن منظور بود
و ایں اسرار کم کسے نوشتہ است .... داگر فی الحقیقت
پرسید تکبر نہ پندارید و فائدۂ خود دانید غیر ما ازیں عین شما خوشتر است۔

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک
شائستہ ہو اسپ جس کا چالاک
غمگین جو رخش بے محابا ہو تیز
انساں کو شرط اس سے ہے خوف و باک

زیادہ والسلام
۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء)

(۵) مکتوب غالب بنام غمگین

قبلہ و کعبہ حضرت پیر و مرشد برحق سلامت!

گفتم وائے عقدۂ دیگر بکارم افتاد و ہولناک مقامے پیش آمد
چہ من خود آں نخستیں نامہ را کہ در ڈاک بمن رسیدہ است حرز بازوئے
اندیشہ ساختہ و بہ گرمی آں گفتار چوں شکر در آب گداختہ ام۔ ہر چند
می بایدکہ بہ پاسخ آں قدسی صحیفہ دیدہ و دل باہم آمیختے و بہ رنگا رنگ
پوزش سخن انگیختے لیکن یزداں داند کہ از جرأت خود آں مایہ شرمسار
بودم کہ ہرگز عذر نتوانستم کرد و جواب آں ہمایوں منشور نتوانستم
نوشت تا ایں بار کہ نامۂ دیگر رسید بے قراری بر شرمساری افزود و
خواستہ و ناخواستہ مرا در سخن آورد۔ ہی ہی در عرضداشتے کہ از
فضولی و فزونی سری در عین و غیر سخن راندہ ام کہ ایں کلمہ کہ غیر کو؟
بدلہ بیش نیست و رنہ سخن ہماں است کہ حضرت می دانند و من
نیز بر آنم۔ واللہ آنچہ دریں ہر دو صحیفہ نگاشتہ کلک ہدایت رقم
بودہ است ہمہ بجا و حق و ستودہ است و اندیشۂ ایں ننگ آفرینش
نیز بر خلاف آں نیست۔ اما چہ کنم کہ وقت از دست رفت و سخن بے
خواست گفتہ آمد۔ ہمانا ذوق التفات حضرت پیر و مرشد دوست
آمد آمد سفینۂ رباعیات دل را آں چناں انجا برانگیخت کہ از خود
رفتم و در بیخودی سخنے گفتم۔ با ایں ہمہ از حضرت پنہاں نخواہد بود
کہ آں گفتار نہ بطریق دعوی بود نہ از راہ سرکشی۔ خواستم کہ ایں بدلہ
ذوق افزاید۔ آں خود مرا بہ گرداب تشویر افگند۔ خوش گفت آں کہ
گفت۔ مصرع

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

....

..... چوں حضرت در منع ارسال رباعیات سرزنشے بہ سزا فرمودند آئینہ
حیرانی بکار بردم و نہفتہ ہائے ضمیر پراگندۂ خود را دیوانہ وار آشکار کردم۔
اگر جرم من بخشیدنی نیست نوید عفو تقصیر دہند تا از سر مسلمان گردم
و بہ رحمت الٰہی ایمان تازہ کنم۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔
نگاشتہ بست ہشتم محرم روز شنبہ ہنگام چاشت از اسد اللہ
روسیاہ

میر صاحب مشفق سید حیدر علی(۱) صاحب سلام خوانند و خاک ساری ما از
مرا بجناب پیر و مرشد عرض داشتہ سعی دراں فرمایند کہ خطائے من بخشیدہ
شود فقط (۱۲۵۶ھ)

(۶) مکتوب غالب بنام غمگین

دیگر خط مرزا نوشہ بجناب حضرت صاحب مدظلہ العالی

"... سخن در باب رباعیات می رود۔ یا رب بیان من مخالف
مزاج پیر و مرشد نبود۔ سہ رباعی کہ در آغاز رقم یافتہ مضمون آں دارد کہ علیؓ
خلیفہ بود۔ و ایں عقیدہ را من ندارم۔ من علیؓ را امام دانم و دیگراں را
خلیفہ، خلافت مرادف سلطنت و ریاست است۔ بزبان عرب
رئیس و حاکم را خلیفہ گویند اگرچہ معنی لغوی نیابت است۔ بالجملہ علیؓ
بلا فصل بعد از نبی امام است و امامت امریست یزدانی و علی امام است
ہم در عہد خلافت ابوبکرؓ و ہم در عہد خلافت عمرؓ و ہم در عہد خلافت
عثمانؓ۔ و ایں کہ مشہور است کہ علیؓ بعد از عثمانؓ خلیفہ شد غلط است۔
اصل اینست کہ امام برحق علی مرتضیٰؓ چوں بعد از رسول امام شد ابابکر صدیقؓ
را خلیفہ کرد و امر قضا بوے سپرد تا قطع خصومات مسلمین نماید و بر مومنین
فرمانروا باشد و پس از او عمر را برگزید و ازاں بعد عثمان را خلافت داد۔
ایں ہر سہ تن بداد رد سپردند و نبی و امام را اطاعت کردند۔ بعد از عثمانؓ
ہیچ کس لائق عہدۂ قضا در مسلمین یافتہ نشد و آں کہ آرزو کردنی شائستہ

---

(۱) یہ بزرگ حضرت غمگین کے خلیفہ بھی ہیں اور میر منشی بھی۔ زیادہ تر تصانیف غمگین انھیں کے قلم کی نقل کی ہوئی ہیں جو شاہ غمگین اکادمی گوالیار میں محفوظ ہیں۔

این کار نبود لاجرم امامِ وقت کار قضا بعہدۂ خود گرفت و خود بقطع خصومات اہلِ اسلام پرداخت ۔ شاہ اگر کار قاضی کند او را قاضی نگویند و ہماں بالجملہ علی امام است در ہر عہد ۔ امّا خلافت خود بعد از حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ بہ بنی امیہ منتقل شد و ازاں گروہ بہ آلِ عباس رسید و ایں ہر دو گروہ برعکسِ خلفائے ثلثہ ستم ہا کردند و خونہا ریختند و امامت علی رضؓ و اولادش را نخو کردند و ائمہ را کشتند ۔

خبیث کسے کہ علی را خلیفہ نداند زیادہ چہ برطرازم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(۷) مکتوب غمگین بنام غالب

جواب باصواب از طرف جناب حضرت صاحب بہ مرزا نوشہ متخلص غالب و اسد

"مشفقا! من در بابِ تفضیل امیر علیہ السلام تحقیق شما خواستہ بودم نہ در امامت و خلافت ۔ شما از خلافت ہم جناب امیر را معزول کردید ۔ اوّل عفو تقصیر خواہم بعد ازاں چند حروف بنویسیم ۔ آں مشفق را شاید کہ معنی خلافت و امامت بہ تحقیق نرسیدہ کہ امیر علیہ السلام را صرف امام می دانید و خلیفہ نمی پندارید ۔ ایں مذہب تراشیدۂ سامی است ۔ ہر چند خوب دانم کہ آں مشفق از طریقۂ خود برنخواہند گشت لیکن چونکہ ایں فقیر دوست شما است واجب شد کہ آنچہ حق باشد می نویسم ۔ آں مشفق کہ خلافت را حمل بر سلطنت کردہ اند محض بے جا است و حقیقت سلطنت و خلافت ازیں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قیاس باید کرد کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

پس اگر خلافت مثل سلطنت می بود آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بلفظ عضوض نمی فرمودند و دیگر آں مشفق خلافت را حمل بر قضا بطور اہانت کردہ اند و حقیقت قضا ایں است کہ حدیث نبویؐ در حق علی مرتضیٰ واقع است کہ اقضیٰ ہم علی یعنی در جمیع امت ما اقضیٰ علی است پس موافق حدیث شریف در ہماں سی سال تا شش سال علی مرتضیٰ خلافت کردند و داخل خلافت شدند ۔ صرف امام دانستن بچہ وجہ و انصاب معنی خلافت تا آمدن لفہمیدہ اند کہ خلافت چیست نہ قضا است و نہ سلطنت بلکہ قضا و سلطنت نیز داخل خلافت اند نہ حقیقت خلافت ۔

و صاحب فتوحات مکّی از انواع چہارگانہ خاتمی دارد ۔ خاتمی نوع اوّل از ولایت محمدی کہ جامع بداں صوری و معنوی و مقرون خلافت باشد علی ابن ابی طالب علیہ السلام را نوشتہ ۔ زیرا کہ امر خلفائے راشدین است و مذہب سامی خلاف ایں حدیث است کہ :

الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ و قد تمت بعلی

و ایں خاتم را خاتم کبیر گویند و آں مشفق با وصف قد تمت بعلی بخلاف ایں حدیث بنی امیہ و آل عباس را خلیفہ پنداشتند و ایں سراسر خلاف است چرا کہ ایں ہمہ داخل ملک عضوض ہستند، داخل خلاف نیستند و چونکہ حق تعالیٰ بملائکہ فرمود کہ :

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط

پس ملائکہ مثل سامی بنی امیہ و آلِ عباس و اقبال ایشاں را تصوّر نمودہ گفتند : اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک ۔

پس تازیانۂ : انی اعلم ما لا تعلمون

خوردند ۔ پس مناسب چناں است کہ معنی خلافت از انّی اعلم ما لا تعلمون دریافت نمایند و اگر عقل کار نکند از کسے عارف بپرسند ۔ و ایں ہر چہار اصحاب در آں خلافت شریک کہ حق تعالیٰ ایں فرماید کہ انی اعلم ما لا تعلمون و درصورتیکہ ملائک از ادراک معنی خلافت محروم ماندند گلہ از آں مشفق عبث است و من چنانکہ از دو حدیث نبوی خلافت امیر علیہ السلام نمودہ ام شما از یک بطلان خلافت جناب امیر ثابت کنید ۔ و ایں فقرہ کہ نوشتہ اند کہ حضرت امیر از طرف خود اصحاب ثلثہ را قضا سپردند و وقتیکہ کسے قابل قضا نماند خود قضا اختیار کردند، ایں سخن در ہیچ کتاب دیدہ نشدہ ۔ شاید کہ در کتب روافض باشد ۔ و لطف ایں است کہ در خلافت عمر رضی اللہ عنہٗ فیصلۂ قضایای مسلمین جناب امیر علیہ السلام میکردند و عمر رضی اللہ عنہٗ فرمودہ بودند کہ تا ایں مرد دانا در شما است، ہیچ مسئلہ از ما میرسید ۔ مشفق من عجب تحقیق سامی است کہ اعیان ثابتہ را با امواج محیط و خطوط شعاعی را بہ آفتاب تشبیہ میدہید و خلافت را با قضا و سلطنت ۔ آنچہ آں مشفق می فرمایند در ہیچ کتب صوفیہ و اہلِ سنت و جماعت دیدہ نشدہ ۔ خداوندا کہ از کجا می فرمایند و مذہب ما موافق قرآن شریف و حدیث نبوی و اقوال عارفان صوفیہ است و خلاف ایں را مسلّم نمی دارم بلکہ باطل می دانم ۔ و ایں چہ طریقہ است کہ خبیث کسے کہ امیر المؤمنین را خلیفہ نداند و چوں سابق ارقام نمودہ ام کہ گفتگوئے ما بر ملاقات موقوف است لہٰذا بر ہمیں قدر اکتفا نمودہ شد کہ آں مشفق بریں حدیث مرقومہ نگاہ فرمودہ تأمل فرمایند

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

اخلاقیاتِ غالب

اقبال سلمان

غالب طاؤس و رباب کے دور میں پیدا ہوا اور طاؤس و رباب کے دور کی شاعری میں غمِ عشق کو محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ غمِ روزگار اس کے موضوع سے خارج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور اس کے زمانے کے دوسرے شعراء مثلاً مومن، ذوق، شیفتہ وغیرہ کا کلام غمِ روزگار سے قریباً خالی ہے، اور ظاہر ہے کہ جس فن میں غمِ روزگار نہیں ہوگا، اس میں کوئی پیغام بھی نہیں ملے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کے زمانے کی شاعری کو ہدفِ ملامت بنائیں، نہ اس دور کی شاعری کو ہمارے سامنے شرمندہ ہی ہونے کی ضرورت ہے۔ ہر زمانہ کا ایک مخصوص تقاضا ہوتا ہے۔ تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور اسی سبب سے فکر و عمل کے انداز بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں

جب غالب کے بعد، بلکہ یوں کہنا چاہیئے اس کی زندگی کے آخری ایام ہی میں طاؤس و رباب کے نغمے دم گھٹ کر رہ گئے، تو اُردو شاعری نے غمِ روزگار کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ خواجہ حالی وہ پہلے شاعر تھے، جنہوں نے بدلتے ہوئے حالات اور ان کے تقاضے کو ٹھیک وقت پر محسوس کیا اور اپنے کلام کو بڑی حد تک ایک پیغام کی شکل میں پیش کیا۔ ان کے بعد اکبر آبادی، اقبال اور متعدد دوسرے شعراء نے بھی پیغام و خطاب کی راہ اختیار کی جس سے فنِ شعر ہی کو وسعت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ عوام کی ذہنی اور فکری تربیت میں بھی بڑی مدد ملی۔

اصل موضوع سے ان الفاظ کا تعلق یہ ہے کہ اصولاً ہمیں غالب سے کسی قومی، معاشرتی یا اخلاقی موضوع پر اظہارِ خیال کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے لیکن اس کے کلام کے مطالعے سے جہاں ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے پُرشکوہ اندازِ بیان، ندرتِ خیال اور قدرتِ زبان کے لحاظ سے وہ ایک منفرد شاعر ہے، وہاں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ غمِ عشق کے علاوہ کسی نہ کسی حد تک غمِ روزگار کا بھی نقیب ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ زندگی کے مسائل سے بحث کرتے وقت وہ ایک معلم یا واعظ یا پیغامبر کا انداز اختیار نہیں کرتا۔ اسے اپنی رندمشربی، حسن پرستی اور بادہ خواری کا بخوبی احساس ہے اور اخلاق و معاشرت یا زندگی کے کسی اور مسئلے پر براہِ راست اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ بالواسطہ بھی اُس نے جو کچھ کہا ہے، اس میں اشارے کنائے سے کام لیا ہے، یا اپنے کسی تجربے کو اس پیرائے میں بیان کر دیا ہے کہ ہم خود بخود اس سے کوئی پیغام یا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ دعوی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ طریقِ بیان انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے اور بدرجۂ غایت مؤثر بھی۔

غالب کے کلام میں یا عمومی طور پر یوں کہہ لیجیئے تمام اُردو شاعری میں فکری یا نظریاتی تضاد اس ہمہ گیری کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، اسے عیب قرار دیا جائے یا خصوصیت۔ پھر یہ تضاد بھی ایسا نہیں کہ اسے کسی شاعر کے ذہنی ارتقا یا اُس کے مختلف حالات و تجربات کا نتیجہ قرار دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا جائے، بلکہ حالت یہ ہے کہ ایک شاعر ایک ہی وقت میں رجائیت کا اظہار بھی کرتا ہے اور قنوطیت کا بھی، خوشی کا بھی اور غم کا بھی مدح کا بھی اور ہجو کا بھی، بے نیازی کا بھی اور نیازمندی کا بھی، خودداری کا بھی اور چاپلوسی کا بھی۔ ایک شاعر کی ایک ہی غزل میں یہ سارے مضامین یکجا مل جائیں گے۔ اگر اس کیفیت کو پیشِ نظر رکھا جائے، تو غالب کے کلام میں کوئی غیر متضاد پیغام نہیں مل سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر چند اشعار کے حوالے سے اُسے ایک رجائی شاعر ثابت کیا جا سکتا ہے تو ایسے اشعار بھی مل جائیں گے، جو اُس کی قنوطیت پر دال ہو سکتے ہیں۔ بد اس حقیقت کے باوجود غالب کے ہاں وہ جواہر ریزے پائے جاتے ہیں، جنہیں اردو شاعری کا بہترین سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہمیں غالب کی اخلاقی تعلیم پر روشنی ڈالنی چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایک بے شکایت زندگی پر یقین رکھتا ہے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ بے شکایت زندگی کوئی معمولی مطمحِ نظر نہیں، بلکہ انسانی اخلاق کا ایک نہایت بلند مقام ہے۔ کسی آدمی کی شخصیت ناپنے کے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ اپنے ماحول

یا اپنی قسمت کے خلاف شکایت کی زندگی بسر کرتا ہے یا ان سے سمجھوتہ کر کے خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنی زیادہ اُس کی زبان آلودۂ شکایت ہوگی، اتنی ہی اس کی شخصیت بھی کمزور ہوگی۔ شکایت دراصل انتقام ہی کی ایک شکل ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جو شخص سیدھے طریقے سے انتقام نہیں لے سکتا وہ گلے شکوے کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح ہم انتقام لے کر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح شکایتیں کر کے اپنے تعلقات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ دوستی اور محبت کا نازک رشتہ شکایتوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ غالبؔ اس نفسیاتی حقیقت سے بخوبی واقف ہے، چنانچہ کہتا ہے:

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا!

یعنی دوستوں کا لطف و کرم تو بہرحال عزیز ہوتا ہے، لیکن ان کی بے التفاتی اور سرد مہری بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں اور باوجودیکہ ان کی بے اعتنائی اور بے رُخی سے میرا دل ویران ہو گیا ہے، حرفِ شکایت لب پر نہیں آ سکتا۔ اس کے برعکس میں نے شکایتوں کو اپنے دل میں اس طرح محفوظ کر لیا ہے، گویا ویرانے میں خزانہ دفن ہے۔ شعر میں "غبارِ دل" کے تعلق سے "ویرانہ" اور "گنج" کے لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنے مال و زر کو حفاظت کی غرض سے بیابانوں میں جا کر دفن کر دیتے تھے۔ ان لفظوں میں اسی دستور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غالبؔ کا یہ خُلق و مروت صرف دوستوں تک محدود نہیں، عام انسانی تعلقات میں بھی وہ یہی وطیرہ اختیار کرتا ہے جس کسی نے بھی اس کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کی، اس نے درگزر سے کام لیا۔ حتیٰ کہ جہاں اُسے دادرسی کا یقین ہے، وہاں بھی کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!

مطلب یہ کہ جو کچھ ہونا تھا، ہو گیا۔ ملاح نے میرے ساتھ بدسلوکی اور ظلم و ستم روا رکھا، مجھے اذیت پہنچی اور مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا سے شکایت کر کے داد و انصاف حاصل کر دوں اور خدا جو عدیل ہے، اس سے میرا بدلہ لے بھی سکتا ہے، لیکن اس سے کیا حاصل؟ مناسب یہی ہے کہ ملاح کی ایذارسانیوں کو فراموش کر دیا جائے۔ بڑائی بدلہ لینے میں نہیں، معاف کر دینے میں ہے۔ تقریباً یہی مفہوم اقبالؔ کے ایک شعر میں بھی پایا جاتا ہے:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ بھی غالبؔ کا ہم مسلک ہے، لیکن اس کے اندازِ بیان میں مجبوری سی پائی جاتی ہے، اس کے برعکس غالبؔ کا عفو و درگزر واضح طور پر رضاکارانہ ہے۔

عفو و درگزر کے علاوہ غالبؔ کے ہاں ہمیں خودداری یا عزتِ نفس کا پیغام بھی ملتا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بے نیازی اور بے احتیاجی کی حالت میں تو خودداری قائم رکھی جاتی ہے، لیکن اضطرار کی حالت میں بہت کم لوگ اس گوہرِ بے بہا کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مجبوری میں سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غالبؔ مجبوری اور اضطرار کی حالت میں بھی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ محبت سے بڑی مجبوری کیا ہو سکتی ہے؟ یہ وہ کیفیت ہے، جس میں انسان آرام و آسائش، نام و ننگ، مال و دولت بلکہ جان تک قربان کر دیتا ہے۔ میر تقی میرؔ نے کہا ہے:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

مصحفیؔ کہتا ہے:

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

مگر غالبؔ نے ایک نہایت مشکل مرحلے پر اپنی خودداری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا محبوب روٹھ گیا ہے۔ اسے منانا تو بڑی بات ہے، ناراضی کا سبب دریافت کرنا بھی وضع داری کے خلاف سمجھتا ہے:

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر نے کتنا خونِ جگر کھا کے غیرت اور خودداری کی یہ کیفیت برداشت کی ہوگی۔ عشق کی بغاوت فرو کرنے کے لیے عقل نے کن کن مصیبتوں کا مقابلہ کیا ہوگا۔ جذبات کی طغیانیوں میں پامردی کے ساتھ ڈٹ جانا اور عزتِ نفس کا دامن کسی صورت نہ چھوڑنا وضع داری کی نہایت قابلِ رشک حالت ہے۔ غالبؔ کے سوا شاید ہی کسی شاعر نے خودداری کی اتنی بلند اور اچھوتی مثال پیش کی ہوگی۔ امیرؔ کی خودداری کا

اونچا سے اونچا مقام اس کے نزدیک یہ ہے:

کسی امیر کی مجلس کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

صرف پہلا مصرع معمولی سی خودداری کا پتہ دیتا ہے۔ دوسرا مصرع محض خیال آرائی ہے، جس میں انسان کے قدرتی انجام کی رعایت سے ایک بات پیدا کر لی گئی ہے۔ اختیاری خودداری سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

ذوق کی خودداری کیا ہے؟ یہ کہ:

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

شاعرانہ تعلّی اور رعایتِ لفظی کے لحاظ سے ممکن ہے، یہ شعر قابلِ تعریف ہو، لیکن خودداری کا قابلِ عمل نمونہ اس میں بالکل نہیں۔ اسی طرح شاہ نصیر نے کہا ہے:

آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں
گر نہ خم تعظیم کو پہلے سرِ محراب ہو!

یہاں بھی خودداری کی کوئی ٹھوس ترغیب نہیں پائی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک لطیفہ کہہ لیجئے لیکن غالب اس موضوع کو چٹکلوں اور لطیفوں کی صورت میں بیان کر کے موضوع کی سنجیدگی اور متانت کو نقصان نہیں پہنچنے دیتا۔ بہرکیف، مقصود یہ نہیں کہ دوسرے شعراء سے اس کا مقابلہ کیا جائے ضمناً یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب نے خودداری کا جو معیار اپنے سامنے رکھا ہے، وہ فی الحقیقت بہت بلند ہے۔ خودداری ہی کے متعلق ایک اور مقام پر کہتا ہے:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

یعنی خضر کی بزرگی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی خودی اور خود اعتمادی کو جواب دے دیں اور انہیں اپنا رہنما تسلیم کر لیں۔ غالب تو اس بزرگ کو اس لئے بھی رہنما نہیں مانتا کہ وہ ایک دفعہ سکندر کو دھوکا دے چکے ہیں:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

"آزمودہ را آزمودن جہل است" کی کتنی جامع تفسیر کی گئی ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
[illegible]

بندگی، بے چارگی کا دوسرا نام ہے، لیکن اس حال میں بھی جہاں ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم خدا کی طرف رجوع کریں، وہاں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ خدا کا رویہ کیسا ہے۔ اس کا باب اجابت ہمارے لئے وا ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کا دروازہ ہمارے لئے کھلا ہے تو بہتر، ورنہ حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ الٹے پاؤں لوٹ آئیں۔ ایسے خدا کو ماننے کا کیا فائدہ، جو اپنے بندے کو قرب سے محروم رکھے؟

غالب کے ہاں رجائیت یعنی، امید پسندی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ وہ عام طور پر زندگی کے روشن پہلو کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور تاریک رُخ کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے، گویا وہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امید ہی وہ بنیاد ہے، جس پر زندگی کی ساری عمارت قائم ہے۔ یہ چہل پہل یہ رونق، یہ خوب صورتی، یہ حرکت کرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور اس کی زندہ اخلاقی قدریں صرف امید کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں۔ زندگی میں سے امید سلب کر لی جائے، تو انسان کی اولوالعزمی، نیکی، ہمدردی، سچائی اور احسان و مروّت ایسے اوصاف اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ جس شخص کے دل میں امید کی شمع روشن نہیں، اس کی اخلاقی حالت مشکوک سمجھنی چاہیے۔

غالب کی رجائیت کا یہ عالم ہے کہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی شعاعیں تلاش کر لیتا ہے۔ ایک دانش مندانہ کہاوت ہے کہ ہر چمکنے والی بجلی گرتی نہیں اور گرے بھی تو لازم نہیں کہ ہمیں پر گر پڑے۔ غالب کا اندازِ فکر بھی یہی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ رجائیت، کردار کی یہ مضبوطی اور قلب و روح کی یہ بلند ہمتی اردو شاعری کے پورے دفتر میں کہیں نہیں ملے گی۔ شعر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مصیبت آتی ہے، تو آیا کرے۔ یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ وہ ہمیں پر نازل ہوگی۔ ایک روشن تجربہ یہ بھی تو ہے کہ مصیبت سامنے آتی ہوئی دکھائی دی، لیکن اپنے دھیان گزر گئی۔ یہ درست ہے کہ ایک آشیانہ بجلی کی زد میں آ کر راکھ ہو گیا ہے، لیکن کیا ضرور ہے کہ وہ میرا ہی ہو۔ میں خواہ مخواہ اپنی جان کیوں ہلکان کر دوں؟

اگر کسی مہم کی ناکامی لوگوں میں مشہور ہو جائے، تو وہ اس کا تجربہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، مبادا ہمیں ناکامی ہو۔ غالب کے نزدیک یہ [illegible] ناکامی سے بھی مایوس نہیں

ہوتا اور اعتماد کے لہجے میں سعیٔ دیگر کی دعوت دیتا ہے :

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

وفاداری، بشرطیکہ استوار و مصمم ہو، غالب کے نزدیک جزوِ ایمان نہیں، بلکہ اصل ایمان ہے اور اگر یہ خوبی کافر میں بھی پائی جائے، تو وہ مومن کی سی تعظیم و تکریم کا مستحق ہو جاتا ہے :

وفاداری بشرط استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

وہ ہمیں تسلی دیتا ہے کہ مشکلات و مصائب سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ان کا تجربہ کرنا چاہیئے اور یہ تجربہ ہمیں بتائے گا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جو آخرکار آسان نہ ہو جائے ۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں !

وہ گفتگو میں ادب آداب، شائستگی اور مخاطب کا احترام ضروری سمجھتا ہے :

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ؟
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے ؟

وہ اپنا قصور کسی دوسرے کے سر تھوپنے کا قائل نہیں۔ مرد وہ ہے جو مردانہ وار اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اپنی بجائے کسی بے گناہ کو مصیبت میں مبتلا نہ ہونے دے :

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

کسی ہنر میں کمال حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اہلِ کمال سے بغض و کدورت روا رکھی جائے ۔ خوبی جس کسی میں بھی پائی جائے، اس کا اعتراف کرنا چاہیئے :

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک اور غزل کا مقطع ہے :

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی فن میں کمال پیدا کرنا چاہیئے تاکہ قدر و عزت حاصل کر سکے :

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

غالب کے ہاں سچائی کی ترغیب بھی پائی جاتی ہے :

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر میں دو شعر ایسے پیش کیے جاتے ہیں، جن میں غالب ہمیں براہ راست خطاب کر کے اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ ان شعروں میں بدگوئی سننے اور غیبت کرنے کی مناہی کی گئی ہے، غلط کاری کو روکنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ نصیحت کی گئی ہے کہ خطاکار کو بخش دینا چاہیئے :

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

٭

غالب سرائیکی میں

دلشاد کلانچوی

ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں وہ آئے ۔ اس لئے امید ہے اُردو خواں حضرات مغربی پاکستان کی بولی "سرائیکی" کو نہ جانتے ہوئے بھی اپنے محبوب شاعر غالب کو پہچان لیں گے ۔ جو اس ترجمہ میں جلوہ گر ہے ۔ مترجم کے حسنِ سعی سے دیوان اردو تمام و کمال سرائیکی میں منتقل ہو چکا ہے ۔ (مدیر)

ایہو نہ ہئی اساڈی قسمت، جو وصال یار ہوندا
جو ہیا وی جیندے رہندے، ایہو انتظار ہوندا

ودے وعدے تے ہیں جیندے تاں ایہ جانی کوڑ بھیو
ایں خوشی توں مرنہ ونجدے، جو کجھ اعتبار ہوندا

تیڈی نازکی کنوں ہئی جو بدھا ہا قول ڈھلا
نہ تروڑ ایکوں سگدا، جو ایہ پکی تار ہوندا

کوئی میڈے دل توں پچھے تیڈے تیر ادھ چھکے کوں
ایھا دل کوں نہ کھٹکدا، جو جگر دے پار ہوندا

ایہ کتھوں دی دوستی ہے، جو بنڑیا ہے دوست ناصح
کوئی میڈا دارو بنڑدا، کوئی غمگسار ہوندا

جو پتھر دے چھوں ایہ وگدا تاں لہو کڈھیں نہ تھمدا
جیکوں ڈکھ سمجھ گیدھا ہئی جو ایہو شرار ہوندا

ایہ جیو ڈکھ ہے، جان گھسی ایہ جو دل ہے کتھاں ٹلدا
جو ایہ عشق ڈکھ نہ ہوندا، ڈکھی روزگار ہوندا

میں جو آکھاں، کیکوں آکھاں، ڈکھی رات ہک بلا ہے
نہ میکوں مرن برا ہا، جو ایہ ہکی وار ہوندا

تھئے مرنے دے جو رسوا، تھئے کیوں نہ غرق دریا
نہ جنازہ کوئی چودا، نہ کوئی مزار ہوندا

اوکوں ڈیکھ کون سگدا، جو ہے ہکو کہیں تے وکھرا
کوئی ڈو دی چھاوی جو ہوندا تاں ملنڑ وچار ہوندا

ایہے مسلے تے تصوف ایہ تیڈا بیان غالب
تیکوں تاں ولی سمجھدے، جو نہ بادہ خوار ہوندا

مخصوص سرائیکی حروف تہجی۔

ٻ = ب خفیف لہجے کے ساتھ، مثلاً بال بچے = بال بچے۔
ڈ = ڈ خفیف لہجے کے ساتھ مثلاً ڈانگ = ڈانگ ۔ ڈنڈا
ڳ = گ خفیف لہجے کے ساتھ مثلاً گڈ = گڈ

غالب کی تصویر کاری

(چند اشارے)

شمس الدین صدیقی

غالب کو تشبیہات و استعارات کا بادشاہ قرار دینے کی روش بہت عام ہے۔ اس سے اتنا تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ تشبیہہ و استعارہ سے بکثرت کام لیتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کونسی باتیں ہیں جو اس کی تشبیہوں اور استعاروں کو دوسرے شاعروں کی تشبیہوں اور استعاروں سے ممیز کرتی ہیں۔ غالب کے تخیل کے لئے بلندی، وسعت، گہرائی، گیرائی، باریکی، نزاکت، نفاست، لطافت غرض کتنی ہی صفات استعمال کی جاتی ہیں، لیکن تنقید کے میدان میں یہ الفاظ کچھ اس کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں کہ اپنی معنویت کھو بیٹھے ہیں۔ اس لئے میں عمداً ان سے پرہیز کروں گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ اجمالی طور پر غالب کی تصویر کاری (امیجری) کی امتیازی خصوصیات پیش کروں۔ تشبیہہ، استعارہ، تمثیل یہ سب چیزیں تصویر کاری کے ذیل ہی میں آتی ہیں۔

غالب کی تصویر کاری کی جو خصوصیت سب میں ممتاز نظر آتی ہے یہ ہے کہ اس کی تصویریں سکونی نہیں بلکہ متحرک ہوتی ہیں۔ لرزش، ارتعاش، رقص، جوش، ہنگامہ، مختصر یہ کہ حرکت غالب کی تصویر کاری کا جزوِ اعظم ہے۔ ان اشعار پر غور فرمائیے:۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اسی سلسلے میں دو غزلیں اور قابلِ ذکر ہیں جن کے ابتدائی مصرعے یہ ہیں:

ع پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ع عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے

حد یہ ہے کہ غالب پُر سکون، قائم اور غیر متحرک چیزوں کا تصور بھی متحرک حیثیت میں کرتا ہے، جیسے:

نہ پوچھ بےخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

غالب کی تصویر کاری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تصویریں سادہ و مفرد نہیں ہوتیں بلکہ مرکب، بوقلموں اور رنگا رنگ ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات نہایت روشن اور چمکدار بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ چند شعر دیکھئے:

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا

دستگاہِ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا
یک بیابانِ جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے

یہ سب تصویریں نہ صرف روشن بلکہ مرکب بھی ہیں اور متحرک بھی۔

غالب کے تخیل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسے وسیع و عریض، ارفع اور پُرعظمت چیزوں سے بہت رغبت ہے اور جلیل چیزوں کا بیان غالب اپنی تصویر کاری کے لئے غیر شعوری یا شعوری طور پر بہت کرتا ہے۔ چنانچہ دیوان غالب میں سیلاب، سیل، سمندر، بحر، قلزم بیاباں، صحرا، دشت، گردوں، نہنگ، پلنگ اور اسی قسم کی اور کئی پُرعظمت چیزوں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس کی مثالیں سارے دیوان میں بکھری پڑی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

★

ع بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
ع کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

★

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

★

ع دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

وغیرہ وغیرہ

غالب کی لذت پرستی، خصوصیت سے لمسی لذت کا اشتیاق اکی تصویروں میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر غالب نے اس میں ارتفاع پیدا کیا ہے جو دوسروں نے نہیں کیا۔ جرأت، مومن اور داغ کے ہاں بھی لذت پرستی ہے لیکن غالب کی سطح سے نیچی:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل
غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

پیش پا افتادہ، فرسودہ اور عام راہ سے ہٹ کر چلنا غالب کی ایک اور امتیازی خصوصیت ہے جو اس کی تشبیہوں اور تصویروں میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ویسے بھی نئی بات کہنے کے لئے نیا پیکر ضروری ہے۔ نیا پن اور دوسروں سے مختلف ہونے کی خواہش غالب کو اُلٹی بات اور اُلٹے انداز کی طرف راغب کرتی ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ عارضِ معشوق کو پھول سے تشبیہ دے، وہ کہتا ہے:

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

اسی طرح گھر کی ویرانی کو دشت سے تشبیہ دینے کی بجائے بات اُلٹ کر یوں کہتا ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس اُلٹے پن سے قطع نظر غالب کا نیا پن بجائے خود ایسی خصوصیت ہے جو اس کی اپج طبیعت کی دلیل ہے۔ چند نئی تصویریں اور تشبیہیں دیکھئے:

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی
غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے
در کار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے
مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

نیا پن پیدا کرنے کے لئے غالب اپنے وسیع مطالعۂ علمی سے بھی مدد لیتا ہے چنانچہ ایسی چیزوں اور ایسے واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو صرف وسیع المطالعہ اشخاص ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً:

آشوبِ فن

صہبا اختر

گیان دھیان کی سرد گپھا سے اُلجھی ہوئی خاموشی میں
اپنے اپنے فن کی سمادھی میں چنگاریاں ڈھونڈتے ہیں
اس امید میں راکھ سے جیسے فن کی جوالا پھوٹے گی!

ہم وہ جوگی ہیں جو ذہن کے برگد کی تاریکی میں
جب چنگاریاں بھی نہیں ملتیں راکھ کو کیا کیا پھونکتے ہیں
دل پہ ہر دم جمنے والی برف یقیناً ٹوٹے گی

★

ہم وہ کالیداس ہیں جن کے خواب شکنتلا جیسے ہیں
وہ جنگل بن جس کے سائے کہر کی طرح برستے ہیں
جیسے بھی ہو تاریکی کے اک اک غار میں جانا ہے

لیکن سندر بن کے بجائے جنگل بن میں رہتے ہیں
وہ جنگل بن جس کے زہری سانپ ہمیں کو ڈستے ہیں
فن کو امر کرنے والے امرت کا کھوج لگانا ہے

★

ہم وہ میرؔ ہیں جو محروم ہیں زلفِ سیہ کی اسیری سے
لیکن اپنا بھی رشتہ ہے خونِ دل کی گلابی سے
کس دن خرقہ جبّہ ہم نے مستی میں انعام کیا

واسطہ عطر فروشانِ حاضر کو نہیں دلگیری سے
ہم بھی بنے پھرتے ہیں پیئے بن کوچہ کوچہ شرابی سے
میرؔ کے رستے چل کر ہم نے میرؔ کو بھی بدنام کیا

★

ہم وہ غالبؔ ہیں اب جن کو قرض کی مے بھی ملتی نہیں
کوئی علائی جیسا نہیں اب ہم سے غزل لکھوانے کو
کوئی حالیؔ کوئی شیفتہؔ نغمے سننے سنانے کو

کوئی رام کلی اپنے نغموں کی آنچ سے کھلتی نہیں
کوئی نہیں در آتا دل میں رنگِ سخن برسانے کو
کوئی بہادر شاہ نہیں ہے لطف کا ہاتھ بڑھانے کو

★

میرے عہد کے کالیداسو، میرو، غالبو! بات سنو
ماہ و سال کے بارِ گراں سے جن پر جینا بھاری ہے
کون تمہاری نظم کا سامع کون غزل کا قاری ہے

مت شعروں کی سیج بچھا کر پیار کے کاغذی پھول چنو
اُن کی نظر میں شعر کا لکھنا مشغلۂ بیکاری ہے
دیدہ و دل کی گنگ فضا میں ہُو کا عالم طاری ہے

"نالۂ طائر بام"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

طائر زیر دام اور طائر بام کی نواؤں میں بنیادی فرق ہے۔ اور یہ فرق صدر پاکستان کی اس تقریر سے بخوبی نمایاں ہے جو انہوں نے اس سال راولپنڈی میں قائد اعظمؒ کے یوم پیدائش کے موقع پر ارشاد فرمائی اور جس کی تلخیص ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ — مدیر

آج کا دن ہم سب کے لئے مسرت و خوشی کا دن ہے کیونکہ آج قائد اعظمؒ کا یوم ولادت ہے۔ آج ہمارے اس عظیم لیڈر اور رہنما کی پیدائش کا دن ہے جس نے اپنی ہمت، اپنے حوصلے اور اپنی جانفشانی سے قوم کو صحیح راستہ دکھایا، پاکستان کا نظریہ لوگوں کے ذہن نشین کرایا اور ان کے ذہنوں میں اس کے خطوط کو اجاگر کیا۔

اس موقع پر ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم اس شخص کی روح کو خراج تحسین پیش کریں جس نے ہمارے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس مبارک موقع پر ہمیں اپنے گزشتہ افعال و کردار کا بھی جائزہ لینا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم نے ماضی میں کون سے اچھے کام کئے ہیں اور کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں آئندہ کے لئے اپنا لائحہ عمل بھی متعین کر لینا چاہئے۔

میں اس بات کی تلقین کروں گا کہ جو باتیں میں نے کہی ہیں آپ ان پر غور و فکر کریں اور ملک کی بہبود کے لئے جو راہیں ہم نے نکالی ہیں، یا نکال رہے ہیں، ان کا جائزہ لیں۔ یہی نہیں بلکہ آپ اپنے لئے جو طریقہ کار مقرر کریں اس پر کمربستہ ہو کر عمل کریں اور اپنے اپنے دائرہ میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی پیروی کرانے کی کوشش کریں۔ اگر ہم یہ کر سکے تو انشاء اللہ، خداوند تعالیٰ بھی ہماری مدد کرے گا اور ہمیں صحیح طور پر سوچنے اور صحیح طریقے پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے گا۔

دنیا میں عظیم رہنما، ایسے رہنما جو جرأت و ہمت اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ہم آپ سب سے بلند تر ہوں، کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ قانون قدرت یہی ہے کہ ہم ان عظیم رہنماؤں کی صفات کو اپنائیں جو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا میں ہر انسان کی زندگی میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ایک دو مرحلے ایسے آتے ہیں جن پر اس کے سامنے کئی ایک راستے ہوتے ہیں اور یہ معلوم کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے کہ کونسا راستہ ٹھیک ہے۔ جو شخص صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے اس کی قوم بن جاتی ہے۔ اور اگر خدا اس کی مدد نہیں کرتا اور بصارت اس کو مدد دینا چھوڑ دیتی ہے تو وہ غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے قائد اعظم کے سامنے بھی یہی معاملہ تھا کہ آیا ہندوستان کی آزادی میں مسلمان بھی آزاد ہو گا یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہم غلام ہو جائیں۔ بہت سے عالموں کے دماغ میں جن میں علامہ اقبالؒ بھی شامل تھے، یہ سوال پیدا ہو رہا تھا۔

موجودہ زمانہ میں جب کہ ذرائع آمد و رفت سہل ہو گئے ہیں اور دنیا ایک چھوٹی سی جگہ بن گئی ہے اور کسی قوم کا راز کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا، قوموں کے لئے اپنی آزادی برقرار رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ان حالات میں آزادی کو قائم رکھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے معاشرے کی خرابیوں کو دور کریں۔ بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد ہمارے رہنما آزادی کے استحکام کی ضرورت کو فراموش کر بیٹھے اور قوم کو صحیح راہ نہ دکھا سکے۔ آزاد قوموں کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان میں ہر شخص کو اپنا فکر بعد میں ہوتا ہے اور دوسروں کا پہلے، مگر ہمارے ملک میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ہم لوگ صوبائی اور قومی تعصبات کا شکار ہو کر رہ گئے تھے اور اپنے نصب العین کو بھول گئے تھے۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ ہمارا ملک دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ غرض قوم تباہی کے راستہ پر پڑ چکی تھی۔ لہذا یہاں انقلاب آیا۔ انقلاب اگرچہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے تاہم جب کوئی حکومت اپنے ملک کے معاملات کو صحیح طور پر نہیں چلا سکتی اور فتنہ و فساد کی قوتیں زور پکڑ جاتی ہیں تو وہاں انقلاب آنا لازم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ قدرت کو امن و امان کی اقدار کو محفوظ کرنا مقصود ہے۔

انقلاب ایک ہمارے ملک ہی میں نہیں آیا بلکہ اکثر ممالک میں بشمول ایک اسلامی ملک کے، انقلاب آئے ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں انقلاب اس لئے نہیں آیا کہ لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹیں یا لوٹ مار ہو، یا دوسری فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کریں۔

اس انقلاب کا رہنما میں تھا، اور مجھے صاف طور پر معلوم تھا کہ اس ملک کے مصائب کیا ہیں اور عام طور پر یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا حل کیا ہے۔ آپ نے میری وہ نشری تقریر سنی ہوگی جو میں نے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو کی تھی۔ آپ اسے پھر پڑھیں اور دیکھیں کہ گذشتہ دو سال میں ملک میں جو اصلاحات ہوئی ہیں وہ ان وعدوں کے مطابق ہیں یا نہیں جو اس تقریر میں کئے گئے تھے۔ گزشتہ دو سال میں جو اصلاحات نافذ کی گئی ہیں ان کا مقصد معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنا اور قوم کو بیدار کرکے اس میں احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے۔ جب تک ہماری پوری قوم بیدار نہ ہو جائے گی، کچھ نہ ہو سکے گا۔ چند افراد کی بیداری سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب رات دن کام کریں، اور نہ صرف اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل بنیں بلکہ اپنے بوجھ سے زیادہ اٹھائیں۔ موجودہ نسل کو ہی نہیں بلکہ آئندہ دو تین نسلوں کو بھی اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر قوم اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل بنے گی۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے، تو قوم کو دو سو سالہ غلامی کے برے اثرات سے نجات دلا کر کس طرح ترقی کے راستے پر گامزن کر سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میں ایسا کرنے کی صلاحیت ہے اور انشاء اللہ! آپ ایسا ضرور کریں گے۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو میں یوں انتھک محنت اور کوشش نہ کرتا اور میرے ساتھی اس طرح رات دن جانفشانی سے کام نہ کرتے۔

ہمارے ملک میں زرعی اصلاحات نافذ ہو چکی ہیں۔ یہ مساوات قائم کرنے کی طرف ایک بہت بڑا قدم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت نہیں چلا سکتے۔ حالانکہ جمہوریت تو مسلمانوں کے خون میں شامل ہے۔ ہماری تعلیمات کی بنیاد جمہوریت پر ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا پیغام یہی ہے کہ ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں۔ لہٰذا آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہم میں ذات پات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کوئی شودر نہیں ہے۔ ہمارے یہاں رنگ و نسل کا امتیاز نہیں ہے۔ ہم سب برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ہم سب برابر ہیں۔ ہم میں سے بڑا وہ ہے جس کا عمل اچھا اور ایمان پختہ ہے۔ لہٰذا ہمیں جمہوریت کا سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایسی جمہوریت رائج کرنے کی ضرورت ہے جسے لوگ سمجھ سکیں۔ اور جس پر عمل کر سکیں اور یہ کام ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ ذرا آپ بنیادی جمہوریتوں کے اصولوں پر غور کیجئے۔ ان کا نفاذ بجائے خود کتنا بڑا انقلاب ہے۔

بنیادی جمہوریتوں کا مقصد یہ ہے کہ جہاں کہیں اور جس طرح پر بھی ہو سکے لوگوں کو حکومت کے کاروبار میں شریک کیا جائے تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ ملک کے وسائل کیا ہیں اور ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں انہیں یہ بھی معلوم ہو سکے کہ ان وسائل کو کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کا دوسرا مقصد اس خلا کو ختم کرنا ہے جو لوگوں اور حکومت کے افسروں میں ہوا کرتا ہے۔ تاکہ ملک کے مختلف عناصر میں تصادم کی بجائے تعاون عمل پیدا ہو اور فروعات اور آپس کے جھگڑوں میں وقت ضائع نہ ہو۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ بنیادی جمہوریتوں کے فلسفے کو سمجھیں۔ بنیادی جمہوریتوں کے نفاذ کے ذریعہ حکومت لوگوں کو یہ ذمہ داری سونپ رہی ہے کہ یہ تمہارا اپنا ملک ہے، تم خود اس کا نظم و نسق چلاؤ۔ تم میں احساس ذمہ داری موجود ہے۔ تم اس ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت بھی رکھتے ہو۔

زرعی اصلاحات اور بنیادی جمہوریتوں کے نفاذ کے علاوہ شعبۂ تعلیم میں بھی انقلابی اصلاحات نافذ کی جا رہی ہیں۔ ہم نے نئے طریقۂ تعلیم کی بنیاد کچھ اس طرح رکھی ہے کہ آئندہ بیس پچیس برس کے عرصے میں ملک میں کوئی شخص ناخواندہ نہیں رہے گا۔ اس طرح آئندہ تعلیم کا مقصد بھی ضرورت کے مطابق تربیت یافتہ نوجوان پیدا کرنا ہوگا تاکہ جس قسم کے افراد کی ضرورت ہے وہ حاصل ہو سکیں۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ آئندہ حکومت مشرقی اور مغربی پاکستان کے مستحق بچوں کو سالانہ ڈیڑھ کروڑ روپے کے وظائف دے گی جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سال تقریباً سات آٹھ ہزار مستحق طلبا، وظائف حاصل کریں گے ——

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ہماری مالی حالت پہلے سے کئی درجہ بہتر اور مستحکم ہو چکی ہے۔ اب خدا کے فضل سے ہمارے ملک کے خزانے کی لوٹ کھسوٹ ختم ہو گئی ہے۔ ہمارے وزیر خزانہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے ہیں اور میں بھی حساب کرنیکی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اپنے دائرۂ اختیار میں قوم کے

سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ ہمارے ملک میں پہلے کی نسبت زیادہ تجارتی اور صنعتی سامان پیدا ہو رہا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں خوراک کی کمی بھی پوری ہو جائے۔

خدا کے فضل سے ہمارے عوام میں بھی حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان میں بھی خودداری اور خوداعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ دیگر ممالک بھی اب ہماری ترقی کی رفتار کو محسوس کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ہم کس تیزی سے صحیح راستے پر گامزن ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے حالات پہلے کی نسبت بہت بہتر ہیں مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہماری مشکلیں بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ ہمارے لئے ابھی سستانے کا وقفہ نہیں آیا۔ ابھی پچیس تیس برس تک ہمیں نہایت تندہی اور جانفشانی سے کام کرنا پڑے گا۔ میری نظریں دیکھ رہی ہیں، اور اگر آپ بھی ذرا دوربینی سے کام لیں تو آپ کو بھی نظر آئے گا، کہ آج سے پچیس تیس برس زیادہ سے زیادہ پچاس برس کے بعد ہماری قوم پوری طرح منظم و مضبوط ہوگی اور ہماری طاقت بیکار باتوں پر صرف نہیں ہوگی۔

موجودہ حالات میں ایک اور خطرہ بھی درپیش ہے اور وہ یہ کہ کہیں مادّی چیزوں کو حاصل کرنے کی دوڑ میں ہم روحانی اطوار کو فراموش نہ کر بیٹھیں اور اپنے نصب العین سے دور نہ ہٹ جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ مادّی ترقی ہمارے لئے بہت ضروری ہے لیکن ہمیں اپنی آخرت یعنی دوسری زندگی کی بہتری کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اسلامی اصولوں کی سختی کے ساتھ پیروی کریں۔ یہ کہنا تو آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ رہی ہے اور سوائے ترکوں کے، جو کسی حد تک آزاد رہے ہیں، باقی اسلامی ممالک میں انتشار پھیلا رہا ہے، اور اکثر مسلم ممالک غیر کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ان حالات میں قدرتی طور پر ہمارے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھ رہے ہیں اور ان کی صحیح پیروی کر رہے ہیں کہ نہیں۔ ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم اصولوں اور طریقوں کو آپس میں ملا دیتے ہیں حالانکہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ یہ اصول کبھی نہیں بدلتے۔ طریقے بدلتے رہتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ملک کے مذہب دوست حضرات اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کریں کہ اسلامی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ دور کے تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف میرا نہیں بلکہ پوری قوم کا ہے۔ ایسا نہ کیا گیا تو دنیا اسلام کو چھوڑ دے گی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، آج سے بیس پچیس برس بعد ہر شخص پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور بذاتِ خود ہر معاملہ پر غور و فکر کر سکے گا، اور اسے کھوکھلی نعرہ بازی سے دھوکہ نہیں دیا جا سکے گا۔ اسلام ایک سیدھا سادا مذہب ہے۔ وہ صرف سمجھنے اور پیروی کرنے کی چیز ہے بشرطیکہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اصول اور چیز ہے اور فروعات اور شے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ آج کل زندگی لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔

حال ہی میں میں نے کئی ایک دوست ملکوں کا دورہ کیا جن میں کچھ اسلامی ممالک بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں کے لوگوں کو پاکستان اور پاکستان کے حالات سے بہت دلچسپی ہے اور ان میں بڑا اسلامی جذبہ پایا جاتا ہے۔

ہمارا اپنا ملک ایک ایسا ملک ہے جو اسلام کی آواز پر بنا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی مختلف قسم کے لوگ موجود ہیں مگر اس کے باوجود مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کے لوگوں نے مل کر پاکستان بنایا۔ اس کی وجہ بھی تھی کہ ان کے دلوں میں ایک جذبہ تھا۔ وہ سب ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ ہے اسلامی برادری۔ لہٰذا ہم اس برادری سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہماری قومیت کی جڑ اکھڑ جائے گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر عوام کے سامنے پیش کریں۔

یہ ملک ہمارا ہے۔ ہمیں اس ملک کو بنانا ہوگا۔ ہمیں اس کے لئے قربانیاں دینا ہوں گی۔ اور انشاء اللہ ان قربانیوں کا صلہ اگر ہم کو نہ مل سکا تو ہماری آئندہ نسلوں کو ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج قائدِ اعظم زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کچھ کہتے جو میں نے عرض کیا ہے۔ کیونکہ یہ وقت کی سب سے بڑی اور اٹل ضرورت ہے۔ آخر میں چند ایک باتیں مختصر طور پر کہوں گا جن پر نظر رکھنی بہت ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں سادگی اختیار کرنی چاہیئے اور شادی بیاہ کی رسوم اور موت کے موقعے اور دیگر تقریبات پر جو بے جا اسراف ہوتا ہے اس کو ختم کر دینا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو محنت و کاوش کا عادی بنائیں

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

وفاق پرور، عہد آفریں

شفیق بریلوی

چہل پہل کی ایک اور لہر جو اپنے پیچھے پُرکیف اور خوشگوار یادوں کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ گئی اور اس کے ساتھ خیرسگالی اور یگانگت کا احساس بھی۔ یہ لہر ایک اور شاہی مہمان کی آمد سے پیدا ہوئی۔ ملکہ الزبتھ ثانی، برطانیہ جیسے عظیم تاریخی ملک کی تاجدار۔ جس جذبۂ خلوص کے ساتھ یہ شخصیت ہمارے یہاں آئی اُسی ذوق و شوق کے ساتھ اس کا خیر مقدم بھی کیا گیا اور کچھ عجب نہیں کہ جہاں تک دونوں ملکوں کے باہمی روابط کا تعلق ہے اس دورہ کے نتائج اس ہنگامی ذوق و شوق سے کہیں پائدار ثابت ہوں جن کے ساتھ ہمارے ملک میں آنے والی اس پہلی فرماں روا ملکہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ بلاشبہ اس سے برطانیہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ۔

خوشگوار تعلقات کا یہ دن بدن بڑھتا ہوا سلسلہ عین اُس یادگار دن تک پہنچتا ہے جب کہ آزادی کی صبح طلوع ہوئی تھی اور اس نے ہمارے باہمی تعلقات کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ پاکستان اور برطانیہ ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ بن گئے۔ یہ برطانیہ کے روایتی تدبر کا ایک اور عمدہ ثبوت اور خوش خلقی کا مظاہرہ تھا۔ خواہ اس کی تہ میں کوئی اور ہی اسباب کارفرما ہوں جن کے باعث ترکِ اقتدار بالکل ناگزیر ہوگیا تھا ــ کہ اس نے اپنے آزاد ہونے والے ممالک کو کلیتہً خود مختار ہوجانے پر بھی دولت مشترکہ میں شامل رکھا۔ ایسے روابط آج کل کی دنیا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ان حالات میں ملکۂ برطانیہ کی ہمارے یہاں تشریف آوری ایک تاریخی اور بڑا خوش آئند واقعہ ہے۔ ان کا یہ دورۂ خیرسگالی نئے دوستانہ روابط کا نتیجہ ہے اور ان کو استوار کرنے کی عمدہ تدبیر۔ حُسنِ اتفاق سے یہ خیرسگالی ایک نسائی شخصیت کے پُرکشش روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے جو اپنے ساتھ صنفِ نازک کا تمام ترکیف و افسوں، حسن و لطافت اور جاذبیت لئے ہوئے ہے۔

یہ امر مزید باعثِ مسرت ہے کہ تاجدارِ برطانیہ اور دولتِ مشترکہ کی سربراہ ملکہ الزبتھ، دورِ انقلاب میں پاکستان آئی ہیں۔ جب کہ قائدِ انقلاب کی رہنمائی میں قائدِ اعظمؒ اور ملتِ اسلامیہ کے تصور کا پاکستان عملی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس عہد کا سب سے مؤقر ادارہ "بنیادی جمہوریت" ہے۔ ملکہ برطانیہ اس ادارے میں عوامی احساسات و جذبات کی ویسی ہی نمائندگی ملاحظہ فرمائیں گی جو ان کے یہاں برطانوی پارلیمنٹ میں نظر آتی ہے۔

دورِ انقلاب کے بعد پاکستان نے بین الاقوامی سیاست میں اپنا وقار پوری طرح قائم کرلیا ہے۔ صدر ایوب کے مشرقِ وسطیٰ، سعودی عرب و مصر، مشرقِ بعید، یوگوسلاویہ اور مغربی جرمنی کے دوروں نے پاکستان کے بلند عزائم سے دنیا کے ایک وسیع حصّہ کو روشناس کرادیا ہے۔ کئی ممالک کے ممتاز فرمانرواؤں اور سیاستدانوں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس سے بیحد متاثر ہوئے ہیں۔ ملکۂ برطانیہ کا دورہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے دیگر مہمانوں کی طرح وہ پاکستان کے متعلق بہترین تاثرات لے کر جائیں گی۔

اس کی جھلک ہم قبل ازیں ملکہ کے شوہر ڈیوک آف ایڈنبرا کے دوروں میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ جب وہ برطانوی ادارۂ ترقی سائنس کے سابق صدر کی حیثیت سے پاکستان کی ترقی سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تو اس موقع پر ملکہ الزبتھ نے بھی خیرسگالی کا پیغام بھیجا تھا۔ ان کا یہ دورہ دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے اور ایک دوسرے کو زیادہ قریب لانے کا باعث ہوا۔ یوں برطانیہ نے ایک دوست ملک کی حیثیت سے پاکستان کی ترقی میں پہلے ہی سے جس اشتراک و تعاون کا عملی ثبوت دیا ہے وہ دونوں ملکوں کے باہمی روابط کا ایک روشن پہلو ہے۔

قدرتی طور پر نئے دور میں آپس کے تعلقات کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب دونوں ملکوں کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ ایک کو دوسرا کیا دے سکتا ہے، اور اس سے کیا لے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ جیسا پرانا، ترقی یافتہ ملک جسے زندگی کے ہر شعبہ میں صدہا سال کا وسیع تجربہ حاصل ہے، پاکستان جیسے نئے ملک کے کیا کیا کام نہیں آ سکتا۔ اور حق یہ ہے کہ اس نے داد و ستد کے تحت ہی سہی، اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا بھی ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا کام تھا منصوبۂ کولمبو کو عملی جامہ پہنانا۔ جو کتنی ہی قوموں کے مشترکہ فائدہ کا منصوبہ ہے اور اس کے تحت ضرورت مند رکن ممالک کو فنی اور دیگر قسم کی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ حال ہی میں کولمبو پلان کی دسویں سالگرہ پر دو برطانوی عمائد نے بجا طور پر یہ اعلان کیا کہ کولمبو پلان میں شریک ممالک نے نہ صرف ایک دوسرے کو مدد دینا سیکھا ہے بلکہ دنیا کے سامنے ایک نہایت عمدہ مثال بھی پیش کی ہے۔ کہ کس طرح اس قسم کا تعاون سرمایہ اور فنی امداد دونوں میں ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ زراعت، انجنیئری، طب و حکمت تحقیق اور تعلیم کے میدانوں میں کامیابی بڑی ہی مؤثر اور حوصلہ افزا ثابت ہوئی ہے۔

اور یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ۵۹-۱۹۵۸ء کے لئے کولمبو پلان کے تحت برطانیہ نے پہلے سے کہیں زیادہ سرمایہ و فنی امداد کا اہتمام کیا ہے۔ ۱۵ فروری ۱۹۵۹ء میں برطانیہ نے کوئی ایک کروڑ پونڈ کا قرضہ دینے کا اقرار کیا تھا۔ تاکہ پاکستان کے ترقیاتی پروگرام، خصوصاً زرعی پروگرام، کو روبہ عمل لایا جا سکے۔ برطانوی حکومت نے جن اداروں کو تحقیق و تربیت کا سامان بہم پہنچایا یا پہنچانے کا وعدہ کیا ان میں سے بعض یہ ہیں۔ ڈھاکہ ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر، گورنمنٹ کالج لاہور ریڈیو سٹوپ سنٹر، سندھ ایگریکلچرل اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور سرامکس انسٹی ٹیوٹ ڈھاکہ۔

پچھلے سال کے وسط تک ۲۵۸۲ تربیت پانے والوں کو برطانیہ میں خندہ پیشانی سے قبول کیا گیا۔ اس سال برطانیہ نے کل ۳۷ ماہرین کی خدمات مہیا کیں۔ اسی طرح برطانیہ نے ڈھاکہ کا شہری پلان تیار کرنے کے لئے ایک برطانوی کمپنی کی خدمات مہیا کیں۔

برطانیہ شروع ہی سے سائنس اور صنعتی ترقی کا گھر رہا ہے اور یہاں کے کئی ادارے خاص خاص معاملات میں بے انتہا مہارت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے عروج میں بحری طاقت کو خاص دخل رہا اور اس کی مہارت جہاز سازی کی صنعت میں مسلّم ہے۔ چنانچہ برطانوی کمپنیوں نے ہمارے یہاں اس قسم کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ایک طرف کراچی کی نئی بحری اور شہری گودیاں، دوسری بندرگاہ چاٹ گام کی طویل المیعاد ترقی، انہی کی کاروباری سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ ایک بہت بڑی مہم تھی سوئی گیس کی ۳۵۰ میل لمبی پائپ لائن بچھانا — سوئی (بلوچستان) سے لے کر کراچی تک اور وہاں سے ملتان تک اس کی کافی بڑی توسیع — اسی سلسلہ میں ڈیزل طاقت کی تنصیب کی ضرورت بھی پیش آئی اور یہ کام بھی ایک برطانوی کاروباری ادارے ہی نے دوسروں کے ساتھ مل کر انجام دیا۔ ادھر سکھر بیراج پر ایک ۷۸۰۰ فٹ لمبا پل تعمیر کرنے کے علاوہ برطانوی انجنیئر منگلا بند تعمیر کرنے میں بھی مصروف ہیں۔

ایک اور ماہرانہ صنعت الیکٹرونکس یعنی برقیات ہیں جن کی کتنی ہی صورتیں ہیں۔ اور جن کی پاکستان کو ایک نیا ملک ہونے کے باعث خاص ضرورت رہی ہے۔ اور اب جب وہ اپنے دوسرے پنج سالہ اہتمام بالشان منصوبے کو روبہ عمل لانے کی تیاری کر رہا ہے، اسے اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں برقیات کو ہر قسم کی ترقیات میں کس قدر بنیادی حیثیت حاصل ہے ٹکنالوجی کے اعتبار سے بھی اور اقتصادی حیثیت سے بھی۔ برطانیہ برقیاتی کنٹرول اور سامان دونوں میں بیک وقت شروع ہی سے مدد دے سکتا ہے۔

آج کل اُن تمام ممالک کو جو ترقی کے میدان میں قدم رکھ رہے ہوں، دوسرے ممالک کے ساتھ مواصلاتی ربط کی اشد ضرورت ہے جس کے لئے ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور براڈ کاسٹنگ کی سہولتیں اور تیز رفتار مواصلات لازم ہیں۔ اس سلسلہ میں برطانوی ماہرین کا تجربہ بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان میں اس کی اور بھی ضرورت ہے۔ اسلئے کہ اس کے دونوں حصّوں میں بہت بڑا فاصلہ ہے اور اس کو پاٹنے کے لئے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے برقیاتی سلسلوں اور انجنیئری میں مہارت کی ضرورت ہے۔ جن میں ملٹی چینل مائیکرو ویو سلسلے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں بھی تمام اقتصادی ترقیاتی منصوبوں میں شہری انجنیئرنگ کی اشد ضرورت ہے۔ پاکستان پہلے ہی برطانوی کاروباری اداروں کا مہیا کیا ہوا برقیاتی سامان برت رہا ہے۔ جس میں اعلیٰ ارتعاش کے وہ ٹرانسمٹر

بھی شامل ہیں جو سمندر پار ٹیلیگرافی اور ٹیلیفونی سلسلہ میں کام آ رہے ہیں۔ پاکستان میں بعض بڑے بڑے معاون منصوبے اختیار کئے جانے کی بھی توقع ہے۔ مثلاً جہلم پر منگلا اور سندھ پر تربیلا کے مقام پر بندوں کی تعمیر ان کے لئے بھی غیر معمولی مہارت درکار ہے۔ اور برطانوی کاروباری ادارے ایسے معاملات میں اپنے حسنِ کارکردگی کے لئے مشہور ہیں۔

برطانوی کاروباری اداروں کو تیل کی تلاش سے بھی بہت سروکار رہا ہے۔ یہ ایک اور میدان ہے جس میں ان اداروں نے خاص دلچسپی لی ہے اور پاکستان میں تیل کی جستجو میں بڑی سرگرمی دکھلائی ہے۔

یہ افادی نوعیت کی سرگرمیاں بجائے خود بہت اہم ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ وقیع اور نتیجہ خیز وہ تہذیبی و ثقافتی استفادۂ باہمی ہے جو دونوں قوموں پر پہلے بھی اثر انداز ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں برٹش کونسل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جو عملاً ثقافتی فیضان کا وسیلہ ثابت ہو رہی ہے۔

ان سطور میں مختلف قسم کی سرگرمیوں کا ذکر محض برسبیل تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی کئی اور صورتیں بھی ہوں گی جو خاصی اہم ہیں۔ اور ان کا سلسلہ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا جو دونوں ملکوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۷۳ء میں برصغیر کی نمائندہ طاقت کی حیثیت سے ملکہ انگلستان کی جدّۂ ماجدہ ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں ایک بیش قیمت ہار پیش کیا تھا۔ اب ان کی جانشین آزاد و خود مختار عوام کی طرف سے اس ہار سے کہیں زیادہ خوشنما اور گراں قدر تحفہ لے کر اپنے وطن واپس جائیں گی۔ اور یہ تحفہ ہوگا آزاد انسانوں کی آزاد سرزمین، پاکستان کے گہرے نقوش و تاثرات۔

گنجِ خرابات: بقیہ صـ۴۳

جواب: ارے بھئی! لکھنؤ اب لکھنؤ کہاں رہا۔ خدا کو منظور ہی یہ تھا کہ اندر کا اکھاڑا شہرِ خموشاں بن جائے۔ ہم جیسے دو چار مرثیہ خواں رہ گئے ہیں۔ یہ بھی اپنی اپنی ہڑواڑ میں جا بسے تو بس افسانے ہی افسانے رہ جائیں گے۔ کون یقین کرے گا کہ اس شہر میں کبھی ایسے بٹیر بھی لڑتے تھے۔ ایسی کنکوے بازی بھی ہوتی تھی ؎

مٹ گئی زندہ دلی اِک لکھنؤ کیا مٹ گیا
میتیں رکھی ہوئی ہیں نوحہ خواں کوئی نہیں

نقش ہائے رنگ رنگ: بقیہ صـ۱۹

و دیگر من در جواب خط سامی جز خاموشی چارہ ندارم۔ ازیں جہت سکوت ورزیدم۔ در آں مشفق نوشتہ امامت امر الٰہیت یزدانی۔ انصاف فرمایند کہ کدام امریست کہ یزدانی نیست و ایں چہ تعریف امامت است کہ شما کردہ اید۔ و حقیقت امامت و خلافت جز عارفان کامل کم کسے میداند۔ اگر پرسیدہ آید مشکل افتد۔ اللہ تعالیٰ آں روز بظہور آرد کہ ملاقات ما و شما شود و گفتگوئے ایں جمع امور بالمشافہ کردہ آید۔ معنی المکتوب نصف الملاقات ازیں خط سامی دریافت گردید و اگر طبیعت سامی خواہد تحقیق خود را و ایں خط را روبروئی علما و فقرا، آنجا گزارید و ملاحظہ فرمائید کہ کدام طریق محمود است و کدام مذموم و ما کہ علی علیہ السلام را تفضیل میدہیم موافق کلام اللہ و حدیث شریف است نہ از مذہب تراشیدۂ خود۔ مشفق من آنچہ از سینہ زوری جواب خواہند داد مسلّم نخواہم داشت۔ اگر از کلام اللہ و حدیث شریف و قول علماء صوفیہ و تحریر فقیر پسند نندیا نہ افتد جواب اس سوائی از کلام اللہ و حدیث شریف نمی خواہم۔ و عقل سلیم نیز گویند کہ مطابق کلام اللہ و حدیث شریف باشد نہ خلاف آں۔ بس اگر آیت و حدیث در بطلان خلافت جناب امیر علیہ السلام ہم نرسد مناسب است کہ شوقیہ ننویسند و ایں قصہ را موقوف نمایند چرا کہ ازچنیں سخناں (جز) پریشانی ہیچ فائدہ نیست والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ فقط غمگین (۱۲۵۶ھ)

غالب کی تصویر کاری: بقیہ صـ۲۵

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہاں پیراہنِ کاغذی، مہِ نخشب اور ساغرِ جم کی تلمیحیں علمی حیثیت رکھتی ہیں۔

غرض غالب کی تصویر کاری کی امتیازی خصوصیتیں ہیں — نیاپن، لذت پرستی، جلالت کا احساس، رنگا رنگی، چمک دمک اور حرکی انداز۔ ان کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے — مشکل پسندی؛ لیکن میں نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ یہ خصوصیت غالب کے ابتدائی کلام میں بہت نمایاں ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ غالب کو غالب بنانے والا اس کا ابتدائی کلام نہیں جو بیدل کی پیروی میں لکھا گیا، بلکہ بعد کا کلام ہے۔

رپورتاژ:

"اِک خواب نما دنیا"!

محمد عمر میمن

حیدرآباد کی گرم خشک فضا میں میرا پانچواں دن ہے، اور کل میں پھر کراچی لوٹ جاؤں گا۔ روشنیوں کے شہر میں جہاں زندگی روشنیوں اور سایوں کے ہر لحظہ تغیر پذیر تماشے کا بڑے تواتر سے پیچھا کرتی ہے۔ زندگی پھر اسی ڈگر پر لوٹ آئے گی جس پر اب سے کچھ شب و روز پہلے محوِ خرام تھی — اور پھر وہی گہما گہمی ہوگی، نیم روشن نیم تاریک چائے خانوں کی مانوس، پُرسکون ٹھنڈی فضا ہوگی، فیملی رومز ہوں گے، بار ہا آئی گئی مہربان گذرگاہیں ہوں گی اور پے در پے قدموں تلے روندی گئی ساحلی تفریح گاہیں۔

آیئے اس اثنا میں آپ کو حیدرآباد کی مختصر سی سیر کرا دوں۔ میرانِ سندھ کا سابق دارالخلافہ، حیدرآباد، محمد بن قاسم، فاتح سندھ کی امیدوں کا مرکز جس نے ماہر تاریخ دانوں کے اندازے کے مطابق نیرون کوٹ کے بھیس میں کفر کی بیخ کنی اور تبلیغ اسلام کی دعوت دی تھی۔ اور آج بھی اس کی حیثیت وادیٔ مہران کے سب سے بڑے اور بھرے پُرے شہر سے کم نہیں۔ آج ہم بھی اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ موجودہ حکومت کے ماتحت یہاں ہونے والی بیشتر اصلاحی اسکیموں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ مستقبل میں یہ بھی ایک چھوٹے موٹے جگمگاتے، روشنی اور نور کے سیلاب میں ہمکتے ہوئے کراچی سے کم نہ ہوگا۔ وادیٔ مہران کے تمام تجارتی لین دین کا سب سے بڑا مرکز۔

گو یہ شہر آج اپنے قابلِ فخر ماضی کی تمام شان و شوکت کھو بیٹھا ہے لیکن اس کے باوجود یادِ رفتہ کے چند مدھم مدھم، مبہم مبہم مٹے مٹے سے نقوش جو کچھ ٹوٹی پھوٹی حالت میں زمانے کی دست برد سے باقی بچ گئے ہیں، ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ اب سے کوئی دو سو سال پہلے اس چھوٹی چھوٹی گیروے رنگ والی اینٹوں کے شہر کی بنا رکھی گئی تھی۔ یہاں ہمیں لاہور کے سے پُرشکوہ، مسکراتے گنگناتے، اپنے ماضی کی شان و شوکت کے فسانہ ہائے جمیل دھیمی اور مدھم سرگوشیوں میں سناتے، دیدہ زیب، پُرکیف باغات نہیں ملتے اور نہ فن تعمیر کے اعلیٰ ترین شاہکاروں ہی سے نظر آسودہ ہوتی ہے۔ — لیکن ایک تاریخی شہر ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ کراچی سے ایک سو گیارہ میل دور یہ چھوٹا سا شہر ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔

اس وقت ہم تلک چاڑھی پر کھڑے ہیں جس کے ہر دو جانب جگمگاتی زندگی کی ضروریات سے بھری پری دکانیں ہیں۔ اس کی شمالی جانب جو ایک پختہ سڑک جا رہی ہے، آگے چل کر یہ ایک دوراہے پر دو گزرگاہوں میں منقسم ہو جائے گی۔ دائیں سڑک آگے چل کر مارکیٹ سے ہوتی ہوئی لہرا کر شاہی بازار سے مل جاتی ہے اور بائیں جانب والی سڑک رکروٹنگ آفس سے ہوتی ہوئی لیاقت میڈیکل کالج یا سول اسپتال تک جاتی ہے۔ اب ہم اسی سڑک پر مغرب کی جانب رخ پھیر کر چلتے ہیں۔ یہ اترائی ہے یا نشیب ہے! کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے تک یہ نشیب جاری رہے گا۔ اس کے بعد ہم بائیں جانب مڑ جائیں گے۔ ایک طویل سڑک کی طرف جو برابر اسٹیشن تک پہنچتی ہے۔ اسے اسٹیشن روڈ اور بابائے ملت کے نام پر محمد علی جناح روڈ بھی کہتے ہیں۔

ہم نشیب طے کر چکے ہیں اور بائیں جانب مڑ گئے ہیں۔ بائیں طرف سب سے پہلی دو منزلہ سرخ عمارت نذرتھ کالج صرف خواتین کے لئے ہے۔ ——— اور یہ اس سے ملا "سینٹ میریز کانوونیٹ گرلز اسکول" ہے۔ جس میں ننھے شگوفوں جیسی بچیاں نرسری رائمز گنگناتی تیتریاں اپنے کومل وجود لئے منڈلاتی پھرتی ہیں۔ اس سے متصل چرچ ہے جس کے عقب میں ایک طویل و عریض میدان چھوڑ کر مستقبل کے جناح، سارتر، شیکسپیر اور گیٹس کے لئے ایک اسکول ہے۔ یہ چرچ اسکول کے احاطہ ہی میں ہے۔ اسکول کا نام "سینٹ بونا وینچرس کانوونٹ اسکول" ہے۔ ٹھہریئے، اپنے قدموں کے اضطراب کو روک لیجئے۔ اس اسکول سے میرے بچپن کی

بہت سی یادیں وابستہ ہیں، اس لئے کہ تقسیم کے بعد دو سال تک میں نے اسی کے ابتدائی درجوں میں تعلیم پائی ہے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں اپنے گرد و پیش کو فراموش کر کے چند لمحات کے لئے بچپن کے اُن موہوم جزیروں میں لوٹ آتا ہوں جہاں خوشنما دھند ہر طرف پھیلی ہوتی ہے۔ اور ذہن حوادث عالم کی المناکیوں سے ناآشنا رہتا ہے۔ یہ میرا اسکول ہے، میں اسے سلام کرتا ہوں۔ رکئے، ٹھہریئے۔ مجھے ذرا دیر کو فادر ڈاس، فادر فرانسس، پستہ قد ہنس مکھ شریر، شریف النفس مضبوط اعضاء، فادر پنٹو اور رما دام — کے متعلق سوچ لینے دیجئے — میری ذہنی تشکیل میں ان سب کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔

اس سڑک پر دونوں جانب میونسپل ہال ہے جس کے صحن میں نماز کے وقت مومنین کی ستھری قطاریں بے حد دلفریب لگتی ہیں۔ اور دل میں مانوس مذہبی جذبات کو بیدار کر دیتی ہیں۔ اور آگے چلئے۔ ہاں یہی، اسے حبیب بینک کہتے ہیں جس کی بیشتر شاخیں تمام پاکستان میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس سے کوئی دو فرلانگ آگے — جی! یہ گاڑی کھاتہ ہے۔ کہنے کو تو یہ گاڑی کھاتہ ہے لیکن یہاں گاڑیاں بس خال خال اور لوگوں کا اژدہام دکھائی دیتا ہے۔ غالباً اسے گاڑی کھاتہ اس مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا پیاؤ ہے جہاں وکٹوریہ والے اور ٹانگے والے اپنے گھوڑوں کو پانی پلاتے ہیں۔ گاڑی کھاتے کے چوک سے بائیں جانب فراز ہے جس پر کوئی فرلانگ بھر چلنے کے بعد ہمیں ریڈیو اسٹیشن ملتا ہے۔ یہاں پر محض تین اسٹوڈیو ہیں! اکثر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی مترنم کافیوں کو سنتے سمے بے اختیار ریڈیو اسٹیشن کو یاد کر لیتا ہوں۔ ریڈیو اسٹیشن سے ملحق ایک باغ ہے جس میں ریڈیو کا بلند ایریل ایستادہ ہے۔ رات کے گھور اندھیروں میں اس کی چوٹی پر چمکتا ہوا سرخ قمقمہ بالکل سمندر کی لامحدود وسعتوں میں بڑے عزم اور استقلال سے ایستادہ روشنی کے مینارے کی طرح معلوم ہوتا ہے جس کا کام بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ دکھانا ہے۔

چوک سے دائیں جانب جو سڑک جاتی ہے۔ اس پر آگے چل کر ہمیں دائیں جانب فردوس ٹاکیز اور اس سے ذرا آگے بائیں طرف سندھ یونیورسٹی ملتی ہے۔ پھر آگے چل کر یہی راستہ گدو روڈ میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں کوٹری بند سے ذرا پہلے مشہور منحرف المزاج افراد کی آخری آرام گاہ ہے۔ مینٹل ہاسپٹل۔

اگر ہم بلا مڑے چوک سے ناک کی سیدھ میں گزر جائیں تو آدھے میل کی مسافت کے بعد ریلوے اسٹیشن آتا ہے۔ بات کہاں سے نکلی تھی کہاں جا پہنچی۔ گاڑی کھاتے کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ چوک سے دائیں طرف یونیورسٹی اور گدو بندر جانے والی سڑک پر دس ہی قدم دور بائیں ہاتھ کو "افضل ہوٹل" ہے اور دائیں طرف دو منزلہ "سلطان ہوٹل"۔ ذرا آگے ایک نام نہاد کافی ہاؤس ہے۔ سلطان ہوٹل کی زیریں منزل سے ملی ہوئی دو ایک پان فروشوں کی دکانیں ہیں اور رسائل فروشوں کے تختے۔ جن پر بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے وہ رسائل اور کتب پھیلائے ہر راہ گیر کو منتظر نظروں سے گھورتے ہیں۔ ہوٹل کا چھت سے مبرا صحن، جس میں گردش دوراں کے خلاف مدت سے سینہ سپر میز کرسیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہوٹل کی بالائی منزل اور نام نہاد کافی ہاؤس کا ہال۔ یہ سب وادی مہران اور سابق صوبہ سندھ کے اس مشہور شہر کے سخن وروں کے مراکز ہیں۔ شام کے ڈھلتے سایوں اور مدھم ہوتی ہوئی روشنیوں کے وقت یہاں بڑی چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے۔ کراچی کے زیلین کافی ہاؤس، کیفے ٹیریا، کیفے جارج، اور لاہور کے پاک ٹی ہاؤس، شیزان اورینٹل، چائنیز لنچ ہوم، وائی ایم سی اے کی طرح یہ بھی یہاں کے شعراء اور ادباء کے اڈے ہیں۔ گاؤں کی چوپال کی طرح جہاں دن بھر کڑی دھوپ میں مشقت کر کے ستانے کی غرض سے اور حقہ گڑگڑانے کے لئے سادہ لوح دہقان آ بیٹھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اپنے اڈوں پر یہاں کے ادیب، شاعر اور نقاد حضرات دن بھر اپنی نوکریوں میں کولھو کے بیل کی طرح جتے رہنے کے بعد سانجھ پڑے کرشن کنہیا کی طرح آن بیٹھتے ہیں اور اپنے زرد زرد چہروں پر پھیلے کرب کو سستی چائے کی چسکیوں اور سگریٹ کے دھوئیں میں سمو دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب دیکھئے ادب کے مختلف فیہ مسائل پر بحث ہو رہی ہے۔ اور موزیک کی میز پر دنادن اپنے نکتہ کی وضاحت کے لئے گھونسے برس رہے ہیں۔ یا بقول حبیب جالب:

بحث یہی کرتے رہتے ہیں سست ادب کی ہے رفتار

آپ کسی ادیب یا شاعر سے ملنا چاہیں تو اس کا گھر کہاں ڈھونڈتے پھریں گے، کہیں "چھوٹی گٹی" "فقیر کا پڑ" جیسے صوتی اعتبار سے بے ہنگم میلے کچیلے نیم روشن محلہ کی پتلی پتلی گلیوں میں ہوگا۔ بس شام کو انہیں مراکز میں آ جائیے۔ ملاقات یقینی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا، ٹنڈو جام سے اُتر کر ہم اب اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ بیچ میں یہ چوک آگیا ہے۔ نہ ہم یونی ورسٹی کی طرف مڑتے ہیں اور نہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف بلکہ سیدھے ہی چلتے ہیں۔

رُک کیوں گئے؟ آئیے نا۔ اچھا اچھا آپ پان خرید لیں۔ ہاں بالکل، یہ ایک گرم دوپہر ہے اور شہر کسی بچاری یا کاہن کی سنہری عبا کے جھلملاتے رنگوں کی طرح حسین اور جگمگاتا ہوا ہے۔ اس کی مدھم مدھم، تیز آہنگ والی پرجوش، نقرئی، دھیمی، تیز آوازیں، اس کی چیخیں، اس کی کراہیں، ابلتے ہوئے قہقہے باہم مدغم ہو کر بالکل ان مناجات شکر کی مانند محسوس ہوتے ہیں جو زندگی کے لئے ابھی ابھی سانسوں کے درمیان گائی جا رہی ہوں۔ سورج نصف النہار پر پوری شدت سے چمک رہا ہے۔ اور شدید گرمی کی لہریں نیلگوں آسمان کی دبیز دھندلاہٹوں سے نیچے یوں آرہی ہیں جیسے زمین کے فراخ سینے پر پڑنے والی سورج کی ہر ہر کرن کوئی آگ کی حدت سے گرم اور سرخ شمشیر ہے جو اس کے سینے میں پیوست کردی گئی ہے۔

یہاں دن کے وقت گرمی ضرور رہتی ہے، لیکن یہاں کی شام گو شام اودھ تو نہیں ہوتی، تاہم تپتے دن کے مقابلے میں ضرور فرحت بخش اور پرکیف ہوتی ہے۔ شام کو ہواؤں میں ہلکی ہلکی خنکی آجاتی ہے اور راتیں، ریگستان کی راتیں تو اپنی ٹھنڈک کے لئے ویسے بھی مشہور ہی ہوتی ہیں۔

جی ہاں، یہی بالکل یہی۔ یہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا آفس ہے اور مشہور پختہ قلعے کے زیریں حصّہ میں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، سڑک کے سہارے سہارے قلعے کی بلند و بالا فصیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ بس اسٹیشن یہاں سے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ دور ہی ہے۔ اچھا یوں ہی سہی، آپ کا اصرار ہے تو ہم اسٹیشن کی بجائے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے آفس سے ملی ہوئی بائیں جانب والی سڑک پر مڑ جاتے ہیں، چلئے پہلے قلعہ ہی دیکھ لیں۔

یہ سڑک ہماری راہبر ہے۔ یہ ہمیں اونچائی پر لے جائے گی۔ حتیٰ کہ ہم شکستہ قلعے کے بھاری پھاٹک تک پہنچ جائیں گے جہاں ماضی کی عظمتوں کی کتنی ہی کہانیاں آج مدفون ہیں۔ ہم قلعے کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ تاریخ کے اوراق الٹنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ سندھ کے فرشتہ سیرت حکمراں غلام شاہ کلہوڑا نے بنوایا تھا۔

یہ قلعہ چونے پتھر کی اس پہاڑی کے انتہائی جنوبی سرے پر واقع ہے جس کو یہاں کے لوگ مقامی زبان میں "گنجو ٹکر" کہتے ہیں۔ جس کا مطلب غیر سبز و شاداب ٹیکری نکلتا ہے۔ اس گنجو ٹکر پر حیدرآباد کا پورا شہر آباد ہے اور اس کے چاروں طرف نشیب میں دیگر علاقے ہیں۔ مغربی حصہ میں حیدرآباد چھاؤنی اور مشرقی حصّہ میں نہر پھلیلی وغیرہ۔

یہ پرشکوہ قلعہ جس میں اب صرف چند ہی ٹوٹے پھوٹے، لوگوں کی بد احتیاطی اور وقت کا شکار پرانے ڈھانچے ہی رہ گئے ہیں، ہمارے ذہن کو بے اختیار حال کی دبیز ردا ہٹا کر ماضی کی اُن گم گشتہ گذرگاہوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ جب یہ قلعہ کبھی زندگی کی تمام حرارت اور جلوہ سامانیوں سے مرصع رہا ہوگا۔ اور اس کے بلند میناروں سے جھانکتی ہوئی جمیل شہزادیوں کی محبت میں سرگرداں ہو کر اجنبی دیسوں کے شہزادے اس کی فصیلوں کے زیر سایہ آپس میں نبرد آزما ہوتے ہوں گے محض ایک مسکراہٹ کے حصول کے لئے، زر وسیم پرنیاں و حریر میں لپٹے ہوئے ایک کنوارے نسوانی وجود کو اپنے میں جذب کرلینے کے لئے ــــ اور کون جانے ان کی چشم بیمار سے گھائل ہو کر ہی کتنے قلعے کی فصیلوں تلے گرے ہونگے!

آپ کو اپنی امیدوں کے مطابق یہاں شہزادوں اور شہزادیوں کے محلات نہیں ملیں گے جن کا آپ نے تصور کیا ہوگا:

" وہ بزم اٹھی، وہ شمع بجھی، وہ ساز و ساماں دور گئے!"

چنری کے ملائم کونوں کو دانتوں میں دبا کر بل دینے، شرما کے کبھی چھپ چھپ جانے اور ہنس ہنس کے دل میں آنے والے کی محبت کی جوت جگانے اپنی راہ چل دینے والیاں اب کہاں! حسن کے طوفان بہت دور بھٹک چکے ہیں اور عشق کے تمام ساحل ڈوب گئے ہیں۔ دیکھئے تو، ہاں کیسی فسردگی اور تیرگی ہی تیرگی پھیلی ہوئی ہے یہاں اپنی آنکھوں کی نمی کو پونچھ دیجئے، یہ تو زمانے کا ازل سے ہی دستور رہا ہے:

"مٹا کر بنانا، بنا کر مٹانا"

اس میں تعجب کیا؟ وہ دیکھئے، قلعے میں کتنی بے ترتیبی سے مہاجرین کی سیدھی سادی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ دلچسپی کی وہاں دو ہی چیزیں رہ گئی ہیں۔ ایک تو حفاظتی مینارہ جو ہر قلعے کے لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اور دوسرا وہ منقش کمرہ جہاں اب بھی شکستہ، رنگ و روغن سے کسی حد تک مبرا، پھیکی پھیکی

تصویریں ماضی کے ان باکمال مصوروں کی فن کاری اور ماہرانہ چابکدستی کے فسانے بہانگ دہل دہرا رہی ہیں۔ ویسے یہاں ایک بہت بڑا خوش وضع حوض بھی ہے جو باشندگانِ حیدرآباد کے لئے پانی فراہم کرتا ہے۔ آیئے اس منقش کمرے کی طرف چلیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ اس کمرے کی چھت ملمع شدہ ہے۔ اور اس کی دیواروں پر اب بھی کچھ مٹی مٹی سی مختلف رنگوں سے مزین تصویریں ہیں۔ اس دیوار کو تو دیکھیئے، ہاں یہی ـــ یہ منظر خاصا واضح ہے معلوم ہوتا ہے وقت کی دو دھاری تلوار اس کی حقیقت پسندی کے سبب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی ـــ یہ کیا منظر ہے! اچھا تو سنئے، اس میں رنجیت سنگھ کی لارڈ لیک سے جو ۱۸۰۳ء میں ملاقات ہوئی تھی اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اگر آپ ذرا سی کوشش کر کے حفاظتی مینارے پر چڑھ سکیں تو آپ کو وہاں سے پورے حیدرآباد کا نقشہ دکھائی دے گا۔ اور سب سے پہلی چیز جو آپ کی نگاہ کو اپنی جانب مائل کرے گی وہ ہیں گھروں کی چھتوں پر ایستادہ لکھو کہا بادگیر۔ پرانے لوگوں کی ہنرمندی کی داد دیجئے۔ انہوں نے کتنی فنکاری سے گرمیوں کی جھلستی تپتی دوپہروں میں اپنے کو ٹھنڈی فرحت بخش ہوا پہنچانے کے لئے یہ نسخہ دریافت کیا تھا جو آج بھی ان کی عظمت کا معترف ہے۔

اچھا تو گویا آپ مُصر ہیں کہ حفاظتی مینارہ پر ضرور چڑھیں گے۔ یوں ہی سہی۔ دیکھئے سنبھل کے۔

اب ذرا مغرب کی جانب زاویۂ نگاہ مرکوز کیجئے۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر آپ کو زمانے کے ہاتھوں شکست کھایا ہوا ٹوٹا پھوٹا مٹی کا یہ قلعہ جو نظر آرہا ہے ـــ ہاں یہی، اس کے اندر ایک دفنہ دکھائی دے گا جہاں فرشتہ خصلت نیک صفت شاہ مکائی کا قیدِ حیات سے آزاد جسمِ خاکی ابدی نیند سو رہا ہے! اس سے اور آگے مغرب میں بہت دور جہاں ملاقت ور دریائے سندھ کا چمکیلا سنہری پانی سورج کی روشنی میں یوں جگمگا رہا ہے۔ جیسے کوئی ریشم کا کپڑا چاندی اور سونے کے موٹے موٹے تاروں سے مرصع جگمگائے۔ اگر آپ اس وقت دریا کے کنارے ہوتے تو ضرور دریا کی گرم موجوں کو ریتیلے ساحل سے آشفتہ سر ٹکراتے سنتے، دلفریب موسیقی کو سنتے جس کو سن کر آپ کو بے اختیار یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس سرچشمۂ حیات، منبع زیست اور مسرت [illegible]

حیات کا سرچشمہ ہی تو ہے!

یہ ہندوؤں کی دیوی ہے۔ سندھ کا نیل ہے جو سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا سورج کی روپہلی روشنی میں مسرور بہہ رہا ہے کبھی اس کا بہاؤ شہر کی مشرقی جانب تھا۔ لیکن اپنی لاابالی چلبلی روایت کے مصداق آج یہ بڑھیا الھڑپن سے دوسری جانب بہہ رہا ہے۔ اس کی ننھی منی سیمابی لہریں سورج کی کرنوں کے نورانی غبار میں جگمگا رہی ہیں۔ یہ ماں ہے، اس نے اپنی کوکھ سے کتنی ہی نہروں کو جنم دیا ہے۔ آہ! یہ وہی تو ہے جس کے پُرمسرت سینہ پر آنحضرت صلعم کی پیدائش سے صدیوں پہلے سقراط کے دیس یونان کے فوجوں سے لبریز جہاز بڑی ہم آہنگی سے ایک ذلیل ارادے سے بہے تھے، بڑے طمطراق سے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کو مسخر کرنے چلے تھے۔ تاریخ کے صفات کو ذرا اور الٹیئے۔ انگریزوں کے جہاز بھی اس کے سینے پر اپنی سفاکی کے ہزاروں نشانات ثبت کرتے اب سے صرف چند صدیوں قبل بہے تھے۔ یہ دیوی کتنی حسین ہے، یہ سدا جوان رہے گی اور آنے والی خزائیں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گی؟ اس کو حیاتِ دائمی حاصل ہے۔ سنئے تو کنارے سے ٹکراتی ہوئی موجیں کتنے دلکش مدھم سروں میں یہ مژدہ سنا رہی ہیں:

"پرانے چراغ جھلملا کر ایک نہ ایک روز خاموش ہو جائیں گے، پھر نئے چراغ روشن ہوں گے۔ لوگ یوں ہی آتے اور جاتے رہیں گے لیکن میں ـــ سدا جوان رہوں گی۔ اسی ہم آہنگی سے بہتی رہونگی۔ انسان کتنا ہی سفاک کیوں نہ ہو جائے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"

بہت دیر ہوگئی۔ آیئے اب حفاظتی مینارے سے نیچے اُتر آیئے۔ نہیں! کیوں بھلا ـــ؟ اچھا! دریا کے حسن نے مسحور کر لیا ہے، اچھا اب تو آجایئے ہم شام کو اس کے پاس چلیں گے۔

اب ہم قلعے کے شکستہ دروازے سے نکلتے ہیں۔ اپنی نگاہیں سامنے ہی جمائے رکھئے ـــ یہ میل ڈیڑھ میل لمبا بازار ہے جسے شاہی بازار کہا جاتا ہے۔ یہ ایک محراب دار اونچے دروازے پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ بازار یہاں کے تمام تجارتی لین دین، اور خرید و فروخت کا مرکز ہے۔ پان بیڑی سگریٹ سے لے کر آلات موسیقی تک یہاں دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ یہاں کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے۔ یہاں کی انارکلی ہے، یہاں کی ایلفی اور یہاں کا چاندنی چوک ہے! یہ بازار بہت تنگ ہے۔

بمشکل تین ساڑھے تین گز چوڑا راستہ ہے جس کے ہر دو جانب سہ منزلہ عمارات ہیں۔ ان عمارات کے زیریں حصہ میں دکانیں یوں برابر برابر ایک دوسرے سے پیوست اور منسلک ہیں۔ جیسے شہد کے چھتے میں مختلف خانے۔ سورج کی روشنی بھی بس یہاں خال خال ہی پہنچتی ہے، اس لئے کہ دکانداروں نے سائے کے لئے اوپر پردے کچھ اس طرح لگا رکھے ہیں کہ پورا بازار ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں دن کے وقت بھی خاصا اندھیرا رہتا ہے اور دکانوں میں روشنیاں جلتی رہتی ہیں۔ سارا دن بازار ضرورت مندوں، شوقیہ چلنے والوں اور نظارہ بازی کرنے والوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ سرکاری افسروں سے لے کر عام آدمیوں تک اور اژدہام ہیں بھول بھلیوں کی طرح ادھر سے ادھر اپنا راستہ بناتے، دھکے دیتے اور دھکے کھاتے آگے بڑھتے ہیں۔ اب سے کوئی دو ڈھائی سال پہلے اس تنگ بازار میں خوانچہ فروش اور ٹھیلے والے چلنے والوں کا راستہ اور بھی دشوار کر دیتے تھے۔ لیکن بعد ازاں اس کی تنگی کو دیکھ کر ٹھیلے والوں اور خوانچہ فروشوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے باوجود اس کی گہما گہمی میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی۔ رات کو آٹھ بجے تک (جب دکانوں کے بند ہونے کا وقت ہوتا ہے) اور اس کے بعد بھی یہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور کبھی تو آپ برقع پوش معزز — اور باحجاب خواتین کو بڑی بے بسی سے اپنا راستہ بناتے، لوگوں کے ہجوم سے لڑتی بھڑتی دیکھ کر ان کی بے بسی پر اپنے اندر جذبۂ ترحم کو بیدار ہوتا ہوا محسوس کریں گے۔

ہم بھی ہجوم کی ریل پیل سے لڑتے بھڑتے بازار سے نکل آئے ہیں۔ اور اب ہم اس میل ڈیڑھ میل لمبے بازار کے دوسرے کنارے پر آ گئے ہیں جو محراب دار بلند دروازے پر ختم ہوتا ہے۔ اس اونچے دروازے پر بڑا سا گھڑیال آویزاں ہے جس کا کام دن رات محض گزرتے وقت کی پشت پر ضربیں لگانا ہی ہے۔

ہم اسی سڑک پر آگے چل کر دائیں جانب مڑیں گے تو ہمیں ہیر آباد کا مشہور علاقہ ملے گا۔ جس کو کبھی بہترین رہائشی علاقے کی حیثیت حاصل تھی۔ پورا علاقہ عموماً ایک منزلہ عمارتوں پر مشتمل ہے جن کی تعمیر میں چھوٹی سرخ، یا دامی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہاں کے بیشتر مکانات پہلی جنگ عظیم یعنی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کے دوران تعمیر ہوئے تھے۔

اور اب ہمارے سامنے حیدر آباد سینٹرل جیل کی بلند و بالا سرخ اینٹوں سے تعمیر شدہ عمارت ہے۔ جس کی بنا ۱۸۵۱ء میں رکھی گئی تھی۔ اور یہ جگہ صوبہ سندھ پر انگریزوں کی فتح سے قبل مرحوم مرزا خسرو کی ذاتی قیام گاہ کا کام دیتی تھی۔

دیکھا آپ نے — ہم جیل سے نکل آئے ہیں۔ مگر ہمارے بائیں جانب ایک طویل و عریض قبرستان ہے۔ جس میں ابدی نیند سونے والے اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہیں کہ ان کے یہ مقابر آج شکستگی اور تباہ حالی کے مختلف ادوار سے گزر رہے ہیں۔ کون جانے اپنی زندگی میں انہوں نے کیسے کیسے کارہائے لائقہ سرانجام دیئے ہوں گے۔ اور ان کے رعب اور دبدبہ سے زمین تھرا اٹھی ہو گی لیکن آج — کس کم مائگی سے یہ زمین کے نیچے پڑے ہیں! دیکھئے۔ یہاں تقریباً ایک درجن مقابر ہیں۔ یہ مختلف جسامت کے ہیں اور تمام کے تمام کلہوڑا اور تالپور حکمراں خاندان کے مرحوم و مغفور حکمرانوں کے جسد خاکی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں سنسان مقام پر یہ شکستہ مقابر، شہر کی جگمگاتی گرم گرم زندگی میں رینگنے والے انسانوں کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ آپ جب یہاں آئیں گے تو ماحول کی یہ تیز، دبیز غمناک سنسناتی خاموشی آپ کے دل میں آخرت کا خوف بھر دے گی۔ آپ محسوس کریں گے آپ کو بھی ایک روز اس جہانِ فانی سے کوچ کرنا ہو گا جس کی رنگا رنگ بزم آرائیوں میں آپ اپنی انتہا، اپنے انجام کو بھولے بیٹھے ہیں۔ ان مقابر میں سے چند ایک پر خوبصورت اور رنگا رنگ ٹائلوں کا خوبصورت کام کیا ہوا ہے جو سندھ کی تہذیب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس قسم کی رنگین، منقش اینٹیں آپ کو پاک و ہند میں اس کثرت سے سندھ کے علاوہ کہیں نہیں ملیں گی۔ دیکھئے، مقابر کے اندر قبریں سنگِ مرمر سے تراشیدہ ہیں، آپ کو معلوم ہے ان مقابر میں ممتاز مقبرے، "غلام علی خاں" اور میر کرم علی تالپور کے ہیں۔ ان کے گرد بیرونی حصہ میں بے شمار قبریں ہیں جو بے توجہی کے سبب بڑی سرعت سے کھنڈرات اور ملبے میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ ہائے افسوس! ماضی کے ان پُرشکوہ حکمرانوں نے کبھی پل بھر کو بھی یہ نہ سوچا ہو گا کہ مرنے کے بعد ان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو گی، ان کے گرد موشی

آوارہ پھرا کریں گے اور اپنے فیضلے سے ان مقدس زمینوں کو آلودہ کریں گے ۔

چلئے تلک چاڑھی کی طرف واپس چلیں ۔ وہاں سے ایک بار پھر نشیب میں اُترتے ہوئے ہم بجائے بائیں طرف مڑنے کے سیدھے مغربی سرے کی طرف رخ کریں گے جہاں حیدرآباد چھاؤنی ہے ۔

دیکھا آپ نے، یہاں ہمیں بیشتر پرانی ڈھب کے بنگلے ملتے ہیں جو خوبصورت باغوں کے درمیان کھڑے قیام گاہ تھی۔ لیکن اب اس کی وسعتوں میں پاک بحری فوج مقیم ہے ۔ گدو روڈ سے ذرا اونچائی پر دیکھتے ہوئے ہمیں "پروٹیسٹینٹ چرچ آف سینٹ ٹامس" دکھائی دیتی ہے جو پہلے گیریزن چرچ کے نام سے مشہور تھی ۔ اسے ۱۸۹۵ء میں برٹش گورنمنٹ نے تقریباً ۵۰۰۰۰ روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا تھا ۔ اس میں اب بھی بہ آسانی بیک وقت چھ سو افراد سما سکتے ہیں ۔ اس میں کمیونین ٹیبل کے شمالی حصہ پہ ایک پیتل کی لوح آویزاں ہے جس میں فتح سندھ کے موقع پر میانی اور ڈابو کی لڑائی میں کام آنے والے انگریز افسروں اور فوجیوں کی تعداد درج ہے ۔ دوسری جانب ایک اور لوح پر اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ درج ہے ۔

فردوس ٹاکیز کے نزدیک گدو روڈ پر سندھ یونی ورسٹی کی عمارت ہے' یونی ورسٹی کا تصور ذہن میں آتے ہی جب ہم اس پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں قدرے مایوسی ہوتی ہے ۔ یہ عمارت ایک یونی ورسٹی کے لئے بہت چھوٹی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پہلے یہ عمارت بچوں کے لئے اسکول کا کام دیتی تھی۔

گدو روڈ پر چلتے ہوئے جب ہم پہاڑی سے اتر کر میونسپل باغ کی طرف بڑھتے ہیں تو ہمیں سڑک کے دو جانب چٹیل میدان دکھائی دیتا ہے ۔ جہاں آنکھوں کی تازگی اور فرحت پہنچانے کے لئے ایک چھوٹا سا بھی سرسبز قطعۂ ارض موجود نہیں ۔ لیکن ذرا آگے چلنے کے بعد سڑک کے دونوں جانب ایستادہ طویل قامت درختوں کے فرحت بخش سائے میں گرما کی اس جھلسا دینے والی گرمی کا احساس کم ہو جاتا ہے ۔ یہاں پر چند خوبصورت لیکن پرانی وضع کے بنگلے ہیں۔ ان کے عین مقابل میونسپل باغ ہے جو پہلے ایکانومک گارڈن کے نام سے مشہور تھا ۔ اور ۱۸۴۷ء سے قبل بحکم سر چارلس نیپیئر اس کی بنا رکھی گئی تھی تاکہ فوجی دستوں کے لئے تازہ اور سرسبز ترکاریوں کا انتظام ہو سکے ۔

آیئے، اب منحرف المرکز لوگوں کی قیام گاہ آرہی ہے ۔ مذکورہ باغ سے تھوڑی دور پر سڑک کے بائیں جانب پاگل خانہ ہے جو ایک شریف النفس' فرشتہ سیرت' ہمدرد بنی نوع انسان پارسی سرکاؤس جی ریڈی منی کی سخاوت کے نتیجہ میں ۱۸۷۱ء میں تعمیر ہوا ۔ یہ مختلف عمارتوں پر مشتمل ہے جن کا ایک چہار دیواری کے ذریعے احاطہ کیا گیا ہے ۔

میر جو ٹنڈو، جہاں اب لطیف آباد کالونی ہے' حیدرآباد کے مغرب میں کوئی تین میل دور واقع ہے اور دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے نزدیک ہے ۔

اور اب ہمارے سامنے ایک یادگاری ستون ایستادہ ہے ۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا ۔ ہاں بھی، بالکل' ۔۔۔ اب اس کی تاریخی اہمیت بھی بتانی پڑے گی ۔ ذرا رُکئے، میں دم تو لے لوں ۔ بہت تھک گیا ہوں ۔ آپ بھی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ آیئے اس درخت کی چھاؤں میں چند لمحات کھڑے ہو کر سستا لیں ۔ آپ نہیں پیتے' لیجئے نا، تکلف مت کیجئے ۔ خیر، سگریٹ میری فطرت ثانیہ بن چکی ہے ۔

ہاں تو یہ ستون ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریذیڈینسی بلڈنگ کے مقام کا تعین کرتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں اب سے سالہا سال پہلے میروں کے بلوچی فوجیوں نے ریذیڈینٹ میجر اوٹرام کی زیر قیادت انگریزی دستوں پر پندرہ فروری ۱۸۴۳ء میں انتہائی بہادرانہ حملہ کر کے انہیں الٹے پاؤں لوٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا ۔

مغرب میں سورج کا خون ہو چکا ہے اور ہماری کشتی دریائے سندھ کی سطح پر جو سینۂ مادر کی طرح شفیق ہے' بہت سہولت سے سبک سبک بغیر ہلکورے کھائے بہی جا رہی ہے ۔ ہولے ہولے' ہلکے ہلکے' ۔۔۔ دریائے سندھ ۔۔۔ عرب تاریخ دانوں کی لہیلی مہران' ۔۔۔ اور وہ دیکھئے چودھویں کا چاند اپنی تمام مہربان سیم گوں ٹھنڈی خواب آور کرنوں کے درمیان آہستہ آہستہ آسمان کی شفیق دھندلاہٹوں میں بلند ہو رہا ہے ۔ اور یہ سیماب صفت بے کل ستارے جنہیں ہر لمحہ جگمگانے ہی سے کام ہے کس طرح اپنی تمام شفیق نرماہٹ لئے، ہماری مسرت میں ہمارے شریک ہو رہے ہیں ۔ ان کی جگمگاتی روشنیاں ۔ پانی کی مرتعش سطح پہ متبسم دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہی ہیں ۔

یہ وہ لمحہ ہے جب پروازِ تخیل جانے کن کن اجنبی دیسوں کی طرف نکل جاتی ہے، وہاں جہاں زندگی تمام تر حسن اور احساسِ حسن ہے، جہاں غمِ دوراں غمِ جاناں جیسی کسی چیز کا وجود تک نہیں۔ سنیئے، اب تو ماجھی نے بھی فطرت کے حسن سے مسحور ہو کر کوئی بہت ہی دلفریب لیکن غمگین نغمہ چھیڑ دیا ہے۔ ... سستی کی غم زدہ آہوں سے بھرپور کوئی المناک نغمہ جیسے کہ برہ بول ہیں، اپنے پنوں کی صحرا صحرا جستجو میں ریت اور بگولوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی، پنوں پنوں چلاتی ہوئی سسی کے بے کل جیون کا تمام تر سوز ہے، غم ہے، طلب اور جستجو ہے!

اپنے ذہن کے تمام تر دریچوں کو کھول کر اسے اس جاوداں طلسمی لمحے کی یاد سے بھر لیجئے۔ کل آئے تو نہ جانے کن کن اجنبی دیسوں کی طرف جانا پڑ جائے۔ وہاں جہاں زندگی سرگرم عمل ہے اور جہاں جذبات فیکٹریوں اور دیگر صنعتی اداروں کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ ایسی مصروف اور مدقوق زندگی میں کبھی اپنے دریچے کے باہر پڑی ہوئی کرسی پہ نیم دراز ان لمحات کی یاد دل کی آنکھوں میں بجلی کا ایک کوندہ بن کر لپک جائے گی تو آپ زندگی کے اس بے ہنگم تسلسل اور جمود میں تازہ دم ہو کر از سرِ نو زندہ رہنا سیکھ سکیں گے، ـــــ یادوں کے سہارے، اور ایسے چند لمحے ہی تو حاصل زیست ہوتے ہیں

انسانی جستجو اور محنت کا مآل، ان کے سوا زندگی میں باقی ہی کیا رکھا ہے؟

ماضی کے جلال اور حال کے جمال کی یہ تصویریں، یہ جھلکیاں آپ نے دیکھ لیں، مگر میری نگاہیں مستقبل کے پردے کے پیچھے سے چمکنے والی روشنیوں سے بھی اکتساب نور کر رہی ہیں۔ اور آپ جب میری آنکھ سے دیکھ رہے تھے اور میرے ذہن کے ساتھ سوچ رہے تھے تو مستقبل کی کرنوں کو بھی آنکھوں میں اترتا محسوس کریں گے۔ حیدر آباد اور کوٹڑی میں جابجا مستقبل کی تعمیر کے ثبوت مل رہے ہیں۔

زمانہ نئی کروٹ لے رہا ہے اور دور انقلاب نے تو ایک نئی حیات، نیا ولولہ، نیا آہنگ زندگی کو بخش دیا ہے۔ میں نے دیکھا، اگلے لوگ جس طرح شہر کی آئینہ بندی کیا کرتے تھے، اب شہر کے بام و در سجانے کے ساتھ ساتھ معاشرتی و معاشی تعمیر کے کاموں میں خود حصہ لے رہے ہیں، نئی کاروباری تگ و دو، نئی نئی فیکٹریوں کا قیام، نوجوان صناعوں کا ذوق عمل، زندگی کی بھاگ دوڑ، ہماہمی، غرض جہاں جہاں نظر پہنچتی ہے تعمیر آشیاں کے لئے تنکے جمع کرنے کی سعی و کاوش کے ثبوت ملتے ہیں۔ شروع شروع میں جو فکر فردا نظر آتی تھی اب کوئی دو سال سے اسے پھر حیات تازہ نصیب ہو گئی ہے ٭

★

فکاھیہ :

کُنجِ خرابات

اشرف صبوحی

نواب کیا، نوابی کا کھنڈر، نواب گھسیٹا اپنے دیوانخانہ میں اکیلے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اپنے ہم مشرب دوستوں کا انتظار کرتے کرتے بےچین ہوکر ملازم کو آواز دیتے ہیں۔

نواب (بےچین ہوکر) نفیرے او نفیرے! مردود کہاں ٹل گیا؟

ملازم : حضور کے آگو تو کھڑا ہوں

ارے لپک کر خبر لائیو۔ مرزا جانی اب تک کیوں نہیں آئے۔

ملازم : یہ کیا آگئے ہیں سرکار۔

مرزا جانی: آداب عرض کرتا ہوں نواب صاحب

نواب : آگئے بھئی! بڑی راہ دکھائی۔

مرزا : سرکار! ذری نبتی خُفیہ فروش سے معاملہ کرتا رہ گیا تھا۔

نواب : مرزا صاحب سید کربلائی بھی غائب ہیں۔ شیخ فجو کا بھی پتہ نہیں۔ آج ذری سا ابر کیا آیا ہے سب ہی سیل گئے۔

مرزا : حکم ہو تو بچھوا تنبولن کی دکان تک ہو آؤں۔ آپ جانیں، اس کے ہاتھ کی گلوری کھائے بغیر انہیں چین نہیں آتا۔ سولسوے وہیں اٹکے ہوں گے۔

نواب: اب تم کہاں جاؤ گے کسی کو دوڑا دو۔ یہاں تو جماہیاں آرہی ہیں۔

مرزا: پھر اتنے میں تیار کروں؟

نواب : برا نہ ماننا، ان کے ہاتھ میں سرور ہی اور ہے۔ خدیجے (خدا جانے) کیا پڑھ کر پھونک دیتے ہیں!

مرزا : واقعی، کہیں ایسا نشہ ہی نہیں گھُٹتا۔ ذری دیکھئے گا نواب صاحب! وہ کون بزرگ سفید ڈاڑھی، گھٹا ہوا سر، ایک ہاتھ میں تسبیح، دوسرے میں سفید بستنی چڑھی ہوئی ٹیری کا بک لئے تشریف لا رہے ہیں۔ واہ رے استاد! واللہ ہاتھ چوم لے۔ عجائب خانے سے ہڈیوں کا ڈھانچ نکال کر خوب کھال چڑھائی ہے۔

نواب: شیخ جی معلوم ہوتے ہیں۔

شیخ جی: آداب عرض نواب صاحب!

مرزا : اماں شیخ جی آج تو قسمت جاگ گئی بھئی خوب آئے۔

نواب : شیخ جی! واللہ آنکھیں ترس گئی تھیں۔ حضت اتنے دن کہاں رہے؟

شیخ جی! قبلہ ذری کلکتہ چلا گیا تھا۔

مرزا ، سرکار! اب دیر کیا ہے۔ ہمارے شیخ جی تو ان فنوں میں یکتا ہیں۔

نواب: میں کیا انجان ہوں؟ سامان تو سارا لیس ہے۔ شیخ جی آجائیے میدان میں۔

شیخ جی۔ بسر و چشم! (پیالی دیتے ہوئے) لیجئے قبلہ نواب صاحب!

نواب : (چسکی لے کر) اے سبحان اللہ! لیجئے، یہ بھی آن پہنچے۔

سید : کیوں حضت ہمارا انتظار بھی نہیں کیا؟

نواب: ارے بھئی سیّد! تم کہاں کھپو ندیا گئے تھے؟

شیخ جی: چنچناؤ نہیں۔ تمہارا حصّہ میں نے الگ لگا رکھا ہے۔ لو،

سید: ارے کون؟ استاد پنیک! بھئی آج تو جو خدا سے مانگتا ملتا۔ واللہ! (چسکی لے کر) لطف آگیا۔ میں بھی کہتا تھا کہ یہ رنگ تو دیکھا ہوا سا ہے۔ حلق سے اترتے ہی سرور را اے سبحان اللہ۔ ان ہاتھوں کے صدقے۔

مرزا : کیا بات ہے بھئی دار الشفا کی برفیاں اِس وقت یاد آرہی ہیں۔ تازی نبی ہوں گی۔

سید: واللہ مرزا صاحب! ایک ایک ڈلی بہت ہے۔ دونا لطف آجائے گا۔

شیخ جی: (منہ پھیر کر) ارے کلّو! ذرا جھپاکے سے لانا تو سہی۔ لے آٹھ پیسے لیتا جا۔ ہات ترے ملاعون کی۔ حقہ پیتے پیتے رستے ہی میں فنا فی النار ہوگیا۔

نواب : (پنیک سے چونک کر) نفیرے ہوت۔ جب دیکھو غائب!

ملازم: حاضر سرکار حاضر!

مرزا: تمہارا کام چور ہے۔ ارے بھئی دوڑا چلا جا۔ رحمو کی دکان تو جانتا ہے؟ آدھ سیر برفی تلوا لا۔ دیکھنا ہیرو باسی نہ چڑھا دے۔

سید: ارے میاں ذری سی گنڈیریاں بھی تو منگوا لو۔

مرزا: حضرت دانت بھی ہیں۔

شیخ جی: دانت نہیں تو کیا ہوا۔ پلپلائیں گے۔

مرزا: اہا ہا! عنقا کا نابود ہونا کیا معنی؟ میں چشم دید کہہ رہا ہوں۔ اسکے سر پر ایسی چوٹی ہوتی ہے جیسی گھوڑے کی دُم۔

شیخ جی: اور میں اپنا مشاہدہ عرض کردوں۔ سکھنے جاتیوں کو رستہ میں ایک چڑیا کی منقار سے ڈھول تاشوں کی آواز سنائی پڑی۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کئی ساز ملے ہوئے بج رہے ہیں۔ قریب جا کے غور جو کرتا ہوں تو موسیقار ہے۔

نواب: آپ کو جھٹلانے والا اپنے حسابوں خود جھوٹا۔

سید: شیخ جی وہ آپ کا لکھی بٹیر تو مر گیا ہوگا؟

شیخ جی: شیر افگن! یہ کابک میں کیا ہے؟ مرنے کی ایک کہی۔ ارے صاحب اس کے دم خم ابھی ویسے ہی ہیں۔

نواب: بھئی ایسا بٹیر نہ دیکھا نہ سنا۔ کیوں حضرت کتنی ایک پالیاں جیتا ہوگا؟

شیخ جی: قبلہ! گنتی کس کو یاد ہے۔ مگر آخری کشتی انتخاب تھی۔ رستم و اسفندیار کے معرکے بھی ایسے نہ ہوں گے۔ خیال فرمائیے چھوٹے صاحب عالم کا دور دورہ۔ لکھنؤ کی اٹھتی ہوئی محفل، ایسا ہنگامہ کہ قیصر باغ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بادشاہ کا صف شکن۔ مرزا کنگرو کا منجھایا ہوا۔ پستے بادام ٹھونگ ٹھونگ کر مُنڈا۔ ادھر صاحب عالم نے اس حقیر کو ٹہوکا "شیخ جی۔ آج آبرو رہ جائے تو بات ہے"۔ مجھے بھی اپنے سُندر بن والے پر پورا بھروسہ تھا۔ اللہ کا نام لے کر چھوڑ دیا۔ یہ جھوجھل میں آ کر جو پلا ہے تو ایک ایک لات میں دس دس لڑھکنیاں کھلا دیں۔ ایک میں بیچارہ کیا، ہر شخص تھرتھرا رہا تھا۔ ادھر صف شکن بھاگا ادھر یہ چلا۔ مرزا کنگرو شاہی غرفے میں کہیں بھولے سے ڈپٹ بیٹھے۔ بھلا اسے کہاں تاب تھی۔ بہو بیگم صاحبہ جھروکوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ فرماتی ہیں مجھے سیمرغ کا شبہ ہوا۔ حضرت یہ دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ مرزا کنگرو اچک کر ہاتھی پر۔ داؤں تو اچھا کیا، لیکن بٹیر کو تو مفت خدا غصہ دلا دیا۔ وہ کیا کرتا۔ ادھر ہو تو ف فیلبان نے ہاتھی کو ریل دیا۔ ہاتھی کا سونڈ اٹھا کر آگے بڑھنا تھا کہ میرے شیر نے تیور بدلے۔ ایک جھتول لات جو رسید کرتا ہے تو ہاتھی مع عماری چاروں شانے چت۔ سناٹے بھیجا نکل گیا۔ پھر جو ہلڑ مچا ہے خدا کی پناہ! فوج میں کمر بندی ہو گئی۔ میں نے اسی دم بٹیر کو کابک میں بند کیا۔ یا تو خلقت نے اسے گنبد کا گنبد دیکھا تھا یا میرا ہاتھ پڑتے ہی مٹھی بھر پر تھے۔ اور اس ڈر سے کہ کہیں لام نہ بندھ جائیں کلکتے کی سیدھا بھریں۔

نواب: ہاں صاحب! اللہ نے سب طرح کی مخلوق پیدا کی ہے۔

مرزا: قبلہ و کعبہ فرمایا کرتے تھے ان جنگل کے پچھیوں میں جنات ہوتے ہیں۔

سید: اور جنات کہاں سے آئے؟

شیخ جی: میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارا شیر افگن کوئی جنوں کا بادشاہ ہے۔ واللہ اس کے قصے سناؤں تو صبح ہو جائے اور ختم نہ ہوں۔ پھر سند کے ساتھ عینی شاہد موجود ہیں۔

نواب: بھئی قسمیں کیوں کھاتے ہو۔ تمہاری تو شاعری میں بھی ہم نے کوئی مبالغہ نہیں دیکھا۔

شیخ جی: بلکہ میں تو لفظیں بھی ایسی بولتا ہوں جو پہلو دار نہیں ہوتیں۔

نواب: شیخ جی! آج تو کچھ سنا دو۔ بہت دن ہوئے کان ترستے پڑے ہیں۔

مرزا: ہاں بھئی، اب یہاں کون ہے۔ شاعری بانجھ ہو کر رہ گئی۔

شیخ جی: لیکن حضرت میں کیا اور میرا کلام کیا۔ پھر جب سے شیش محل کی صحبتیں چھوٹیں قسم لے لو جو ایک بیت بھی کہی ہو۔ سفر کی ماندگی بھی ہے۔ آواز کی خستگی ملاحظہ نہیں فرماتے؟

مرزا: یہ عذر آپ کی شان کے خلاف ہیں۔ ہاں خدا سلامت رکھے!

نواب: دو چار بیتیں ہی سہی۔ واللہ آپ کے شعروں کے تیور، پڑھنے کا طرز۔ کوئی دوسرا ہو تو لے۔ ہاں تمہیں ہماری جان کی قسم!

شیخ جی: دوستوں کی قدردانی ہے۔ خیر سنئے۔ سفر میں کلکتہ سے آتیوں کو دو چار بند موزوں ہو گئے ہیں۔

سید: کوئی مسدس کہا ہے؟

شیخ جی: مسدس کیا۔ افیون پر ذری سی فکر کی تھی۔

نواب: خوب خوب! سید کربلائی! تم جانتے ہو۔ اس قسم کے مضامین تو ہمارے شیخ جی کا حصہ ہیں۔

مرزا: سبحان اللہ! ارشاد ہو۔

شیخ جی: (دو چار مرتبہ کھنکارنے کے بعد ہچکی لے کر) آپ حضرات کے ملال کا خیال ہے۔ توجہ فرمایئے۔ عرض کرتا ہوں۔

نواب: ارشاد۔

شیخ جی:

مردمِ چشمِ حسینانِ جہاں ہے افیوں — عنبرِ خالِ رخِ حورِ جناں ہے افیوں
طفل بھی مرتے ہیں جس پردہ جواں کی افیوں — طرزِ معشوق، عجب راحتِ جاں کی افیوں
اس قدر عاشق و شیدا ہیں جہاں میں کس کے
یہ وہ لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہیں زن و مرد اس کے

مرزا: کیا بات ہے!

شیخ جی:

اس پریزاد کے القاب کروں کیا میں بیاں — حبش اور ہند کے حکامِ اجل کی سلطاں
مستی کوہ سرور، آتشِ موسیٰ کا دھواں — مرہمِ زخمِ دلِ عاشقِ بے ربطیٔ جاں
اہلِ غم بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے
لوگ معشوقِ سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے

مرزا: اے سبحان اللہ! "اہلِ غم بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے"

سید: اور سرکار! "لوگ معشوقِ سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے"

بند ملاحظہ ہو:

کوئی ساون کی گھٹا کہتا ہے کوئی ظلمات — کوئی لیلیٰ اسے کہتا ہے کوئی وصل کی رات
اس کی تلخی میں بھرا ہے مزۂ قند و نبات — اسی معجون کی تاثیر میں ہے موت و حیات
دل میں ہے کافر و دیں دار کے الفت اس کی
سنگِ اسود کی طرح کرتے ہیں حرمت اس کی

مرزا: ہر کہ شک آرد کافر گردد!

سید: ذری حرمت کی لفظ کو دیکھنا کیا بات نکالی ہے۔

شیخ جی: آداب عرض ہے۔ تسلیمات۔ تسلیمات!

مرزا: کیوں، خاموش کیوں ہو گئے؟

شیخ جی: اب پھر سہی۔ حافظہ بھی یاری نہیں دیتا۔

نواب: دو چار بند تو اور سنائیے۔ آپ کا حافظہ تو ماشاءاللہ چھاپہ خانہ ہے

شیخ جی: اجی۔ جوانی گئی زندگانی گئی۔ ساری باتیں سن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب وہ اگلی جیسی یادداشت کہاں۔ صبح کا کھایا تو رات کو بھول جاتا ہوں۔

مرزا: پھر بھی بالکل چٹ تو نہیں ہوا۔

شیخ جی: یہی اصرار ہے تو اِدھر اُدھر سے جو بند یاد آتا جائے گا، پیش کروں گا

نواب: کیا مضائقہ ہے۔

شیخ جی: لیجیے، دو بند اور یاد آ گئے۔

اس چھلاوے کے نرالے ہیں جہاں سے انداز — کہیں جادو ہے کہیں سحر کہیں شعبدہ باز
اسی سلطان کے ہیں سینکڑوں محمود و ایاز — بے خبر رہتا ہے اس شوخ کا ہر محرمِ راز
نہیں کھلتا ہے کہ بند آنکھوں سے کیا تکتے ہیں
دیدۂ دل سے مگر شانِ خدا دیکھتے ہیں

مرزا: چار مصرعوں سے کس قدر دست و گریباں ٹیپ پیدا کی ہے۔

نواب: مضمون کتنا سچا ہے۔

شیخ جی: تسلیمات! تسلیمات!

شیخ جی:

جامِ دل اس کی محبت سے اگر ہو مخمور — دائم الخمر رہے، بادۂ گلگوں سے نفور
پاک طینت ہے یہ دنیا میں نجاست سے دور — اس کے عشاق سے ہوتا ہی نہیں فسق و فجور
اس سے کرتے نہیں پرہیز کسی مذہب میں
صورتِ آبِ رواں پاک ہے ہر مشرب میں

سید: کربلا، نجف اشرف، خراسان ان سارے مقامات کے اکابر یہی کہتے ہیں۔

شیخ جی: بس حضور! اب کہاں تک سمع خراشی کروں۔

نواب: بھئی، ایک دو بند ہماری خاطر سے اور۔ واللہ کیا اچھوتے مضمون ہیں۔

شیخ: (کھنکار کر) عرض کرتا ہوں۔

مرزا: ارشاد۔ ارشاد

شیخ جی:

سانولے رنگ کا جلوہ ہے عجب ہوش رُبا — دم بھرکتا ہے شب و روز سیہ چشموں کا

مرزا: اے ماشاءاللہ! "دم بھرکتا ہے شب و روز سیہ چشموں کا"

شیخ جی:

سحر ہے ناز و ادا، قہر و بلا ہے غمزا — بد مزاجی بھی ہے اس شوخ کی خوبی سے سوا

سید: اے منہ چوم لے۔ یہ لفظیں آج کسے نصیب ہیں؟ ہاں حضرت؟

شیخ جی:

یہ وہ محبوب ہے اس کا ہو اگر محوِ جمال — آدمی زاد میں پیدا ہوں فرشتوں کے خصال

نواب: سبحان اللہ! یہی بات ہے۔

شیخ جی: ابھی اور سنیئے

شیخ جی:

نہ ہوس کھانے کی رہتی ہے نہ پینے کا خیال — اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں جو پائے وصال

اس سے صحبت جو تہ گنبدِ افلاک رہے

جُرمِ عصیاں سے فرشتوں کی طرح پاک رہے

مرزا: ——— اور توبہ۔ شاید اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی

شیخ جی: بس حضرت! حقیقت عرض کر رہا ہوں، سنتے جائیے۔

یہ وہ ہے پیرِ طریقت کہ جو ہو اس کا مرید — ماسوا اللہ سے اک آن میں ہو جائے بعید

نواب: وہ کیونکر؟

شیخ جی:

چونکہ رہتی ہے اسے نفس کُشی کی تائید — کیا عجب ہے جو خدا از لیست میں دے اجرِ شہید

مثلِ شمشیرِ اجل قاتلِ لذات ہے یہ

واہ کیا صاحبِ اعجاز و کرامات ہے یہ

سید: یہ دعویٰ، یہ ثبوت! سبحان اللہ! اے سبحان اللہ! اور پھر مصرعوں کی کروٹیں ملاحظہ ہوں.....

مرزا: بھئی ہمارے پاس کیا رکھا ہے۔ داد دینے میں بھی گھاٹے ہیں۔ بلا سے کچھ ہو، میں نے پانچ برسیں اپنی عمر کی آپ کو دیں۔ اللہ آپ کو جیتا رکھے!

شیخ جی: حضور کی ذرہ نوازی ہے۔

مرزا: کیا سچی باتیں کہی ہیں۔ ہمارے شیخ جی تو چھپے رستم نکلے۔

نواب: کیوں بھئی سید! کتنی مدت میں ایسا صاف ستھرا کلام سنا ہے؟

سید: بندہ نواز! مختصر یہ ہے کہ مجھے تو سیروں افیم کا نشہ ہوگیا۔ شاعری کیا سارے مصرعے معجزے ہیں۔

شیخ جی: (تن کر) یہ سب حضرت میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کی صحبت کا فیض ہے۔ ورنہ آج کل کے شاعر ان بندشوں کا کیا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اور ایک شاعری پر کیا منحصر، اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ لکھنؤ جیسا منچلا، عیش کا متوالا شہر ایسا اجڑا ہے کہ کہیں زندہ دلی کا نام نہیں رہا۔ مرغ بازی، بٹیر بازی تو غارت ہوئی تھی۔ چانڈو مدک بہر نو پہرے لگے ہی تھے۔ کوئی برائی ہوگی۔ کنکوے اڑانا کیوں موقوف ہوا؟ آج کل کہیں پیچ بھی ہوتے نہیں دیکھے!

مرزا: حضرت! کنکوے لڑانے کو ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہیئے۔ کنکوے کے ساتھ دولت اڑتی ہے۔ کوئی بیچارہ کیا کھا کے لڑائے گا۔ لڑانے والے مرگئے اور لڑائے ہم نے۔ باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت گھر میں۔ کنکوے لڑانے کے کہاں تھی۔ ایک دن کی سنئے۔ میں نے چھٹن صاحب سے پانچ اشرفی پیچ بدا تھا۔ ادھر میں نے بگلا بڑھایا، اُدھر انہوں نے الفیا کھینچا۔ اب دونوں کنکوے چھپکتے ہوئے، کندھے جھاڑتے متوالوں کی طرح جھومتے جھامتے چلے جاتے ہیں۔ واللہ ہے دو چرخیاں جن پر ساڑھے تین تین سیر ڈور چڑھتی ہے، خالی ہوگئیں اور پیچ آج نہیں ملتے کل نہیں ملتے۔ ایک بار ہی پیچ ملانے کی گھات میں غوطہ جو کھلاتا ہوں تو ڈور بنارسی باغ والے چھالیوں کے پیڑ میں جا پھنسی۔ لاحول ولا قوۃ! کمبخت لاسا ہوگئی، عاجز آگیا۔ شرمندگی الگ۔ پیچ و تاب کھا کے رگڑا جو بتاتا ہوں تو پیڑ کے دو ٹکڑے اور کنکوا سر پر۔ واہ وا کا غل مچ گیا۔ اِدھر اُدھر پھیر پھار دو ہاتھ جو زنا ٹے کے لگاتا ہوں تو چھٹن صاحب کا کنکوا کھٹ سے الگ۔ لیکن ہاتھ لگاتا ہوا پیچھے جو ہٹا تو سہ منزلے کھپریل پر، اور کھپریل سے گولی کی طرح لنڈھکتا ہوا پچھواڑے والی گڑھیا میں غڑاپ سے جا رہا۔

نواب: ارے رے رے! سارا کھیل پانی ہوگیا ہوگا!

سید: بھئی کہیں چوٹ چپیٹ تو نہیں لگی؟

مرزا: اجی اس گڑھیا پہ خدا کی مار! پچھلی سنیچر کے دن انجینئر صاحب نے اس کی تھاہ لینی چاہی تھی۔ چودہ ہزار فٹ ڈوری غائب غلّا ہوگئی۔ تھاہ ہوتی تو پلتے۔ گڑھیا کا ہے کو سمندر کی بچّی کہئے۔ دفتر میں اندراج موجود ہے۔

شیخ جی: اُفّوہ! پھر!

مرزا: پھر کیا؟ گرتے کے ساتھ ہی بس ایک غوطہ کھایا۔ ڈور تو ہاتھ میں تھی۔ پیرنے ویرنے سے تو نام کو بھی آشنا نہ تھا۔ لکن کنکوے کے زور سے پانی کے اوپر بلبلے کی طرح پیرتا پھرتا ہوں۔ اتنے میں ہوا کا جنگی جھونکا جو آتا ہے اور کنکوا اُن کے جو فرّاٹا بھرتا ہے تو بندہ پھر اسی سہ منزلہ پہ تھا۔ حضرت کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی! تول میں ساڑھے سات من پختہ کا آیا تھا۔

شیخ جی: پیر و مرشد بجا ہے! اس میں کوئی خلافِ عقل بات بھی نہیں۔ بلکن یہ خبر تو لندن کے اخباروں میں بھی چھپی تھی۔ اور ہاں خبر کے ساتھ دونوں کنکووں کی تصویر بھی تھی۔ یہ انگریز بھی غضب کے پتلے ہیں۔ کہاں بیٹھے ہوئے کہاں کے فوٹو اتار لئے!

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

غزل الغزلات!

منیر جعفری

اس سال خاور (مشرقی پاکستان) سے باختر (مغربی پاکستان) تک فلوُ کی گرم بازاری دیکھکر اس "جنگی بخار" کی یاد تازہ ہوگئی جس نے ۱۹۱۹-۱۹۲۰ء میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر ایک کہرام مچا دیا تھا۔ اس سے خیال پیدا ہوا کہ یہ موضوع بھی کچھ کم قومی نہیں۔ اسلئے سید ضمیر جعفری صاحب کو اس پر طبع آزمائی کی دعوت دی گئی جس کو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا مگر وہ غالباً خود ہی فلو کا شکار ہو گئے۔ اسلئے ایک مردے از غیب کو خدا دا موقع ملا کہ ان کی بذلہ سنجی کا حق وہ ادا کرے۔ اس زدِ قلم کا نتیجہ یہ پُر لطف نظم ہے جس کو ہم قارئین کے تفنن طبع کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ مدیر

کچھ اس انداز سے اس سال اے یاراں فلوُ آیا
کہ آثارِ قیامت کا سا نقشہ روبرو آیا
بڑھا قریہ بہ قریہ، شہر شہر اور کو بکو آیا
پروبازوئے عزرائیل بن کر ہو بہو آیا
بچا مشرق میں کوئی اور نہ مغرب میں بچا کوئی
کوئی تو ابن مریم ہو، کرے دکھ کی دوا کوئی
کچھ آیا اس طرح اُٹھ کر شکوہِ ترکمانی سے
کہ عاجز آ گئے سب ڈاکٹر بھی نسخہ دانی سے
ہوا شرمندہ ایٹم بم بھی اپنی قہرمانی سے
تھا پانی نقش بر دیوار بلغم کی روانی سے
وہ کھانسی جس سے ڈلکا بج رہا تھا جا بجو اس کا
وہ نزلہ، وہ بہے جانا مثالِ آبجو اس کا
نہیں دیتا مسیحا گو اثر کر پاس آ جائے
کوئی مریخ کا باسی بروئے طاس[1] آجائے
جہنم سے نکل کر اہرمن کی سانس آجائے
ہے داروئے اجل ہی جو کسی کو راس آجائے
اسی کا راج ہے جب تک بقلئے دورِ سما ہے
خدائی کے لبوں پر رات دن وردِ "کریما" ہے
میاں کی سانس اکھڑی ہے تو بیگم بھی روہانسی ہے
اُدھر چھینکوں پہ چھینکیں ہیں، اِدھر کھانسی پہ کھانسی ہے
دمادم بجتی ہے چھاتی کہ جیسے تھال کانسی ہے
دمِ آخر ہے سب کا ہر طرف پھانسی ہی پھانسی ہے

جہاں دیکھو اُدھر اک قہقہوں کا دور جاری ہے
انوکھے بلبلوں کے چہچہوں کا دور جاری ہے
نہ کیوں بے اختیاری میں یہ لب پر اپنے لے آئے
ہو دم بھر جس سے تسکیں یا الٰہی ایسی شے آئے
کہاں سے کس طرح سے کاسۂ سر میں وہ مے آئے
جوشاندہ ہی سہی پیالہ اسی کا پے بہ پے آئے
افاقہ اس سے گو ہوتا نہیں ہے پھر بھی کیا غم ہے
کریں گے حق ادا کھانسی کا جب تک دم میں یا دم ہے
اگر ہر درد کی حق نے یہاں کی ہے دوا پیدا
تو پھر کی ہوگی داروئے فلو نے کچھ ادا پیدا
کوئی تدبیر استیصالِ ظالم ناروا پیدا
جہاں کی ڈوبتی کشتی کا کوئی ناخدا پیدا
قضا و قدر نے خود ہی لگا رکھی ہے پابندی
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی
رواں سکہ اسی کا باختر سے تا بہ خاور ہے
بظاہر دورہ دورہ جس کا عینِ حکم داور ہے
پلٹنا حکمِ حاکم کا نہ باور تھا نہ باور ہے
چلے صحت کا سکہ کس طرح اللہ ہی یاور ہے
کہ اس فتنے کا باعث ہے ہماری ہی زیاں کاری
جہاں دیکھو وہاں ہے گندگی کی گرم بازاری
نہ رستم اس سے بچتے ہیں نہ بالاں اس سے بچتے ہیں
گدا بچتے ہیں اس سے اور نہ سلطاں اس سے بچتے ہیں

نہ بچتی جھگیاں اس سے نہ ایواں اس سے بچتے ہیں
نہ بنگلے اور نہ سیٹھوں کے شبستاں اس سے بچتے ہیں
ادا کرنا ہی پڑتا ہے گنہ کا سب کو کفّارہ
وبائے عام کا بجتا ہے چاروں کھونٹ نقّارہ
جو روغن میں ملاوٹ ہے تو کھانوں میں ملاوٹ ہے
سپاری میں ملاوٹ ہے تو پانوں میں ملاوٹ ہے
جو گیہوں میں ملاوٹ ہے تو دھانوں میں ملاوٹ ہے
دکانوں میں زمانے بھر کی دانوں میں ملاوٹ ہے
جو یہ ہو تو مرض کیونکر نہ باساز و براق آئیں
برائے ہر کہ ومہ آئیں با صد طمطراق آئیں
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم تھا
یہ شغل چور بازاری، گراں جانی کو کیا کم تھا
ثمر اپنی ہی غفلت کا ستم رانی کو کیا کم تھا
یہ ہاتھ اپنا ہی اپنی فاتحہ خوانی کو کیا کم تھا
کہ یا رب! کر دیا برپا یہ تو نے محشرِ ثانی
چڑھے تپ مرغ بریاں کو یہ بریانوں کی بریانی!
غرض اب تا بکے اس زور سے آہ و فغاں کیجے
مناجاتوں کا لمبا سلسلہ وردِ زباں کیجے
جلے دل کا دھواں تا گنبدِ گردوں رواں کیجے
کہاں تک عرض کاوش ہائے اندوہِ نہاں کیجے
دعا ہے یہ فلو کا خاتمہ بالخیر ہو جائے
گلا چھوڑے کہیں، وقفِ گلوئے غیر ہو جائے!

---

[1] طاس — اُڑن طشتری جسے بعض لوگ اہلِ مریخ کا زمین کے ساتھ نامہ و پیام و راہ پیدا کرنیکا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

غزل

عبدالعزیز فطرت

رگِ جاں جب بھی غزل خواں ہوگی
زندگی رقصِ بہاراں ہوگی

جانتا ہوں، شبِ غم کی مشکل
جان جائے گی تو آساں ہوگی

مرتے دم تک ہمیں معلوم نہ تھا
زیست شرحِ شبِ ہجراں ہوگی

درد نکھرے گا تو بن جائے گا دل
موج اگر پھیلے گی، طوفاں ہوگی

ہم جو ہم ہیں، تو ہماری مشکل
بڑی مشکل ہی سے آساں ہوگی

کیا خبر تھی کہ خوشی کی تنویر
پردۂ غم سے نمایاں ہوگی

گوشۂ دل میں سلگتی ہوئی آگ
دوستدارِ شبِ ہجراں ہوگی

جگرِ چاک ملے، تو کس کو
حسرتِ چاکِ گریباں ہوگی

عشق صادق ہے تو ویرانئ دل
اپنی آبادی پہ نازاں ہوگی

ہوں گے ہمدوش اثر سے فطرت
میرے نالوں میں اگر جاں ہوگی

غزل

ایاز صدیقی

ان کی بے گانہ روی رفتارِ دوراں ہوگئی
موجِ غم کچھ اس طرح پھیلی کہ طوفاں ہوگئی

آرزو ابھری، خرد بھٹکی، جنوں کو دے اٹھا
درد چمکا، دل جلا، ہستی فروزاں ہوگئی

اس قدر بھٹکی ہے راہِ جستجو میں زندگی
گمرہی افسانۂ ہستی کا عنواں ہوگئی

ہم سکوں آغوش تھے، دنیا سکوں آغوش تھی
ہم پریشاں کیا ہوئے دنیا پریشاں ہوگئی

اوّل اوّل دشمنی میں بھی وفا کا رنگ تھا
آخر آخر دوستی بھی دشمنِ جاں ہوگئی

عقل ہی نے عقل کو زنجیر پہنا دی ایاز
زندگی سے زندگی دست و گریباں ہوگئی

فن :

نقّاش یا کندہ کار ؟

ضیاء العین ضیا

کچھ یہی سوال ہے جو مشرقی پاکستان کے جواں سال فنکار — اس کی عمر اس وقت کل ۳۰ سال ہے — صفی الدین کے سلسلہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ اسے ایک نقاش کہیں یا کندہ کار۔ اور جب ہم اس کی تمام سرگرمیوں اور فنی مظاہر کا جائزہ لے بھی چکتے ہیں تو بھی اس سوال کا دو ٹوک جواب نہیں دے سکتے۔ شاید اس کی وجہ فن کار کے وجدان ہی میں کوئی بات ہو۔ بہرحال اس سلسلے میں اس کی زندگی کے ظاہری پہلوؤں پر بھی نظر ڈالنا لازم ہے۔ اور اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنا بھی ضروری ہے۔

مشرقی پاکستان کا یہ ہونہار فن کار — کشیدہ قامت، نرم دم گفتگو، اخلاق و شائستگی کا پیکر — کلکتہ میں پیدا ہوا۔ اُس کے اُبھرتے ہوئے شعور نے ابتدا ہی سے لیتھو کے کام سے دلچسپی پیدا کرلی جس سے رنگ و روغن کے گداز فن — نقاشی، کی بہ نسبت ایک ٹھوس فن سے رغبت ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح کندہ کاری سے ملتا جلتا فن اس کی "پہلی محبت" قرار پایا۔ لیتھوگرافی سے لکڑی کا کام کچھ دور نہیں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ لکڑی پر نقش کھودنے اور اس قسم کے دیگر مشغلوں سے دلچسپی لینے لگا۔ یہ محض ابتدا تھی۔ ایک ذہین و فطین جوہر کے اپنے آپ کو پانے یا ظاہر کرنے کی کوششیں۔ جس طرف طبیعت نکل جائے اور اس طرح اس کو اپنے فطری رجحانات کا سراغ مل جائے۔

مگر ایسی اضطراری کوششیں زیادہ سے زیادہ ایک علامت ہوتی ہیں جو میلانِ طبع کی کچھ کچھ نشاندہی ہی کرتی ہیں۔ طبیعت کا حقیقی رنگ، تو جب کھلتا ہے کہ انسان باقاعدہ تعلیم پائے، تربیت حاصل کرے۔ خام جوہر پختہ ہوں اور جو بات مبہم ہے وہ بالکل واضح ہو جائے۔ صفی الدین نے بھی یہی محسوس کیا اور فن کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اس نے کلکتہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں کئی استادوں کی زیرِ تربیت فن کے رموز سیکھے یہاں تک کہ ڈپلوما بھی حاصل کر لیا۔ بلکہ ۱۹۴۵ء میں "اکیڈمی آف فائن آرٹس" کلکتہ کی طرف سے "طلائی تمغۂ صدر" بھی حاصل کیا۔ ارباب شناس حلقوں میں اس کی حیثیت تسلیم کی جانے لگی۔ اس زمانہ میں وہ روغنی و آبی رنگ استعمال کرنے کا دلدادہ تھا۔ مسی پلیٹوں پر کام کرنے یا ان میں کسی تیکھے اوزار سے کھود کھود کر نقش کندہ کرنے کی طرف زیادہ رجحان نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں یونیسکو کی زیرِ نگرانی پیرس میں جو بین الاقوامی نمائشِ فنون منعقد ہوئی، اُس میں صفی الدین کے ایسے ہی نقوش رکھے گئے تھے۔ جن میں رنگ و روغن ہی سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس میں پہلے نقاش ہی بیدار ہوا، کندہ کاری کا شعور بعد میں پیدا ہوا۔

۱۹۴۶ء میں ایشیائی فنونِ لطیفہ کی ایک بین الاقوامی نمائش دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ صفی الدین نے اس میں بھی شرکت کی۔ اور ۱۹۴۷ء میں اس کی نقاشی کے نمونے "انڈیا ہاؤس" اور "برلنگٹن ہاؤس" (لندن) میں بھی آویزاں کئے گئے۔ اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں سنگاپور میں بھی اس کے کام کی نمائش ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں جب سارے ملک کی کایا پلٹ گئی تو وہ کلکتہ کو چھوڑ کر اپنے نئے وطن، مشرقی پاکستان آ گیا۔ اور "ڈھاکہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ" میں گرافک آرٹس کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ مگر یہ بھی اس کی پرورشِ فن کا ایک مرحلہ ہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل جو شخص فن کی کسی شاخ میں مہارت پیدا کرنا چاہے، اس کے لئے یورپ جانا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ فنون وہاں برسوں کی نشوونما کے بعد ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ چکے ہیں۔ چنانچہ صفی الدین بھی

اس اہم مقصد کے لئے اس دنیائے ہنر و فن کو روانہ ہوا۔ مگر یہ نسبتہً حال کی بات ہے۔ کیونکہ اس نے انگلستان اور یورپ کا دورہ ماضیٔ قریب ہی میں کیا ہے۔ اس طرح اسے یہ موقع ملا کہ وہ مغرب کے تجربہ و حکمت کے چراغوں سے روشنی حاصل کرے اور اپنے شعور و فن کو جلا دے۔

۱۹۴۸ء تک صفی الدین کی فنی کاوشوں کی جو کیفیت رہی، اس سے ایک بات بخوبی ظاہر ہے۔ ابھی تک اس کی طبیعت کے رجحانات غیر معین تھے۔ شعور ذات اور عرفان فن کے مرحلے ان کے لئے بھی آسان نہیں ہوئے۔ اور صفی الدین کی ابھی تک عمر ہی کیا تھی۔ اس لئے اگر صفی الدین کو بھی اپنا اور اپنے فن کا دھندلا دھندلا سا تصور رہا، تو یہ کچھ عجب نہیں۔ ہر فن کار کو تلاش، جستجو اور دریافت خود کے ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی منزل نگاہوں سے نہاں ہوتی ہے۔ اور وہ کبھی کبھی فیضان کے لطیف و براق لمحوں ہی میں اس کا سراغ پا سکتا ہے۔ صفی الدین کے اس وقت دو مسئلے تھے۔ ایک اپنے آپ کی تلاش اور دوسرے اپنے مشاہدات کی تلاش اور محسوسات کو مادی شکل میں جلوہ گر کرنے کے لئے ایک برجستہ اسلوب اظہار۔ اس احساس کے تحت وہ تمام تر اسی تلاش میں منہمک ہو گیا۔ اس کے نزدیک جہاں تہاں نمائشوں پہ نمائشیں ترتیب دینا اور سستی شہرت حاصل کرنا بیکار تھا۔ ایک فن کار کے لئے حقیقی مایۂ شرف یہی ہے کہ وہ اپنی بصیرت اور اپنا اسلوب پیدا کرے ــــ دونوں منفرد، دونوں اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے اور اس کے طبعی جوہروں سے وجود پذیر۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد کوئی آٹھ سال تک اس کی زندگی خلوت ہی کی زندگی رہی۔ جس میں جلوت کو بہت کم دخل رہا۔ دریافت، تجربہ، تحقیق یہی تمام تر اس کی کاوشوں کا حاصل تھا۔ قدرتی طور پر جب یہ ایک ایک کر کے نمودار ہوں گے تو اس کو اپنی حقیقی قوتوں، اپنی صلاحیتوں جوہروں، کا علم ہو جائے گا۔ یہ درحقیقت اپنی طبیعت کی رو میں بہے جانے کی تکنیک ہے۔ اس زمانے میں اگر اس کے ہاتھ میں موقلم تھا۔ اور نظر قرطاس پر تھی، تو اتنے ہی ذوق و شوق اور شدت کے ساتھ وہ نفیس چوبی نقش تراشنے میں بھی سرگرم رہا۔ وہ احساس تنہائی، وہ کھویا کھویا پن، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش، یہ سب اس کی تمام شخصیت کو محیط تھے۔ گویا یہ لمحات خود شناسی کے مقام تک پہنچنے سے پہلے کے وہ لمحات تھے جن سے خلا کا احساس ہوتا ہے۔ اور جب یہ لمحے رخصت ہو جاتے ہیں تو وہ روشن لمحات چھوڑ جاتے ہیں جن میں ہر چیز روشن روشن اور نکھری نکھری نظر آتی ہے۔ مدتیں گزر گئیں مگر وہ لمحات یا لمحہ نہ آیا جب اس کو اپنا حقیقی کام، اس کی وضع معلوم ہو۔ اس گو مگو کے عالم میں اس نے یہ طے کیا کہ وہ یورپ کی وسیع دنیا کی سیر کرے جو فنی حیثیت سے روشن تر دنیا بھی تھی۔ شاید وہاں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جس مقصد کا وہ متلاشی تھا وہ حاصل ہو جائے۔

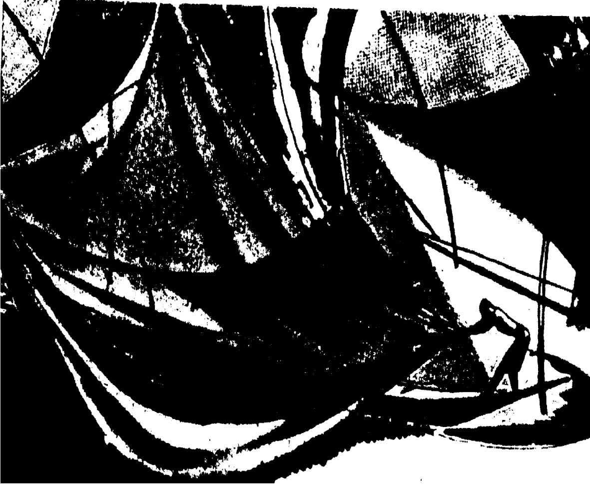
فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

مگر اسے مغرب کی آرٹ گیلریوں سے جوت جگانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اپنے ہی دیس میں طوفان حوادث اس کے لئے مکتب اور لطمۂ موج، سیلی استاد ثابت ہوا۔ یہ طوفان ایک حقیقی طوفان تھا، اور لطمۂ موج فی الحقیقت لطمۂ موج۔

مشرقی پاکستان کو سیلابوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ اور یہ سچ مچ سیلابوں کی سرزمین ہے۔ انسان کی قدرت کے خلاف جنگ کی ایک شاندار مثال، صفی الدین کے دیس کا ایک اور ہم پیشہ و ہم مشرب تھا۔ زین العابدین، جس کے لئے ایک ایسا ہی حادثہ الہام آفریں ثابت ہوا تھا۔ بنگال کا خوفناک قحط۔ زین العابدین نے اسی میں اپنے آپ کو پایا تھا۔ اور اب صفی الدین کو اپنا عکس سیلاب کی ہیبت ناک موجوں میں نظر آیا۔ وہ چیز جس نے اس کے دل کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور اپنی سب سے زیادہ گہری قلبی کیفیتوں کو جلوہ گر کرنے کی تحریک دلائی۔ اس نے دیکھا۔ ایک قہار جبار بپھرا ہوا بے پناہ دریا، اونچے اونچے کڑاڑوں کو توڑ پھوڑ کر ہڑپ کرتا ہوا۔ میل ہا میل تک آبادیوں کو زیر و زبر کرتا ہوا، شہروں میں ہزاروں خوش و خرم، رستی بستی گھر گرہستیاں حلقۂ صد کام نہنگ کا شکار ہوتی ہوئیں۔ اور سیلاب، ہر قید و بند کو توڑتا ہوا بے تحاشا سیلاب، قاآنی کے مار گرزہ کی طرح ایک خوفناک اژدہا نے مسلسل شکنجے، کی طرح شہر کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کی ہڈیوں، پسلیوں کو چکنا چور کرتا ہوا۔

اس سیلاب نے صفی الدین کے ذہن میں ایک تہلکہ پیدا

شی یا کندہ کاری؟

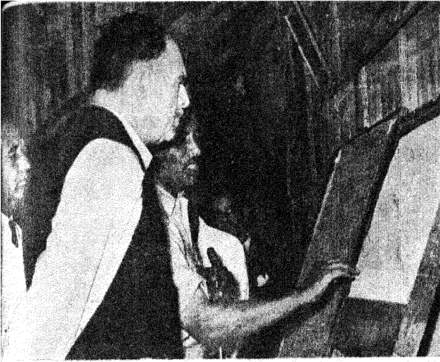


رقی پاکستان کے جوان سال مصور،
[illegible] ، کے دو بدیع فن پارے

جل ، جال — جیون (ایچنگ)

سیلاب : جو مشرقی پاکستان کے باشندوں کو جہد حیات کی مستقل دعوت ہے (آبرنگی نقش)





سیلاب زدگان مشرقی پاکستان کی امداد کے لئے افواج اور
بنیادی جمہوریتوں کی سرگرم کارروائی



سنہری ریشہ : سنہری مستقبل (رپورٹ جوٹ
انکوائری کمیشن)



نہری رو پہلی : پاکستان کے سب سے بڑے ضلع' میمن سنگھ، میں پٹ سن
اور دھان کی وسیع پیمانہ پر پیداوار



بلوچستان کے پسماندہ علاقوں میں بنجر زمینوں کو قابل کاشت
بنانے کی تدابیر (اسکالکو، ضلع مستونگ)

کردیا۔ فنکار اور اس کا ماحول ایک ہوگئے۔ زندگی اور فن ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس کے دیدہ و دل نے مشرقی پاکستان کی حقیقی زندگی اور اس کے بنیادی تجربوں کو پالیا۔ اس کے مشاہدہ و تجربہ نے اس زندگی، اس تجربہ کا مکمل احاطہ کرلیا۔ وہ کوئی کنارے پر کھڑا ہوا ناظر نہ تھا کہ اس کی حیثیت محض تماشائی کی ہو۔ سیلاب خود اس کے کمرہ تک چڑھ آیا تھا۔ ایک بل کھاتا، پھنکارے مارتا، تند و تیز سیلاب جو سنہری دھوپ اور روپہلی چاندنی دونوں میں اپنی چھب دکھاتا، مصور کو لبھاتا اور اسے دعوت اظہار دیتا۔ اسے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں نظر پڑیں جیسے وہ سب سیمیائی پیکر ہوں، سربند مچھلی کی رفتار، تیز یا مدھم، ایک طلسمی نظارہ تھا۔ اس تباہ کن منظر میں نقاش کو موضوع ہی موضوع بکھرے نظر آئے۔ وہ فن کار کی نگاہِ بینا سے دیکھتا تو اسے سطحِ آب کے نیچے خطوط اور طرحوں کی ایک دنیا جھکولے لیتی نظر آتی۔ جس نے اس کی روح کا ایک ایک تار ہلا کر رکھ دیا۔ اور پھر اُن سے جو لرزشیں پیدا ہوئیں، انہوں نے خود بہ خود قرطاس پر رنگوں کی صورت اختیار کرلی۔ اور فن کا معجزہ بروئے کار آیا۔ اب اسے اپنا موضوع معلوم ہوا۔ اسے اپنے آپ، اپنے فن کا پورا پورا وثوق ہوچکا تھا۔ اور اس نے جو نقوش بنائے وہ واقعی اس کی اپنی چھاپ لئے ہوئے تھے۔ حقیقی معنوں میں تخلیقی و انفرادی۔ اب وقت تھا کہ وہ اپنے حقیقی سرمایۂ کمال کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہ موقع اسے ۱۹۵۹ء میں ملا۔ جب کہ لندن میں ایک نمائشِ فن منعقد ہوئی اور اس نے "نیوورن آرٹ گیلری" میں اپنے ۵۹-۱۹۵۸ء کے بنائے ہوئے فن پارے پیش کئے۔

ان تصاویر کی خوبی یہ تھی کہ ان میں موضوع یعنی سیلاب کی تصویر کشی کا حق بھی ادا کیا گیا تھا اور فن کار کی اپنی نظر بھی کام کررہی تھی۔ باہر کی دنیا کا عکس بھی تھا اور صاحب فن کی اندرونی دنیا کا عکس بھی۔ برسوں کی مشق و تجربہ کے بعد اسے کندہ کاری جیسے فن پر بھی فی الجملہ دسترس حاصل ہوچکی تھی جس کی طرف اس وقت تک بہت کم لوگوں نے رجوع کیا تھا۔ اور یہی وہ نمایاں خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ سوئٹزرلینڈ کی بین الاقوامی سہ سالہ نمائش اُچھی الوان نگاری منعقدہ ۱۹۵۹ء میں انعام کا مستحق قرار پایا۔ اب وہ محض نقاش ہی نہ تھا، کندہ کار بھی تھا۔ اور کندہ کاری کی طرف اس شدت سے مائل گویا نقاشی اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہو۔ اسے لڑکپن میں لکڑی پر کھدائی اور لیتھوگرافی کا شوق تھا جو آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے نقاشی پر چھا سا گیا۔ گویا وہ مرقع کشی کی بہ نسبت ارتسام اور تراش خراش کے فن کی طرف زیادہ مائل ہو۔

شاید محض یہ کہہ دینے ہی سے فن کار کا امتیاز پوری طرح ظاہر نہ ہو۔ اس کے لئے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ موقلم کا فن ہمارے یہاں کتنا ہی پرانا سہی، مگر تیکھی نوک کی چیز سے کھود کھود کر، تراش خراش کر کوئی چیز تیار کرنا، اس کا ہمارے یہاں دستور نہ تھا۔ اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ غالباً ہمارا نامور فن کار، عبدالرحمٰن چغتائی ہی ہے۔ جو مصوری اور کندہ کاری دونوں فنون کا استاد تھا۔ اور کسی فن کار کو اس کا خیال نہ آیا۔ یا شاید وہ اس ذریعۂ اظہار کو عام عقیدہ کے مطابق درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھتے تھے۔ مصوروں کی دنیا تو بس رنگ و روغن ہی کی دنیا تھی۔ وہ تو مشغلے یا تفریح کے طور پر تبدیل ذائقہ کے لئے بھی اس کی طرف رجوع ہونے پر تیار نہ تھے۔ چہ جائیکہ اسے باقاعدہ فن کے طور پر اختیار کرتے۔

ایشیا تو ایشیا مغرب میں بھی انگریلونگ اور ایچنگ کو بہت کم فروغ حاصل تھا۔ بیشک سولھویں سترھویں صدی عیسوی میں کتابوں کے گرد پوش، فنِ ارتسام ہی کے شرمندۂ احسان تھے۔ اور اس طرح اس فن کو خاص ترقی ہوئی۔ مگر جونہی طباعت کے موجودہ طریقوں نے میدان میں قدم رکھا اور اُس تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے جو مشینی دور کا خاصہ ہے، تو دوسرے دستی ہنروں کی طرح ارتسام اور کندہ کاری بھی گرد ہوگئے۔

جب یہ فنون اس طرح گلدستۂ طاقِ نسیاں بن گئے تو خوش قسمتی سے دو اُستاد میدان میں آئے جنہوں نے ان کو مٹتے مٹتے سنبھال لیا۔ ان میں سے ایک تھا ہالینڈ کا مشہور نقاش، ریمبراں اور دوسرا انگلستان کا نامور ہیدو ہسلر دونوں نے ان فنون میں ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ یہ پھر سے

چمک اٹھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے فن کاروں نے بھی ان کو اپنانا شروع کر دیا۔ اور یہ تھوڑے ہی عرصے میں کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔

کہاں یورپ اور کہاں ایشیا۔ ہمارے یہاں تو ہنوز روزِ اول کی کیفیت سمجھنی چاہئے۔ ان فنون پر صرف ایک فن کار کے توجہ دینے سے کیا بنتا ہے۔ انگریزی کے ایک مقولے کے مطابق صرف ایک ابابیل سے بہار کی رُت تھوڑی بن جاتی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ چغتائی کی بدولت اس فن کا چرچا ضرور ہو گیا اور لوگ یہ جان گئے کندہ کاری بھی ایک مستقل اور اہم فن ہے۔ قدرتی طور پر چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مغربی پاکستان کے چراغ کی جوت مشرقی پاکستان تک جا پہنچی۔ اور وہاں کے ایک ہونہار فن کار نے ان فنون کو اپنا کر اُن میں نئی لو پیدا کی۔ اور اس طرح سلسلہ برابر آگے بڑھتا جا رہا ہے، خصوصاً دورِ انقلاب میں جبکہ ادب و فن کو مکمل منشورِ آزادی حاصل ہو چکا ہے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ سازگار فضا میں انتہائی دلجمعی کے ساتھ ہر قسم کی تخلیقی سرگرمیوں کی داد دے سکتے ہیں۔ اب پاکستان میں گرافک فنون — چوبی نقاشی، ایچنگ، لیتھوگرافی، آبرنگی وغیرہ — ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے فنون کا مستقبل یقینی اور بغایت درجہ تابناک ہو چکا ہے۔ صفی الدین کے نقاشی و کندہ کاری کے نمونے جو زیادہ تر دورِ انقلاب ہی کی یادگار ہیں، اس سلسلۂ ارتقار کا نقطۂ آغاز ہیں۔ جسکے ہم تا حدِ نظر خوب سے خوب تر اور بلند سے بلند تر درجے ہی درجے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس نئے دور کے فن پارے دل پہ جو کیفیت چھوڑتے ہیں ان کی تشریح کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ فنکار کا تصور اُس پختہ کاری کے ساتھ جو امتدادِ وقت اور ذہنی ارتقا سے پیدا ہوتی ہے، گہرائی اور گیرائی دونوں کو پا چکا ہے۔ دریائے پدما وہ بے قرار، الھڑ دریا جو بنگال کا خونِ حیات ہے، مصوّر نے اس کی لاابالی جھلکیاں بڑی چابکدستی سے اپنی گرفت میں لے لی ہیں اور سطحِ قرطاس پر پیش کر دی ہیں۔ کشتیوں کے رنگا رنگ بادبان یا پانی کی سطح پر سوئے سوئے، ادھر ادھر

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ایک رنگ

جمیل نقوی

میں نے کچھ ایسے بھی لمحات گزارے ہیں جمیل
جن کی یادوں میں کئی رنگ ہیں ہلکے گہرے
بات یوں دیکھنے میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن
ایک رنگ ایسا بھی ہے جس کی نظر تابی سے
میرے احساس کی دنیا ہے فروزاں اب تک
جیسے کچھ سوچ میں ہے دیدۂ حیراں اب تک
میرے جذبات کی لہروں میں دمکتا ہے وہ رنگ
میری تخئیل کے پردوں سے جھلکتا ہے وہ رنگ
میرے اشعار میں الفاظ کے رنگیں پیکر
اسی اک رنگ کے اعجاز کا آئینہ ہیں

سوچتا ہوں یہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے
میرے برّاق تصوّر نے تراشا ہے جسے
ہاں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شے کا وجود
کسی بنیاد، کسی کُنہ، کسی بات پہ ہے
لاکھ وہ بات فقط خام خیالی ہی سہی

لوگ کہتے ہیں کہ ہر رنگ کا مرکز ہے نگاہ
خواہ وہ ایک نگاہِ غلط انداز ہی ہو
رنگ ہر رنگ سما جاتا ہے آناً فاناً
آنکھ کے راستے احساس کی گہرائی میں
ذہن بُن لیتا ہے ہر رنگ کے تانے بانے
کوئی اس راز کو کیا سمجھے کوئی کیا جانے

بات میں بات نکل آئی تو کہنے دیجے
اک نگاہِ غلط انداز کا مارا ہوں میں
اک حسین آنکھ کے مبہم سے اشارے کی قسم

ادارے:

"خون گرم دہقاں کا"

(زرعی کالج، لائلپور، پر ایک نظر)

امیر حسن سیال

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہمارے ایک اہم ادارے، زرعی کالج لائلپور کا جشن جوبلی بڑے اہتمام سے منایا گیا، جو ہمارے لئے ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے کہ یہ کالج محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ہماری ملکی ترقی کے لئے رگِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا جشن جوبلی اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارا ملک بڑی حد تک زرعی ملک ہے۔ اس کی معیشت زیادہ تر زرعی ہے اور یہی ہونی بھی چاہئیے۔ اور ہماری آئندہ ترقی و خوشحالی کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ لہذا اس ادارے کا جشن جوبلی اس چیز کی پہچان اور تائید ہے جو ہماری زندگی کا بنیادی عنصر اور روحِ رواں ہے۔ خون گرم دہقاں کی تاثیر، اس کی اہمیت اور دھرتی کے سینے سے بیش از بیش پیداوار، سامانِ نمو اور سرمایہ و دولت حاصل کرنے کی ضرورت۔

ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہی ہے۔ وہی ملک جس کے گیت وارث شاہ، شاہ لطیف بھٹائی، خواجہ غلام فرید وغیرہ نے گائے ہیں۔ اسکی آبادی ۸۵ فیصد گاؤوں کی آزاد فضا میں بستی ہے۔ اور اگر ہم حقیقی پاکستان کو دیکھنا چاہیں تو شہروں سے دور دیہات ہی میں پائیں گے۔ اس کے باشندے زیادہ تر زرعی کام دھندوں ہی سے روزی کماتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاشی و معاشرتی نظام کو غور سے دیکھیں تو دھرتی کی نسبتوں کا جال اسکی رگ رگ اور ریشے ریشے میں پھیلا ہوا پائیں گے۔ اور سچ یہ ہے کہ ہم صدہا سال سے دھرتی کے دھن، اس کے اناج، ہی سے اپنے آپ کو برقرار رکھتے رہے ہیں۔

اس لئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے زراعت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ جب ہی تو شروع سے اس پر خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اور دورِ انقلاب میں تو اس کی اہمیت کا احساس اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اور سب سے پہلے اسکی نظر نظامِ اراضی کی طرف ہی گئی اور اسی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا۔ نتیجہ زرعی اصلاحات نافذ ہوئیں —— ایسی کایا پلٹ دینے والی اصلاحات جن کا تصور ہی محال تھا۔ اور اس تیزی سے کہ ان کے دوررس نتائج ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہوگئے ہیں۔

ملک میں زراعت کی ترقی اور اصلاح کے سلسلہ میں جو کوششیں ہورہی ہیں وہ اپنی جگہ خوب ہیں اور انہیں اور بھی فروغ دینا چاہئیے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس میں بھی تعلیم، تربیت، تجربہ، تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ جو سچ مچ سونے پر سہاگہ ثابت ہوگی۔ اور یہ ایسی درسگاہوں سے ہی ممکن ہے جو زراعت کے فن کو مؤثر بنانے اور تقویت دینے میں مدد دیں۔ بالفاظ دیگر اُن سے زراعت کا علم بھی حاصل ہو اور ہنر بھی ہاتھ آئے۔ ہم اس کے نظری و عملی دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں۔

لائلپور کا مشہور زرعی کالج اسی قسم کی مایۂ ناز درسگاہ اور تربیت گاہ ہے۔ ایشیا کی سب سے بڑی درسگاہ، جس کی افادیت اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کہ یہ پرانی ہے۔ اس کے نام پر نہ جائیے۔ یہ صرف نام ہی کا زرعی کالج نہیں۔ اگر ہم کبھی چلتے پھرتے اس طرف جا نکلیں تو ہمیں اس کے سرسبز و شاداب ماحول کو دیکھ کر حیرانی ہوگی۔

ایسی درسگاہ میں اساتذہ بھی اپنے اپنے میدان میں ماہر ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس زرعی کالج میں ان کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسٹاف ۱۷ پروفیسروں پر مشتمل ہے جو اپنے اپنے شعبۂ علم و تجربہ کے ماہر ہیں اور علمی و عملی جائزوں میں مصروف رہتے ہیں۔ پڑھانے والے ۳ پروفیسر علیحدہ ہیں۔ دیگر اساتذہ ان کے علاوہ ہیں۔ تین پروفیسر امریکہ سے بھی مستعار لئے گئے ہیں۔ اس طرح ۵۵ اساتذہ اور زرعی محقق اس ادارہ میں کام کرتے ہیں جس کا سالانہ بجٹ ۳۴ لاکھ روپے ہے۔ ان میں سے ۲۴ لاکھ روپیہ صرف زرعی تحقیق پر صرف کیا جاتا ہے۔

معلمین سے گذر کر متعلمین پر نظر ڈالی جائے تو تصویر اتنی ہی

روشن ہے اور فضا اچھی خاصی بین الاقوامی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے چھ سات سو طلبہ میں افغانستان، ایران، مصر، شام، عراق، نیپال اور تھائی لینڈ تک کے طلبہ بھی شامل ہیں۔ کالج کے تین بڑے بڑے ہوسٹل ہیں جن میں چار سو سے زائد طلبہ قیام پذیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ مقامی طلبہ جس طرح اپنی زبان میں کوئی بات سمجھ اور سیکھ سکتے ہیں، غیر زبان میں نہیں کرسکتے۔ اسلئے یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ایک کورس کا بندوبست کیا گیا ہے جس سے دو ڈھائی ہزار طلبہ اس وقت تک استفادہ کرچکے ہیں۔ ہر سال ۵۰ گریجویٹ زرعی سائنس میں سند حاصل کرتے ہیں اور اب تک سترہ سو سے زائد طلبا سائنس بی، ایس، سی کرکے اپنے ملک کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

زراعت صرف بونے اور کاٹنے ہی کا نام نہیں۔ اس کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو باغبانی بھی ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو پھلوں کی کاشت کی خاص ضرورت ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ تعلیم اور سند دیجاتی ہے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ابتک اس فن میں کوئی ساڑھے تین لاکھ طلبہ ایم۔ ایس سی کی سند حاصل کرچکے ہیں اور پانچ افراد نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ لمبے چوڑے کورسوں کے ساتھ ساتھ مختصر کورسوں کا سلسلہ بھی ہے یعنی شجر کاری، میوہ زیری سبزی ترکاری کی حفاظت، شہد کی مکھیاں پالنا، ٹریکٹر چلانا، ڈیری کا کام، پھلوں کی حفاظت وغیرہ۔ ان کاموں میں ہزارہا طلبہ تربیت حاصل کرچکے ہیں۔

زراعت ایک ایسا علم یا کام ہے جس کے کتنے ہی شاخ و برگ ہیں۔ استعارۃً ہی نہیں بلکہ حقیقتہً اس کا صحیح اندازہ عالم خیال میں نہیں بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم سچ مچ اس درسگاہ میں آئیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔ آپ کو ہر طرف شاخیں ہی شاخیں اور کونپلیں ہی کونپلیں پھوٹتی نظر آئیں گی۔ یہ ہے اگرانومی یعنی دیہی معاشیات کا شعبہ۔ یہ زرعی علم کیمیا کا شعبہ جو واقعی پیداوار کے حق میں کیمیائی اثر رکھتا ہے۔ یہ رہا مائیکالوجی کا شعبہ، جس میں پودوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حیوانات کی طرح نباتات بھی جاندار ہیں، اسلئے پودے بیمار بھی پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک شعبہ ان کے علاج معالجہ کا ہے۔ پودوں کے جوڑ پیوند لگانا، یہ ایک اور شعبہ رہا۔ پھر علاج الحیوانات ہے۔ انٹومالوجی کا نام تو آپ نے پہلے بھی سنا ہوگا۔ یہی کیڑوں مکوڑوں اور حشرات الارض کا علم، جو انسانوں اور حیوانوں کی طرح پودوں کے بھی دشمن جاں ہیں۔ ان کی ایک خاص زرعی شاخ بھی ہے۔ غرض زراعت بھی کوئی معمولی چیز نہیں کہ اسے ہتھیلی پر سرسوں جمانا کہا جاسکے۔ یعنی بس اتنی ہی بات کہ زمین پر دانے بکھیر دئے اور کھل سم سم پڑھ دیا۔ جھٹ دانوں کے طلسمی پٹ کھل گئے اور آن کی آن میں فصل کی فصل تیار ہوگئی۔ یہ سمجھنا تو پرلے درجے کی ستم ظریفی بلکہ ——— حماقت ہوگی۔ بیشک بونے والا بیج بو دیتا ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ اس سے پہلے بھی اور بعد بھی کتنا ہی ریاض کرنا پڑتا ہے، خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ خونِ گرم دہقاں مہینوں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اور پھر وہ برقِ خرمن نہیں بلکہ جانِ خرمن بن جاتا ہے۔ یہ سب علم و تجربہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جتنے یہ وسیع ہوں گے اتنا ہی بہتر ہوگا یعنی جتنا گڑ اتنا ہی میٹھا۔ دھرتی کے سینے میں چھپی ہوئی دولت یونہی برآمد نہیں ہوجاتی۔ اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جنہوں نے اس کوکنی اور تیشہ رانی میں جان لڑائی ہو۔ آخر انسان تجربہ کی بھٹی سے ہی کندن بن کر نکلتا ہے۔ سائنس کے معجزوں سے کون واقف نہیں "سوپر فاسفیٹ" نامی ایک معمولی سا سفوف ہے۔ مگر اسے "برسیم" چارہ کی فصل پر چھڑک دیا جائے تو سچ مچ معجزہ ہوجائیگا۔ پیداوار تین گنا بڑھ جائے گی۔ کالج کے محقق تجربہ و تحقیق سے اس قسم کی مفید باتیں دریافت کرتے ہیں اور کسانوں کے سامنے مظاہرہ کرکے انہیں یقین دلاتے ہیں۔ اس طرح زراعت ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ سفوف تو محض مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اس قسم کا ایک اور جادو اثر سفوف ہے ——— "امونیا سلفیٹ"۔ جس کے کرشموں کے کسان اس زراعتی کالج ہی کے ذریعہ سے قائل ہوئے ہیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ایسی ہی بے شمار اور بھی اہم دریافتیں ہیں جو سچ مچ زمین کو آسمان بنا دیتی ہیں۔

اس درسگاہ میں شعبے ہی شعبے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ ان کا یہاں تعارف کروایا جائے۔ ایسا فنی ادارہ کسی اعلیٰ درجے کے ماہرفن ہی کے ماتحت بخوبی کام کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس کے موجودہ پرنسپل علم کیمیا کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں۔ کالج میں ان کی زیرنگرانی جو تحقیق ہوتی ہے وہ محض علمی یا زرعی ہی نہیں بلکہ تکنیکی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ مثلاً ہمارے آپ کے لئے ایک بڑا ہی دلچسپ اور رغبت آفریں کام ہے د

دوں کے لیس دار مادہ کی صنعتی تحقیق، جیسے آئس کریم، کسٹرڈ، پارچہ جات
اوپری سطح کو چکنا بنانے اور کاغذ پر ایسے ہی عمل کے لئے برتا جاتا ہے۔

جب کالج کھلا ہو، کام کا سلسلہ جاری ہوا اور ہر طرف گہما گہمی
نظر آئے تو اس کا منظر بہت ہی دلکش ہوتا ہے۔ کوئی طالب علم
دھر "جنتر" کے جنگلی بیج پر تجربہ کر رہا ہے جس سے گوند نکلتا ہے۔ کھاد
کھاد اور گیس کا ماخذ، جیسا کہ حال ہی میں پتہ چلایا گیا ہے اور اس
سے فائدہ بھی اٹھانا شروع ہو گیا ہے۔ یہ تحقیق اعلیٰ ساز و سامان کے
بغیر کیسے ممکن ہے؛ چنانچہ کالج ہر طرح کے جدید ترین سامان سے لیس ہے۔
اس کی مدد سے مویشیوں کے چارہ، دودھ، مویشیوں کے وزن
بڑھانے وغیرہ کے سلسلہ میں جو اہم اور بکار آمد معلومات حاصل ہوئی
ہیں، ان کا تذکرہ ایک داستان سے کم نہیں۔

ہم آپ تو صرف ایک ہی مٹی کو جانتے ہیں۔ یہ بھوری بھوری
چیز جو ہمیں عام طور پر نظر آتی ہے۔ مگر یہ ہماری بھول ہے۔ مٹی کی سینکڑوں
قسمیں اور درجے ہیں۔ کالج کے کیمیاوی شعبہ میں آپ درجنوں بوریوں کا انبار
دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ کیا یہ ہوائی حملے سے بچاؤ کی تدبیر ہے؟
نہیں یہ تو محض طرح طرح کی مٹی کے نمونے ہیں۔ اور یہاں کے محقق ان کے
خواص معلوم کرکے ان کی درجہ بندی کرتے ہیں۔

کالج کی دیواریں تا حد نظر گوناگوں تصاویر سے آراستہ ہیں۔ سب
میں نباتات ہی کے مختلف پہلو اجاگر کئے گئے ہیں۔ عجیب تر یہ کہ بعض پودوں
نے خود ہی تصویروں کا روپ دھار لیا ہے! یعنی یہاں کے خوش
ذوقوں نے پودوں ہی کو اٹھا کر فریموں میں جڑ دیا ہے۔ عجب عجب پودے،
درختوں کے نمونے برگ و بار — وہی بات ہے

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

بلکہ یہاں تو برگِ درختانِ خشک بھی درسِ بصیرت دیتے ہیں! یہاں
جھاڑیاں، جڑیاں، بوٹیاں، کیا نہیں؟ سب چھوٹے بڑے ایک ہی
صف میں! مستانہ وار جھومنے والے کھجور اور پام دیکھئے۔ ان میں سب
سے بڑا شاید "کالوک" نامی پیڑ ہے۔ جس میں تیز قرمزی رنگ کے پھول
لگتے ہیں اور ایک پھل بھی ہوتا ہے جس کے اندر سے ریشمی روئی برآمد
ہوتی ہے۔ قدرت کی طرح یہاں بھی سرو و سمن یکجا ہیں۔

ہماری نہایت اہم فصلوں میں ایک گندم ہے جسکی کاشت
۶۰-۷۰ لاکھ ایکڑ اراضی پر ہوتی ہے۔ اس کے سلسلے میں تحقیقاتی
کام ۱۸۹۳ء میں شروع ہو گیا تھا جو برابر ترقی کرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے
کہ یہ سلسلہ اب بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

ایک بڑا ہی اہم بنیادی کام بیجوں کی ترقی ہے۔ کالج ان کے
بارے میں تحقیق کا اہم ترین مرکز ہے۔ لوزیات کے شائقین کو یہ سن کر
یقیناً بڑی مسرت ہوگی کہ آزادی سے پہلے مغربی پاکستان میں مونگ پھلی
بالکل نہیں پیدا کی جاتی تھی۔ مگر "ہے گلشن کا بندوبست بہ رنگِ دگر" آج
اب مونگ پھلی اہلِ ذوق کی تسکین کے لئے بکثرت پیدا کی جاتی ہے۔
اگر آپ اس سمن کے ساتھ سرو کا تماشا بھی کرنا چاہیں تو گنتے کی
ان گنت قسمیں بھی دیکھ لیجئے۔ کیوبا، جاوا، روس، سب کی بھانت
بھانت قسمیں یہاں حقیقی معنوں میں اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ کیونکہ ان کو
چاروں طرف سے بجلی کے قمقموں سے نورٌ علیٰ نور کیا گیا ہے۔ اور معلوم
ہوا ہے کہ برقی روشنی ان کی بالیدگی میں بڑی مدد دیتی ہے۔

اپنی سنہری فصل گندم کا ذکر ہم اوپر کر ہی چکے ہیں۔ اس ضمن
میں روپہلی فصل — روئی، کا تذکرہ ایک لطیف مناسبت سے
خالی نہ ہوگا۔ روئی پاکستان کی سب سے بڑی نقد فصل ہے جو ۳۴ لاکھ
ایکڑ پر کاشت ہوتی ہے۔ اور اس سے ۱۷ لاکھ گانٹھ روئی پیدا ہوتی ہے۔
اسی لئے کالج جس طرح گندم کی سنہری فصل کو اور بھی سنہری بنانے کی کوشش
کر رہا ہے اسی طرح اس روپہلی فصل کو بھی اور روپہلی بنانے میں کوشاں ہے۔

غذا کا مسئلہ ہمارے یہاں ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے بارے
میں جو کوششیں ہمارے یہاں اب تک ہوتی رہی ہیں ان کا سلسلہ موجودہ انقلابی
حکومت نے تیز تر کر دیا ہے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے اور نہری پانی
کے معاہدہ کے تحت اس پر اور بھی شدید توجہ مبذول کی جائے گی تاکہ ہم
غذا کے سلسلہ میں مکمل طور پر خود کفیل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں
لائلپور کی قدیم زرعی درسگاہ ایک نہایت اہم کردار ادا کرے گی۔ اور اس سے
ہمیں بہترین نتائج کی توقع کرنی چاہئے۔

نیشکر، اور اسلئے "التزاماً" شکر کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ
شہد کا ذکر نہ ہو تو شاید کام جاں پوری طرح حلاوت اندوز نہ ہو سکے۔
شہد کی مکھیاں پالنا اور شہد نکالنا ایک بڑی آسان، اہم سستی اور بہت
ہی بیش بہا صنعت ہے۔ آزادی کے بعد اس پر بڑی خاص توجہ دی جا رہی
ہے۔ لاکھ جسکے متعلق سنا کرتے تھے کہ لاکھ ٹکے کی سیر کائے اور جو آزادی سے پہلے
ہندوستان سے آتی تھی اب اسکی پچاس فیصد ضروریات ہمارا ملک خود پوری کر

لگا ہے۔ شاید ہوتے ہوتے اور ترقی کرتے کرتے یہ واقعی ٹکے سیر بلکہ اس سے بھی سستی بکنے لگے۔

غرض یہ ہے اس پچاس سالہ درسگاہ کی پُر لطف روداد جو درحقیقت کسی صاحبِ ذوق و نظر کے لئے رومانوی داستان سے کم دلچسپ نہیں۔ اس ادارہ نے کسی ہنگامہ آفرینی سے نہیں بلکہ بڑی خاموشی سے ملک کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور اب جبکہ ہم تعمیر و ترقی کے ایک نئے نہایت اہم مرحلے میں قدم رکھ رہے ہیں اور انقلابی حکومت نے سائنس، ٹکنالوجی اور زراعت پر خاص زور دینے کا تہیہ کیا ہے، اس کی پر خلوص اور مسلسل جد و جہد ہمارے لئے اور بھی نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

★

"خاتونِ پاکستان" کراچی (نرسنگ نمبر) مدیر شفیق بریلوی قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۹۹ کراچی

"خاتونِ پاکستان" ایسا ماہانہ مصور مجلہ ہے جو ایک عرصہ سے قومی میدان میں بہت وقیع خدمات انجام دے رہا ہے۔ بلکہ اس کا مطمحِ نظر ہی یہ ہے کہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عوام کی آگاہی و رہنمائی کے لئے اہم قومی موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دے اور معاشرہ میں ایسے معاملات کا شعور پیدا کرے جو قومی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کا پچھلا شمارہ قومی صحت کے متعلق تھا اور موجودہ اسی کی ایک نہایت اہم شاخ "نرسنگ" سے متعلق ایک خاصی وقیع پیشکش ہے۔ جس میں اس کی ضرورت، اہمیت اور مختلف پہلو بڑے دلکش پیرائے میں اُجاگر کئے گئے ہیں۔ "نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیئے"۔ یہ برجستہ الفاظ جو آخری تصویری صفحہ کی زینت ہیں، اس کی بخوبی عکاسی کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ شمارہ اس پیشہ کو جو خواتین کے لئے نہایت موزوں ہے مقبول بنانے اور ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کرنے میں بڑی مدد دے گا۔

اس سلسلہ میں بریگیڈیئر شریف "ڈائرکٹر جنرل آف ہیلتھ، حکومت پاکستان کی یہ رائے سند ہے کہ "خاتونِ پاکستان" نرسنگ نمبر نکال کر پاکستان کی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ میں اس نمبر کو حکومت اور عوام کا پہلا تعاون قرار دیتا ہوں" ———— ٭

نقاش یا کندہ کار: ———— بقیہ صفحہ ۵۰

میگھ دونوں کی سہانی پرچھائیاں یوں تو ہر وقت موجود ہوتے ہی ہیں۔ مگر فن میں اُجاگر ہونے کے لئے صحیح معنوں میں دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھانے والی زبان کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ زبان ان کو صفی آلدین نے عطا کی۔ اس کے بعد یہ کشتیاں محض کشتیاں نہیں رہتیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت بن جاتی ہیں۔ یہ وہ نقوش ہیں جن میں آب رنگی، گہری ایچنگ اور کندہ کاری کی تکنیکیں برتی گئی ہیں اور اس طرح تینوں کی فسوں کاری آمیز ہو کر گویا سہ آتشہ بن گئی ہے۔ ان نقوش کو دیکھ کر انسان چونک پڑتا ہے۔ ان کے انوکھے پن کا جادو!

یہ کرشمہ آفرینی "مچھلی پکڑنے کا سمے" میں نمایاں ہے جس میں صفی آلدین نے سیاہ رنگ کو بڑی نفاست اور کاریگری سے برتا ہے۔ اس کے خطوط میں موسیقی کی لہروں جیسا اُتار چڑھاؤ ہے۔ سیاہ رنگ کا برتنا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے صفی آلدین نے اس کے برتنے میں بہت ہی جی لگا کر محنت اور ریاض کیا ہے۔ اس نقش کی سیاہی میں ایک مخملیں گھلاوٹ اور ملائمت ہے۔ صفی آلدین کو بافت اور ڈیزائن سے بڑا لگاؤ ہے۔ جب بھی کہیں مناسب جگہ ملتی ہے وہ اس سے ضرور کام لیتا ہے۔ تصویر "بھاٹا" لندن کی رائل سوسائٹی آف ایچرز اینڈ انگریورز" میں دکھائی گئی۔ اس کے وسط میں مصور نے ایک سیاہ دائرہ بنایا ہے جسے ایک خط قطع کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری خطوط اور ترتیب کی بھاری بھرکم وضع دیکھنے والے کو دیر تک محو رکھتی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کشتی اب رواں ہوئی، اب رواں ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ صفی آلدین نقاشی سے اُتنا ہی شغف رکھتا ہے جتنا کندہ کاری سے، بلکہ یورپ سے واپس آنے کے بعد اس نے پھر اپنی پہلی محبوب، نقاشی کی طرف توجہ کی ہے، مگر بنیادی طور پر وہ کندہ کار ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نقاشی بھی کندہ کاری ہی کا بدلا ہوا روپ لگتی ہے اور اس میں اسی فن کا عنصر غالب رہتا ہے۔ بہرکیف، جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے، صفی آلدین

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

مسائل حاضرہ:

اعضائے قوم

اسلم قریشی

افراد حقیقی معنوں میں اعضائے قوم ہوتے ہیں۔ صرف تعداد وشمار ہی میں نہیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ قوم کا دست و بازو ہوتے ہیں اور اس کی قوت بھی۔ ان کو قوم کا بہترین سرمایہ کہا جاتا ہے۔ وہ اس کے وسائل میں سب سے زیادہ اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے تمام وسائل کو کام میں لاتے ہیں اور اہم نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم قوم کو بڑا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے اس کی اپنی اکائیوں پر توجہ دینی چاہیئے۔ افراد کا ٹھیک ٹھیک شمار، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات کی فراہمی، ان کی صلاحیتوں وغیرہ کا جائزہ قوم کے لئے کوئی قدم اٹھانے، منصوبے باندھنے یا کام کرنے کے لئے مقدم ہے۔ بلاشبہ کسی قوم کا سب سے اہم خزانہ اس کے عوام ہی ہیں۔

اگر یہ درست ہے تو پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم وقتاً فوقتاً یہ پتہ چلائیں کہ ہماری تعداد کیا ہے۔ اور اس سے بھی بہتر یہ کہ ہر شخص کی ذات، مذہب، فرقہ، حیثیت، آمدنی، تعلیم، لیاقت اور دیگر امور کے متعلق اہم کوائف فراہم کریں اور جو بھی منصوبہ، تدبیر یا حکمتِ عملی اختیار کریں انہیں کی روشنی میں کریں۔ آج کا زمانہ تو پھر بھی بڑا ترقی کا زمانہ ہے۔ اور معمولی سے معمولی ملک بھی صحیح اعداد وشمار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ہزارہا برس پہلے بنی اسرائیل نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ ان کی مذہبی کتاب توریت میں پہلے پیدائش کا باب آتا ہے۔ اور اس کے بعد گنتی کا۔ پاکستان جیسے نئے ملک کے لئے یہ گنتی اشد ضروری ہے۔ ایسی کہ اس میں افراد کو گنا ہی نہ جائے بلکہ تولا بھی جائے یعنی ان کے متعلق تمام ضروری باتیں معلوم کی جائیں۔ اور ان کی خوب چھان بین کی جائے تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ یہ کام بالکل اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح کوئی ڈاکٹر انسانی جسم کا معائنہ کرتا ہے۔ تاکہ اس کی صحیح حالت معلوم کی جائے اور پھر اس سے کام لیا جائے یا مناسب دوائیں یا تدبیریں تجویز کی جائیں تاکہ وہ معاشرہ کا ایک مفید عنصر ثابت ہو، اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ کام آسکے۔

اب جب ہمارے ملک نے انقلابی حکومت کے ساتھ ایک بھرپور زندگی کا آغاز کیا ہے اور تعمیر و ترقی کے ایک نئے دور میں قدم رکھنے والا ہے، خصوصاً دوسرے پنج سالہ منصوبے کے ساتھ طرح طرح کے اور منصوبے بھی باندھے جا رہے ہیں، یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہم سب ہیں کتنے، ہماری ضرورتیں کیا ہیں، ہمارے لئے کیا کیا باتیں موزوں ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔ غذا، معاش، دولت، رہائش، صحت، تعلیم، ہر بات میں صحیح کیفیت اور صحیح ضرورتوں کا دریافت کرنا لازم ہے تاکہ ان کے مطابق مناسب قدم اٹھاتے جاسکیں۔ انقلابی حکومت شروع ہی سے جس زور و شور کے ساتھ زندگی کے تمام معاملات و مسائل کے درپے ہے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ مردم شماری اور دیگر اعداد و شمار کا بھی پوری طرح احاطہ کیا جائے تاکہ صحیح نہج پر تعمیر و ترقی کی تدابیر کرنے اور مؤثر منصوبے مرتب کرنے میں کوئی کسر نہ رہ جائے یہ نہ ہو کہ ہم اس صورت حال سے دوچار ہوں ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہی وجہ ہے کہ سارے ترقی یافتہ ملکوں میں عموماً ہر دس سال بعد مردم شماری ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی اس سے پہلے ایک مردم شماری ہو چکی ہے۔ اور یہ دوسری مردم شماری ہے جس کو زیادہ سے زیادہ صحیح اور جامع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ سب باتیں ہمارے صاحبِ نظر سربراہ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کی نگاہ میں تھیں۔ اس لئے پہلے اس

مقصد کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو ایک سال تیاریاں کرتا اور منصوبے بناتا رہا۔ لہٰذا موجودہ شماری ان تمام سرگرمیوں کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت اظہر من الشمس ہے۔ اس لئے صدر پاکستان نے اس کے آغاز سے پہلے قوم کو خطاب کرنا اور اس کو مناسب ہدایات دینا ضروری سمجھا۔ انہوں نے پہلے ہی بتا دیا کہ مردم شماری کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانا ہمارے لئے من حیث القوم کیوں ضروری ہے۔ ہمارے یہاں غذا کا مسئلہ ہے، آبادی کا مسئلہ ہے، رائے عامہ اور انتخابات کے مسئلے ہیں۔ رہن سہن، معیار زندگی اور صحت کا مسئلہ ہے۔ آمدنی اور رفاہ و بہبود کے مسائل ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب بڑی احتیاط سے مطالعہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ قوم کی حیثیت ایک بڑے کنبے، جماعت یا برادری کی ہے۔ اور جیسے ہم گھر گرہستی میں جو کچھ کرتے ہیں ہر بات کی ٹھیک ٹھیک جانچ کے بعد ہی کرتے ہیں۔ اسی طرح ساری قوم کے سلسلہ میں بھی ہونا چاہئے۔ آخر ہم اپنے حال و مستقبل، زندگی اور موت کے اہم مسائل سے کیسے غافل ہو سکتے ہیں۔ جبھی تو اس کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا۔ اور کارکنوں کے ساتھ تعاون کی التماس اور تلقین کی گئی۔ یہ ایک یقینی بات ہے کہ جب اس غیر معمولی اہتمام کے ساتھ مردم شماری، یکم فروری ۱۹۶۱ء کی صبح تک ختم ہو گی تو ہمیں معلومات کا ایسا اہم ذخیرہ ہاتھ آجائے گا۔ کیونکہ سربراہ قوم کے الفاظ میں دو لاکھ سے زائد شمار کنندگان، جذبۂ خدمت سے سرشار، طول و عرض ملک میں، گھر گھر پہنچ کر معلومات فراہم کریں گے، ہر ہر فرد کا اندراج کیا جائے گا، اور ہم خواہ کہیں رہتے ہوں، ساحل مکران سے سلہٹ تک اور خیبر سے کوہستان چاٹگام تک یہ، مردم شماری کی جائے گی اور کوئی نہ کوئی شمار کنندہ ہم تک ضرور پہنچے گا ـــ جس سے ہم بے شمار فوائد حاصل کر سکیں گے۔ ذرا چشم تصور وا کر کے ان فوائد پر نظر ڈالئے۔ آپ کو تا حد نظر ایک نہایت شاندار اور روشن سلسلہ نظـــر آئے گا۔ آیئے ہم اس سلسلے پر نظر ڈالیں جو کہکشاں کی طرح دور تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں سے اپنے حسنِ فردا کے چمکتے دمکتے ستارے چنیں، ان میں آنے والے دور کی تابانیوں کی جھلک دیکھیں۔

ہمارے ملک میں آئندہ رائے دہندگان کی فہرست اس مردم شماری کی بنا پر مرتب ہوگی۔

ہمارے آئندہ انتخابات اسی کی بنا پر ہوں گے اور بنیادی جمہوریتوں کے اراکین انہیں کی بنا پر چنے جائیں گے۔

ہماری غذائی صورتِ حال، غذائی حیثیت سے خود کفیل ہونے کی تدابیر، قوم کی غذائی ضرورتوں کا پتہ چلانا، ہر موقع کے لئے تیار رہنا، پیداوار کا بڑھانا سب اسی پر موقوف ہوں گے۔

نو آبادیوں، ذیلی بستیوں، مکانوں اور رہائش گاہوں کی حالت، تعداد، ضرورت سب اسی پر منحصر ہے۔

قوم کے لئے جو سروسیں، سہولتیں، آسائشیں، منصوبے ضروری ہیں۔ ان کا اندازہ اسی سے ہوگا۔

شہروں، قصبوں اور گاؤں میں سکول، اسپتال وغیرہ اسی کی بنا پر بنائے جائیں گے۔ کون کون سی صنعتیں کہاں کہاں قائم کی جائیں، اسی پر موقوف ہے۔ اسی کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکے گا کہ کتنا اور کونسا مال تیار کیا جائے، کہاں کہاں بھیجا جائے، اور اس کی کھپت کہاں کہاں اور کس کس شکل میں ممکن ہے۔

نئے نئے علاقے کس طرح آباد کئے جائیں، بنجر زمینوں کو کس طرح بکار آمد بنایا جائے۔

زبان، فنی اور عمومی تعلیم، مذاہب، فرقوں، تاہل، بے کاری، معذوری وغیرہ سب کے متعلق ضروری کوائف کی فراہمی اور ان کی روشنی میں ضروری اقدامات۔

صحت، صفائی، ملازمت، ہر بات کی پوری پوری جانچ اور اس کے بعد بہتر سے بہتر تدابیر۔

یہ تو ہوئیں محض جھلکیاں۔ مگر جب یہ اور دوسری جھلکیاں جمع ہو جائیں گی، جب یہ صاف اور واضح روشنیوں کی شکل اختیار کر لیں گی، تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ نگاہوں میں کیسی چکا چوند پیدا کریں گی۔ ایک حقیقتہً شاندار اور تابناک مستقبل کی تمہید بھی اور نوید بھی۔







نالۂ طائرِ بام: —— بقیہ صفحہ ۲۹

اور جو کام کریں خلوص اور تندہی سے کریں اور اس طرح کریں کہ کسی دوسرے کو یہ دیکھنے کی ضرورت نہ رہے کہ آپ کام ٹھیک طریقے سے کر رہے ہیں کہ نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اپنے میں خود اعتمادی پیدا کریں اپنے آپ کو منظم کریں، فضول جھگڑوں سے احتراز کریں اور اپنے قومی نصب العین کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں، اپنے مفاد کی خاطر کبھی قومی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ یاد رکھیں کہ اس سے کبھی آپ کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ آپ اپنے دل میں حکومت یا کسی اور کے خوف کے بجائے خدا کا خوف پیدا کریں اور ہر کام کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ خدا اس سے خوش ہوگا کہ نہیں۔ اس طرح آپ کی بہت سی کمزوریاں اور غلطیاں از خود دور ہو جائیں گی ؎

نقاش یا کندہ کار: —— بقیہ صفحہ ۴۵

میں وہ قوت، بصیرت اور اعتماد پایا جاتا ہے جو اس کی تخلیقی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معمولی معمولی چیزوں کو بھی اس کے نقوش میں جلوہ گر پاتے ہیں اور وہ فن کے کیمیائی اثر سے کچھ کی کچھ بن جاتی ہیں۔ اسے اپنے موضوع پر جو گرفت حاصل ہے اور اسلوب میں اس نے جو خوبی بڑی حد تک پیدا کر لی ہے اس نے اس جواں سال فن کار کے کام کو زیادہ دلچسپ، نیا، اچھوتا اور پُر معنی بنا دیا ہے ؎

مصباح الحق

وہ کہانی تو آپ نے سنی ہی ہوگی - ایک تھا عقل کا پورا اور گانٹھ کا پکا - اس نے جو یہ کہاوت سنی تو کہنے لگا ازیں چہ بہتر؟ روپے کو روپیہ کھینچتا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے - چنانچہ وہ اللہ کا نام لے کر چل پڑا - اتفاق سے اس کا گذر صرافوں کے بازار میں ہوا - جہاں دکانوں میں اشرفیوں کے ڈھیر ہی ڈھیر لگے تھے - دل میں کہا اس قول کی سچائی کو آزمانے کی اس سے بہتر جگہ اور کیا ہوگی - جیب ٹٹول کیا اور بڑی احتیاط سے نشانہ کر کے روپیہ عین اس ڈھیر پر پھینک دیا اور لگا انتظار کرنے کہ اب سارے کا سارا ڈھیر اٹھ کر اسکی طرف آ جاتا ہے - مگر وہ نہ آنا تھا نہ آیا - بیچارہ بڑی دیر وہاں کھڑا حسرت سے تکتا رہا - مگر اسکی امید پوری نہ ہوئی - آخر لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اس کہاوت کے معنی وہ نہیں جو اس نے سمجھے ہیں - روپیہ اس بے ڈھنگے طریقے سے روپے کو نہیں کھینچا کرتا - اگر انسان سوچ سمجھ سے کام لے تو ایک روپیہ واقعی سینکڑوں روپے کھینچ کر لا سکتا ہے -

مگر مشکل یہ ہے کہ بہت کم لوگ یہ نکتہ جانتے ہیں - وہ تو بس یہی جانتے ہیں کہ خدا یا تو چھپر پھاڑ کر پیسہ دے دیگا یا اللہ میاں کی برکت سے آسمان سے دھن برسنے لگے گا، یا پھر زمین سے کوئی خزانہ نکل آئیگا - اگر ہم اس انمول چیز سے کام لیں جو قدرت نے ہم سب کو عطا کی ہے اور جسے ہم سوجھ بوجھ کہتے ہیں تو کسی آوپری دین، اللہ دین کے چراغ یا چھپے خزانوں کی آس امید رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی - ہم چاہیں تو عقل کی مدد سے ایک ہی روپے کے سینکڑوں روپے بنا سکتے ہیں - چاندی بوئیے سونا کاٹئیے - اس کی ترکیبیں تو خیر بہت ہیں اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے کتنے دوست جو کل تک کوڑی کوڑی کے محتاج تھے کس طرح ایکسپورٹ امپورٹ سے دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے - یا پھر روپیہ لگانے کا دھندہ ہے جو زر کے انبار کے انبار لگا دیتا ہے - یہی حصص خریدنے کا کاغذی بیوپار جس میں روپیہ جادو کی طرح بڑھتا جاتا ہے - مگر میں آپ کو یہ ٹیڑھے میڑھے راستے کیوں دکھاؤں - آخر روپیہ بڑھانے کے سیدھے سادے طریقے بھی تو ہیں - بڑے آسان، بڑے محفوظ، بڑے فائدہ مند، اور جن میں ہمارا ہی نہیں سینکڑوں کا بھلا ہے - ساری قوم کا بھلا -

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بڑی بڑی حکومتیں ہوں یا گھر گرہستیاں، وہ روپے ہی کے بل بوتے پر چلتی ہیں - فرق صرف یہ ہے کہ حکومتوں کے پاس بہت دھن ہوتا ہے، ہمارے پاس کم، اور پھر آج کل سکوں ہی سے کام نہیں چلتا - بھلا اتنی مقدار میں سکے کیسے بنائے جائیں کہ وہ اربوں پدموں کی تعداد میں ہاتھ آسکیں - اور دس بیس سو روپے تو خیر کسی نے دے دیئے یا لے لئے مگر پدموں، سنکھوں کی رقم کا کیا بنے - بڑے بڑے تاجر، بیوپاری، بنک، کمپنیاں اور حکومت جو دن میں سینکڑوں بار لاکھوں کروڑوں کا لین دین کرتے ہیں، وہ اتنے سکے کیسے اور کہاں فراہم کر کے رکھیں - اس لئے نوٹوں یعنی کاغذی زر کی ترکیب نکالی گئی - بڑی سیدھی بات ہے - پریس موجود ہیں ہی - ان سے بے شمار نوٹ چھاپ ڈالے اور انہیں علامتی روپیہ قرار دے دیا - تا کہ ہر کوئی انہیں لے دے سکے - آپ کہیں گے یہ تو بڑی عمدہ ترکیب ہے - جتنے نوٹ جی چاہا چھاپ ڈالے - مگر ٹھہرئیے - نوٹ یوں نہیں چھاپے جاسکتے - آخر یہ بھی لازم ہے کہ وقت آپڑنے پر اتنی ہی قیمت کی نقدی ادا بھی کی جاسکے - یعنی اس مالیت کا سونا محفوظ ہونا چاہئیے - پھر یہ بھی اندیشہ ہے کہ لوگوں کے پاس جتنے پیسے زیادہ ہونگے اور

وہ دوسروں کو دے سکیں گے، اتنی ہی چیزوں کی قیمت بڑھتی جائیگی - اور لوگ گرانی، گرانی کا شور مچانے لگیں گے - اس لئے ضروری ہے کہ زیادہ نوٹ گردش میں نہ رہیں - اور جہاں نوٹوں کو دھڑا دھڑ جاری کیا جاتا ہے وہاں انکے واپس آنے کی تدبیر بھی کی جائے - سچ پوچھئیے تو خرابیاں پیدا ہوتی ہی روپیہ کی زیادتی سے ہیں - جسے اصطلاح میں '' افراط زر '' کہتے ہیں - اسلام نے سودخوری کی ممانعت اور زکواۃ کی تلقین سے اس کو روکنے کی کوشش کی ہے صحیح راستہ تو آخر اعتدال ہی کا راستہ ہے - دولت زیادہ ہو جائے تو فتور ہی پیدا کرتی ہے - لوگ ایسے فضول رسموں اور عیش و عشرت پر خرچ کرنا شروع کر دیتے ہیں - اس طرح روپیہ اور روپیہ پیدا نہیں کرتا بلکہ ضائع چلا جاتا ہے - ایسے ہی روپیہ تجوریوں میں بند رہے اور اس کا چلن رک جائے تو اس کو زنگ ہی لگتا چلا جائیگا - کوئی عمدہ ادارہ یا حکومت ہو تو وہ اسے مفید کاموں پر لگا کر دھڑا دھڑ دولت پیدا کرسکتی ہے - اس طرح ساری قوم دولت مند اور خوشحال ہوجاتی ہے - یاد رکھئیے جتنی کوئی چیز زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی قدر کم ہو جائیگی - یہ ایک پکا اصول ہے : پیسہ زیادہ مہنگائی زیادہ - ہمارے ملک میں تو خرابی کا اور بھی اندیشہ ہے - ہمارا ملک زرعی ہے - صنعتیں ابھی ابھی چالو ہوئی ہیں - مصنوعات کم ہیں، اس لئے باہر سے منگوانی پڑتی ہیں جو برآمد سے ہم کماتے ہیں وہ درآمد پر خرچ کردیتے ہیں - اس لئے پھر منھہ دیکھتے رہ جاتے ہیں -

سوال یہ ہے کہ اس افراط زر کی خرابی سے کیسے بچا جائے - اس کا جواب بڑا واضح ہے - کوئی ایسی ترکیب کی جائے جس سے روپیہ واپس آ کر حکومت کے خزانے میں جمع ہوتا رہے اور وہ اسے تعمیر و ترقی کے کاموں پر لگائے - اس سے کم سطح پر آسان اور عمدہ ترکیب یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس نوٹ یعنی روپیہ کثرت سے آجائے تو ہم اسے بےتحاشا خرچ نہ کرتے پھریں - ہم روپیہ بچانا سیکھیں - ہم میں سے ہر ایک کو بچت کی عادت ڈالنی چاہئیے - اگر ہم خود ایسا نہ کرسکیں تو ہماری حکومت نے اس کے لئے سہولت پیدا کر دی ہے - اس نے قومی بچت کی اسکیم جاری کی ہے - اور وقتاً فوقتاً چھوٹی رقم کے سیونگز سرٹیفکیٹ یعنی بچت کے سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے جنہیں بانڈ کہتے ہیں - آپ کسی ڈاکخانہ میں ۱۰ روپے دیجئیے اور ایک سرٹیفکیٹ خرید لیجئیے - یہ حکومت کی طرف سے سند بھی ہے اور اقرار بھی - آپ چاہیں تو ہزاروں روپے کے سرٹیفکیٹ خرید لیں - جتنا گڑ اتنا میٹھا - آپ کی رقم محفوظ رہے گی اور اس میں برابر اضافہ بھی ہوتا رہےگا اور چند ہی سال میں رقم کہیں سے کہیں پہنچ جائیگی! ادھر حکومت کو اتنے وسیع پیمانے پر روپیہ فراہم ہو جائے گا تو وہ اسے قومی تعمیر و ترقی اور رفاہ و بہبود کے بےشمار منصوبوں پر لگا سکتی ہے جس سے پھر آپ ہی کی آسودگی و خوشحالی میں اضافہ ہوگا -

ایسے سرٹیفکیٹ یا بانڈ تو حکومت کی ایک مستقل اسکیم کا جز ہیں اور ان کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے - کیونکہ حکومت کی طرف سے مختلف قرضے جاری ہوتے رہے ہیں اور جو لوگ معاملات کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ ان سرٹیفکیٹوں اور بانڈوں کو خریدنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں اور ان سے حکومت اور قوم دونوں کو بے انتہا فائدہ پہنچتا رہا ہے -

اس سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ہے **قومی انعامی بانڈ** جو عام سرٹیفکیٹوں سے کہیں زیادہ فائدہ مند اور پرکشش ہیں - کیونکہ ان سے بچت ہی نہیں ہوتی اور رقم دن دونی رات چوگنی ترقی ہی نہیں کرتی رہتی بلکہ اس سے آپ کو انعام ملنے کی بھی قوی امید ہے - اگر آپ قسمت کے دھنی واقع ہوئے ہیں تو کچھ عجب نہیں آپ کو صرف دس روپے کے بدلے بیس ہزار کا انعام مل جائے! اور بیس ہزار نہیں تو ساڑھے سات یا دو ہزار ہی کا سہی- یا پھر آپ ایک ایک ہزار کے تین انعامات میں سے ایک، پانچ سو کے دس اور سو سو کے ایک سو بیس

انعامات ھی سے ایک پا سکتے ھیں ۔ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی تو آپ کی قسمت یاور ہوگی ۔ اور اس میں تمام تر فائدہ ھی فائدہ ہے ۔ بہر حال آپ کی اصل رقم تو محفوظ ہے ۔ اور بانڈ جتنی دیر قائم رہے گا اتنی ھی یہ بڑھتی چلی جائے گی ۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام ۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا آپ خیال کرتے ھیں — انعام ۲۰ ہزار ھی کا ہو ۔ اور کیا عجب آپ ھی وہ خوش قسمت ہوں جسے سب سے پہلے یہ انعام ہاتھ آئے ۔ مگر اس کا ایک اور روشن تر قومی پہلو بھی ہے ۔ اس طرح اربوں روپے کی بچت بھی تو ہوگی ۔ قیمتیں چڑھنے نہیں پائیں گی اور عین اس وقت جب ان کا زیادہ اندیشہ ہے کیونکہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے سلسلہ میں کتنے ھی بیرونی ذرائع سے پاکستان میں سرمایہ آمڈتا چلا آئے گا اور چیزوں کی قیمت خواہ مخواہ بڑھتی چلی جائے گی ۔ ھمیں ابھی سے ایسی صورت حال کے لئے تیار رھنا چاھئے اور جتنی بھی ممکن ہو بچت کر کے قومی بانڈ خرید لینے چاھئیں تاکہ حکومت کے پاس بڑی ھی کثیر مقدار میں روپیہ جمع ہوجائے اور وہ اسے قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں لگا کر ھمیں اور بھی خوش‌حال بنائے اور چڑھتی قیمتوں کے خطرے سے بچائے ۔

انعامی بانڈ خرید لینے کے معنی یہ نہیں کہ روپیہ کہیں بند ہو کر رہ گیا ۔ حکومت تو ہر وقت اس کی قیمت دینے کی حامی بھرتی ہے ۔ اگر آپ انہیں بیچ دینگے تو نقصان آپ ھی کا ہوگا ۔ نہ بچت ہوگی نہ کوئی انعام مل سکے گا اور نہ آپ قوم کی مجموعی بھلائی اور خوشحالی میں شریک ہو سکیں گے ۔ اور پھر آپ یہ بانڈ جس کو بھی چاھیں تحفہ میں دے دیں ۔ عیدوں بقرعیدوں کے موقعوں پر جب آپ اتنے پیسے ضائع کرتے ھیں، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اپنے بچوں اور عزیزوں کو ایسی عمدہ چیز خرید کر دیں جو ان کے لئے ھمیشہ کارآمد ثابت ہو ۔ اور پھر ان کے ملنے میں دشواری ھی کیا ہے ۔ آپ اسٹیٹ بنک آف پاکستان جائیے یا کسی بھی منظور شدہ بنک میں تشریف لے جائیے اور کھڑکی پر رقم دے کر جتنے بھی بانڈ چاھیں حاصل کرلیجئے ۔

یہ بھی بڑی اچھی بات ہے کہ انعامات ایسے ھی انٹ شنٹ نہیں دے دئے جائیں گے بلکہ باقاعدہ، سب کے سامنے، قرعہ ڈال کر دیکھا جائے گا کہ کس کا نام آتا ہے ۔ یہ تو قسمت آزمائی ہے اور بڑی اچھی قسم کی قسمت آزمائی ۔ ایک دفعہ نہیں بلکہ متواتر کیونکہ ہر تیسرے ماہ یکم اپریل، یکم جولائی اور یکم اکتوبر کو قرعہ اندازی کی جائے گی ۔ جو بانڈ آپ خریدیں گے وہ خریداری کے مہینے کے خاتمہ سے چھ ماہ بعد انعام کا اہل قرار دیا جائے گا ۔ اور اس کا اہل ھی رہے گا تاوقتیکہ آپ اپنی رقم واپس نہ لے لیں یا حکومت خود ۔ خیال کیجئے ان انعامی بانڈوں کی مقدار بھی کچھ کم نہیں ۔ ان کے تو کتنے ھی سلسلے ھیں : اے ۔ بی ۔ سی ۔ ڈی ۔ ای ۔ ایف ۔ ہر سلسلے میں پانچ پانچ لاکھ بانڈ جاری کئے جائیں گے اور ہر ایک میں ہر تیسرے مہینے ۵۰ ہزار روپوں کے انعامات تقسیم کئے جائیں گے ۔ جن پر کوئی انکم ٹیکس یا سپرٹیکس واجب الادا نہیں ہوگا ۔ بانڈوں کے نمبر عوام کی اطلاع کے لئے گزٹ آف پاکستان اور ملک کے دوسرے اہم اخباروں میں شائع کئے جائیں گے ۔ جس سے آپ کو اپنی جیت کا علم ہو جائے گا ۔ پہلی قرعہ اندازی یکم اپریل کو ہوگی ۔

غور کیجئے، آپ روپیہ حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلتے ۔ بسا اوقات اس ہڑبونگ میں ستم ظریفی کی حد تک پہنچ جاتے ھیں ۔ مثلاً ہم میں سے کتنے ھی سیانے بیانے لوگ ھیں جو کسی نہ کسی وقت روپے کے لالچ میں معمے حل کرنے پر نہیں اتر آتے اور خواہ ایک پیسہ بھی ہاتھ نہ آئے پھر بھی اندھا دھند اس فضول کام پر روپیہ لگائے چلے جاتے ھیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اور ان کے کنبہ والے کھانے پینے تک کے لئے محتاج ہو جاتے ھیں ۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ آپ ایسے کام پر روپیہ لگائیں جس میں ہے ۔ فائدہ آپ کا بھی اور دوسروں کا بھی؟

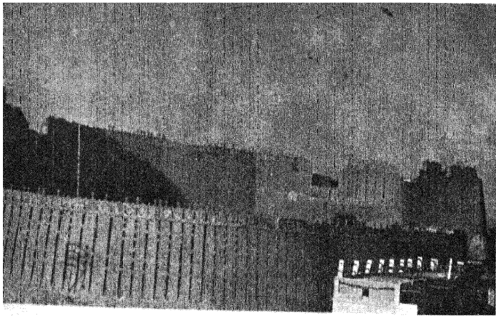
میں خدا لگتی کہونگا - میرے ایک چچا میاں ہیں، بڑے ہی کائیاں - ہمیشہ ایسے داؤں پر روپیہ لگائیں گے جس میں جیت ہی جیت ہو - چنانچہ جونہی ان کے کانوں میں قومی انعامی بانڈوں کی بھنک پڑی وہ اچھل پڑے اور کمر خم ہونے کے با وجود آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ تجوری سے روپیہ نکالا اور "سوسائٹی" سے پیدل چلتے چلتے اسٹیٹ بنک کے پرائز بانڈ سیکشن واقع بولٹن مارکیٹ میں آنکلے - اور صدری کے نیچے جو چور جیب تھیلی کی طرح بنی ہوئی زپ سے بند تھی اس سے ایک ہزار روپیہ نکال کر بانڈ خرید لئے اور انہیں اسی طرح چور جیب میں بند کرکے پیدل گھر آ گئے - اسے کہتے ہیں کفایت شعاری - ایسے ہوشیار شخص کا ایسے معاملہ میں اس قدر شد و مد سے شریک ہونا بجائے خود اس کے مفید ہونے کا ثبوت ہے - اور یہی کیا - بات کا سلسلہ اس سے بھی آگے جاتا ہے اور ہمیں اس خضر راہ کی تقلید کی تحریک دلاتا ہے - تو قصہ یوں ہے کہ ابھی تین چار دن نہیں گزرے تھے کہ انہیں پھر کچھ خیال آیا - شاید پڑوس میں چوری کی کوئی واردات ہوگئی اور سارا زیور اور نقدی لٹ گئی تھی - چچا میاں کے لئے یہ تازیانۂ عبرت تھا - وہ رات بھر جاگتے رہے اور دوسرے دن علی الصبح پھر اپنے سفر شوق پر روانہ ہو گئے - دوسرے کم نظر، نادان لوگ حج کرنے جاتے ہیں تاکہ واپسی پر خوب جی بھر کر سونا اسمگل کرکے قارون بن جائینگے - مگر چچا میاں ایسی کچی گولیاں کھیلنا نہیں جانتے - وہ وہی کام کریں گے جو ان کے لئے، حکومت کے لئے، قوم کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں - چنانچہ انہوں نے دوسرے دن جاتے ہی اس روپیہ سے دو ہزار کے اور بانڈ خرید لئے - ایسے ہی چند دن بعد پھر کوئی رقم ہاتھ لگی تو سب کام چھوڑ چھاڑ بنک میں جا سر نکالا - اب ان کو یہی دھندا بھا گیا ہے - سو بیوپاروں کا ایک بیوپار - اور اب تک دس ہزار کے بانڈ اسے ی تک خرید چکے ہیں! کیوں نہ ہو وہ جانتے ہیں کہ ان کی روٹی ہی نہیں، ساری قوم کی روٹی کس طرف چکنی چپڑی ہے - پھر ہم کیوں نہ بساط بھر یہ بیش بہا بانڈ خریدیں اور چچا میاں کی طرح خریدتے ہی چلے جائیں - بلکہ اس سلسلہ کی منطقی تکمیل یوں ہوگی کہ جو انعام ہمیں ملے اس سے اور بانڈ خرید کر مزید انعام کے امیدوار ہوں - در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست - اور پھر زر را زر می کشد کی بہترین صورت بھی تو یہی ہے*

«منگھوں» کا شہر



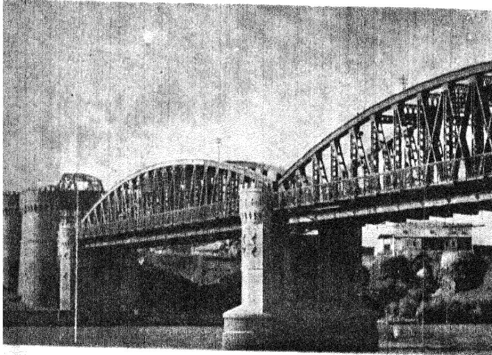
" منگھ " (باد کش)

حیدرآباد (سابق سندھ) صرف خواب نما
افسانوں کا ھی شہر نہیں بلکہ
اس میں نئی زندگی کی دھڑکنیں بھی
ھیں اور جھلکیاں بھی

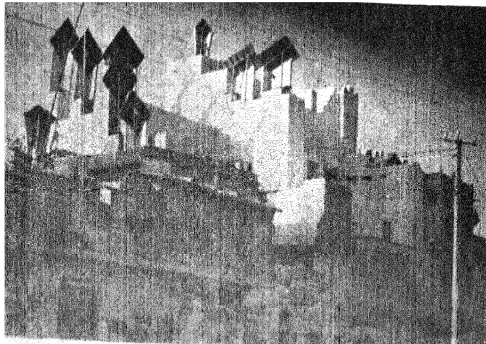


نوٹ

کوچه



کوٹری



نوائے پاک

(طبع ثانی)

قیام پاکستان کے بعد جو نیا قومی شعور پیدا ہوا ہے، اس سے ایک نئے خالص ملی ادب کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس میں شاعری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ہماری آزاد زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو ہمارے حب وطن سے سرشار شعرا کی منظومات میں منعکس نہ ہوا ہو اور اس خوش اسلوبی سے کہ ہم اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

حصول آزادی کے چار ہی سال بعد قابل قدر ملی منظومات کا ایک وسیع ذخیرہ تیار ہوچکا تھا جن میں سے چیدہ چیدہ شہ پاروں کا ایک سیرحاصل مجموعہ "نوائے پاک" کے نام سے پیش کیا گیا تھا اور تمام حلقوں میں بے حد مقبول ہوا تھا۔

——— اور اب گونا گوں مرحلوں سے گزر کر ہماری شاعری کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ ایک نیا مجموعہ، جو ضخیم تر بھی ہے اور دقیع تر بھی، نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

مشمولات :

آزادی	مجاہدانہ منظومات	قائد اعظم رح
حکیم الامت رح	ہمارا وطن	کشمیر
	عہد نو	

چند لکھنے والے :

ابوالاثر حفیظ	احمد ندیم قاسمی	ڈاکٹر تاثیر (مرحوم)
فضل احمد کریم فضلی	قتیل شفائی	سیماب اکبرآبادی (مرحوم)
ش ۔ ضحیٰ	اثر صہبائی	مجید لاہوری (مرحوم)
نظر حیدر آبادی	حمایت علی شاعر	عبدالمجید سالک (مرحوم)
	عبدالعزیز فطرت، وغیرہم	

اس کتاب کی عام مانگ کے پیش نظر یہ ایڈیشن اضافہ و ترمیم کے باوجود نہایت کم قیمت پر مہیا کیا جارہا ہے۔

رنگین و نفیس سر ورق ضخامت : سوا دو سو صفحات

قیمت صرف ایک روپیہ (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا۔



اشاعتِ خاص — بتقریب یومِ پاکستان

جلد ۱۴ — مارچ ۱۹۶۱ء — شمارہ ۳

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

صد رنگ گلستاں!

"جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!"

"مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی ضیاء دیکھ:"

افسانہ از افسانہ می خیزد:

چندہ سالانہ: **پانچ روپے ۵۰ پیسہ**

شائع کردہ: **ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی**

قیمت اشاعتِ خاص: **ایک روپیہ ۲۵ پیسہ**

"یہ رنگ، یہ روپ، یہ آوازیں!"

(جائزہ)

رفیق خاور

یومِ پاکستان ہمیں پھر اس دن کی یاد دلاتا ہے جب ہم نے تہیہ کیا تھا کہ ہم اپنے لئے ایک الگ وطن بنائیں گے جس میں ہمیں پوری پوری آزادی حاصل ہوگی اور جس میں ہم اپنی مرضی و خواہش کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیں گے۔ یہ اسی عزمِ محکم کا نتیجہ تھا کہ ہم بالآخر آزادی حاصل کر کے رہے۔ اگرچہ ہم عملاً ایک عرصہ تک اس کے فیضان سے محروم رہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ دورِ انقلاب کے ساتھ یومِ پاکستان کا منشا حقیقی معنوں میں پورا ہوا، ہم حقیقی معنوں میں ایک آزاد قوم بنے اور ہمارا وطن صحیح معنوں میں ایک آزاد، ترقی پذیر مملکت بن گیا۔ لہٰذا یومِ پاکستان اب ہمارے لئے وہ معنی رکھتا ہے جو قبل ازیں نہیں رکھتا تھا۔ حصولِ آزادی کے لئے ہماری تمام تحریکیں، ہمارے مقاصد اور تمناؤں کے تمام دھارے یومِ پاکستان اور ہمارے اپنے دور میں منعکس ہوتے ہیں جو اس کا منطقی نتیجہ اور منتہائے عروج ہے۔ اس لئے یومِ پاکستان کا تذکرہ درحقیقت ہماری جدوجہدِ آزادی کی تمام تحریکات کی بازیافت اور ان کا بھرپور احساس ہے خواہ ان کا تعلق عہدِ رفتہ سے ہو یا قریبی عہد سے۔ اور اس کے ساتھ ان کارہائے نمایاں کی نشاندہی بھی جو دورِ انقلاب میں حقیقی آزادی کے جلو میں آئے ہیں اور جن کا فیضان تعمیر و ترقی کے سانچے میں ڈھل کر اب ہمارے ماحول، ہماری حیاتِ ملیہ پر بہ شدتِ تمام اثر انداز ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس ہنگامہ آفریں دور میں تاروں کی گردش بے حد تیز رہی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز دکھائی دے۔

یہاں اُن واقعات کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے جو اب تک رونما ہو کر حیاتِ ملیہ کا جز بن چکے ہیں۔ زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم حالات پر زیادہ گہری نظر ڈالیں اور ان بنیادی رجحانات کا سراغ لگائیں جو ان کی تہہ میں کام کر رہے ہیں۔ خصوصاً وہ جو نسبتہً حال میں گذشتہ یومِ انقلاب کے بعد نمایاں ہوئے ہیں۔

قبل ازیں انقلابی حکومت کی سرگرمیوں کا زور زیادہ تر اندرونی اصلاح، اندرونی استحکام، اندرونی نظم و نسق ہی پر رہا ہے۔ اور یہ لازم بھی تھا کہ ملکی حیثیت کو مستحکم کر کے آگے قدم بڑھایا جائے۔ اس دور کا سب سے اہم واقعہ اور اگلے دور کی سب سے بڑی تیاری بنیادی جمہوریتوں کا قیام تھا جو جمہوریت کو ہمارے قومی مزاج اور ضروریات کے مطابق بنانے کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم اور منفرد تجربہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ ایک اور نہایت اہم اقدام تھا جس کے لئے طاس سندھ کا معاہدۂ آب ایک عظیم پیشقدمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور دیگر اہم مقاصد کے حصول کے لئے عالمی روابط کس قدر ضروری ہیں۔ موجودہ زمانہ ہے ہی بیش از بیش عالمی روابط کا زمانہ۔ اور دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اور پاکستان جیسے نئے ملک کو تو ہر قسم کے بیرونی تعاون اور امداد کی اشد ضرورت ہے۔ صدرِ پاکستان کی حقیقت شناس، دوربیں نگاہ نے اسے فوراً محسوس کر لیا اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ پاکستان کو تمام اقوامِ عالم کا مرکزِ توجہ بنا کر چھوڑیں گے تاکہ وہ ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں۔ چنانچہ ان کے ایک طرف سعودی عرب اور متحدہ جمہوریۂ عرب اور دوسری طرف مشرقِ بعید کے برما سے جاپان تک کے عظیم الشان دورے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے نتائج نہایت وقیع ہیں۔ ادھر مغرب کا دورۂ خیرسگالی بھی اتنا ہی اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ حال ہی میں نظریاتی پیچیدگیوں میں الجھے بغیر روس کے ساتھ کاروباری روابط

ایک نہایت عمدہ رجحان کی خبر دیتے ہیں۔ یہ تمام خوشگوار روابط، جن میں ہمسایہ ملک ہندوستان کے ساتھ بہتر دوستانہ تعلقات بھی شامل ہیں، دوسرے پنج سالہ منصوبہ ترقی کی کامیابی کے لئے ایک نہایت عمدہ فال ہیں اور ظاہر ہے کہ پاکستان کی آئندہ تعمیر و ترقی اور خوشحالی کے سلسلہ میں یہ منصوبہ کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے تصورات ہی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس کی روح، اس کے افکار اس کو نشو و نما دیتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں صدر پاکستان بار بار حقیقت پسندی، سائنس اور علوم جدیدہ کی طرف رجوع اور حالیہ تقاضوں کی طرف اعتنا پر جو زور دیتے ہیں اور روایت کی کورانہ پیروی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، وہ بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم ایک خالصتاً جدید ذہنیت پیدا کریں اور روایت و جمود کی دلدل سے باہر نکل کر اجتہاد اور ارتقاء کی راہ پر گامزن ہوں۔

اس ضمن میں تعلیم کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ جن لوگوں نے قومی تعلیم کے کمیشن کی رپورٹ پڑھی ہے انہیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ اس کی سفارشات کس قدر انقلاب آفریں واقع ہوئی ہیں۔ اگر ان پر عمل درآمد کیا گیا اور یقیناً کیا جائے گا، تو آج سے دس پندرہ سال بعد پاکستان کی ذہنی فضا ہی کچھ اور ہوگی۔ علاقائی زبانوں کی ترقی، تراجم کے ذریعہ ان کا آپس میں ارتباط اور عوام کی ایک دوسرے سے شناسائی ایک مشترکہ ادب و ثقافت پیدا کرنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حال ہی میں صدر پاکستان نے مشترکہ رسم الخط پیدا کرنے کی جو ہدایت کی ہے وہ اس باہمی ربط و تعلق کی طرف ایک اور اہم اقدام ہے۔ اس کے علاوہ قومی تعلیم کے کمیشن میں ادب آفریں اداروں کی حوصلہ افزائی اور قیام، جیسا کہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، ادیبوں کے لئے خوشگوار حالات اور ان کی حوصلہ افزائی اور اجتہاد فکر و نظر کے لئے زیادہ سے زیادہ سازگار فضا پیدا کرنے پر زور صریحاً سب نہایت دور رس نتائج کے حامل ہیں۔

حقیقت پسندی اور فہم و بصیرت کا ایک اور نہایت عمدہ ثبوت یہ اعتراف ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی زبان خالص و بے آمیز نہیں رہ سکتی۔ اس کا دوسری زبانوں سے اختلاط ناگزیر ہے۔ ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اردو کے سلسلہ میں یہ اختلاط بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف اسے جامد ہونے سے بچائے گا بلکہ اس میں وسعت، توانائی اور جدت کی بھی بیش از بیش صلاحیت پیدا کرے گا۔ اسی بنا پر صدر پاکستان نے بھی یہی لائحہ عمل اختیار کرنے کی رائے دی ہے۔ تاکہ وہ زبان پیدا ہو جسے قومی تعلیم کے کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی کہا جا سکے۔

جہاں تک زبان و ادب کے جدید ماحول میں نئی وضع پیدا کرنے کا تعلق ہے پُل کے نیچے سے کتنا ہی پانی گزر بھی چکا ہے اور اردو میں کتنے ہی علاقائی عنصر سرایت کر چکے ہیں۔ اور بظاہر یہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھے گا۔ علاقائی زبانوں کے متعدد قابل قدر تراجم، جن کی فنی حیثیت خاصی بلند ہے، دور حاضر کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

ایک اور رجحان جو دور انقلاب کے بعد اور بھی نمایاں ہو گیا ہے فکر و نظر میں ایک عالمگیر پھیلاؤ ہے۔ آج کوئی صحیح معنوں میں جدید ادیب یا شاعر رسم و روایت یا محض اپنے ملک و قوم تک محدود تصورات کے ضمن میں نہیں سوچتا بلکہ اس کی نظر عالمی ادب و افکار پر ہے۔ اس لئے وقیع تخلیقات میں تمام زور طرح نو ہی پر دیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چند سال پہلے جو تصورات یا اسالیب جدید تر خیال کئے جاتے تھے وہ بھی اب کچھ ایسے جدید محسوس نہیں ہوتے۔ اور ان سے کہیں زیادہ جدید رجحانات کی جھلکیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ اس طرح روایت اور تجربہ کی پرانی کشمکش کا پلّہ اب پھر تجربہ ہی کی طرف جھک رہا ہے۔ نئے موضوعات اور پیرایوں کا شوق عبدالعزیز خالد کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ جن کے موضوعات کئی زبانوں، ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً قدیم یونان، بنی اسرائیل، انگریزی، بنگلا۔ اور پھر اس کی تحریروں میں عربی، فارسی، ہندی سب کے دھارے ملتے نظر آتے ہیں۔ اس سوال سے قطع نظر کہ اس کے تجربے کس حد تک کامیاب ہیں، وہ ایک جدید ذہنی شعور اور جدید میلان کی خبر ضرور دیتے ہیں۔ اور ہم غور سے دیکھیں تو اسالیب و تخیلات اور تمثیلات میں بھی ایک کا عنصر صاف نمایاں نظر آئے گا۔

خالد اور جعفر طاہر ایک ہی قلزمِ ہفت آب کے شناور ہیں۔ جعفر طاہر اپنے موضوعات کی تلاش میں کشور بہ کشور اور اقلیم بہ اقلیم گھومتا ہے اور زبانوں کی حد تک ملک ملک اور نگر نگر کی بولیوں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، ہنگری، بنگلا، کشمیری، پنجابی، سندھی وغیرہ سے جوت جگاتا اور دامانِ سخن بھرتا ہے۔

غالب کی طرح اس کے بارے میں بھی شاید "تاب گراں باریٔ گوہر" کا سوال
پیدا ہو۔ لیکن دونوں میں وسیع رجحان کی موجودگی بخوبی عیاں ہے۔ ایسے ہی
کئی شعرا اور ادبا کے یہاں ہاپکنس، ایلیٹ، ایزرا پونڈ، پال والیری، بودلیر،
پروسٹ، ورجینیا وولف، فرائیڈ، برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا وغیرہ کے
افکار و اسالیب سے گہرا شغف نمایاں ہے۔ جو ان کو ادبی، فنی اور ذہنی
حیثیت سے "آفاقی شہری" بنا دیتا ہے۔ بلا مبالغہ اس وقت عالم مشرق
کی عالم مغرب کی ہر ہر تحریک، دبستانِ فکر اور مشاہیر پر گہری
نظر ہے۔

جہاں تک افسانہ کا تعلق ہے، قرۃ العین حیدر اور ایک
جواں سال افسانہ نگار، انور کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ یہ عالمی
رجحان ان دونوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ قرۃ العین کا ذہنی
وطن شروع ہی سے مغرب رہا ہے اور خواہ اس کے موضوعات اپنے ہی
ملک و معاشرہ اور فضا سے متعلق ہوں، اس کا شعور مغرب ہی کے نظریات
اور تصوراتِ فن میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "آگ کے دریا" میں
مشرق و مغرب کا یہ ربطِ باہمی اور بھی نمایاں ہے۔ اس کا تصور عام
روش اور سطح سے بہت پرے ہٹ کر کیا گیا ہے۔ جیسے وہ مغربی
ناولوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہو۔ اسی لئے قرۃ العین حیدر کا تذکرہ کرتے
وقت ٹالسٹائی، ایلیٹ، جیمز جوائس وغیرہ خود بخود معرضِ بحث میں آ جاتے
ہیں۔ انور کے لئے ہمیں ایک اور مغربی یگانۂ فن، برنارڈ شا کی طرف رجوع
ہونا پڑتا ہے۔ وہ طنز، گہری طنز کا پیکر جسے ایک نقاد نے "تازیانوں
اور بچھوؤں" (WHIPS & SCORPIONS) کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔
انور کو بھی مسائل کے ساتھ کچھ ایسا ہی لگاؤ ہے۔ اس کا تیز، چونچال ذہن
اس کی ذکاوت، فطری چلبلا پن اور گہری نظر اسے قدرتی طور پر دوسرا
برنارڈ شا بنا دیتی ہے۔ اس لئے اس کے یہاں مسئلے چھوٹے بڑے نہیں رہتے
بلکہ سب بڑے اور نہایت پُرلطف، نہایت تہہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ
صحیح معنوں میں افسانہ بناتا ہے۔ ان میں کچھ بات، بڑی پتے کی بات
پیدا کرتا ہے۔ لیکن عام روش کے خلاف بیان نہیں کرتا۔ مضبوط ذہن
مضبوط گرفت۔ اس لئے اس کا ہر لفظ، ہر فقرہ پوری طرح سوچا سمجھا
ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خبردار ہو کر لکھا ہوا۔ اس لئے اس کا
ہر جملہ، یہاں تک کہ ہر علامت بھی فن ہے۔ وہ فکر و فن کا باغی ہے۔
اس لئے اس کی تکنیک بھی اپنی ہی ہے۔ اور موضوعات بھی بالکل الگ۔

جبھی اس کی آفاقیت نہایت اہم و منفرد ہے جیسے کوئی منچلا ہراول کا
ہراول فکر و فن میں ایک نئی، بہت آگے بڑھی ہوئی چوکی پر جا دھمکے۔
صریحاً اس قسم کی آفاقیت اپنے اندر بہت وسیع امکانات رکھتی ہے۔

ایک اور صورت جس میں یہ وسیع رجحان تیزی سے ابھر رہا ہے-
نفسیات کے ساتھ شدید لگاؤ ہے۔ معلوم نہیں اس میں علم النفس کے
عمیق مطالعہ اور فرائیڈ، یونگ وغیرہ کے اثر کو کس حد تک دخل ہے۔
یا پھر جن حالات سے ہم گذر رہے ہیں، ان کا ردعمل کس حد تک کارفرما
ہے۔ لیکن شاعری کی حد تک ہم نئی پود کے کتنے ہی شاعروں کو نفسیات کی
بھول بھلیوں میں کھویا ہوا پاتے ہیں۔ یہ حقیقتہً بھول بھلیاں ہے۔
کیفیات، اسلوب اور استعارات و تمثیلات سب کے اعتبار سے۔
نظموں میں عموماً معنی خبط، فی البطن شاعر یا زمین دوز نظر آتے ہیں۔
اور غزلوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ گویا شاعر کسی نفسی الجھن، فرار، شکست
خوردگی، بغاوت، کچھ بھی کہہ لیجئے، کا شکار ہو۔ اور عنانِ کار عقل و
شعور اور نظم و ضبط کے ہاتھ میں نہیں بلکہ نفسی انتشار اور لاابالیانہ پن کے
ہاتھ میں ہو۔ اسی وجہ سے استعارات و تمثیلات اور اسلوب میں
بھی بوالعجبی اور انوکھی اپج ہے۔ جیسے ہمارے کئی شاعر پلک جھپکنے میں
سرریلسٹ بن گئے ہوں۔ غالباً اس رجحان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ
ہم لوگوں پر شعور کا بہت زیادہ دیر غلبہ رہا ہے اور ہم اس کے
زیر اثر حد سے زیادہ ظاہریت، میکانیت، سطحیت، ضابطہ پرستی
اور جبر کے قائل رہے ہیں۔ جدید ذہن گہرائی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ
ان تمام روایتی اور جامد رویوں کے خلاف شدت سے ردعمل کرتے ہوئے
دوسری انتہا کی طرف جا رہا ہے۔ آرٹ میں فنکار تجریدی آرٹ کی
طرف مائل ہیں۔ جو اشاراتی ہونے کے بجائے جامد ہے۔ اور واقعیت
سے گریز کا نتیجہ۔ شاعری کی روش زیادہ ایمائی اور عمیق ہے۔

اس سے ہماری توجہ ایک نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ کی
طرف منعطف ہوتی ہے۔ ایک مدت سے ہماری ادبی جولانیاں
درمیانی سطح پر نظر آتی ہیں۔ ادب ہو یا صحافت، شاعری ہو یا تنقید
اور افسانہ یا ڈرامہ، ہم ایک معین روش، ایک معین تصور سے
مطمئن ہیں۔ ہمیں بہت ہی ادنیٰ صورت میں یہ تصور صحت زبان، قواعد
محاورہ، پارینہ طرز تحریر، پارینہ وضع، فرسودہ ذوق اور میکانکی
اسالیب و مضامین سے عبارت ہے۔ بلند سے بلند شکل میں یہ تقریباً

انہی خیالات اور طور و طریق کو اپنانے کے مترادف ہے جو اقبال تک کے زمانہ کے اندازسے کچھ ہی آگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی صنف ادب میں بھی تخلیق کی سطحیں یکساں نہیں ہوتیں۔ درمیانی سطح پر تخلیق نسبتہً بہت آسان ہے کیونکہ اس میں ادیب کو زیادہ کاوش سے کام نہیں لینا پڑتا اور وہ بڑی حد تک روایت اور مقبول عام، منجھے ہوئے آزمودہ طریقوں پر انحصار کرتا ہے۔ اس طرح تخلیق ایک کھیل، ایک مذاق، ایک مشینی عمل بن جاتی ہے۔ ایک سہل عمل بھی اور سہل انگاری بھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک سرسری احساس یا خیال کو سرسری، چلتی ہوئی زبان اور پیرایہ میں ادا کر دیا، جس کو لوگ سن کر واہ واہ کر دیں، تو شعر و ادب کا مقصد پورا ہو گیا لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ پائدار ادب شدید کاوش اور بلند تصور چاہتا ہے ؎

آں ہمیں باید کہ چو ریزم بجام
زودیے درگردش آرد جام را

بد قسمتی سے ہم نے اپنی کسی صنف ادب میں بھی تصور کی اس بلندی اور وقعت کا احساس نہیں کیا۔ ہم استھائی پر قناعت کر رہے ہیں۔ انترہ کی طرف شاذ و نادر جاتے ہیں۔ حالانکہ عظیم ادب کا مسئلہ بڑی حد تک تصور کی عظمت ہی کا مسئلہ ہے۔ مثلاً ان دو شعروں کا فرق تصور اور اٹھان ہی کا تو فرق ہے ؎

نالہ پابندِ نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
شورِ فریاد گرفتارِ مزامیر نہیں
یہ وہ نالہ ہے کہ پابند بم و زیر نہیں

اسی طرح اقبال کے ؎

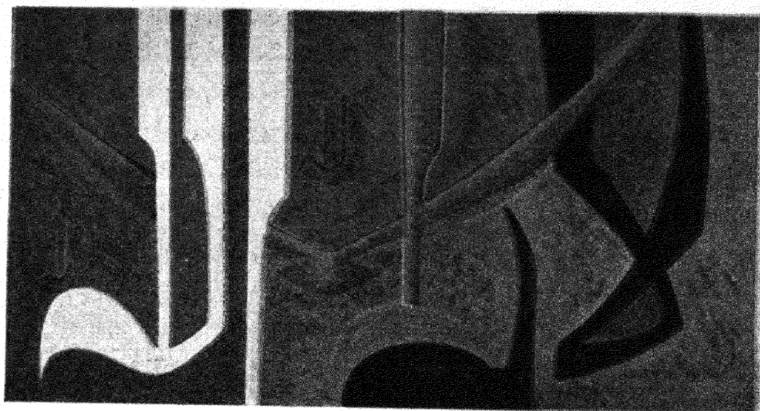
حسینوں میں ہیں کچھ وہی حسن والے
کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں

اور انہی کی "حقیقتِ حسن" میں صرف غزل کے مفرد شعر اور نظم ہی کا فرق نہیں بلکہ تصور، سطح اور اٹھان کا بھی فرق ہے۔ غزل اسی سطحیت کے لئے رسوا ہوئی اور اسے بچانے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ شعراء نے اس کو بچانے ہی کی خاطر داخلیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور جب وہ پھر قوافی ہی کے گورکھ دھندے میں گرفتار رہے یعنی قافیہ ہی کے زیر اثر مضمون آفرینی کرتے رہے جس کا نتیجہ میکانیت تھا، تو نتیجہ ناسخ اور اس کے ہم مشربوں کی خارجی میکانیت کے مقابلے میں داخلی میکانیت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ ہمارے غزلگو شعرا، گلی، شہر، گاؤں، کوچہ، بازار، کتاب کو قافیہ ردیف ٹھہرا کر زبردستی خیالی مضامین وضع کرنے لگے جس کی سب سے مضحکہ خیز شکل وہ غزلیں ہیں جن میں سانپ، بچھو، ہاتھی وغیرہ کو قافیہ یا ردیف کے طور پر استعمال کر کے فرانسیس کی ٹوپی۔ اچھو کی گردن وغیرہ کا برجستہ جواب پیدا کیا گیا۔ اس طرح غزل ہے اور برائیوں کا ایک لامتناہی چکر۔

ادب میں بھی تصور کی عمومیت یہی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ اکثر نظمیں اسی لئے بلند نہیں ہوتیں کہ ان کا تصور بلند نہیں۔ اکثر افسانے اسی لئے اوسط درجہ کے ہوتے ہیں کہ ان کا تصور ارفع و اعلیٰ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اونچے درجہ کے افسانہ نگاروں میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ تنقید بھی تصور کی اوسط حدوں سے کم ہی متجاوز ہوتی ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ادب اس سُجھاؤ اور ہدایت کرنے والے حیات افروز اثر سے محروم ہے جو اسے تنقید کی خیال انگیزی عطا کر سکتی ہے۔ لہٰذا ساری کی ساری بزم تہی پیمانہ ہے۔ اگر تنقید کی اٹھان بلند نہیں تو ادب کی اٹھان بھی بلند نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں جیسے بھی ہو تنقید کا معیار، اس کا تصور، بلند کرنا ہو گا۔ یہ موجودہ عالمی فضا کے پیش نظر اور بھی ضروری ہے۔ ہم آخر تا کجے "مشرق مشرق" اور "روایت روایت" پکارتے ہوئے فروتر تصورات سے مطمئن رہیں گے؟ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ چند سال تخلیقی پیداوار بہت ناہموار رہی ہے۔ اور ادب کا غیر ترقی یافتہ تصور اس ناہمواری کا کس حد تک ذمہ دار ہے خاص طور پر قابل غور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان حقائق سے غافل رہیں اور کسی مسئلہ کو سرے سے مسئلہ ہی تسلیم نہ کریں۔

یہ نہیں کہ فکر و احساس کے سوتے بالکل خشک ہو گئے ہیں۔ اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً دکھائی دیتی ہیں لیکن ضرورت یہ ہے کہ یہ



ملتِ بیضا تن و جاں لا اله　　ساز ما را پردہ گرداں لا اله

لا اله سرمایۂ اسرارِ ما　　رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

حرفش از لب چوں بدل آید ہمے　　زندگی را قوت افزاید ہمے

نقشِ او گر سنگ گیرد دل شود　　دل گر از یادش نسوزد گِل شود

چوں دل از سوزِ غمش افروختیم　　خرمنِ امکاں ز آہے سوختیم

آبِ دلہا در میانِ سینہ ہا　　سوزِ او بگداخت ایں آئینہ ہا

شعلہ اش چوں لالہ در رگہائے ما　　نیست غیر از داغ او کالائے ما

اسود از توحید احمر می شود　　خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است
شوق را مستی ز ہم پیمانگی است

(اقبالؒ)

جھلکیاں زیادہ نمایاں اور زیادہ کثیر ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ایک نور فراواں کی شکل اختیار کر لیں۔ ایسی ایک جھلک "استا نزے" کے مصنف جیلانی کامران کے یہاں نظر آتی ہے۔ پاکستان قائم ہوتے ہی یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ بدلے ہوئے ماحول کے پیش نظر اردو زبان و ادب کا ایڈ انداز کیا ہو۔ علاقائی زبانوں کی غیر معمولی سادگی، بے ساختگی، رچی ہوئی اصلیت اور فضا کے ساتھ پوری پوری مطابقت کو دیکھتے ہوئے کئی لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو کو ان کی وضع اپنانی چاہیئے۔ اس سے اس کی پُرتکلف، اجنبی وضع دور ہو سکتی ہے اور رسم و روایت کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال نے ایک پُر زور تحریک کی شکل اختیار کی اور یہ اب تک ایک نہایت قابلِ لحاظ رجحان ہے۔ اس نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے اور آئندہ بھی اس سے بڑی وسیع توقعات کی جا سکتی ہیں۔ یہ رجحان پھر بھی مقامی ہے۔ اس کی کوشش ہے بدلیس سے دلیس کی طرف آنا۔ ادب کا دھرتی سے گہرا تعلق۔

اس کے برعکس یہی مقصد ایک آفاقی وضع کو اپنانے سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جیلانی کامران نے پہلے تو خواجہ غلام فریدؒ کو نمونہ قرار دیکر مسئلہ کا مقامی و علاقائی حل پیش کرنے پر زور دیا اور پھر انجیل کے سیدھے سادے اسلوب کی طرف رجوع کیا۔ اور فارسی روایت کو خیرباد کہہ کر جس میں غالب خیر نہیں کیوں باقی رہ گئے، دوسری روش کی حمایت کی۔ چنانچہ اس کا مجموعۂ کلام "استا نزے" اور اس کی تمہید دونوں اُس کھری زبان اور بیان کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جسے مغلق زبان میں "عنصری" کہا جاتا ہے۔ "کھری" اور "عنصری" کے الفاظ بجائے خود اس کے مؤقف کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کے خیالات کافی قابلِ غور ہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں بعض بڑے بڑے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں زندہ، پُرکار اور عظیم ادب کا زیرِ بحث آنا ناگزیر ہے۔ پیش نظر شمارہ میں اسی نقاد نے شاعری کی بنیادی خرابی روایت سے انحراف قرار دی ہے۔ سوال یہ ہے۔ اس سلسلہ میں قدیم روایت ہی کیوں پیش نظر ہو۔ جدید اثرات کے ساتھ ایک۔ نئی روایت بھی تو شروع ہوئی ہے۔ جدید شعرا اس روایت کو تعمیر کر رہے ہیں اور اسی کی روشنی میں انہیں دیکھنا چاہیئے۔ کامران کا مسلک وہی پرانا مسلک ہے کہ "اونٹ موجود ہے پھر ریل پر کیوں چڑھتے ہو"؟ اگر آج کل انگریزی لباس پہننے کا فیشن ہے تو یہ کہنا بیکار ہے کہ ہم مغلیہ لباس کیوں زیب تن نہیں کرتے۔ اور ہمارا لباس اس لئے موزوں نہیں کہ وہ مغلیہ نہیں۔

ایک اور نمایاں رجحان پرانے چکروں سے نجات حاصل کرنا ہے اس لئے مقصدیت اور افادیت کے جو تصورات کبھی ہمارے فکر و ادب پر شدت سے غالب رہے اب ان کی دھند چھٹتی جا رہی ہے اور ہم ادب و فن کو محض ادب و فن کی حیثیت سے دیکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ یعنی فن کی حیثیت آلۂ کار کی ہے۔ اس کا زندگی یا افادیت کے ساتھ کوئی لازمی تعلق نہیں۔ اگر جینیس مین جیسا انسان ادیب ہو سکتا ہے اور بڑے پایہ کا ادیب، تو ادب کا انسان دوستی، اخلاق، تہذیب وغیرہ سے کیا سروکار رہا! یہ سوال خاصا بحث انگیز ہے۔ لیکن جہاں تک دورِ انقلاب کی فضا کا تعلق ہے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کا شعور جاگ رہا ہے۔ وہ اس برزخ سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس میں وہ تاریخی حالات کی ناگزیر منطق کے باعث پھنسا رہا ہے۔ اور یہ مستقبل کے لئے ایک نہایت خوشگوار علامت ہے ؎

آخرش جاگ اٹھا وقت کا خوابیدہ شعور
سالہا سال کی ظلمت کا فسوں ٹوٹ گیا
اک کرن پھوٹ کے چمکا گئی گلشن کا نصیب
دستِ صرصر سے ہر اک دامنِ گل چھوٹ گیا

کل تلک سرد تھی جن ذروں کے احساس کی آگ
آج تپ تپ کے وہ خورشید ہوئے جاتے ہیں
جن کو روندا گیا برسوں وہی بے جان سے دل
اک نئے درد کی تمہید ہوئے جاتے ہیں

لاکھ پھینکے شبِ تاریک سویرے پہ کمند
کارواں صبح کا بڑھتا ہی چلا جائے گا!
اپنے ہمراہ لئے سینکڑوں کرنوں کا جلوس
سینۂ دہر پہ چڑھتا ہی چلا جائے گا!

—— حمایت علی شاعر

پیام

(پاکستانی ادیبوں کے نام)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

پاکستان رائٹرز گلڈ کی دوسری سالگرہ، منعقدہ کراچی کے موقع پر صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستانی ادیبوں کو جو پیغام ارسال فرمایا وہ ہمیشہ کی طرح بدرجۂ اتم حقیقت پسندانہ ہوتے ہوئے بقائے ملت کو تمام دیگر امور پر مقدم قرار دیتا ہے اور ادب کی نشوونما اور ادیبوں کی بہبودی و ترقی اور آزادیٔ اظہار کا ضامن ہے۔ اس اجمال کی تفصیل خود اُن کے ارشادِ گرامی میں ملاحظہ فرمائیے جو ادب اور اہلِ ادب میں غیر معمولی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔

آپ کی پہلی سالگرہ منعقدہ ڈھاکہ کے موقع پر میں نے جو پیغام دیا تھا اس میں ذاتی طور پر اہلِ قلم کی آزادیٔ اظہار کے تحفظ کا یقین دلایا تھا۔

مجھے مسرت ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ میں اپنے وعدے پر قائم رہا ہوں اور آج کی تقریب میں یہی مناسب خیال کرتا ہوں کہ بہ شدت تمام اس یقین دہانی کا اعادہ کردوں۔

میں اس موقع پر آپ کی توجہ ایک قومی مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ اب جب کہ آپ کے ادارے کو قائم ہوئے دو سال گزر چکے ہیں کیا یہ ضروری نہیں ہوگا کہ آپ فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر پاکستان کی ملی تمناؤں کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں؟ بے شک میری حیثیت محض ایک قاری کی ہے۔ مگر آپ اتفاق کریں گے کہ انتہادرجہ داخلی ادب بھی بالآخر معروضی ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ آفاقی تصور بھی اس جغرافیائی، تصوری، روحانی اور ذہنی ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا جس میں ادیب زندگی بسر کرتے اور سانس لیتے ہیں۔

میں یہ کہہ کر آپ کی ادبی تحقیقات کے موضوعات یا حدود کا تعین نہیں کر رہا بلکہ آپ کو صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ جہاں ملک و قوم پر آپ کے سلسلہ میں کئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہاں آپ بھی ملت کے رکن ہیں اور رکن رکین۔ اس لئے اب وقت ہے کہ آپ پاکستان کی ذہنی سالمیت، استحکام اور عظمت کے باب میں اپنی جدوجہد کی ضرورت محسوس کریں اور اس کو شدید تر بنانے میں کوشاں ہوں۔

آپ جانتے ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ تاریخ ہر انسان کی فردِ اعمال کا بڑی سختی سے محاسبہ کرتی ہے۔ خواہ وہ ادیب ہوں یا قاری۔ بہرحال میں ہمیشہ آپ کی بہتری، آپ کی ترقی اور آپ کے حقوق کے تحفظ کا خواہاں ہوں۔

منظوم ڈرامہ:

"لہو ترنگ"

(جہادِ آزادی کا ایک غیر فانی واقعہ)

جعفر طاہر

(نواب سراج الدولہ، حاکمِ بنگال اپنی خوابگاہ میں جاگ رہے ہیں۔ آدھی رات بیت چکی ہے۔)

سراج الدولہ: ارضِ بنگال! مرے خوابوں کا فردوس حسیں۔
میرے آبا کا، مری قوم کا محبوب وطن،
عظمتِ دیں کی امیں پاک زمیں۔
میرے نانا کا زمانہ کیا تھا
آسماں اور زمیں عیش کے گہوارے تھے
دورِ گیرانِ بساطِ کرم و لطف و سرور
قبلۂ جم تھا کوئی گوہرِ آدم کوئی۔
کعبۂ راہرواں خانِ معظم ہی تو تھے۔
آج روپوش ہیں وہ کشوریانِ جانباز
آج آتی نہیں کوئی بھی کہیں سے آواز

وقفہ

(نواب کمرے کی ایک کھڑکی کھول دیتے ہیں)

سسکیاں لیتا ہوا سناٹا
جاگتی کروٹیں لیتی ہوئی یہ خاموشی
رات کی کوکھ سے مہتاب ابھرتے تھے کبھی
رات کی کوکھ سے اب غم کا دھواں اٹھتا ہے
مٹتی قبروں کی سیہ مٹی فغاں کرتی ہے
ہم سے مٹی کا یہ ماتم نہیں دیکھا جاتا
چیختی رات کی فریاد نہیں سن سکتے
ہم یہ فریاد نہیں سن سکتے!

(ملکہ لطف النسا خواب سے بیدار ہو جاتی ہیں)

ملکۂ عالیہ: کیا ہوا؟ خیر تو ہے میرے سراج!
سراج الدولہ: درد سے چیختی مٹی کی صدا سنتی ہو
آج ہر شاخ وہ خنجر ہے لہو جس پہ چمکتا ہے چمن زادوں کا
سانولی سرمئی آوازوں کا
رات جس طرح کوئی جھنڈ ہو ارمانوں کا
اور اس جھنڈ میں دیکھو کوئی جگنو بھی نہیں
سرِ مژگاں کوئی تارا، کوئی آنسو بھی نہیں!
ملکۂ عالیہ: آپ حالات سے مایوس نہ ہوں
مالک الملک محافظ ہوگا
سراج الدولہ: (غمگین لہجے میں) مگر یہ غم ہے کہ مٹنے لگا ہے دن کا جمال
عروسِ صبح ترسنے لگی اجالوں کو
ہمارے دیس پہ تاریکیاں سی پھیل چلیں
اجل کی نیند سلانے لگی غزالوں کو
ہم اس طلسمِ قضا کو نہ جیتنے دیں گے
ہمارے دل کا لہو راگ بن کے ابھرے گا
ہمارے دل کا دھواں آگ بن کے لپکے گا
ملکۂ عالیہ: مرے سراج! اندھیروں میں جگمگاتے سراج
ہمارے دین کی عزت، غریب دیس کی لاج
خدائے پاک محافظ ہو! تیرا ناصر ہو!
سراج الدولہ: کوئی نشاں ہے نہ منزل نہ راستوں کے چراغ
یہ تیرتی ہوئی لاشیں خلا کے آنگن میں
لٹک رہے ہیں جنازے ہوا کے دامن میں
گراں گراں یہ خموشی، یہ دردناک سکوت
یہ ہم اٹھائے ہوئے اپنی عمر کا تابوت
ملکۂ عالیہ: فرنگیوں کے ستم اب نہیں سہے جاتے
سراج الدولہ: مگر اٹھو تو یہ سایہ سا کیسا گذرا ہے؟
کسی وجود کی پرچھائیاں لرزتی ہیں

ملکۂ عالیہ: (آہستہ سے آواز دیتی ہیں) عالیہ! آؤ، یہاں آ جاؤ۔
سراج الدولہ: عالیہ خیر تو ہے؟
عالیہ: حضور ایسا گمان پڑتا ہے جیسے دھرتی تڑپ رہی ہو
ہماری مٹی کی روح غم سے نڈھال ہو کر بلک رہی ہو
غموں کے انبار میں جہاں دفن ہو رہا ہو!
خموشیاں بین کر رہی ہوں
یہ ہچکیاں ساحلوں کی، یہ ٹوٹنے لگا رہے
وہ ظلمتوں کی چٹان پر دست و پا بریدہ سسکتے رہے!
سراج الدولہ: عالیہ تم بھی اندھیروں کی مسافر تو نہیں؟
عالیہ: سفر میں شوقِ سفر ہی نشانِ منزل ہے
اندھیری شب میں بھٹکتے ہوئے جواں راہی
کسی سرائے میں آخر پہنچ ہی جاتے ہیں
سراج الدولہ: تری کنیز تو لطف النسا مجاہد ہے!
ملکۂ عالیہ: مجھے خوشی ہے نہیں آج راہبر تنہا
عالیہ: امیر کرتے نہیں ہیں کبھی سفر تنہا
سراج الدولہ: خدا نے چاہا تو یہ آخری سفر ہو گا
ستمگروں سے بہر حال جنگ کرنا ہے
عالیہ: کنیزِ شاہ بھی شاملِ جہاد میں ہو گی
ملکۂ عالیہ: ہماری ہمت عالی زمانہ دیکھے گا
لڑیں گے ہم بھی شہیدانِ کربلا کی مثال
ہماری خاک پہ روئیگا بیکراں گنگا
عالیہ: مگر وطن کی دلہن
ہمارے خوں سے لگائیگی مانگ میں سیندور
ملکۂ عالیہ: جبیں پہ طلعتِ مہتاب و تابشِ خورشید
حرارتِ لب و عارض جمالِ شعلۂ طور
سراج الدولہ: نقدِ شش روزۂ دنیا کیا ہے
ظلم کے سائے میں جینا کیا ہے
عالیہ: رات کا سونا بنا جاتا ہے کچی چاندی
رین رانی کو بھی نیند آنے لگی
نیند بھر کر تو کہاں سوئیے گا
پھر بھی آرام کریں ظلِ الٰہ

ملکۂ عالیہ: کٹ گئی آج کی شب باتوں میں
سراج الدولہ: اور بھی کتنی عجب باتوں میں
عالیہ: آپ آرام کریں
سراج الدولہ: اب کہاں سوئیں گے ہم
ملکۂ عالیہ: وضو کا پانی خجستہ ابھی لاتی ہو گی
عالیہ: سخت خود غرض ہے وہ بھی سرکار مگر
سب سے پہلے وہی پڑھتی ہے نماز
ملکۂ عالیہ: آج ہم پہلے پڑھیں گے اس سے
خجستہ خاتون: (اندر آتے ہوئے) پانی حاضر ہے وضو کا سرکار
(سب مسکرا دیتے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

منظر

محلسرائے کا ایک کمرہ

سراج الدولہ: میر صاحب مزاج کیسے ہیں؟
میر مدن: شکر ہے ظلِ الٰہ
سراج الدولہ: آپ خاموش سے ہیں، خیر تو ہے؟
میر مدن: بھیڑیئے، بھیڑوں کے بچے کھا کر
پوچھتے ہیں کہ حسین میمنے اچھے تو ہیں
ہائے تم لوگ اکیلا انہیں کیوں چھوڑ آئے؟
سراج الدولہ: اب تو اخلاق و مروّت کے ہیں آداب یہی
میر مدن: ایک بچھو سے کسی نے پوچھا
آپ حضرات میں چھوٹوں یا بڑوں کی بھی ہے پہچان کوئی
سراج الدولہ: خوب بہت خوب!
میر مدن: ہنس کے بچھو نے کہا
ہم میں چھوٹے یا بڑے کی تو نہیں ہے پہچان
سب کے سب ہوتے ہیں زہری لیکن
کوئی بھی آنکھ نہیں رکھتے ہیں
سراج الدولہ: طنز محسوس کیا میر مدن!
میر مدن: راہرو کہنے لگا یا حضرت!
آپ کی قوم میں کچھ مرد تو کام بھی ایسے ہوں گے
کاٹنے میں ہو تامل جن کو
بن ستائے نہ کسی کو کاٹیں

سراج الدولہ: بات بے چارے نے اچھی پوچھی
میر مدن: نیش کم نسبتہ کو بل دے کے وہ بچھو بولا
نیشِ عقرب سے تو پہچان ہماری ٹھہری
کنکھوروں سے بھی ڈرلازم ہے
کان میں ہاتھی کے رہ پائے تو چیونٹی بھی بہت
سراج الدولہ: زندگی نوش بھی ہے نیش بھی ہے
میر مدن: نوش کم نیش زیادہ سرکار
سراج الدولہ: یعنی؟
میر مدن: اک مداری کی پٹاری میں کئی سانپ ہیں
ہر سانپ کی کوشش ہے کہ باہر نکلے
ایک دو سانپوں کے سر اب تو پٹاری سے ابھرتے ہوئے
دیکھنے بھی لگے

سراج الدولہ: درلب رائے، اوما چند، موہن لال
میر مدن: حضور اک سانپ مارِ آستیں کہلاتا ہے شاید
سراج الدولہ: میر صاحب کو جو کہنا ہے وہ بے خوف کہیں
میر مدن: عین ممکن ہے مجھے آپ دِوانہ سمجھیں
سراج الدولہ: ہم اور میر مدن کی بات نہ مانیں!
میر مدن: کوئی ہماری بات نہ سنتا ہو سرکار
ملکہ عالیہ: (پسِ پردہ) ملکۂ وقت کا دل بھی جو مجرم ہو تو بے خوف کہیں
سراج الدولہ: میر جعفر تو کہیں ......
میر مدن: میر جعفر ہو کہ میرن ہو وطن دشمن ہیں
ملکہ عالیہ: یہ مسلمان بھی کافر نکلا!
سراج الدولہ: قوم نے ہائے یہ کیا درس لیا
سرفرازوں نے چلن کون سا یہ اپنایا
آج بنگال تو کل دکن و دہلی و اودھ
میر مدن: کون پنجاب کو اور سندھ کو بخشے گا حضور
سراج الدولہ: آج کیا درسِ جنوں اہلِ وفا لیتے ہیں
ملکہ عالیہ: جن پہ تکیہ ہے وہی پتے ہوا دیتے ہیں
سراج الدولہ: میر جعفر کو ستایا تو نہیں ہے ہم نے
اس کی تحویل میں دے رکھا ہے سارا لشکر
اور پھر خون کا رشتہ بھی ہے

میر مدن: اپنوں کا سر لینے میں تسکین زیادہ ملتی ہے۔
خونی رشتے کا تو یہی دوروپ ہے جو البیلا ہے
ورنہ غداری کیا معنی! اک بے کیف سی ہمدردی
بے کیف اور بے رنگ خوشامد بن جاتی ہے
ملکہ عالیہ: اب تنہا ہی لڑنا ہوگا
سراج الدولہ: اپنے خون کا دھبہ دھبہ سرخ سمندر بن جائیگا
ہندستان کے ہر سو نے ساحل سے جا ٹکرائیگا
ملکہ عالیہ: کشتیٔ عمرِ رواں غم نہیں جس گھاٹ لگے
عالیہ: اس دیوار سے دہلی تک
دہلی سے آگے سندھ کی آخری بستی تک
بحرِ ہند کی موجوں میں پیدا کا پانی مل جائیگا،
ملکہ عالیہ: شارعِ شوری جادۂ خونیں بن جائیگی
میر مدن: دشمن سر پر چڑھ آیا ہے
اب سرکار پلاسی پہنچیں،
سراج الدولہ: مرنا عین شہادت ہوگا
سب ہم آواز ہوکر: جو بھی منظورِ مشیت ہوگا

منظر

میدان پلاسی۔ دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا ہیں۔ نواب اپنی فوجوں سے خطاب فرما رہے ہیں

سراج الدولہ: دوستو، ہم نفسو، ہم سفرو!
زندگی آج نئے موڑ پہ آئی ہے
آج درپیش نہیں اپنی حفاظت کا سوال
کشورِ ہند کی تقدیر کا لازم ہے خیال
جیت یا مات ہو اس کی کوئی پروا نہ کرو
آج اپنی سی مگر کر گذرو
چند قطرے ہیں تو کیا آؤ برس کر دیکھیں
ایک اُمرِ چیٔرِ کے ہم سازِ نفس پر دیکھیں
جان جائے کہ بچے، نام مگر رہ جائے
ہم رہیں یا نہ رہیں کام مگر رہ جائے
میر جعفر: آپ کے حکم سے انکار نہیں ہے ہیٹے
لیکن اک مشورہ دیتے ہیں جو منظور کریں،

سراج الدولہ: تجربہ کار ہیں، سالار و سرِ لشکر ہیں
آپ کی ذات پہ نازاں ہے زمینِ بنگال
آپ کی بات نہ مانیں گے بھلا
میر جعفر: تم جواں سال ہو، دنیا نہیں دیکھی تم نے
تم سمجھ سکتے نہیں جنگ میں کیا ہوتا ہے
پھر یہ افرنگ بُرے بھی تو نہیں
سراج الدولہ: عمّو جان! آپ یہ کیا کہتے ہیں؟
سانپ کا پھن بھی کبھی پھول بنا؟
نیشِ عقرب سے کہیں زہر گیا؟
خوئے گرگانِ ستم پیشہ کبھی بدلی ہے؟
میر جعفر: شاعری کرنے لگے ہو بیٹے،
صلح جس طرح بھی ہو جیسے بھی ہو ہم کرلیں
سراج الدولہ: آپ ناراض نظر آتے ہیں
میر جعفر: ہم جو حق بات سمجھتے ہیں وہی کہتے ہیں
سراج الدولہ: جان کے خوف سے ہم شمر کی بیعت کرلیں!
کس توقع پہ کریں آرزوئے قربِ یزید
عزت و عظمت دیں بیچ کے اعلان کریں
صاحبِ فکر و عمل ہیں ہم لوگ
اپنے جمہور کی آواز ہیں ہم!
میر جعفر: دین و دنیا میں بہت فرق ہے میرے بیٹے!
اور پھر قوتِ افرنگ سے انکار نہیں
یہ کوئی قافلۂ مور و ملخ بھی تو نہیں
فوج در فوج یہ بڑھتا ہوا سیلابِ عظیم
آج زندہ نہ ہمیں چھوڑے گا
سراج الدولہ: کیا ہمیں حشر تلک جینا ہے؟
پھر زمانے کو جگا دے تو جوانی اپنی
وقت دہرائے گا رہ رہ کے کہانی اپنی
میر مدن: عین ممکن ہے کہ تکلیف انہیں پہنچی ہو
آپ سے کوئی شکایت ہوا نہیں
آپ کا فرض ہے چاہے معافی مانگیں
میر جعفر: نہیں میر صاحب، ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

علی وردی خاں کا نواسہ مرا لختِ جاں ہے
یہ باتیں جو کہی ہیں مرا فرض تھا۔ اونچ نیچ آپ لوگوں کو سمجھا دیا
ورنہ جھگڑا نہیں ہے،
بھلا اپنے بچوں سے ماں باپ کو زیب دیتا ہے جھگڑا!
سراج الدولہ: ہم بھی انساں ہیں، خطا کار و گنہگار بشر ہیں عمّو
عین ممکن ہے کہ تکلیف کبھی پہنچی ہو
ناگوارانہ کوئی فعل ہوا ہو ہم سے
آپ اس وقت ہمیں بخش تو دیں
میر مدن: جانے پھر وقت ملے یا نہ ملے
سراج الدولہ: بھائی میرن نہیں رو، عمِ گرامی سے کہو، کوئی سفارش تو کرو۔
میر جعفر: ارے یہاں کوئی گلہ ہے نہ شکایت نہ کوئی رنجش ہے
سراج الدولہ: (دستارِ شاہی اتار کر میر جعفر کے پاؤں پہ رکھتے ہوئے)
آپ کے پاؤں پہ دستارِ شہی رکھتے ہیں
اہلِ لشکر: الاماں! الاماں!
اور ایک لشکری: مرحبا! مرحبا!
سراج الدولہ: بخش دیں ہم سے اگر ہو بھی گیا کوئی قصور،
معذرت خواہ، طلبگارِ عنایات ہیں آج
میر جعفر: تم یہ دستار اٹھا لو بیٹے
سراج الدولہ: جب تلک بخش نہ دیں گے یہ نہیں ہونے کا
میر جعفر: آخری وقت میں کیا تم سے شکایت ہوگی
سراج الدولہ: آج ہم سر پہ نہیں رکھیں گے شاہی دستار
میر جعفر: ہم یہ دستار بندھاتے ہیں تمہیں
آؤ سینے سے لگاتے ہیں تمہیں
آؤ آؤ مرے بیٹے آؤ
بوڑھے عمّو کو نہ اب اور پریشان کرو
سراج الدولہ: (مسکرا کر) آپ نے بخش دیا نا قبلہ!
میر جعفر: باپ بیٹے میں لڑائی کیسی!
سراج الدولہ: لیجیے اب حکمِ صف آرائی دیں
میر جعفر: (یکلخت چونک کر) ہاں ہاں۔
قلبِ لشکر میں تو خود آپ رہیں

میمنہ کے لئے موجود ہے میرن سا غلام
میسرہ میر جہاں خاں ہی سنبھالے رکھیں
توپ خانے کے لئے میر مدن کافی ہیں،

سراج الدولہ، آپ کہاں پر ہوں گے

میر جعفر، تازہ دم لشکر جرار لئے ہم بھی رہیں گے موجود۔
کوئی رخنہ کہیں دیکھا تو وہیں پہنچیں گے

(منظر بدلتا ہے، توپوں کے گڑگڑانے کی آوازیں۔ آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

سراج الدولہ، ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں کاظم!

کاظم، حضور میر مدن رہ گئے تن تنہا
پلٹ کے آنے لگی ہے فرنگیوں کی سپہ

سراج الدولہ: میر جعفر کھڑے کیا تکتے ہیں؟

کاظم: ان کا لشکر بھی ہے چالیس ہزار

سراج الدولہ: میر مدن کی جنگ تو دیکھو گورے بگٹٹ بھاگ رہے ہیں

کاظم: میمنہ خالی نظر آتا ہے لیکن سرکار۔

سراج الدولہ: غم نہیں میر مدن کافی ہیں

کاظم: میر جعفر بھی جو اب آگے بڑھیں

سراج الدولہ: ہم انہیں کہتے ہیں (گھوڑا دوڑا کر میر جعفر کے پاس پہنچتے ہیں)

وقفہ

سراج الدولہ: (میر جعفر سے) چچا جان آپ سے درخواست ہے اب آگے بڑھیں

آپ کیا دیکھ رہے ہیں یہیں تنہا تنہا
اب تو گوروں کی سپہ ہونے لگی ہے پسپا

میر جعفر: آپ بے فکر رہیں، قلب سنبھالے جائیں
آخری ضرب لگاتے جائیں

سراج الدولہ: آپ، اور آپ؟

میر جعفر: ابھی بڑھتے ہیں بس بڑھتے ہیں۔

(سراج الدولہ گھوڑا دوڑا کر واپس اپنے لشکر میں آتے ہیں)

سراج الدولہ: دوستو آگے بڑھو، آگے بڑھو جم کے لڑو
پاؤں دشمن کے اکھڑنے لگے، شاباش بہادر بیٹو!

ایک مجاہد، حضور میر مدن ہو گئے وطن پہ نثار!

سراج الدولہ: آفریں باد بریں ہمت مردانہ او
ایسے جانباز کہاں ملتے ہیں
(گھوڑا دوڑا کر میر جعفر کے پاس پہنچتے ہیں)

سراج الدولہ، آپ کیا دیکھ رہے ہیں عمو؟
ہو چکے میر مدن بھی تو شہید!
گورے پسپا ہوئے جاتے ہیں خدارا عمو!
آپ اب آگے بڑھیں حملہ کریں

میر جعفر: گورے پسپا ہوئے جاتے ہیں یہ کیسے جانا؟
تم نے اب تک نہیں پہچانا؟

سراج الدولہ، عمو جان! آپ یہ کیا کہتے ہیں؟

میر جعفر: ہم نہ کہتے تھے لڑائی نہ کرو
شکر ہے دیکھ لیا تم نے یہ اپنا انجام
کس بھروسے پہ چلے آئے تھے لڑنے مرنے
ہم نہ کہتے تھے چلو صلح ہی کر لو ان سے۔

سراج الدولہ: تجھ سا غدار و سیہ کار نہ کوئی ہوگا
تو کہ مردوں کی شہادت کا اڑاتا ہے مذاق
ننگ دیں، ننگ وطن، ننگ وجود
ملک و ملت کا بھرم بیچ کے اتراتا ہے!؟

میر جعفر: سر پھرے چھوکرے کیا بکتا ہے
تخت بنگال پہ بیٹھوں تو سہی
(اہل لشکر سے) دوستو جنگ تمہیں جیتنا ہے
آؤ، احباب کی جانب آؤ
دیکھتے کیا ہو، بڑھو آگے، بلاتے ہیں تمہیں......

(میر جعفر گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہے اور اس کے ساتھ چالیس ہزار کا لشکر گھوڑوں کی باگیں اٹھائے پیدل انگریزی کیمپ کی طرف بڑھتا ہے)

سراج الدولہ: (خود سے) جنگ ہم ہار گئے!
آج غدار وطن جیت گئے
اب یہاں پر ہے ٹھہرنا بے سود
اے پلاسی مری قسمت کے گواہ
شام تک آج جو بہے نور کے دھارے کیا کیا
کر گئے اپنے سبھی جانباز ہمارے کیا کیا
آنے والوں کو سنانا تو کہانی میری

ہر جگہ گردار کی مٹی ہے نشانی میری

منظر

(کافی رات بیت چکی ہے۔ سراج الدولہ ایک جنگل میں بھٹکتا پھر رہا ہے کہ اسے دور سے ایک فقیر کی کٹیا نظر آتی ہے جس میں چراغ جل رہا ہے)

سراج الدولہ: سائیں جی! سائیں جی!

فقیر: کون ہے بے؟

سراج الدولہ: سائیں جی آپ کواڑ یا کھولیں

فقیر: (آہستہ سے جیسے پہچان کر خوش ہو گیا ہو) اٹھیں نواب سراج الدولہ! (بلند آواز سے) کون ہو تم؟

سراج الدولہ: سائیں جی پانی، خدا را پانی!

فقیر: آؤ نا پانی پیو، شوق سے تم پانی پیو۔

(سراج الدولہ پانی پی کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں)

سراج الدولہ: شکر ہے ربِّ کریم!

فقیر: کون ہو تم؟

سراج الدولہ: ایک درماندہ مسافر بابا!
اک بھٹکتی ہوئی روح!

فقیر: ہوں!

سراج الدولہ: ایک ڈھلتا ہوا سایہ ہوں کسی لمحے کی دم توڑتی پرچھائیں ہوں!

فقیر: راستہ بھول گئے ہو شاید

سراج الدولہ: ایک میں ہی نہیں بھولا بابا
آج سب لوگ ڈگر بھول گئے!

فقیر: لوگ، وہ لوگ کدھر ہیں بیٹا؟

سراج الدولہ: چھوڑو چھوڑو بھی وہ خود ڈھونڈ کے راہ پہ آجائیں گے،

فقیر: تم انہیں اٹھ کے پکارو تو سہی،

سراج الدولہ: میں بہت دور نکل آیا ہوں
درمیاں وقت کی دیوار ابھر آئی ہے
سامنے صدیوں کا پھیلا ہوا سُونا بن ہے

فقیر: تم انہیں اٹھ کے بلاؤ تو سہی

سراج: میں بلاتا رہا برسوں ان کو
میں نے اٹھ اٹھ کے صدا دی سب کو

کون سنتا ہے یہاں کون کسی کی آواز؟

فقیر: رات ہے، کتنے ہی بٹ مار یہاں پھرتے ہیں

سراج الدولہ: اب یہاں رات رہے گی بابا!
کتنے بٹ مار پھریں گے آزاد

فقیر: تیرے کپڑوں پہ یہ خون کیسا ہے؟
قتل کر کے تو نہیں بھاگے ہو؟

سراج الدولہ: نہیں بابا، مجھے بٹ مار ملے تھے رہ میں
لڑتا بھڑتا انہیں لوگوں سے یہاں پہنچا ہوں

فقیر: مرحبا! کتنوں کی ٹولی تھی وہ؟

سراج الدولہ: گرگ بندی کا سمے تھا بابا

فقیر: اچھا اب آرام کرو

سراج الدولہ: سائیں جی، اب مجھے جانا ہوگا

فقیر: تم یہیں ٹھہرو میاں،
زخم بھر جائیں تو پھر گھر جانا
یہ تو درویش کا استھان ہے خطرہ کیسا
اس طرف آن کے بٹ مار بھلا کیا لیں گے
اچھا اب سو رہو
باتی بھی ہے بجھتی جاتی ....

(آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

منظر

میر جعفر کا کیمپ

(میر جعفر بھنگ نوش کر رہا ہے)

میر جعفر: جانے کیا بات ہے رنگم بھائی

رنگم: جے مہاراج کی دھن ہو سرکار!

میر جعفر: اب تو نشہ بھی نہیں ہوتا ہے

رنگم: نشہ تو ہوتا ہے دھیرے دھیرے

میر جعفر: من کو تسکین جو حاصل ہو تو رنگم بھائی

رنگم: اب تو کھٹکا نہیں رہا کوئی

میر جعفر: ابھی زندہ ہے سراج او رنگم
خون اس کا جو پیوں، نشہ ہو

رنگم: بوٹی تانبے کی پتیلی میں پکائی ہے جناب

میر جعفر: اب فلک سیر سے کیا ہوتا ہے
رنگم: ساغرِ سبز پئے ہیں کتنے
میر جعفر: گن کے پیتے نہیں پینے والے
رنگم: آپ تو پورے ولی اللہ ہیں
شانت ساگر کی طرح مست سبھل

میر جعفر: تپش دل جو مٹے،
رنگم: بجھ گئی آگ تو پھر راکھ ہیں ہم
میر جعفر: آگ اوہ آگ۔ مگر.......
گھول کر ایک پیالے میں کچھ افیون تو دے
تین تولے سے نہ کمتی ہو مگر
رنگم: ایسے درویش گنی لوگ کہاں ملتے ہیں
میر جعفر: تو نے پی کتنی بتا
رنگم: چانڈو چکھا تھا مگر لطف نہ آیا سرکار
ایک دو گھونٹ لئے سلفے کے
میر جعفر: اور افیون؟
رنگم: یہی دو تولے، مہاراج کی جے
میر جعفر: ساتھ دو گے نہ ہمارا رنگم
رنگم: ساتھ کیا دیگی کرن سورج کا
بندہ قطرہ تو سوامی جی سمندر ٹھہرے
پھر یہ گستاخی بھی ہے
میر جعفر: بھائی افیون تو مشروب ہے اوتاروں کا
دیوتا اس کی بدولت ہی جواں رہتے ہیں
سوم رس کیا ہے وہ افشردۂ افیوں ہی تو ہے
دیویاں پوست کے پھولوں کا عرق پیتی ہیں!
پدمنی رانیاں افیون پہ ہی جیتی ہیں!
کھیت لالے کا ہے تم جس کو شفق کہتے ہو
رنگم: یہ پرم پور پیالہ لیجے
میر جعفر: سنو کچھ گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا آتی ہے،
دیکھو میرن یا کوئی اور ہے
رنگم: کوئی ہو، آپ یہ امرت، یہ مہاجل تو پئیں
ایک سنجوگ سبھا ہے دنیا

ایک سنتاپ سنگھاسن ٹھہرا
میر جعفر: لطف و عالیہ بھی تو گم ہیں
رنگم: وہ بھی یدھ کرنے کو........
میر جعفر: اتنا معلوم ہے میداں میں تھیں دونوں موجود
رنگم: عالیہ ہو وے جو بندے کو عطا
میر جعفر: ہم یہ سنتے ہیں کہ تم ہندو ہو
رنگم: یہ بھی کیا بات ہوئی
میر جعفر: وعدہ رہا
کہنے کو عالیہ لونڈی ہے مگر
چاند سورج کو بھی شرماتی ہے
رنگم: چھوٹے سرکار چلے آتے ہیں
میر جعفر: ساتھ وہ خود سر و مغرور جواں ہے کہ نہیں؟
رنگم: کوئی بھی ساتھ نہیں
میر جعفر: اپنے مخدوم کلائیو سے ملیں گے کیونکر
(میرن داخل ہوتا ہے)
میرن: ابا حضرت آداب!
میر جعفر: خالی ہاتھ آئے ہو شاید بیٹے،
میرن: حضور ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر آج تھک گئے ہیں
گلی گلی ایک اک مکاں ہم نے چھان ڈالا
تمام ایواں کے فرش تک ہم نے کھود ڈالے
گماں یہی ہے کہ مرشد آباد سے کہیں اور جا چکا ہے
میر جعفر: ہمارے مخبر قدم قدم پر چھپے ہوئے ہیں
فقیر، ماجھی، تعلقہ دار، پرگنوں کے مہنت، مکھیا
ہمارے انعام یافتہ ہیں،
رنگم: حضور سے راج پال دھرتی یہ اب کہاں ہیں؟
مگر پیالہ نہ پیجئے گا؟
میر جعفر: پیاس تو ہے
میرن: حضور دیکھیں وہ کوئی بھیک منگا آ رہا ہے
میر جعفر: دیکھو، ممکن ہے کوئی اپنا ہی آدمی ہو
رنگم: کوئی اسرار ہے اس میں سرکار
میر جعفر: تم پیالہ پیو۔ گھبراؤ نہیں،

(فقیر اندر داخل ہوتا ہے)

فقیر: تسلیم حضور!

میر جعفر: سائیں جی! کوئی خبر؟

فقیر: تھک گیا ظلِ الٰہ!

میر جعفر: بیٹھے درویشوں کی عزت نہ کروگے —

میرن: سائیں جی آپ ادھر آ بیٹھیں
تکیہ حاضر ہے

میر جعفر: لوٹی، افیون کہ سلفہ، ارشاد!

فقیر: پہلے انعام ٹھہر جائے تو پھر بات بھی ہے

رنگم: دھن مہاراج مبارک.....

میر جعفر: ہار سونے کا یہ حاضر ہے —

فقیر: تین دن ہونے کو آئے سرکار
میری کٹیا میں ہے ٹھہرا مہمان
آپ کا خاص شکار!

میر جعفر: پہلے دن ہی یہ خبر دی ہوتی

فقیر: بدگماں ہو کے نکل جاتا تو پھر کیا ہوتا

میر جعفر: تم سمجھ دار ہو، دانا ہو فقیر

رنگم: کام آتے ہیں فقیروں کے فقیر

میر جعفر: میرن بیٹے!

میرن: شیر بنگال!

میر جعفر: وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا!
جاؤ اور کام کرو

میرن: ظلِ الٰہ!

رنگم: یہ ہے وہ آپ کے بھائی نے جو بھجوائی ہے
اپنے ہاتھوں سے مہاراج ہی بوتل کھولیں
پی کے دیکھیں تو سہی

میر جعفر: بھئی افیون دو، افیون، خدارا افیون
بیٹھے ہی بیٹھے بہک جاتے ہو اب تو تم بھی
آبِ افرنگ وہی چائے کا رنگ
اور پھر ہم تو مسلمان ہیں، مومن، دیندار
کب بھلا پیتے ہیں افرنگ کی ناپاک شراب

(عرصۂ دراز کے بعد)

چاندنی رات ہے، خاکِ شہدا ہے، میں ہوں
ایک خوشبو سی رگ و پے میں رچی جاتی ہے،
درد کی دولتِ بیدار عطا ہوتی ہے
ہائے یہ خاک، یہ خلوت گہہِ خونیں کفناں!
مشہدِ عشق و وفا، کعبۂ صاحب نظراں
دور شمعوں کی نظر تاب قطاریں، جگنو
مست و سرشار فضاؤں سے یہ رحمت کا نزول
ساحلِ بحر سے آتی ہوئی مخمور ہوا
ایک تقدیس و مسرت کی فضا
میں ہوں اور سامنے مٹتی ہوئی قبروں کے نشاں
ولولہ خیز، جنوں ساز، مہکتی مٹی
چھٹ گئی گردِ ملامت، وہ کدورت کا غبار
اب کہاں "تہمتِ مشہور" ۔ مگر کون ہیں یہ؟
کون ہیں کون یہ خوش وقت، یہ زیبندہ خرام؟
خلوتِ شب کو جگاتی ہوئی معصوم ہنسی
روئے پُر نور پہ چھایا ہوا شاداب سکوں
میں ذرا اوٹ میں ہو جاؤں، سنوں
گفتگو جیسے فرشتوں کا زمینوں پہ درود
جیسے پھولوں کی طرف چاند ستاروں کے سلام
جس طرح راج کنول تال پہ بوندوں کی ملار

ایک آواز: آج آزاد ہے میرا بنگال!
آج سرسبز ہے شاداب ہے صحرائے خیال
آج ہر لمحہ نئی صبح کا لاتا ہے پیام
آج ہر شام کی آغوش میں ہے ماہِ تمام

زنانہ آواز: خوب ہے اپنی شہادت کا مآل

پہلی آواز: ملکۂ عالیہ آزاد ہے اپنا بنگال!
اب نہ وہ ظلم کے دن ہیں نہ ستم کی راتیں
رات آتی تھی تو بے جام و سبو آتی تھی
دن کو پھولوں سے بھی بارود کی بو آتی تھی

باقی ص ۱۲۷ پر

کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا!

اے، ایم، یزدانی

تقریر کرنے کا شوق کسے نہیں؟ ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسٹیج پر جا دھمکے اور ایک آدھ تقریر جھاڑ دے۔ خواہ وہ دل ہی دل میں خوب جانتا ہو کہ وہ قوت تقریر میں دوسرا امریڈ پور کا پیر ہے اور منہ سے ایک دو بول نکلنے تو کیا، اسٹیج پر جاتے ہی گھگھی بندھ جائیگی۔ بہے ہاتھ پاؤں تو مارے کپکپی کے ان کا جانے کیا حال ہو۔ اور پھر ہم تو پروفیسر ٹھہرے۔ یعنی پیشہ ور مقرر۔ خواہ طلبہ ہی کے سامنے سہی، اور آپ جانیں اپنی گلی میں انسان کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر شہرت تو ہر انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مدعا یہ کہ ہمیں بھی پبلک میں تقریر کرکے نام پیدا کرنے، اور جیسا کہ آج کل ہر کوئی چاہتا ہے، لیڈر بننے کا شوق تھا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم جلسہ میں پہنچے بھی تو بہ تاخیر پہنچے۔

حریفاں جادہ ہا بردند و رفتند اور بڑی دھوم دھام سے دھنواں دھار تقریریں جھاڑ دیں۔ اور سچ پوچھئے تو ہمارا نام نامی اور اسم گرامی مقررین یعنی اپنے مظاہروں سے اہل محفل کو حظِ خاطر بہم پہنچانے والے محفل طرازوں کی فہرست میں شامل نہ تھا۔ جو اس روز یعنی شام یا شب کے چشم و چراغ تھے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! اور پھر ہماری شومئی قسمت یا شامتِ اعمال سے، جو بھی آپ کے خیالِ شریف میں آئے —— وہ شام بھی بڑی گرم۔ بلا کا اُمس تھا۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس کے باعث نمازِ مغرب میں دیر ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا پاس ہمارے عزیزانِ وطن سے زیادہ اور کس کو ہے، خواہ وہ ظاہرداری کی بناء ہی پر کیوں نہ ہو۔ اس لئے چاروں طرف "مغرب مغرب" کا غل برپا ہو گیا۔ اور ہم —— آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے! —— یعنی صاحب صدر نے بکمال احساس ذمہ داری یہ اعلان کر دیا کہ اب "قومیت اور نصب العین" کے مسائل گوناگوں پر یہ دلچسپ مذاکرہ ختم ہوتا ہے۔ اور ہماری حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ نہ ایک چھوٹا سا پرچہ دست بدست بھجوانے کے باوجود جناب صدر نے مجھے بلایا اور نہ میں جا سکا، نہ کچھ کہہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں مرگ آرزو پر فاتحہ پڑھی اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو رہا مگر جو آگ دل میں سلگ رہی تھی وہ سلگتی ہی رہی!

یہ تسلیم کہ اس محفل میں بڑے بڑے علماء و فضلاء، سیاست داں، مدبر اور خدا جانے کیا کیا کچھ موجود تھے۔ اور انھوں نے اپنی ہمہ دانی اور آتش بیانی کی خوب داد دی مگر ایک فرد کی دلی تمنا بھی کچھ وقعت رکھتی ہے۔ اور پھر ایسے فضلا و اکابر میں۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ اگر میں بھی لہو لگا کر شہیدوں میں نام پیدا کروں تو کیا برا ہے۔ زیادہ نہیں تین چار منٹ ہی سہی۔ مقررین نے اپنے اپنے خطبات عالیہ میں سر سید، بیکن، آرنلڈ اور خبر نہیں کن کن مشاہیرِ عظام کا ذکر کیا تھا۔ اور ہم بھی تھے آخر انگریزی کمپوزیشن کے معلّم اور وہ بھی انٹرمیڈیٹ اور ایک حد تک بی اے جیسی اعلیٰ جماعتوں کے، اور ایک بڑے ممتاز کالج میں۔ پھر ہم تو تھے ڈنکے کی چوٹ پانچوں سواروں میں۔ مدرس کی حیثیت سے تو مجھے بہت کچھ سننا پڑتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا مگر کسی قدر فرق کے ساتھ اور خوشگوار فرق کے ساتھ کہ جلوہ ان کا باقی سب کچھ میرا تھا۔ یعنی استفادہ ہی استفادہ۔

میں تو تقریر کے لئے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ مگر وائے قسمت! مجھے اس کی اجازت ہی نہ مل سکی۔ میں حاضرین یا منتظمین کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ حضرات! جب میں نے اس موقر دعوت نامہ کو کھول کر پڑھا تھا تو مجھے اس سے کچھ دھن پانے کی توقع ہوئی تھی۔ کیونکہ اسمیں لکھا تھا: "ازراہ کرم اس دستاویز کو اپنے ساتھ لائیے۔" اور یقین جانئے میں اس اہم دستاویز کو

بڑی احتیاط سے اپنی جیب میں ڈال کر لایا تھا۔ یہ تو ہے کہ مجھے اس موقع پر کچھ زیادہ کہنا نہیں تھا۔ کوئی بڑی بات یا کام کی بات، خصوصاً ایسے عالم فاضل لوگوں کے مجمع میں۔ اور نہ میں آئیں بائیں شائیں سے کچھ زیادہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ جب میں اسٹیج پر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں تو جو چیز میرے آڑے آتی ہے وہ پبلک کی ہڑبونگ یا ہاؤ ہو نہیں اور نہ یہ کہ میں نے کہیں تقریر نہیں کی اور میں اس فن سے بے بہرہ ہوں بلکہ میری اور حاضرین کی بدنصیبی سے میری تمام سابقہ تقریریں پادر ہوا یعنی سیدھے سادے لفظوں میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ یہ نہیں کہ مجھے فصاحت و بلاغت کے گر نہیں آتے۔ بلکہ میری آتش بیانی کی نوعیت کچھ اور ہے یعنی جلوت کی بجائے خلوت میں گوہرفشانی۔ ایک دفعہ سارا مجمع چھٹ کر خلوت ہو جانے دیجئے۔ پھر اکیلے میں دیکھئے انداز گل افشانی گفتار!

بعض اوقات جب میں رات یا صبح سویرے بالکل اکیلا ہوتا ہوں تو ایک ایسے شخص کو جو میرے سامنے موجود نہ ہو بڑے زور شور سے خطاب کر سکتا ہوں۔ خواہ وہ کوئی نامی گرامی ڈکٹیٹر، وزیر، سفیر، سیاستدان یا ـــــ وائس چانسلر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر میں یہ دیکھوں کہ اس کے کام میں کوئی کسر ہے تو اسے ایسا لکچر پلاؤں، ایسا لکچر پلاؤں کہ سٹی گم ہو جائے۔ میں اسے للکار کر کہتا ہوں "جناب والا! عام لوگ آپ کے یہ بڑے بڑے نصب العین کیا جانیں۔ مگر وہ یقیناً اس بات کی قدر کریں گے کہ آپ ان کے کچھ کام آئیں، ان کی خدمت کریں، ان کے لئے کچھ ایثار کریں۔ آپ کچھ اپنے پاس رکھ کر کھوتے ہیں، دوسروں کو دے کر پاتے ہیں" ایسا ہی ایک اور خلوت کا لمحہ تھا جب میں ایک بہت بڑے سیاستدان سے کہہ رہا تھا "حضور والا! اگر جناب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت کے سردار ہیں تو شراب اور دوسرے فتنوں کی ممانعت کیوں نہیں کرتے؟ اس سے تو ہمیں بہت بہتر شہری ہاتھ آئیں گے"۔

ایک اور روشن خیال صاحب صدر نے ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے بارے میں جو فصیح و بلیغ تقریر فرمائی تھی وہ میرے سمند تقریر کے لئے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ مگر وہ بھی حسب معمول خلوت ہی میں۔ میں نے کہا "جناب بے شک نیم عریاں رقص کے شوق میں سر تا پا غرق ہیں۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مگر کیا آپ نے کبھی ان بے شمار بھوکے ننگے، غریب، نادار، حاجت مند، خستہ حال لوگوں اور بیماری کے مارے انسانوں اور بچے بچیوں کا تصور بھی کیا ہے جو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں؟ اگر ہم ان کی حالت کو سنوار نہیں سکتے تو ہماری ثقافتی سرگرمیاں اور جمہوری ہمدردیاں کس کام کی؟ ٹھیک ہے، تمام بڑے بڑے لوگوں کی طرح آپ کا یہ خیال کرنا کہ انسان صرف روٹی ہی سے زندہ نہیں رہتا۔ مگر یہ بھی کیا کہ ہم بالکل گھسے پٹے فلمی گانوں اور راک این رول جیسے ناچوں کے ہو رہے ہیں۔ آخر ہماری قوم کو جوانمرد، اور باہمت انسانوں کی بھی تو ضرورت ہے۔ کیا ان کے متعلق کسی نصب العین کی ضرورت نہیں؟"

میں کرسی پر بیٹھا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اور میرے کان ٹیلیفون کی گھنٹی پر لگے ہوئے تھے۔ گھنٹی بجی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ انہی بڑے صاحب یعنی صاحب صدر نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ اور میں تھا کہ بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ انہوں نے کیا فرمایا۔ اور میں نے اپنی تقریر یہی کہہ کر ختم کر ڈالی کہ "بہت خوب جناب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ" اور ان صاحب کے پی اے نے مجھے بعد میں بتلایا کہ انہوں نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ میں نے ان کو بھی دوسرے بڑے بڑے افسروں کی طرح اپنے ہی انداز میں مخاطب کیا: "جناب کی تعلیم کو فروغ دینے کی بے لوث کوششیں بے حد قابل ستائش ہیں۔ مگر ہمیں اساتذہ کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہاں تو ایسے موقعوں پر میری چرب زبانی کے کیا کہنے۔ اور یقین جانئے کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو میں اسے ایسی بے بھاؤ کی سناتا ہوں، ایسی بے نقط، بے پناہ کہ اچھی بڑی بھٹیارنیں بھی مات ہو جائیں مگر خواہ ایک دو ہی آدمی سامنے بیٹھے ہوں، میرے گلے سے کچھ ایسی خرخر کی سی آوازیں نکلنے لگتی ہیں جیسے دم نزع گھنگرو بول رہا ہو۔ اس لئے یہ یوں نہ ہو کہ تقریر کے بجائے تحریر سے[1] الو سیدھا کیا جائے۔ جیسا کہ اب کر رہا ہوں خدا راس لائے!

تو جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دینا چاہتا ہوں وہ ہے۔ یقین۔ بڑے لوگ ہمیشہ ایک ہی جیسا سوچتے ہیں۔ علامہ اقبال رحمہ نے بھی تو یہی کہا تھا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اور بابائے ملت رحمہ نے بھی تو تنظیم، اتحاد، ایقان ہی پر

---

[1] تو کار زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی (ایڈیٹر)



اتحاد شرق و غرب

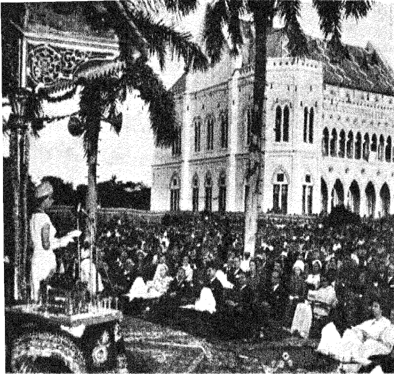
ہ برطانیہ، الزبیتھ ثانی کی پاکستان میں آمد ایک یادگار
ہے - فی الحقیقت عہد آفریں، وفاق پرور - وہ پہلی خودمختار
ہ ہیں جو دور آزادی میں ہمارے یہاں تشریف لائی ہیں،
ایسے حالات میں جبکہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی
کل کایا پلٹ ہو چکی ہے - ان کی آمد بلاشبہ خیرسگالی کے ایک نئے
خوشگوار دور کی تمہید ہے

آرائش: اپنے لئے نہیں مہمان کے لئے
"کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است"





شاہانہ خراج عقیدت (مزار قائد اعظمؒ پر):
بہ زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود



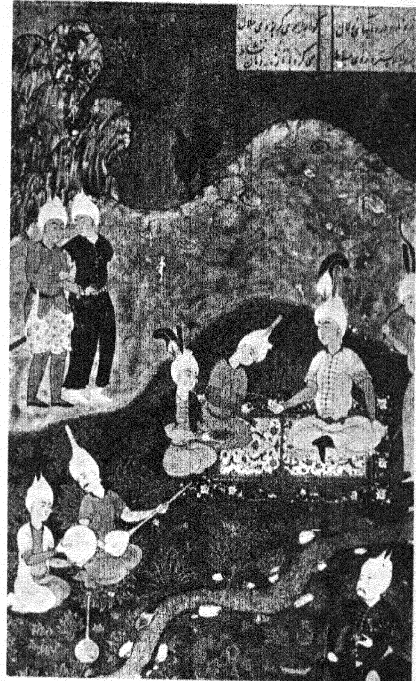
"آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ"
زہے اردو کی قدر و منزلت! ہماری شاہی مہمان کی جدۂ ماجدہ، ملکہ
وکٹوریہ اردو جانتی اور بولتی تھیں - ان کی موجودہ وارث نے
عوام پاکستان کے خیر مقدم (فریئر ہال کراچی) اور سپاسنامہ کا
شکریہ اردو میں ادا کر کے اپنی جدۂ ماجدۂ کی نمائندگی کا
حق ادا کیا ہے اور ہم پاکستانیوں کے دل میں گھر کر لیا ہے

"فنون لطیفۂ آزاد مرداں"

ایرانی مصوری سے مغل مصوری اور مغل مصوری سے پاکستان کے مایۂ ناز مصور عبدالرحمن چغتائی تک ایک شاندار روایت کا سلسلہ ہے جس نے ہمیں فن کے بہترین شاہکار دئے ہیں۔ پیش نظر مرقعات میں، جو ایک گذرے ہوئے دور کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں، ایرانی قلم کی ندرت کاری مشہور و معروف رزمیہ داستانوں کی توضیح و تشریح پر صرف ہوئی ہے



صید افگن



بزم نشاط



توسن چالاک

سب سے زیادہ زور دیا تھا ۔ اگرچہ یہ بڑے کہاں اور میں کہاں ــــــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ــ تو ہمارے ملی نصب العین کا ایک بہت بڑا جز یہی ہونا چاہیئے ۔ یقین ، جس سے معجزے صادر ہوتے ہیں معجزے ــ ہمیں یقین ہونا چاہیئے اور یقینِ محکم کہ ہم اپنی ملت کا مقدر بدل ڈالیں گے ۔

اچھا یہ تو ہوئی ایک بات ۔ دوسری وہ ہے جس پر ہمارے سربراہ قوم، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں ہمیشہ زور دیتے رہتے ہیں۔ محنت، مشقت ۔ کیونکہ یہی چیز ہے جو خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے ۔ محنت و مشقت اور صبر و استقلال سب مل کر ہمارے شہریوں کو بدرجہا بہتر بنا دیں گے ۔

اگرچہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری موجودہ زندگی محض اُخروی زندگی کا پیش خیمہ ہے ۔ اور میں تو کیا سارے مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے ۔ پھر بھی جیسا کہ ہمارے جہاں دیدہ صدر نے بارہا فرمایا ہے ، موجودہ زمانہ سائنس اور فہم و بصیرت کو کام میں لانے کا زمانہ ہے ۔ اور ہمیں محض عاقبت یا عبادت ہی پر ادھار کھائے بیٹھا نہیں رہنا چاہیئے ۔ "گفت حکمت را خدا خیر کثیر" پر بھی نظر رکھتے ہوئے نئی بصیرت اور نیا ذوقِ عمل پیدا کرنا چاہیئے ۔ تاکہ ہم توہم پرستی اور کٹرپن سے آزاد ہو کر دنیا میں ٹھیک طرح زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھیں ۔ اور زیادہ سے زیادہ ترقی کرکے اقوام عالم میں سرفراز ہوں ۔

کیا کیا جائے ، ناں خواہی نخواہی ہمارے پرانے سیاست دانوں ہی پر آکر ٹوٹتی ہے ۔ افسوس! وہ اپنا وقت پاکستان کو بام عروج پر پہنچانے کے لئے صرف نہ کرسکے ۔ اور جب ان کی نیتیں بخیر بھی تھیں ، تب بھی ان کے وار اوچھے ہی پڑے ۔ انہوں نے قوم ، اس کے مزاج ، اس کے ماحول ، اس کی ضرورتوں کو نہ سمجھا ۔ اور بڑے دوسری قوموں کی اندھا دھند ریس کرتے رہے ۔ بھلا مانگے تانگے کے خیالات اور طور طریقے کب تک کام آتے ۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ قوم کا صحیح نصب العین تلاش نہ کرسکے ۔ اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے ۔ کچھ ذاتی اغراض بھی آڑے آئیں اور نفسا نفسی نے افراتفری پیدا کی ۔ اس لئے مارشل لا کو میدان میں کودنا ہی پڑا ۔ آخر قوم دشمن لوگوں کے کرتوت کب تک ڈھکے چھپے رہتے ۔

آپ مجھ سے پوچھیئے معماران انقلاب کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے ۔ یہ کہ انہوں نے قوم کا صحیح نصب العین دریافت کیا ہے اور اس پر عمل کرکے دکھایا ہے ۔ جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں ۔ تعمیر و ترقی کی صحیح داغ بیل کہیں اب آکر پڑی ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر میدان میں بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگے ہیں ۔ چلئے گیارہ بارہ سال کے بعد ہی سہی ہم نے اپنا صحیح راستہ تو پالیا ہے ۔ سچی بات ہے ہم اپنے اسلاف کے کارناموں پر کب تک شیخی بگھارتے رہیں گے ۔ وہی پدرم سلطان بود والی بات ۔ کیوں نہ ہم خود کچھ کرکے دکھائیں ۔ صدر پاکستان برابر اس بات ہی پر زور دے رہے ہیں ۔ ہم کب تک خود کو لوریاں دے دے کر سلاتے اور پرانے زمانوں کے سپنے دیکھتے رہیں گے ؟ ہمارا زمانہ تو تمام تر ٹھوس، دیانت دارانہ ، وطن پرستانہ ، بے لوث منظم و متحدہ کوششیں بروئے کار لانے کا ہے ۔ یہ وہی راستہ ہے جسے ہمارے موجودہ سربراہ ہمیں دکھانے اور اس پر چلانے کی جد و جہد کر رہے ہیں ۔ ہماری نجات ، ہماری عظمت اور جاہ و جلال کا صحیح آہنگ یہی حرکیاتی ، یہی "جوہری آہنگ" ہے ۔ یہ نہیں کہ محض خالی خولی نقارے دھما دھم پیٹے چلے جائیں مگر گت سرے سے ہو ہی نہیں اور ہو بھی تو اینڈی بینڈی ۔

میری یہ خلوت میں کی ہوئی تقریر یہ خود کلامی بے تحاشا بڑھتی تو جا رہی ہے ۔ مگر چلئے ، لگے ہاتھوں ایک دو باتیں اور سہی ۔ یہ اصلاحاتِ اراضی ، یہ بنیادی جمہوریتیں ، یہ مشرق و مغرب کے ساتھ نئے نئے روابط اور دوستی و یگانگت کے مراسم درحقیقت پاکستان کے لئے ایک نئی نشاۃ الثانیہ کی نوید ہیں ۔ یہ بعینہٖ ویسی ہی بیداری کی لہر ہے ۔ جو چودہویں اور سولھویں صدی عیسوی میں جرمنی ، فرانس ، اور انگلستان پر چھا گئی تھی ۔ خیال کیجئے دو سال پہلے کیا نقشہ تھا ۔ افراتفری ، سیاسی منافقتات ، صوبہ پرستی ، تعصب اور ہوسِ اقتدار ۔ انہوں نے ہمارے معاشرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور دنیا ہمیں دیکھ دیکھ کر ہنستی تھی ۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ۔ انقلاب ہمارے لئے جہان تازہ کی نوید بن کر آیا ۔ اور اس نے چند ہی دنوں میں ایسی وسیع اور دوررس اصلاحات صادر کرکے دکھا دیں کہ ملک کی کایا ہی پلٹ گئی ۔ اس کا نتیجہ ہے ایک نیا شعور ، نئی ذہنیت ، نئی بصیرت ، نئے مقاصد ، نئے عزائم ۔ اصلاحات اراضی نے ہر انسان کو آزادی فکر و عمل بخش دی ہے ۔ بنیادی جمہوریتیں انسانی طاقت کے احیاء اور گرد و پیش کی دنیا کی آگاہی کی مترادف ہیں ۔ ہماری ثقافتی اور علمی و ادبی سرگرمیاں ایک دم تیز ہو گئی ہیں جس

باقی صـ ۱۳۲ پر

جبینِ اُفق پر

سیّد فیضی

گھنٹیوں کی چھنک، بڑھتے قدموں کی چاپ
آج بھی نغمہ زن، آج بھی تیز ہے
مجھ کو احساس ہے جیسے دامن مرا
ہنستی کلیوں کے جوبن سے لبریز ہے

ایک میں ہی نہیں ——
خشک پتّوں کی مردہ رگوں نے سُنیں
دھڑکنیں!!
زندگی کے تقاضوں کی خوش فہمیاں
زندگی کے تقاضے مچلنے لگے
گرتے گرتے قدم پھر سنبھلنے لگے
اور —— اُمید نے بھی سہارا دیا
ورنہ میں تھا کہ برسوں بھٹکتا رہا
کامرانی کے ساحل سے دور ——
اپنی منزل کے پاس، اپنی منزل سے دُور!

کس نے انگڑائی لی ——
کون سو کر اٹھا خوابِ پندار سے
اک زمانے کی آنکھوں نے تعظیم کو
اپنی پلکیں بچھا دیں سرِ رہگذر
اور سر جُھک گئے ——
بے کلی جو بھرے گھر کی مہمان تھی
آپ سے آپ چُھپ چھپ کے رخصت ہوئی
بے صدا، بے خروش!
مضمحل، سرفگندہ، اُداس اور خموش!
بڑھتے سورج نے پھیلا دئے ہر طرف
اپنی رنگیں شعاعوں کے جال ——
شام آئی تو وہ بھی نئے روپ میں
سرمئی سج دھج اور احمریں شوخیاں
مشک آلودہ زلفیں بکھرنے لگیں
چند کرنیں ازل سے جو تھیں زرفشاں
اپنی تابانیوں میں نکھرنے لگیں

گھنٹیوں کی چھنک سے فضا مست ہے
بڑھتے قدموں کی چاپ اور قریب آ گئی
دل کے دروازوں نے ہاتھ پھیلا دئے
آنے والوں نے مہکا دئے
نغمۂ آزادیوں کے، دلوں کے چمن!
زندگی نے بھی بدلا نیا پیرہن
ٹوٹنا تھا طلسمِ نظامِ کہن
دیکھنے والو! دیکھو ذرا غور سے

وہ اُفق کی رو پہلی جبیں پر کہیں
کیا سحر کا ستارہ تو روشن نہیں؟

"زیرِ دام"

(انقلاب سے پیشتر کا ایک تاثر)

چوہدری فضل حق

یہ سرمگیں بحر کا کنارا   یہ قربتِ ریگ زارِ دریا
یہ نیلگوں وسعتوں کے دامن   ہیں جن کے پہلو میں آشکارا
مزاجِ فطرت کے سب کرشمے   سپردِ نظارہ پارا پارا
عجب مقام آگیا ہے ہمدم
ہے دل کو فکرِ جہاں گوارا

یہ آج معلوم ہو سکا ہے
یہ راہیں کچھ لابدی نہیں ہیں
عجب مقام آگیا ہے ہمدم
کہ ہم خدا کے بہت قریں ہیں

۲

جو دل کو ڈستی تھیں ناگ بن کر   وہ وحشتیں دور رہ گئی ہیں
وہ رہگذاریں کہ جن پہ مردہ   ثقافتیں نعش سی پڑی ہیں
طویل ناخون و پارسا رو   گِدوں کا سامانِ زندگی ہیں
وہ رہگذاریں کہ برق دامن   ہر اک نظر میں چمک رہی ہیں

۳

کلفٹن سحر آفریں ہیں   قدم قدم جنتیں بسی ہیں
قدم قدم مانگ مانگ روشن   بتانِ زہرہ جبیں کھڑی ہیں
قدم قدم زندگی کی باہیں   خوشی کے شانوں کو چھو رہی ہیں
قدم قدم دھڑکنیں دلوں کی   بنائے رفتارِ زندگی ہیں
قدم قدم زلف و پیرہن نے   جمال گاہیں سنوار دی ہیں

قدم قدم مثلِ انجم تاں   ہیں خاک کے جسم نور افشاں

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

۴

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

کہ ایک مرہونِ غم نظر بھی   کنارِ دریا کے پار اترتی

جہانِ غم کے جگر جگر کو   کرن کرن سے نگار کرتی

بکھیرتی دُور دُور مستی   نفس نفس کامراں گذرتی

حسینۂ خواب کی طرح سے   طبیعتوں میں شباب بھرتی

فضا پہ اس طرح حکمراں ہے

کہ جیسے یہ شام جاوداں ہے

یہ غمزدہ راز داں نگاہیں   یہ پھیلتی زندگی کی باہیں

یہ مہ جبینیں یہ کم ادائیں   کہ زندگی کو ادب سکھائیں

الم کشوں کو وہ دیں ارادے   کہ جو ستاروں کو چھین لائیں

وہ سیرگاہیں جہاں پہنچ کر   چمن جبینوں کی شوخ ادائیں

حیاتِ غم دیدہ سے بچا کر   انہیں کوئی داستاں سنائیں

ہر اک ادا داستانِ پیہم

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

۶

بصد ادب سجدہ کر کے اے دل   یہ داستاں آفریں ساحل

ہمارے ویرانۂ جہاں میں   ہے مثلِ رنگِ بہار شامل

پگھل گئے ہیں یہاں پہ آکر   الم فزا آہنی سلاسل

شعورِ انساں فراغتوں کے   نئے تصور ابھارتا ہے

نئی حیات آفریں نظر سے   نگاہ و گیسو سنوارتا ہے

تھی مدتوں سے تلاش جس کی

نگاہ و تخیّل و جاں کو باہم

وہ برق خو، تیز گام لمحہ

بزیرِ دام آگیا ہے ہمدم

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

○

شہ رود

رئیس امروہوی

چل اے دل! بسوئے شہرِ جانانہ چل
بصد شیوہ ہائے مستانہ چل

یہی ہے تقاضائے خواب و خمار — سوئے ارضِ افسون و افسانہ چل
یہی ہے تمنائے شعر و شباب — سوئے خاکِ مہتاب و میخانہ چل
بہ تعمیلِ منشورِ مے خانہ اٹھ — بہ تعمیلِ پیمان پیمانہ چل
مبارز طلب ہیں حوادث تو کیا — رجز چھیڑ کر رزم خواہانہ چل
مصائب ہیں ہنگامہ آرا تو ہوں — علم کھول کر فتحمندانہ چل
جو مقصودِ خاطر ہے تنہا روی — تو آزاد و تنہا و بیگانہ چل
جو تنہا روی کا سلیقہ نہ ہو — تو انجان راہوں میں تنہا نہ چل

اٹھا دلق و کشکول و کاسہ اٹھا
قلندر صفت چل، فقیرانہ چل

دف و چنگ و طاؤس و طنبور و نے — بہ قانونِ شہ رود و شاہانہ چل
شتربانِ لیلیٰ کو زحمت نہ دے — رہِ شوق میں بے نیازانہ چل
ابھی منزلیں منزلوں تک نہیں — ابھی دور ہے شہرِ جانانہ چل
ابھی حسن کی خیمہ گاہیں کہاں؟ — ابھی اور ویرانہ ویرانہ چل
ابھی شہرِ خوباں کی راہیں کہاں؟ — ابھی اور بیگانہ بیگانہ چل
جبل در جبل دشت در دشت ابھی — جواں مردِ کہسار، مردانہ چل
وہ بنتِ قبیلہ نہ ہو منتظر — ذرا تیز اے عزمِ مردانہ چل
وہ سلمائے صحرا نہ ہو مضطرب — رہِ دوست میں عذر خواہانہ چل
حریفوں کی چالوں سے غافل نہ ہو — کٹھن وادیوں میں حریفانہ چل
غزالوں کی آبادیاں ہیں قریب — غزل خوانیاں کر غزالانہ چل

بہت اجنبیت ہے اس شہر میں
چل اے دل! بسوئے شہرِ جانانہ چل

چشمۂ سحر

جعفر شیرازی

مہکتے، ہنستے ہوئے موسموں کی چاہت میں
چنے تھے شاخِ بہاراں سے رنگ رنگ کے پھول
روش روش پہ خزاؤں نے جو بکھیری تھی
ہمیں نے دھوئی تھی آئینۂ چمن سے وہ دھول
مگر یہ کیا؟ وہ نقیبِ بہار بھی نہ رہے
حیات جن کے تبسّم کا نام تھی نہ رہے!
اور اُن کو سونپی گئی برگ و بار و گل کی کلید
گرے جو آپ ہی شاخوں پہ خوشہ چیں ہو کر
جنہیں سمجھتے تھے ہم اہلِ درد وہ بیدرد
رہے خود اپنوں میں بھی مارِ آستیں ہو کر
طلسم ایسے خداؤں کا بھی مگر ٹوٹا
شبِ سیاہ گئی چشمۂ سحر پھوٹا
وہ دورِ مرگِ حمیت سے تھی بقا جس کی
وہ دورِ کہنہ ہوا ختم، انقلاب آیا
اُمڈ رہی تھیں جو سطحِ فرازِ دوراں پر
گئیں وہ تیرگیاں نورِ آفتاب آیا
نظر کے سامنے ضو ہے چمکتے جادوں کی
دمک رہی ہیں جبینیں اٹل ارادوں کی

اعتبارِ قوم

مشتاق مبارکؔ

آج میں ہوں اور لبوں پر ذوقِ استفسار ہے
شعلہ اندر شعلہ ہے کس کی حیاتِ آتشیں؟
کس کے پیکر میں حرارت ہے کہ ہے عینِ حیات
پھونک دی کس نے تنِ افسردۂ ملّت میں جاں؟
رازِ تعمیرِ ملل جس سے نہاں کوئی نہیں
فکر ہے جس کی چراغِ راہِ تعمیرِ حیات
بڑھ رہا ہے پرچمِ ملّت کو لہراتا ہوا
مصر و انڈونیشیا۔ جاپان میں جس کے قدم
بڑھ کے جس نے خاکِ بطحا کو کیا دل سے سلام
روضۂ ختم الرسل پر تھا جو مصروفِ دعا
ہو گئی جس کی دعائے مخلصانہ مستجاب
بن گئے تھے کل جو بیگانے ہوئے حلقہ بگوش
جس کی تابانی سے پھیلی شش جہت میں روشنی
تاب زار رگ رگ سراسر جوہری آہنگ سے
ہر نفس مدِ نظر تدبیرِ کارِ نو بنو
نقش زیبائے دیارِ پاک مقصودِ انام

نغمہ پردازِ نفس وارفتۂ گفتار ہے
گرمیٔ اندیشہ سے لبریز کس کا ساتگیں؟
بن گئی ہے کس کی برّاقی سے دن تاریک رات
کس کے نطقِ آتشیں میں کوندتی ہیں بجلیاں؟
وہ زمیں ہے جس کے سر پر آسماں کوئی نہیں
منتشر ذرات کو سامانِ تمکین و ثبات
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی گاتا ہوا
گاڑ آئے شانِ پاکستاں کا پرسطوت علم
اہلِ برما کو دیا جس نے اخوت کا پیام
جو درِ مولا پہ تھا اک بے گداؤں کا گدا
آ گیا طبعِ زمانہ میں یکایک انقلاب
آ گیا پیمانۂ غفلت کے متوالوں کو ہوش
مشرق و مغرب میں تاب افزائے صلح و آشتی
بہرہ ور اک ماورائی دانش و فرہنگ سے
روز و شب مصروفِ تشکیلِ شعارِ نو بنو
کس طرح حاصل ہوا اس شہ کا رکو رنگ دوام

کس سے جز ایوب ہوا اس نقش کی صورت گری
جو ہے وجہِ اعتبارِ قوم، وہ مردِ جری

مسائلِ حاضرہ:

اردو شاعری دوراہے پر

جیلانی کامران

اس مضمون میں میرے پیشِ نظر اردو شاعری کا ایک خاص دور ہے۔ اور چند ایسی باتیں کہی ہیں جو اس دور کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ میں اُردو شاعری پر کسی قسم کی درسی گفتگو نہیں کرنا چاہتا اور نہ اُس نوع کی تنقید کو استعمال کرنا چاہتا ہوں جو شاعری اور قاری کے مابین ترجمان کے فرائض انجام دیتی ہے۔ میں اس شاعری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے شاعر آج کل اور آج کی فضا میں لکھ رہا ہے یا لکھنا چاہتا ہے۔ اور وہ جس زبان میں لکھنا چاہتا ہے یا لکھ رہا ہے اُردو زبان ہے۔ اس اعتبار سے میرا اصل موضوع اردو شاعر ہے، اور وہ مسائل میرے پیشِ نظر ہیں جو اسے آج کل کی فضا میں اردو شاعری کی تخلیق کے سلسلے میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مسائل تخلیقی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ تخلیق ایک بالغ نظر اور ذی حس انسان میں، جو شاعر بھی ہے، ایک عمرانی مفہوم رکھتی ہے، اس لئے مجھے بعض ایسی باتوں کا ذکر بھی کرنا پڑے گا جو فن سے بظاہر غیر متعلق دکھائی دیں گی۔

پچھلے دس بارہ برسوں کے دوران میں لوگوں نے اردو شاعری کے متعلق کئی بار اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اُردو شاعری تخلیقی طور پر رک چکی ہے۔ بعض لوگوں نے ادب میں جمود کے اعلان کو غلط ٹھہرانے کی کوشش بھی کی اور کہا کہ شاعری برابر لکھی جا رہی ہے اور شاعر اس فن کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دے رہے ہیں۔ فارم اور ہیئت کے تجربات، نئی کتابیں، پرانے اساتذہ کے عروض کا استعمال، اور اس نوع کی دوسری کئی صورتیں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ اردو شاعری جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ اگر ہم اعداد و شمار پر بھروسہ کریں تو کالج کے میگزینوں، ادبی رسالوں اور مشاعروں میں حصہ لینے والے شاعروں کی تعداد میں کسی قسم کی کمی نظر نہیں آتی۔ ضخامت کے اعتبار سے پچھلے دس سال اپنے سے پہلے کے دس برسوں سے شعری پیشکشوں میں کسی طرح کمتر نہیں تھے۔ ان حالات میں جمود کا خیال درست دکھائی نہیں دیتا۔

میں جمود یا عدمِ جمود کے قائل فریقوں میں سے کسی کا بھی ساتھ دینا نہیں چاہتا۔ کیونکہ دونوں اپنے طور پر اعلیٰ مقصد کے لئے کوشاں تھے۔ دونوں کا طریق کار مختلف تھا لیکن وہ جس شے کی پردہ کشائی چاہتے تھے وہ ایک غیر منقسم حقیقت تھی۔ دونوں چاہتے تھے کہ شاعری پیدا ہو، بہتر ہو اور مختلف ہو۔ لیکن ایسی شاعری کیسے رونما ہو، دونوں اس راز سے ایک حد تک غالباً ناواقف تھے۔ اس لئے انہوں نے کاریگری کو فن اور ہیئت کو نظم کے معنی دیئے۔ اور شاعری کی نشو و نما میں اپنی طرف سے جتنا بھی ممکن ہو سکتا تھا، حصہ لیا۔

اس حقیقت سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو گا کہ شاعری ایک بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے جسے نہ صرف شاعر نبھانے کی سعی کرتا ہے بلکہ قاری بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ قاری اپنی طرف سے شاعری پر کسی قسم کی ذمہ داری عاید نہیں کرتا بلکہ شاعری سے ذمہ داری اخذ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے شاعر قاری تک، اپنی نظم کے ذریعے ایک مخصوص نوع کی ذمہ داری پہنچانے کا فرض پورا کرتا ہے۔ اگر ہم اس مفروضے کو مان لیں، تو جوبات توجہ طلب ہے وہ شاعر کے اس رشتے کا مسئلہ ہے جسے وہ اپنی مخصوص ذمہ داری کے ساتھ قائم کرتا ہے اور جسے وہ اپنی نظم کی وساطت سے قاری تک پہنچاتا بھی ہے۔ اس ساری صورتِ حال میں شاعر کی ذمہ داری کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

نظم میں شاعر کی تمام تر ذمہ داریاں موضوع کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ میں اُن ذمہ داریوں سے انکار نہیں کرتا جو تکنیک اور عروض سے تعلق رکھتی ہیں، تاہم اگر عروض اور تکنیک کو اپنے طور پر ایک مقصد کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور موضوع کی طرف توجہ نہ کی جائے تو ایسی نظم کی عمرانی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ وہ ذمہ داریاں جو خالصتاً فن سے تعلق رکھتی ہیں اور فن کو عمرانی تقاضوں کا حصہ نہیں بناتیں، ایسی ہیں جنہیں آج کل کوئی بھی شاعر قبول نہیں کر سکتا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں اُردو شاعری موضوع سے متعلق جملہ ذمہ داریوں کو احسن طور پر نہیں نبھا سکی۔ جس قسم کے موضوعات پچھلی نسل نے مختلف ادبی اور تصوراتی تحریکوں سے حاصل کئے تھے، وہی شاعری بدستور استعمال کرتی رہی۔ اور جہاں کچھ اچھے شاعروں نے اپنی منفرد افتادِ طبع کے ساتھ شاعری کی آرائش کی، وہاں وہ ان ہی موضوعات کا شکار بھی ہو کر رہ گئے۔ اردو شاعری اسی لہجے اور مذاق کو پختہ کرتی گئی جو ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس رائے سے اختلاف ضرور ہو گا۔ تاہم میں کہوں گا کہ شاعروں نے موضوع کے بارے میں سوچنے کی شاید کبھی کوشش نہیں کی۔ اُن کا ذہن زمانہ حال جغرافیائی

سرحدوں، اپنی نفسیاتی الجھنوں اور اپنی دلی سوانحمری میں اُلجھا رہا ہے۔ وہ کبھی بھی خود سے آزاد نہیں ہو سکے اور انہوں نے جتنی بھی نظمیں پیدا کی ہیں ان کے اپنے قدرت بھی چھوٹی ہیں۔ ان کا موضوع ایک مختصر سے محل وتوع میں کچھ اس طرح سمٹ چکا ہے کہ شاعر اور اس کا قاری دونوں اسی قید خانے میں مطمئن نظر آتے ہیں اور نہ تو ان کی آنکھیں اس محل وتوع کی حد بندیوں کو پار کر سکتی ہیں اور نہ ان کا تخیل، مقام اور وقت کی سرزایانی کو کوئی مفہوم دے سکا ہے۔ ایسی صورت حال میں ان کی ذمہ داریوں کا خلوص بھی زائل ہو چکا ہے لہٰذا جب ہم اپنی شاعری کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں تو اپنے ضمیر کے سامنے خود بخود شرمسار ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ جو علم وادب کے ساتھ گہرا شغف رکھتے ہیں اور عالمی ادبی سرگرمیوں سے واقف ہونے کی بنا پر بین الاقوامی انداز نظر کی تلقین کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ شاعری کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب توہوں کے سامنے کوئی کام کرنے کو نہیں ہوتا تو وہ شاعری کرتی ہیں۔ ان ہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہماری ثقافت کی نمائندگی سے سروکار رکھتے ہیں۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ جس میں شاعری کا منصب تفریحی ہوتا ہے اور شاعر کی حیثیت اس مینیجہ درسرکس ماسٹر کی سی ہوتی ہے، جس کے لئے تماشائیوں کو خوش اور مطمئن رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہماری شاعری اپنے منصب سے دانستہ گر چکی ہے۔ ایک طرف تو لوگ اس کی اہمیت سے منکر ہیں اور دوسری طرف وہ شاعری کو تفریحی چیز سمجھتے ہیں۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تو ہم اس صورت حال کو کسی طریقے سے سلجھا لیتے۔ لیکن حقیقت ان سطحی تأثرات سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا زمانہ سائنسی عقل پرستی اور اقتصادی منصوبہ بندی کا زمانہ ہے اور ایک اچھی اور دور اندیش حکومت سائنسی عقل پرستی اور اقتصادی منصوبہ بندی کے ذریعے بہتر معیار زندگی اور مستحکم قومی شخصیت کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو مان لیں، تو ہمیں جس نوع کی فکری و سیاسی صداقتیں دستیاب ہوں گی وہ کچھ اس طرح کی ہوں گی:

(۱) چونکہ زمانہ سائنسی عقل پرستی کا زمانہ ہے اس لئے ہم شاعری کی کسی بھی طرز کی شعری دروغگوئی کو پسند نہیں کرتے، دروغگوئی سے مراد ایسی شعری کیفیتیں ہیں جنہیں ہم خارجی معیاروں سے ناپ نہیں سکتے اور جن کی صداقت کی جانچ بیرونی اور منطقی استدلال سے ممکن نہیں۔ یہ نقطۂ نظر شاعری میں ابہام کو سرے ہی سے خطرناک قرار دے کر نظم کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

(۲) چونکہ اقتصادی منصوبہ بندی، بہتر معیار زندگی کی ضمانت دیتی ہے اور معیار زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے وقت اور محنت درکار ہے، اس لئے ایسی شاعری جو معیار زندگی کے پست ہونے کی شکایت کرتی ہے وہ حالات کو صحیح اور درست سیاق و سباق میں نہیں دیکھتی بلکہ سستی جذباتیت کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرتی ہے۔

(۳) اور چونکہ ایک اچھی اور دور اندیش حکومت، قومی صورت حال کو عملی طور پر بہتر شکل دینے کے لئے مختلف طریقوں سے حکمانہ اور غیر حکمانہ طور پر کوشش کر رہی ہے اور اس کی کوششوں کے نتائج اوسط منطقی اصولوں کے مطابق مفید اور کارآمد ہیں اور آئندہ بھی مفید اور کارآمد ہوں گے، اس لئے ایسی حکومت، یا اس ماحول کو جس میں ایسی حکومت کام کر رہی ہے منفی انداز میں پیش کرنا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔ ایسا کرنا محض جذباتی ہوگا اور ایسے اقدام میں مرحوم ترقی پسند تحریک کی اُفتادِ طبع دکھائی دے گی چونکہ ہماری قومی زندگی ایک طرف بین الاقوامی کمیونزم اور دوسری طرف غیر ہمدرد ہمسایہ ممالک کے درمیان بکھری ہوئی ہے، اس لئے اپنی ملکی سرحدوں کے اندر منفی تصورات کی افزائش، نزاعی رجحانات پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ جن کی اجازت کوئی بھی معقول شخص نہ دینا چاہتا ہے اور نہ کبھی دے سکتا ہے۔

جس صورت حال کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کا شاعری کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ کیونکہ اس صورت حال اور شاعر کا آپس میں براہ راست تعلق ہے ایک تو یہ حقیقت قابل غور ہے کہ شاعری اپنے منصب سے گر چکی ہے اور دوسری یہ کہ جس قسم کی صورت حال فکری و سیاسی حقائق کی پیروی کر رہی ہے، اس کی موجودگی میں موضوعات کا بیشتر ذخیرہ شاعری میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حالات ان موضوعات کو شاعری میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے موضوعات متروک ہو چکے ہیں اور ان کی شعری اور عمرانی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ پچھلی نسل جس طرز کی شاعری پیدا کر رہی تھی اس کے میلانات معاشی اور اقتصادی نوعیت کے تھے۔ اور اب وہی میلانات ایک مثبت پروگرام اور عملی منصوبہ بندی کے ذریعے سرکاری محکموں کی ذمہ داری میں آ چکے ہیں۔ ان حالات میں شاعری کیلئے محکمۂ خوراک، لیبر ایکسچینج یا کسی اور محکمے کی ذمہ داری کو قبول کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔

جب سے شاعروں نے اپنے آپ کو ذمہ دار فنکار کی حیثیت سے پہچانا ہے، ان کا احساس موضوع کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ اور جب سے بیرونی زندگی اور ماحول کے ساتھ شاعر کی رشتہ بندی ہوئی ہے، ایک ذمہ دار شاعر کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ذریعے ان اکائیوں کی ترجمانی اور عکاسی کرے جو اس کے ماحول میں اور اس کے آس پاس موجود ہیں اور جو شاعر اس مقصد کی تائید میں

تامل برتتا تھا اسے ذمہ دار شاعروں کی فہرست سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس ساری کہانی کا ہمارے پیشروؤں سے گہرا رابطہ ہے۔ خارج کو انہوں نے طبعی شباہت میں پہچانا تھا۔ اور صرف طبعی رشتہ بندیوں ہی کو جائز قرار دیا تھا۔ اس طریق کا سے خارج، محض معاشری اور سیاسی حقیقت کی شکل میں دستیاب ہوتا تھا اور انسانوں، گروہوں، طبقوں اور تقاضوں کی عکاسی اور ترجمانی کے لئے مواد مہیا کرتا تھا۔ شاعر ذہنی و فکری طور پر اپنے آپ کو خارج میں جذب کر کے خارج کی ضروریات اور مقاصد کی تکمیل کے لئے فن پیدا کرتا تھا اور اسی طرح ان شرائط کو پورا کرتا تھا جو اسے ایک ذمہ دار شاعر بناتی تھیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے معاشری اور سیاسی سطحوں پر بعض ایسی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جن کی وجہ سے شاعر سیاست اور معاشرے کی ذمہ داریوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اب وہ ذمہ داریاں منظم اداروں کی تحویل میں آ چکی ہیں اور شاعر کا کام اس میدان میں ختم ہو چکا ہے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں شاعر کی ذمہ داری کیا ہے اور ایسے طریقے کیا ہیں جو شاعری کو ذمہ دار فن کا منصب عطا کر سکتے ہیں؟

مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے کئی ایک برسوں سے شاعر ایک غلط میدان میں سرگرداں رہا تھا۔ اس کا جس دنیا سے تعلق پیدا ہوا تھا وہ اس کی اپنی دنیا نہ تھی بلکہ سیاسی کارکنوں، تنظیموں اور علم نفسیات کے ماہروں کی دنیا تھی۔ اس دنیا کے لوگ شاعر سے شاید اس لئے رسم و راہ رکھنا چاہتے تھے اور رکھتے تھے کہ وہ جذبات اور الفاظ کے ذریعے ان کے مقاصد کی نشر و اشاعت کرتا تھا۔ شاعر کی اپنی آواز چھن چکی تھی، وہ دوسروں کے بتائے ہوئے محاوروں، اصولوں اور انہی کے بانٹے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ وہ محض ایک ساز تھا جس پر جو انگلیاں گیت پیدا کرتی تھیں وہ دوسروں کی تھیں! اگر ساری بات ساز اور ساز کار کی ہوتی تو کوئی برائی نہ تھی۔ لیکن شاعر ساز نہ تھا، اس لئے جو نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ شاعر سے اس کی وہ صلاحیت چھن گئی جو اسے ان پیشہ ور انقلاب پسندوں کے ملنے سے پہلے مہیا تھی۔ وہ صلاحیت جو اسے اپنے طور پر موضوع بتایا کرتی تھی اور راستہ دکھاتی تھی۔ لہذا اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت اردو شاعری کا سب سے بڑا مسئلہ موضوع کا مسئلہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

عجمی شاعری کی تاریخ میں موضوع کو کم و بیش ثانوی حیثیت دی گئی ہے اور اسے ہمیشہ شاعر کی اپنی اُفتادِ طبع پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ جس موضوع پر چاہے لکھے اور جس موضوع پر لکھنا نہ چاہے اسے رد کر دے۔ مجھے اس صداقت سے بہت کم اختلاف ہے تاہم یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ انفرادی افتادِ طبع اپنے طور پر کبھی بھی مطلق العنان نہیں رہی ہے وہ ایک یا دوسری طرح روایت ہی کی تابع رہی ہے۔ اس نے ہمیشہ روایت ہی کی سمت نمائی میں کام کیا ہے اور ایسے عمدہ نتیجے پیدا کئے ہیں جن سے ہماری ثقافتی عظمت قائم ہے۔

روایت، انفرادی افتادِ طبع اور موضوع کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ روایت پائیدار، مستقل، زرخیز اور متقابلتاً غیر فانی ہے۔ انفرادی اُفتادِ طبع، شاعر کے وجود سے رونما ہوتی ہے، روایت سے اپنا سلسلہ جوڑتی ہے، اپنے طور پر روایت کی تفسیر اور ترجمانی کرتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے موضوع کو پیدا کرتی ہے۔ شاعر مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی اپنی انفرادی اُفتادِ طبع بھی جو کارگزاری کا باعث تھی، محو ہو جاتی ہے۔ لیکن موضوع باقی رہ جاتا ہے۔ اور روایت کی تاریخی سرگزشت میں شامل ہو کر آنے والے زمانوں کو روایت کے ایک نئے نشانِ راہ کی خبر دیتا ہے۔ چونکہ ان تینوں اکائیوں کی باہمی رشتہ بندی اصولی اور بنیادی ہے، اس لئے روایت کی عدم موجودگی میں باقی کی دو اکائیوں کا تذکرہ بالکل بے سود ہے کیونکہ ایسا موضوع جسے روایت کی تائید حاصل نہیں روایت کی تواریخی سرگزشت میں اسی طرح شامل نہیں ہو سکتا جس طرح مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کوٹھیاں شامل نہیں کی جا سکتیں۔

عجمی روایت جس سے اردو شاعری کی روایت برآمد ہوتی ہے، کبھی بھی خالصتاً دنیاوی روایت نہیں رہی۔ اور نہ اس نے دنیاوی اندازِ فکر کو قبول کیا ہے۔ عجمی اندازِ فکر طبعی اور خارجی حقائق کو بنیاد کے طور پر قبول کرتا ہے اور پھر ان کو ایسے طور پر مرتب کرتا ہے کہ یہ شخصی تفسیر اور سمجھ سوچ کے وسیلے سے اپنے اندر سے ان حقائق کو برآمد کرتے ہیں جو مستقل، دیرپا اور غیر فانی ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خارجی اور داخلی کے باہمی سلوک اور رابطے سے ایک آفاقی نقش نامہ ظاہر ہوتا ہے جسے عجمی اندازِ فکر ایک پُر معنی صورت بخش کر عالمگیر علامت بنا دیتا ہے۔ اور یہ علامت انسان اور کائنات کے مابین ایک ایسا رشتہ قائم کرتی ہے جس سے انسان اپنی زندگی کو ان معیاروں کے مطابق جانچتا ہے جو نیکی، خوبصورتی اور خوشی کے معیار ہیں۔ لیکن نیکی، خوبصورتی اور خوشی کے پیچھے جو عظیم روشنی نظر آتی ہے وہی اس علامت کو مفہوم دیتی ہے جسے عجمی اندازِ فکر پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عجمی اندازِ فکر روشنی کا اندازِ فکر ہے جسے وہ دنیاوی حدود دار بعہ میں تلاش بھی کرتا لیکن اسے یہاں برپا ضرور کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس روشنی کو جس علاقے سے حاصل کرتا ہے وہ جسم اور زیست کی سرحدوں سے باہر ایک ایسا علاقہ ہے جس کی شناخت دل کے تجربے سے ممکن ہوتی ہے اس سارے اندازِ فکر میں خارج، خارج

نہیں رہتا بلکہ اس روشنی کے وسیلے سے اسی روشنی کا حصہ بن جاتاہے اور اپنے طور پر اسی کے پائیدار اور مستقل ہونے کی شہادت بھی دیتا ہے۔ جب تک خارجی اور طبیعی حقائق اس روشنی کے بغیر ہوتے ہیں وہ انسانی زندگی کے دکھ کی روداد بیان کرتے ہیں اور نیکی، خوبصورتی اور خوشی کا چرچا نہیں کرتے۔ ان پر انسانی جسم کی سزایابی حاوی رہتی ہے۔ اور انسان اپنے محدود لمحے میں مطمئن لیکن ذہنی طور پر بے چین رہتا ہے۔ عجمی روایت اسی بے چینی کا اندمال کرتی ہے۔ وہ انسان کو کائنات کے ساتھ جس رشتے میں منسلک کرتی ہے وہ اس کے دل کو ان صداقتوں سے بہرہ ور کرتاہے جنہیں میں نے نیکی، خوبصورتی، خوشی اور روشنی کہا ہے۔

اُوپر کے پیراگراف میں عجمی روایت کے بارے میں جو کچھ کہا گیاہے اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتاہے کہ عجمی روایت کو بیان کرنے کے سلسلہ میں صرف لفظوں کی نمائش کی گئی ہے اور کہ عجمی روایت کا فلسفہ آج کل کی دنیا میں بیکار ہے۔ میں نے عمداً وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جن سے عجمی روایت کا چہرہ بخوبی دکھائی دیتا۔ کیونکہ عجمی روایت میں مسلمانوں کی مذہبی تاریخ اور ان کا الہیاتی اور صوفیانی فلسفہ سب شامل ہیں۔ محدود کو لامحدود کے ساتھ، لمحے کو ہمیشگی کے ساتھ اور میں کو تُو کے ساتھ منسلک کرنا عجمی روایت کی امتیازی خوبیوں میں سے ہے۔ روایت کی نشاندہی کے لئے لازم ہے کہ ہم عجمی روایت سے اسی نوع کی روایت مراد لیں جس کا اوپر سرسری تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ ہماری روایت کی یہی اصلی اور مستقل تعریف ہے، باقی سب کچھ اسی سچائی کا عکس ہے جو کبھی غزل کے شعروں میں، کبھی ایرانی مصوّری اور کبھی ہمارے لوک گیتوں میں دکھائی دیتاہے۔

آپ کہیں گے میں نے اردو شاعری کے چند مسائل پر کچھ کہنے کا وعدہ کیا تھا، اور اس وعدے کو نبھانے کی بجائے بعض ایسی متفرق باتوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے یا تو آپ پہلے سے واقف ہیں یا آپ **واقف ہونا نہیں** چاہتے ــــــ!

میں نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ انفرادی افتادِ طبع روایت کی سمت نمائی کے بغیر کام نہیں کرسکتی اور چونکہ وہ کارآمد ثابت نہیں ہوسکتی اس لئے کسی قسم کا موضوع بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل اگر اُردو شاعری موضوع کے بغیر ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انفرادی افتادِ طبع میں کسی قسم کی خامی ہے بلکہ یہ ہے کہ انفرادی افتادِ طبع روایت کے عملی اور فکری تعاون سے محروم ہے۔ پچھلے چند برسوں سے شاعری پر گفتگو کرنے والوں نے روایت پر بھی باتیں کی ہیں اور کہاہے کہ اردو شاعری مختلف روایتوں سے مل کر بنی ہے اور یہ روایتیں اصنافِ سخن کی ہیں، غزل کی روایت، قصیدے کی روایت، نظم کی روایت اور عروض کی روایت، ان سے اردو شاعری کی تعمیر ہوتی ہے لیکن انہوں نے جس حقیقت کو فراموش کیاہے وہ یہ ہے کہ خود اُردو شاعری عجمی روایت کا نتیجہ ہے۔ میں اس فقرے کے لئے معذرت نہیں چاہوں گا، کیونکہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ اردو شاعری محض عجمی روایت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ آریائی روایت بھی اس میں شامل ہے اور میں اس حقیقت کو نظرانداز کرکے تعصب اور کم نظری کا ثبوت دے رہا ہوں۔ میں اس سلسلہ میں صرف یہ کہوں گا کہ اردو شاعری کا ہندی، مراٹھی، گجراتی، تامل اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے ساتھ موازنہ کرکے یہ ثابت کیا جاسکتاہے کہ اردو شاعری جن اقدار اور صداقتوں کو پیش کرتی ہے وہ اقدار اور صداقتیں ہندوستانی زبانوں کی شاعری کی صداقتوں اور اقدار سے بہت مختلف ہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ اردو شاعری عجمی روایت کا نتیجہ ہے غلط بیانی نہیں۔

آج کل کی دنیا میں ہمارے سامنے صرف دو راستے ہیں جن میں سے ایک کا انتخاب ازبس ضروری ہے۔ یا تو ہم پچھلی نسل کی شاعری کی پیروی کریں اور شاعری کو نظر آنے والے مسائل کی عکاسی کا ذریعہ بنائیں۔ یا ہم پچھلی نسل کے شعری حدود و ارتجہ کو عجمی روایت کے تعاون کے ساتھ عبور کریں اور زندگی کو ایک جامع مفہوم دیں جو آج سے پہلے بعض وجوہ کی بنا پر ممکن نہ ہوسکا۔ میں ان میں سے کسی راستے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں حاضر و غائب کے فلسفے، عجمی روایت اور پچھلی نسل کی شاعری، ان تینوں کو مربوط کرنے کے حق میں ہوں تاکہ اس دوراہے پر، جس پہ میں اور آپ کھڑے ہیں، ایک ایسا شعری عکس رونما ہو، جس میں بیک وقت ماضی، حال اور آنے والا زمانہ دکھائی دے اور اس کے ساتھ ساتھ میں اور آپ بھی دکھائی دیں۔ کیونکہ میں اور آپ بھی اسی سرگزشت کا حصہ ہیں جس کا اوپر کے لکھے ہوئے فقرات ہیں۔

ایک کتاب، ایک جائزہ

نصرہ بشیر

(ارباب قلم کی آرا اور بحث و نظر کے سلسلہ میں ادارہ قطعی غیر جانبدار ہے ——— مدیر)

یہ کتاب ہے "انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت" مرتبہ محمد اشرف جسے ہمدرد اکیڈمی، کراچی نے شائع کیا ہے تصنیف کا عنوان بہت مبہم ہے۔ بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مغرب کے ان من چلے سیاحوں کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے اپنی قوم کے مفاد کے پیش نظر انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت کی اور سیاسی و جغرافیائی اطلاعات بہم پہنچائیں۔ لیکن جلد ہی قاری کو اس ابہام کا پتہ چل جاتا ہے۔ درحقیقت یہ تصنیف ایک خاص سفر کی روئداد ہے جسے بحکم حکومتِ ہند، پنڈت من پھول اور ان کے رفقا، جن میں مولانا محمد حسین آزاد بھی شریک تھے، اختیار کیا تھا۔ ہمارے لئے اس تصنیف کی دلچسپی کا واحد باعث مولانا آزاد کی شخصیت اور حالات ہیں۔

کتاب کا مواد اتنا وسیع نہ تھا کہ وہ ایک مستقل تصنیف کا متحمل ہو سکے۔ بہتر ہوتا اگر اسے ایک جامع مگر مختصر مضمون کی شکل میں پیش کیا جاتا۔ مگر مصنف نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کتاب فروعات اور رطب و یابس کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ عریض و طویل جغرافیائی حالات اور تاریخی اطلاعات جن کا نفسِ مضمون سے کوئی واضح تعلق دکھائی نہیں دیتا، عجیب و غریب قیاس آرائیاں جن میں مدحت سرائی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا، کتاب کا جزو غالب ہیں۔ جن میں کہیں کہیں سیاحوں کی نقل و حرکت کی روئداد ملتی ہے۔ کتاب کو دیکھ کر حضرت حفیظ جالندھری کا یہ مصرع یاد آتا ہے، جس میں حسب ضرورت کچھ ترمیم کی گئی ہے کہ:

"گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھا ہے"

کتاب کا آغاز درحقیقت صفحہ ۳۸ سے ہوتا ہے۔ جہاں "مشن کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی" کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ وسط ایشیا میں روس کے اقدامات کے پیش نظر حکومت ہند نے ایک پولٹیکل مشن وسط ایشیا بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کے ممبران کو نام اور بھیس بدل کر ان علاقوں میں جانے کی ہدایت کی گئی۔ یہ مشن چار افراد یعنی پنڈت من پھول، میر منشی لفٹننٹ گورنر پنجاب منشی فیض بخش، محمد حسین آزاد اور کرم چند نند رام زرگر پر مشتمل تھا۔ اور اس کے قائد اول الذکر یعنی پنڈت من پھول تھے۔ اس کے بعد "سوالنامہ" یعنی مطبوعہ اطلاعات کی تلخیص ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مشن کو کونسے ممالک کا دورہ کرنا ہے اور کونسی اطلاعات بہم پہنچانی ہیں۔ بقول مصنف یہ مواد تمام تر انڈیا آفس لندن کے ایک فائل اور مولانا آزاد کی چند یادداشتوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ کتاب سنہ ۱۹۶۱ء کے آخر میں چھپی ہے۔

مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس سفر کے تمام تر حالات ان کی ذاتی کاوشوں کے مرہون منت ہیں اور ان سے پہلے کسی کو ان کا علم نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "سب سے بڑی خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی کا یہ دور اب تک پُر اسرار پردوں میں چھپا ہوا تھا (یعنی اس دور کا پُر اسرار پردوں میں چھپا رہنا بڑی خوشی کی بات تھی!) اور اس کی تفصیل پر انڈیا آفس کے بستوں میں ایک سو سال سے زیادہ احتیاط اور دور اندیشی کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ الحمدللہ کہ آزاد کے عقیدت مندوں کے سامنے اس کی نقاب کشائی کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔"

غالباً مصنف کو اس بات کا علم نہیں یا وہ دانستہ اس سے اغماض کر رہے ہیں کہ ان رازہائے سربستہ کی بابت تمام ضروری اطلاعات ڈاکٹر محمد صادق، سابق پروفیسر ادبیات انگریزی گورنمنٹ کالج، لاہور کے بیش بہا مقالے

"MAULVI MUHAMMAD HUSAIN AZAD: HIS LIEE AND WORKS"

میں اجمالاً درج ہیں۔ "جس کے مسودہ کی دو کاپیاں کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ اور جس کا سن تصنیف ۱۹۳۹ء ہے"۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ "ماہِ نو" بابت جنوری ۱۹۵۸ء میں پہلے ہی ان کی نقاب کشائی کا شرف حاصل کر لیا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ مسٹر محمد اشرف اور ڈاکٹر صادق کے بیانات میں معمولی سا فرق ہے۔ لیکن اس مشن کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اراکین مشن کے ذمے کونسا کام سپرد کیا گیا تھا، ان کے متعلق دونوں کے بیانات میں ذرا فرق نہیں۔ ڈاکٹر صادق نے "سوالنامہ" تمام وکمال اصلی الفاظ میں پیش کیا ہے مسٹر اشرف نے اس دعوے کے باوجود کہ "سوالنامہ" انہیں مولانا آزاد کے کاغذات میں مل گیا ہے محض اس کی تلخیص پیش کی ہے۔

ڈاکٹر صادق کے مقالہ میں بہ صراحت مذکور ہے کہ:

"۱۸۶۵ء کو جس بات نے یادگار حیثیت عطا کر دی وہ وسط ایشیا کو ایک سیاسی مشن کی روانگی تھی جس پر آزاد کو ڈاکٹر لائٹنر اور پنڈت من پھول کے ہمراہ روانہ کیا گیا تھا تاکہ وہ اس ملک کے حالات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ اس مشن کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی گریز لازم ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز ہی سے، روس وسط ایشیا میں آگے بڑھنے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے تھا۔ ۱۸۳۹ء میں ایک روسی لشکر اورن برگ سے روانہ ہوا تھا تاکہ خان خیوا کو روس کے لوگوں کو اغوا کر کے ترکستان کی منڈیوں میں فروخت کرنے کی سزا دے۔ لیکن یہ مہم ناکام ثابت ہوئی۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے کامیابی کے ساتھ وسط ایشیا پر خروج کیا اور اس کی افواج کی خوقند، بخارا اور خیوا کے ازبک خوانین کی افواج سے مڈبھیڑ ہوئی۔

اپنا انجام دیکھتے ہوئے خان خوقند اور امیر بخارا نے ہندوستان، انگلستان اور قسطنطنیہ سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اکتوبر ۱۸۶۴ء سفیر خوقند لاہور آیا اور لارڈ لارنس کے دربار عظیم میں شریک ہوا۔ اس وقت تک یہ دونوں ملک اپنی آزادی کھو کر زار روس کی سلطنت میں شامل ہو چکے تھے۔

حکومت ہند یہ چاہتی تھی کہ ان بیرونی معاملات میں نہ الجھے۔ پھر بھی یہ مناسب سمجھا گیا کہ ان دونوں ملکوں کے سیاسی حالات معلوم کرنے کے لئے ایک خفیہ مشن بھیجا جائے جو اُن کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اس مشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ آزاد کا انتخاب اسی کی سفارش سے عمل میں آیا۔ مولوی خلیل الرحمٰن جنہوں نے یہ اطلاع خود آزاد سے حاصل کی تھی مجھے بتایا کہ ڈاکٹر لائٹنر نے ایک درویش کی حیثیت سے سفر کیا۔ آزاد نے معمولی حیثیتوں پر قناعت کرتے ہوئے کبھی درویش اور کبھی نانبائی کا روپ دھارا۔

بالواسطہ طور پر مشن نے آزاد کو ایک اور فائدہ بھی پہنچایا۔ اس سے وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا جو انہوں نے انجمن پنجاب کے ساتھ وابستہ ہو کر شروع کیا تھا۔ جب سے غدر برپا ہوا تھا، حکومت ان کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس یادگار خدمت کی بدولت انہوں نے حکومت کی پوری طرح خوشنودی حاصل کر لی۔ غدر زادہ کابوس جو اُن کے سر پر تقریباً دس برس سوار رہا تھا، آخر کار دور ہو گیا۔"

علاوہ ازیں آج سے دو سال بیشتر مدیر "ماہِ نو" کی تحریک پر ڈاکٹر صادق نے اس سفر پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ان تمام واقعات پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ واضح کرنے کے لئے کہ اولیت کا سہرا کس کے سر ہے دونوں کتابوں سے متوازی اقتباسات بے محل نہ ہوں گے۔ تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اور حق، حق دار کو پہنچ جائے۔

مسٹر اشرف لکھتے ہیں " ترکستان میں طوائف الملوکی نے مقامی امیروں کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ روس بے روک ٹوک ترکستان کے علاقوں میں در آیا۔ روسیوں نے ترکستان پر فوج کشی کا یہ عذر پیش کیا کہ بہت سے روسی تاجروں اور سوداگروں کو ترک چھاپے مار اور قزاق پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اور روسی فوجیں انہیں آزاد کرانے آ رہی ہیں.... انگریزوں کو ترکستان میں روسی اقتدار کا حال معلوم کرنے کی زبردست خواہش تھی..... اس لئے

ہندوستان کے گورنر نے صوبہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کو یہ حالات معلوم کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۶۵ء کا ہے۔ صوبہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کو بھی اس علاقہ سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک پولٹیکل مشن وسط ایشیا بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کے ممبروں کو نام اور بھیس بدل کر ان علاقوں میں جانے کی ہدایت کی گئی۔ اس مشن کے ممبر پنڈت من پھول، منشی فیض بخش، مولانا آزاد اور کرم چند نند رام تھے۔"

اس کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ آزاد نے یہ سفر کیوں اختیار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

" آزاد کو ان ممالک سے گہری دلچسپی تھی..... ادبی دلچسپیوں کی بنا پر انہوں نے اسے فوراً قبول کرلیا۔(۲) آزاد کو اپنے والد مولانا محمد باقر صاحب مجتہد کا بغاوت کے الزام میں شہید ہونا بھی یاد ہوگا..... مولانا آزاد کی گرفتاری کے لئے انعام بھی مقرر ہوچکا تھا...... ان کے دوستوں نے یہ بات بھی مولانا آزاد کو بتائی ہوگی کہ اگر اس خطرناک سفر سے صحیح سلامت اور کامیاب واپس آگئے تو بغاوت کے الزامات اور دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائیں گی۔ علاوہ ازیں، اُس سے آئندہ ترقی کے دروازے کھلنے ضرور نظر آتے تھے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صادق کا مضمون "آزاد کا سفر ایران" مطبوعہ "ماہ نو" جنوری ۱۹۵۸ء بالتفصیل پڑھیے۔ اس کو پڑھ کر کون مانے گا کہ اس راز سربستہ کا انکشاف مسٹر اشرف کے قلم معجز التیام سے ہوا ہے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایک دو باتوں میں مسٹر اشرف کا بیان زیادہ درست ہے۔ مثلاً اس مشن کے قائد پنڈت من پھول تھے نہ کہ ڈاکٹر لائٹنر۔ ڈاکٹر صادق کو دوسرے دو غیر معروف اراکین کے نام بھی معلوم نہیں تھے۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے آج سے بیس پچیس برس پہلے ذاتی تحقیق اور کاوش سے ان پُراسرار حالات کی نقاب کشائی کر دی تھی، جو کسی کو بھی معلوم نہ تھے اور جن کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا، یہاں تک کہ ان کے متعلق ہوائیاں اڑانے کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر ان کی نہ انڈیا آفس کے خفیہ فائل تک رسائی تھی اور نہ ہو ہی سکتی تھی۔ جس کو دیکھتے ہی یہ آسانی عقدہ حل ہوجاتا، یہ تو وہ ناممکن الحصول چیز تھی جس پر ایک سو سال سے زیادہ احتیاط اور دوراندیشی کی مہریں لگی ہوئی تھیں" اور اُن دنوں اس تک پہنچنے میں دور افتادہ محقق تو کیا فرشتوں کے بھی پر جلتے تھے۔ اگر اس فروگذاشت سے قطع نظر کرلی جائے تو ڈاکٹر صادق کا بیان مؤرخانہ سنجیدگی اور ادبی لب و لہجہ کا وقار لئے ہوئے ہے۔ وہ مسٹر اشرف کی منتشر بیانی، مبالغہ اور خودنمائی (اپنے بزرگوں کی تعریف خود نمائی نہیں تو اور کیا ہے؟) سے پاک ہے۔ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اس سفر سے آزاد کی غرض حکام کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ مسٹر اشرف نے اس کا بعلت مجبوری اعتراف کیا ہے اور مولانا کی سیاحت پسندی اور علم دوستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ اپنے نظریہ کی تائید میں وہ فرماتے ہیں۔ (مولانا) "سخندان میں ایک جگہ فرماتے ہیں ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوق سیاحت مل کر مجھے ترکستان کے ملک میں لے گئے۔ گویا اس سوال کا جواب (مولانا نے یہ سفر کیوں اختیار کیا؟) مولانا آزاد نے خود ہی دیا ہے"

مسٹر اشرف سے کوئی پوچھے کیا مولانا آزاد یہ لکھ دیتے "ایک دفعہ مخبری کا شوق مجھے ترکستان لے گیا تھا"؟ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زیر نظر کتاب ایک سنجیدہ تصنیف نہیں بلکہ مدلل مداحی ہے۔ مولانا آزاد کے محرکات سفر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"انہوں نے اس نکتہ پر بھی غور کیا ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کی قیامت ابھی ختم ہوئی ہے۔ اگر شمال مغربی سرحد سے ہندوستان پر روسیوں کا حملہ ہوگیا تو ملک کے لئے مصیبت پیدا ہوجائے گی۔ اس خطرے کا سدباب حکومت برطانیہ کی مدد کے ذریعے ہی کیا جاسکتا تھا۔"

تو کیا روس ہندوستان پر صرف اس لئے حملہ آور نہیں ہوا کہ مولانا آزاد نے وافر اطلاعات بہم پہنچا کر ہند اور اسلامی دنیا کے درمیان سد سکندری کھڑی کر دی تھی؟ کون مولانا آزاد؟ وہی جو اس وقت ایک نہایت ادنیٰ ملازمت پر بمشاہرہ ۳۵ روپے مامور تھے؟ جنہیں ان خدمات کے عوض ۳ سو روپے کی بیش بہا رقم بطور انعام ملی جسے بعد میں چھ سو روپے کردیا گیا اور جو اس انعام سے جو منشی فیض بخش کو دیا گیا آدھی تھی؟

مسٹر محمد اشرف پر انجیل مقدس کا وہ مقولہ صادق آتا ہے
کہ انہیں دوسروں کی آنکھ کا ذرّہ نظر آتا ہے، مگر اپنی آنکھ کا شہتیر
نظر نہیں آتا۔ وہ انڈیا آفس والے فائل سے جب بھی ذرا پرے
ہٹتے ہیں منہ کی کھاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ذیل کے نکات قابلِ داد ہیں۔

(۱) صفحہ ۴۴ پر آپ لکھتے ہیں "مولانا اس وقت (سفر ترکستان
کے وقت) انجمن پنجاب کے سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے"۔
یہ واقعہ ۱۸۶۵ء کا ہے۔ اس کے برعکس گارساں دتاسی
کے ۱۸۶۷ء والے مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد مارچ ۱۸۶۷ء
میں سکریٹری کے فرائض انجام دینے پر مامور ہوئے۔ اس کی توثیق ڈاکٹر
محمد شفیع ڈین شعبہ آرٹس پنجاب یونیورسٹی کے مضمون "شمس العلماء
محمد حسین آزاد" سے ہوتی ہے۔ جس میں درج ہے کہ مولانا آزاد
۲۷ مارچ ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

(۲) صفحہ ۴۴ پر لکھا ہے "چند بزرگوں کا خیال ہے کہ اس مشن
کے بعد مولانا آزاد اور پنڈت من پھول میں ایسی یگانگت بڑھی کہ
مولانا آزاد نے اپنی ایک تصنیف کا نام "نصیحت کا کرن پھول" انہیں
کی رعایت سے رکھا ۔۔۔ مشن سے واپسی کے بہت دن بعد یہ کتاب
لکھی گئی تھی۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں (کسی چیز سے اتفاق نہیں)
کیونکہ مولانا نے اور کسی جگہ اس کا ذکر نہیں کیا"۔

لیکن مولانا آزاد نے مخبر بن کر ترکستان جانے کا بھی کہیں
ذکر نہیں کیا۔ کیا آپ کو اس سے بھی اتفاق ہے یا نہیں؟ آیئے دیکھئے
دیباچہ کتاب میں اس تصنیف کی بابت مصنف کے والد بزرگوار
آغا ابراہیم کیا لکھتے ہیں۔ "معلوم ہوتا ہے کہ انہوں (آزاد) نے
یہ (مسودہ) ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا۔ پنڈت من پھول اس وقت
جناب لفٹننٹ گورنر کے میر منشی تھے پنڈت صاحب کی ایک
یادداشت مورخہ ۱۲ جون ۱۸۶۲ء مسودہ کے آخر میں لگی ہے۔

مولانا آزاد رعایت لفظی پر جان چھڑکتے تھے۔ آخر اس تصنیف
کا نام "نصیحت کا کرن پھول" کیوں رکھا گیا؟ کیا کرن پھول کو موضوع
کتاب سے کوئی خاص مناسبت ہے اور پھر پھول کی ضرورت ہی کیوں
محسوس ہوئی؟ یہ بھی یاد رہے کہ یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو پنڈت
من پھول کی وساطت سے مولانا آزاد کو محکمہ تعلیم میں ملازمت ملی
تھی۔ وہ اس مشن پر بھی پنڈت صاحب کی سفارش سے گئے تھے۔
حکومت کی طرف سے انہیں دعوت نہیں دی گئی تھی۔

بہر حال یہ کتاب سفر سے بہت پہلے کی تصنیف ہے،
"بہت بعد" کی نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس سفر کے بعد مولانا اور
پنڈت صاحب کے تعلقات بگڑ گئے تھے اور انہوں نے اپنی رپورٹ
میں آزاد کے خلاف بہت زہر اگلا تھا۔

(۳) پھر آپ لکھتے ہیں "سفر پر جانے سے پہلے سخندانِ فارس کا
خیال بھی ان کے دماغ میں تھا" یہ محض قیاس آرائی ہے۔ کتاب کے
مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں اس تصنیف کا خیال سفر کے
دوران میں آیا ہوگا۔

(۴) آغاز سفر کی بابت آپ لکھتے ہیں کہ "یہ (آزاد) ایک اور قافلے
کے ساتھ ۳ ستمبر ۱۸۶۵ء مطابق ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ دوشنبہ
کے روز پشاور سے روانہ ہوئے"۔ حساب سراسر غلط ہے۔ ۳ ستمبر ۱۸۶۵ء
مطابق ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ ہے اور ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ
مطابق ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء۔

(۵) صفحہ ۱۲۶ پر لکھا ہے "اس سفر کے پندرہ برس بعد جب وہ شہرت
کی مسند پر فراغت کا تکیہ لگائے اردو کی خدمت میں منہمک تھے،
اس سفر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "ایک دفعہ جوانی کی
ہمت اور شوق سیاحت مل کر مجھے ترکستان لے گئے"۔

مسٹر اشرف عجیب غلطیوں میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔
اُن کے اپنے بیان کے مطابق مولانا آزاد اس سفر پر ۱۸۶۵ء
میں تشریف لے گئے۔ اس سن پر ۱۵ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۸۸۰ء
بنتا ہے۔ یعنی بقول مصنف مولانا نے فقرہ ۱۸۸۰ء میں لکھا۔
یہ فقرہ "سخندانِ فارس" حصہ اول میں درج ہے جو بقول آغا محمد
۱۸۷۲ء سے کچھ پہلے رفاہِ عام پریس لاہور میں چھپی تھی۔ دوسرے
حصہ کے لکچر ۱۸۷۲ء میں دیئے گئے تھے۔

آپ پوچھیں گے مصنف کو ۱۵ سال کا خیال کیسے آیا جبکہ
درحقیقت یہ فقرہ ترکستان سے واپسی کے ایک دو سال بعد لکھا
گیا تھا؟ بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نے "سخندانِ فارس" پر نظرِ ثانی
کے بعد تمہید کتاب میں لکھا۔ "مگر کیا کروں انتظار فرصت میں
۱۵ برس گزر گئے ۔۔۔" مولانا آزاد بالکل درست ہیں۔ کیونکہ یہ
تمہیدی الفاظ ۵ اگست ۱۸۸۰ء میں لکھے گئے تھے۔ اور اگر

۱۸۷۲ء یعنی سن تصنیف کتاب پر ۱۵ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۸۸۷ء بنتے ہیں۔ مگر مصنف خبر نہیں کس سوچ میں تھے کہ سفر ترکستان سے سیدھے "سخندانِ فارس" پر جا دھمکے۔ آغا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ سخندانِ فارس کا خاکہ ان کے ذہن میں گھر بنا چکا تھا جب حکومت کی جانب سے انہیں ترکستان جانے کی دعوت ملی تو اپنی دلچسپیوں کی بنا پر انہوں نے فوراً قبول کرلیا۔ صفحہ (۵۰) ترکستان میں اس کی کیسے تکمیل ہوسکتی تھی۔ غالباً آزاد کو تو ایران اور ترکستان کا فرق معلوم تھا۔ اہلِ ایران تو کہتے ہیں کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم" لیکن جس ایران میں آزاد گئے تھے وہاں فارسی کا خوب چرچا ہوگا۔

(۶) سب سے زیادہ اچنبھے کی بات صفحہ ۱۲۷ پر درج ہے سرخی ہے: "مولانا آزاد کی زندگی کی چند اہم تاریخیں" لکھا ہے۔

"۱۸۲۷ء ... دہلی میں پیدائش (مطابق ۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ)

اس سن ہجری کے مطابق جو تاریخ نکلتی ہے وہ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء ہے اور یہی مولانا کی صحیح تاریخ پیدائش ہے۔ آگے چل کر آپ لکھتے ہیں کہ آزاد ۱۸۶۲ء میں محکمہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے۔ ملازمت کی صحیح تاریخ پہلی جنوری ۱۸۶۴ء ہے۔ آزاد کی "کتاب ملازمت" میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔

یہ سوءِ ظن ہی سہی لیکن میں کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں کہ مسٹر اشرف کو شروع ہی سے ڈاکٹر صادق کے مضمون مطبوعہ "ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۵ء کا علم تھا۔ اور وہی مضمون ان کی مزید تحقیق کا محرک بنا۔ واقعات یہ ہیں:۔

اپنی تصنیف کے آغاز و ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اشرف لکھتے ہیں۔ جون ۱۹۵۸ء میں نیویارک سے کراچی جاتے ہوئے چند روز لندن ٹھہرا۔ اس گتھی کو سلجھانے کا خیال میرے ذہن میں بہت دن سے گھر کرچکا تھا۔ انڈیا آفس لائبریری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں سے "میری تلاش" نے مجھے برٹش میوزیم پہنچایا۔ لیکن وہاں بھی گوہرِ مراد میرے ہاتھ نہ آیا.... اس سال ۱۹۵۹ء اپریل کے مہینے میں.... انڈیا آفس میں ایک بار پھر قسمت آزمانے کی کوشش کی"۔ اور ان کو مطلوبہ فائل مل گیا!

یعنی آپ کو اس تحقیق کا خیال پہلے جون ۱۹۵۸ء میں آیا۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ڈاکٹر صادق کا مضمون "ماہِ نو" شمارہ بابت جنوری ۱۹۵۵ء میں چھپا۔ "ماہِ نو" مغربی پاکستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا رسالہ ہے۔ کیا مسٹر اشرف کو اس اہم مضمون کا جس کا ان کے جدِ امجد کی زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے علم نہ ہوا ہوگا؟ یہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ مسٹر اشرف کو اس تحقیق کا خیال "ڈاکٹر صادق" کے مضمون چھپنے کے فوراً ہی بعد ہوا اور جونہی انہیں لندن جانے کا موقع ملا انہوں نے انڈیا آفس کا رُخ کیا۔ خیر مان لیجئے کہ آپ کو اس مضمون کا علم نہ تھا۔ اگرچہ یہ بات بھی برِ بنائے شہادت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ لندن سے واپسی پر آپ پاکستان تشریف لائے تو "ماہِ نو" کے شعبۂ اُردو سے بہ نفسِ نفیس مطلوبہ شمارہ حاصل کیا۔ جسے انہوں نے ضرور پڑھا ہوگا۔ اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے، ڈاکٹر صادق سے ملے اور بہت دیر آزاد کی سیر و سیاحت پر گفتگو رہی لیکن آپ نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اس کا ذکر تک نہیں کیا! شاید یہ بات اخلاقی فرائض اور دیانت داری کے تقاضوں میں شامل نہیں۔

میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ یہ سب افسانہ ہے۔ مسٹر اشرف نہ کہیں تشریف لے گئے اور نہ ڈاکٹر صادق ہی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ لیکن وہ اس بات سے کیسے انکار کرسکتے ہیں کہ انہوں نے مذکورہ شمارہ منگوایا، اسے پڑھا۔ غالباً اسکے حصول کیلئے خط کتابت بھی کی "ماہِ نو" کے شعبۂ اردو میں تشریف لے گئے اور ڈاکٹر صادق کی بے علمی اور بے مائیگی کا پیٹ بھر رونا رویا۔ مگر عیب جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو پر عمل نہ کرتے ہوئے انہوں نے ان کی تحقیق کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ وہ تمام گراں قدر اطلاعات جن کی تلاش میں وہ مہینوں آوارہ و سرگرداں رہے، ان کے یہاں سب کی سب موجود تھیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ تو اسی بات پر ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ اس تحقیق کا سہرا اُن کے سر رہے اور ڈاکٹر صادق کا نام تک نہ لیا جائے! اگر ان کی یہی خواہش تھی تو متعلقہ شمارہ "ماہِ نو" کیلئے خط کتابت کرنے میں ان سے بڑی چوک ہوئی! انہیں چاہئے تھا کہ وہ چپ سادھے رہتے اور پھر ڈرامائی انداز میں میدانِ تحقیق میں داخل ہوکر دعوئے اولیت کرتے۔ مسٹر اشرف نے خواہ مخواہ خط کتابت کرکے اپنا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا!

تصنیف کا بین السطور ملاحظہ کیجئے۔ صاف پتہ چل جائیگا کہ انہوں نے اسے لکھتے وقت ڈاکٹر صادق کا مضمون پڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صادق نے لکھا ہے کہ آزاد کا اس مشن پر جانے کا مقصد اولیٰ اُن سیاسی بد اعمالیوں کا کفارہ ادا کرنا تھا جو ان کی ذات سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ مسٹر اشرف نے یہ نکتہ وہیں سے لیا ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد کی اخلاقی صفائی کے پیش نظر انہوں نے ادبی محرکات کو پہلی جگہ دی ہے جو ہرگز قابل قبول نہیں۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے: پنڈت من پھول کی بابت وہ لکھتے ہیں "چند لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نے اپنی ایک تصنیف کا نام نصیحت کا کرن پھول انہی کی رعایت سے رکھا۔" یہ بات ڈاکٹر صادق کے مضمون میں درج ہے اور کسی اور محقق نے کسی اور جگہ اس کا ذکر نہیں کیا۔ کیا مسٹر اشرف بتا سکتے ہیں کہ "وہ چند لوگ" کون ہیں؟

مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ "سوالنامہ" انہیں آزاد کے کاغذات میں مل گیا تھا۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ مولانا آزاد کے پنشن کے کاغذات مرتب کرتے وقت آغا ابراہیم نے سارا گھر چھان مارا لیکن سوالنامہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ تو پھر اب ۷۰ سال کے بعد یہ مسٹر اشرف کو دھرا دھرایا کہاں سے مل گیا؟ اور اگر مل گیا تو اسے جوں کا توں کتاب میں کیوں داخل نہ کر دیا؟ اس کا خلاصہ کس مصلحت کی بنا پر تیار کیا گیا؟ بے ادبی معاف، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسے ڈاکٹر صادق والے "سوالنامہ" کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ میری رائے میں نہایت موزوں ہوگا اگر ڈاکٹر صادق اور مسٹر اشرف سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے اپنے "سوالنامے" کا فوٹو "ماہِ نو" میں چھپنے کے لئے بھیج دیں۔ "ماہِ نو" غالباً ان کے اخراجات کا کفیل ہو سکیگا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ماسوا اس اطلاع کے کہ ڈاکٹر لائٹنر اس مشن میں شامل نہ تھے، مسٹر اشرف کی تصنیف میں کوئی نئی بات نہیں اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ؎

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں!

شب گزیدہ سحر!

(انقلابی سرمہ)

اس طرح کا ایک بھی سُرمہ نہیں بازار میں
اِک سلائی سے ہماری دُور ہو کر رہ گئیں
بیچتی سورج کی کرنیں اب نہیں تاریکیاں
اب فضاؤں میں غبار آلودگی بالکل نہیں

لکھ رہے ہیں تا سند روز قیامت تک رہے
آنکھ کی بیماریاں سب دیکھتے ہی دیکھتے!
سُرخیوں کا اب نہیں ہوتا سویرے ول پہ اثر
شب گزیدہ اب نظر آتی نہیں ہم کو سحر!

سید باقر علیم

افسانہ:

"بحر ہے پایاب مجھے"

الاز

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔

لیکن بندرگاہ میں رات کے دو نہیں بجتے۔ نہ یہاں دن کے دو بجتے ہیں۔ بندرگاہ میں رات نہیں ہوتی۔ نہ یہاں دن ہوتا ہے۔ یہاں نہ صبح ہوتی ہے، نہ شام ہوتی ہے۔ یہاں صرف کام ہوتا ہے، صرف روشنی ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی، سرچ لائٹوں کی روشنی۔ روشنی اور کام۔ وقت کے سائے بندرگاہ سے باہر کھڑے رہتے ہیں۔ بندرگاہ کا گھڑیال وقت نہیں بتاتا۔ وہ کہتا ہے: زندگی حرکت میں ہے، زندگی اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے، زندگی ایک بہت بڑی کرین ہے جس کے دیوہیکل بازو کرۂ ارض کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔

لیکن دیوہیکل کرینوں کا دماغ وقت کا احساس نہیں رکھتا۔ وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ اس کے مضبوط فولادی بازو تیس ٹن بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ انسان کے بازو تیس ٹن بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ مشین کے بازو اٹھا لیتے ہیں۔ مشین کے بازو بھی تو انسان کے بازو ہیں۔ انسان کے بازو چھوٹے ہیں۔ اور کمزور ہیں۔ وہ تیس ٹن وزن کو پلیٹ فارم سے اٹھا کر جہاز کے عرشے پر نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے اس نے اپنے لئے لمبے لمبے مضبوط فولادی بازو ایجاد کر لئے ہیں۔ انسان نے مشینوں کی مدد سے اپنی آنکھیں، اپنے کان، اپنے پاؤں اور اپنے ہاتھ بہت مضبوط کر لئے ہیں۔ مشین انسان کی زرخرید غلام ہے، محنت کش وفادار غلام۔ اور جب انسان رات کے دو بجے سرچ لائٹوں کی روشنی میں مشین سے کہتا ہے: اس وقت دن ہے۔ رات نہیں ہے۔ تو مشین سرِ تسلیم خم کر کے چپ چاپ تیس ٹن وزن اٹھا کر جہاز کے عرشے کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

بندرگاہ میں کام ہو رہا ہے۔ بندرگاہ کو دیکھ کر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کام اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ بلند سطح کا کام جس کا تعلق تمام دنیا سے ہے۔ یہ وسیع و عریض دنیا۔ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، پاکستان۔ امریکہ کا جہاز برتھ نمبر ا پر کھڑا ہے۔ روس کا جہاز برتھ نمبر ۲ پر۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان کے جہاز برتھ نمبر ۳۔ ۴۔ ۵ اور ۶ پر کھڑے ہیں۔ پاکستان کا جہاز برتھ نمبر ۷ پر کھڑا ہے۔ کرینیں چیخ رہی ہیں، تجارتی سامان اتارا جا رہا ہے، لادا جا رہا ہے۔

کراچی سو رہی ہے۔ بندرگاہ جاگ رہی ہے۔ کیونکہ بندرگاہ کراچی نہیں ہے۔ بندرگاہ نیویارک ہے۔ ماسکو ہے۔ لندن ہے۔ بندرگاہ پیرس، برلن اور ٹوکیو ہے۔ اور بندرگاہ کراچی ہے۔ بندرگاہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے، تجارتی جہاز اس بین الاقوامی ادارے کے سفیر ہیں۔ یہ سفیر دوسرے ملکوں کی ضروریات کا سامان لے کر ہر لحظہ، ہر لمحہ سمندروں کی ہولناک گہرائیوں سے الجھتے ہوئے بندرگاہوں کی طرف جا رہے ہیں۔ تجارتی جہاز بین الاقوامی محبت کے پیغامبر ہیں۔

اور پاکستان کا جہاز "طلوعِ اسلام" ٹوکیو جانے کے لئے تیار ہو رہا ہے۔

"طلوع اسلام" کے کوارٹر ڈیک پر اُس کا کپتان، اختر آفندی اپنے مہمانوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ اس کے مہمان اسلام شپنگ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے ارکان ہیں جنہوں نے حال ہی میں یہ جہاز "طلوعِ اسلام"، ایک غیر ملکی فرم سے خریدا ہے۔ کپتان اختر آفندی نے اُن کو کوک ٹیل پارٹی پر مدعو کیا ہے۔

شراب کپتان آفندی پر وہی اثر کرتی ہے جو شبنم کے چھینٹے پھولوں کی کلیوں پر کرتے ہیں۔ شراب سے اس کی ذہانت کے پھول کھل اٹھتے ہیں، اور اُن کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔

اس وقت وہ کہہ رہا ہے:

"بندرگاہ ایک عبادت گاہ ہے۔ عام عبادت گاہوں کی طرح عام عبادت گاہوں میں خدا کی عبادت ہوتی ہے۔ بندرگاہ میں کام کی عبادت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک کام کی عبادت خدا کی عبادت ہے۔

WORK IS WORSHIP کام عبادت ہے۔ بندرگاہ کام کا مندر ہے۔ عمل کی مسجد ہے۔ جہاز عالمی اتحاد کا سمبل ہے۔ اور جہاز رانی کا پیشہ ملکوں کی کثرت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش۔ بندرگاہ میں پہنچ کر اختر آفندی ایرانی نژاد نہیں رہتا۔ سراج گونگلو ترکی نژاد نہیں رہتا اور یوسف بن یعقوب عربی نژاد نہیں رہتا۔ یہاں ہم سب ایک عالمی برادری کے رکن ہیں۔ اس وسیع دنیا کے باشندے ہیں۔"

یوسف بن یعقوب، جو اسلام شپنگ کمپنی کے بورڈ اوف ڈائرکٹرز کا چیرمین ہے، اپنا نام ایسی بے اعتنائی سے لئے جانے پر جھنجھلا کر بولا:

"معاف کیجئے، مجھے اپنے عربی نژاد ہونے پر فخر ہے۔ میرے آباواجداد عرب سے آکر اس ملک میں آباد ہوئے تھے اور اب میں اس ملک کا ایک معزز شہری ہوں۔"

یہ کہہ کر یوسف بن یعقوب نے اپنا کوک ٹیل کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور غصے کو غٹاغٹ پی گیا۔

کپتان آفندی نے جواب دیا:

"معاف کیجئے میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس ملک اور ہر ملک کے معزز شہری اس دنیا کے معزز شہری ہیں۔ یہ روکٹ کا زمانہ ہے۔ دنیا ایک شہر بن گئی ہے۔ اور ہمارا ملک اس شہر کا ایک محلہ۔ میں نے یہ کہا تھا کہ جہاز رانی کا پیشہ ہم میں ایک عالمی شہریت کا احساس پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ پیشہ دوسرے پیشوں کے مقابلے میں زیادہ ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔"

یوسف بن یعقوب اس بحث کو آگے بڑھانے کے لئے کپتان آفندی کی بات کا جواب دینا چاہتا تھا۔ لیکن سٹیورڈ کوک ٹیل کا ایک اور گلاس لے آیا۔ یوسف بن یعقوب اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور بورڈ کے ایک اور رکن نے اس کی بجائے بات شروع کرکے گفتگو کا رخ بالکل بدل دیا۔

اُس نے اپنے کوک ٹیل کے گلاس سے ایک گھونٹ پی کر کہا:

"میں مسٹر یوسف بن یعقوب سے معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انسان کو ایک وقت میں ایک ہی کشتی پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ایک کشتی میں ایک پاؤں اور دوسری کشتی میں دوسرا پاؤں رکھنے والا انسان جہاز رانی کے پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایسے نام پسند نہیں آتے جیسے سراج الدولہ ساسانی۔ اور اختر الزمان آفندی اور یوسف بن یعقوب۔ یہ نام ہمارے ملک کے معلوم نہیں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ اپنے ملک سے شہر بدر ہوکر ہمارے ملک میں آباد ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے ملک میں آباد ہو کر انہوں نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بڑے مضحکہ خیز نام ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمیز ملیح آبادی اور جاں نثار جالندھری۔ شاید یہ حضرات اپنے نام کے ساتھ اپنا پتہ اس لئے دیتے ہیں کہ وہ کہیں گم نہ ہو جائیں۔ یا شاید وہ ایسے نام اس لئے پسند کرتے ہیں کہ جب وہ ترقی کرکے بڑے مرتبوں پر پہنچ جائیں، لندن پہنچ جائیں، نیویارک پہنچ جائیں تو وہ اپنی اوقات نہ بھول جائیں۔ اور آسانی سے اپنے گھونسلے میں واپس آجائیں۔ مجھے تو سیدھے سادے نام پسند ہوتے ہیں۔ ایسے نام جو خاص اس ملک کی پیداوار معلوم ہوں، مثلاً ہمارے بورڈ کے ایک ڈائرکٹر کا نام نظام دین۔"

نظام دین نے چونک کر کہا:

"جناب میں نے آپ کی طرح کوک ٹیل نہیں پی ہوئی۔ آپ مرغے کی دم پی کر خواہ مخواہ دوسروں کے ناموں کی دُمیں کھینچتے پھرتے ہیں۔ ناموں میں کیا رکھا ہے۔ نام رکھنے میں انسان کو اپنے دین اور مذہب کا خیال رکھنا چاہئے۔ میرے والد صاحب قبلہ چودہ گاؤں کے مالک تھے اور اُن کا نام محمد دین تھا۔ وہ بڑے دیندار تھے۔ اس کا ثبوت ان ناموں میں ملتا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹوں کے لئے چُنے۔ انہوں نے میرا نام نظام دین رکھا۔ میرے ایک بھائی کا نام چراغ دین ہے۔ دوسرے کا سراج دین۔ تیسرے کا معراج دین۔ چوتھے کا امام دین۔ پانچویں کا الہ دین ——"

بورڈ کے ایک بے دین شرارتی رکن نے اُس کی بات کو کاٹ کر کہا:

"چوہدری نظام دین، آپ کتنے بھائی ہیں؟"

نظام دین نے بڑے فخر سے جواب دیا:

"ہم ماشاء اللہ سب مل کر آٹھ بھائی ہیں۔"

اُس بے دین نے جلدی سے کہا۔

"اگر آپ بارہ بھائی ہوتے تو کسی کا کیا بگاڑ لیتے۔"

اس پر سب زور زور سے ہنسنے لگے ۔

جب ہنسی دب گئی تو چوہدری نظام دین نے کہا :

" جناب ، میں آپ کی ہنسی کا مطلب سمجھتا ہوں ۔ یہ آپ کا قصور نہیں ہے ۔ یہ مرغے کی دُم ہل رہی ہے ۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دُودھ اور پُوت اس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے اچھے دنوں میں دُودھ اور پوت کی دعائیں دی جاتی تھیں اور جس کے پاس سب سے زیادہ بھینسیں اور سب سے زیادہ بیٹے ہوتے تھے وہ بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا تھا ۔ بھائی انسان کا بازو ہوتا ہے ۔ میرے آٹھ بھائی میرے آٹھ بازو ہیں ۔ آٹھ بازو مل کر ایک کرین کے بازو کے برابر ہوتے ہیں ۔"

بورڈ کے بے دین ممبر نے پھر طنز کیا :

" اور خاندانی منصوبہ بندی ہماری کرینوں کی صنعت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے ۔ افسوس ! "

بورڈ کے ایک اور ممبر نے کہا ۔

" لیکن میری رائے میں اولاد کی خواہش ایک فطری جذبہ ہے ۔ اور اس کو کسی سٹیج پر روکنے کی کوشش ایک غیر فطری حرکت ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یا جن کی اولاد بہت کم ہوتی ہے ، وہ اولاد کی کمی پوری کرنے کے لئے کتے اور بلیاں پالتے ہیں ۔ بندر اور ہرنیاں پلتے ہیں ۔ طوطے ، مینائیں اور عقاب پالتے ہیں بلکہ بعض حالات میں ریچھ ، ہاتھی اور شیر بھی پالتے ہیں ۔"

کپتان آفندی نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا :

" جی نہیں ، ہرگز نہیں ۔ یہ فطری جذبہ نہیں ہے ۔ یہ خالص اقتصادی مسئلہ ہے ۔ اگر کسی مائی کے لال میں ہمت ہو ، تو وہ میدان میں آئے اور میرے چھ بچے مجھ سے لے لے ۔ میں شکریہ ادا کروں گا ۔ چھ بچے ! توبہ ، توبہ ! ابھی تو شکر ہے چار فوت ہو چکے ہیں ۔ ان دس بچوں میں سے تین اس وقت پیدا ہوئے تھے جب میں بے کار تھا ۔ بزرگوں سے سنا تھا ۔ بچہ اپنا رزق ساتھ لاتا ہے ۔ لیکن میرا بچہ رزق لے کر نہیں آیا ۔ راشن کارڈ لے کر آیا ۔ راشننگ کا زمانہ تھا ۔ بچے کے راشن کارڈ نے ہمارے راشن میں چار چھٹانک چینی کا اضافہ کر دیا ۔ لیکن میرے خرچ پر ۔ اور میں بے کار تھا اور ادھار کھا رہا تھا ۔ آخر مجھے اپنی بیوی پر رحم آگیا ۔ مجھے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت ہے ۔ اس لئے میں نے اس کو ہر سال ایک بچہ پیدا کرنے کی دردناک روٹین سے رہائی دلانے کے لئے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ لوگ اولاد حاصل کرنے کے لئے دوسری شادی کرتے ہیں میں اولاد سے بچنے کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا ۔ در اصل اس دنیا میں میری سب سے بڑی خواہش ایک بانجھ عورت سے شادی کرنے کی تھی ۔ لیکن مجھے بانجھ عورت نصیب نہیں ہوئی ۔ میں نے اپنی دوسری شادی کا فیصلہ بڑے ڈرامائی حالات میں کیا ۔ ان دنوں میں پرتگال کی ایک شپنگ کمپنی میں ایک جہاز کا کپتان تھا ۔ ایک دن میں برازیل کی ایک بندرگاہ میں مرچنٹ نیوی کلب میں بیٹھا تھا ۔ میرے سامنے کلب کی سٹینو گرافر مس کرآسٹو بیٹھی تھی ۔ پینتیس سال کی مس کرآسٹو مجھے بہت پسند تھی ۔ وہ اُس وقت میرے سامنے بیٹھی میرے لئے چائے بنا رہی تھی ۔ کلب کے بیرے نے مجھے ایک تار دیا ۔ میری بیوی کا تار تھا ۔ یہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی نے جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ پر کسی نے دونالی بندوق سے فائر کر دیا ہے ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مس کرآسٹو بالکل بانجھ ہے ۔ اور مس کرآسٹو سے میری شادی ہو گئی ۔"

چوہدری نظام دین نے کہا :

" اچھا تو آپ کی بھی دو بیویاں ہیں ۔ مجھے بھی دوسری شادی کرنی پڑی ۔ میری پہلی بیوی سے صرف لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں ۔ آپ کی دونوں بیویاں ایک ہی مکان میں رہتی ہیں ؟ دونوں لڑتی تو نہیں ؟ میری بیویاں تو ہر وقت لڑتی رہتی ہیں ۔ پہلے وہ ایک دوسرے کو مارتی ہیں ۔ پھر میں دونوں کو مارتا ہوں ۔ آپ کی دونوں بیویاں تو صلح صفائی سے رہتی ہوں گی ؟"

کپتان آفندی نے جواب دیا :

" چوہدری صاحب ، میری صرف ایک بیوی ہے ۔"

" لیکن آپ نے ابھی اپنی دوسری بیوی کا ذکر کیا تھا ؟"

" میں نے اس کو طلاق دے دی ہے ۔"

" کیوں ؟"

" وہ بانجھ نہیں تھی ، اور نہ وہ کنواری تھی ۔ اس کے چھ بچے تھے ۔ اُس نے جھوٹ بولا تھا ۔"

چوہدری نظام دین کو غصہ آگیا :

"جھوٹ بولا تھا اُس نے؟ پھر آپ نے اُس کو طلاق کیوں دی؛ اُس حرامزادی کو سڑک پر بچھا کر اُس کے اوپر سے رولر پھیرنا تھا۔ اُس کو تمام عمر جھوٹ بولنے کی سزا دینی تھی۔"

کپتان آفندی نے ندامت سے کہا:

"میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بھی جھوٹ بولا تھا۔ میں نے کہا تھا میں کنوارا ہوں۔"

تھوڑے عرصے کے لئے گفتگو بند ہوگئی۔

اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر یوسف بن یعقوب نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"کیپٹن آفندی، اس جہاز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آپ نے میری رپورٹ نہیں پڑھی؟ اُس میں میں نے .... اس جہاز کے بارے میں پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں نے اس میں ثابت کیا ہے کہ یہ جہاز نہیں گدھا گاڑی ہے۔"

"گدھا گاڑی!"

"گدھا گاڑی!"

"گدھا گاڑی!"

سب اپنا اپنا کوک ٹیل کا گلاس تپائی پر رکھ کر کپتان آفندی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

چودھری نظام دین نے کہا:

"آپ نے اپنی رپورٹ میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ جہاز جہاز نہیں ہے گدھا گاڑی ہے؟"

کپتان آفندی نے جواب دیا:

"جی ہاں"

"بڑی غلطی کی، ہم نے یہ رپورٹ نہیں پڑھی"

کپتان آفندی نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

"مسٹر یوسف، آپ نے اسلام لائنز کے لئے 'طلوعِ اسلام' جیسا کھٹارا خرید کر اپنے پیسے سمندر میں پھینک دیئے ہیں۔ آپ اس جہاز کو مون سون سے پہلے بیچ ڈالیں۔ یہ جہاز مون سون کے تھپیڑے برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس کی سٹار بورڈ سائڈ میں دس ڈگری کا جھکاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ جہاز اپنا توازن کھو چکا ہے۔ اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے میں نے جہاز کے تمام وزن سٹار بورڈ سائڈ میں شفٹ کر دیئے ہیں۔ اور لوڈنگ کا دباؤ ہولڈ کے سٹار بورڈ گوشوں میں منتقل کر دیا ہے۔ اس طرح ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کپتان اس سے معمولی موسم میں اور معمولی طوفان میں کام لے سکتا ہے۔ لیکن مون سون میں یہ جہاز خطرناک ہو جائے گا۔ لیکن اگر کمپنی اس جہاز سے ضرور کام لینا چاہتی ہے تو اس ٹرپ کے بعد اس کو ایک سال کے لئے سنگاپور کے ڈوکیارڈ میں ری فٹ کے لئے جانا پڑے گا۔ لیکن اس مرمت پر اس کی لاگت سے دگنا خرچ آئے گا۔ اپنی رپورٹ کے آخر میں میں نے کمپنی کے سامنے ایک اہم تجویز پیش کی ہے۔ اس میں میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمارا ملک صرف بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی تجارتی جہازوں کی مدد سے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ہماری سب سے بڑی ضرورت ایک بڑے معیار کا شپ یارڈ ہے جس میں بڑے سائز کے تجارتی جہاز بنائے اور مرمت کئے جا سکیں۔ ایسا ایک شپ یارڈ گوادر میں یا اُرمارا میں تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر کمپنی اس تجویز کو غور کے قابل سمجھے تو میں اس اسکیم کا بلیو پرنٹ تیار کر سکتا ہوں۔"

اسلام شپنگ کمپنی کے ڈائرکٹر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

پھر سٹرن کی طرف سے آنے والے کوریڈر میں چیف آفیسر کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

چیف آفیسر نے رپورٹ کی:

"کیپٹن، لوڈنگ ختم ہوگئی ہے۔ لائفبیلٹس سیکیور کر لی گئی ہیں۔ واٹر ٹائٹ ہیچ بند کر دیئے گئے ہیں۔ جہاز سفر کے لئے تیار ہے۔"

کپتان آفندی نے پوچھا:

"شیڈیول کیا ہے؟"

"ساڑھے تین بجے۔"

"ہائی ٹائڈ کب ہے؟"

"پانچ بجے۔"

"ٹگ آ گیا ہے؟"

"نہیں، اس کے لئے ٹیلیفون کیا ہے۔"

"کونسا ٹگ ہے؟"

"رستم۔"

مجاهدوں کی سر زمین

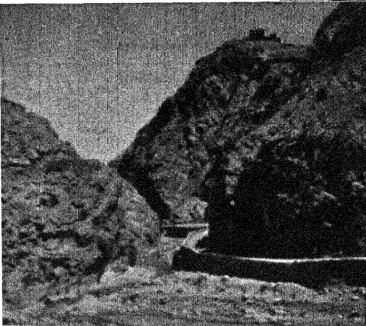


ہمارے شمالی سرحدی علاقے کے شجاع، حریت پرست فرزندان وطن جہد آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ استعمار کے خلاف، حصول پاکستان کے لئے، آزادی کشمیر کے لئے۔ اور اب بھی نئی نسل اسی شجاعانہ روایت پر پرورش پاتے ہوئے ہر جہتی ترقی میں ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ شریک ہے۔

" حیات جاوداں اندر ستیز است "



" رقص سر مستانہ رقص "
(زندگی اورفن میں مکمل ہم آہنگی)



سنگلاخ پہاڑ، سخت کوش زندگی

"ہوا کی فورس کیا ہے؟"

"دو"

"ویدر رپورٹ کیا ہے؟"

"محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹوں میں موسم خوش گوار رہے گا۔ ہوا کا وہ دباؤ جو جنوبی افریقہ کے نیچے بن رہا تھا، بحر اوقیانوس کی طرف چلا گیا ہے۔ ہوا کا رخ: شمال مغربی۔ درجۂ حرارت: اکیاسی اور ساٹھ۔ ہاربر کے اندر پانی ہموار ہے۔ ہاربر سے باہر دو درجے کی سوئل ہے۔"

"لوڈنگ میری ہدایت کے مطابق ہوئی ہے؟"

"یس سر"

"جہاز سٹیم پر ہے؟"

"یس سر"

"اولرائٹ۔ ڈیل ڈن۔"

اب کوک ٹیل نے ڈائرکٹروں کے دماغ کو سیراب کر دیا ہے۔ اب اُن کے سروں پر مرغوں کی دُمیں اُگ آئی ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بدحواسی کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اُن کی زبانیں مفلوج ہو گئی ہیں۔ وہ کپتان آفندی کے ساتھ ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ اس لئے شروع شروع میں انہوں نے کوک ٹیل کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن انسان کوک ٹیل کو اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ سکتا۔ کوک ٹیل انسان کو اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے۔ انسان نے کوک ٹیل اس لئے ایجاد کی ہے کہ کوک ٹیل انسان کو دھکا دے کر گٹر میں گرا دے اور وہ ساری رات وہیں پڑا رہے۔ اس وقت حالات پر کوک ٹیل کی حکومت ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں طلوعِ اسلام کے کوارٹر ڈیک پر ایسی شرمناک باتیں ہونے والی ہیں، جو انسان اپنے ہوش و حواس میں کبھی نہیں کر سکتا۔ تھوڑی دیر میں اسلام شپنگ کمپنی کے ڈائرکٹر گٹر میں گرنے والے ہیں۔

لیکن کپتان آفندی کو کوک ٹیل پر کنٹرول ہے۔ کیونکہ کپتان آفندی آدمی نہیں ہے۔ جن ہے۔ کپتان آفندی جن پیتا ہے وہ کوک ٹیل پسند نہیں کرتا۔ اُسے جن پسند ہے۔ وہ جن اس لئے پیتا ہے کہ وہ جن کو قابو میں کرنا چاہتا ہے، وہ تمام عمر جن پیتا رہا ہے اور اب اُس نے جن پر قابو پالیا ہے۔ اب وہ جن کی بوتل کو اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا ہے۔ بوتل میں سے سفید جن نکل کر زمین سے آسمان تک اُس کے سامنے پھیل جاتا ہے۔ اور کپتان آفندی کے حکم کا انتظار کرتا ہے۔

اور چوہدری نظام دین نے اپنا دماغ کوک ٹیل سے سیراب نہیں کیا۔ اس لئے اس کے سر پر مرغے کی دم نہیں اُگی۔ وہ تو مرغے کی اذان کا انتظار کر رہا ہے۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ وہ بار بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔

آخر اس نے کہا:

"چیئرمین صاحب، فجر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ جو بات کرنی ہے کریں۔"

یوسف بن یعقوب نے آخر اس اہم مسئلے کو چھیڑا جو اس پارٹی کا سبب تھا۔

"کیپٹن آفندی، بورڈ آپ کی تجاویز کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بورڈ کو آپ کے بلند مقاصد اور بلند نظری کا اعتراف ہے۔ ہم آپ کے ملک اور کمپنی کے لئے خیر خواہی کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اور وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ان تجاویز پر انتہائی سنجیدگی سے غور کریں گے۔ اور اس سلسلے میں جلدی ہی حکومت سے خط و کتابت کا آغاز کریں گے لیکن آپ کو یقیناً ہم سے اتفاق ہوگا کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کم از کم دس سال کا عرصہ درکار ہے۔ اور ہم اتنے لمبے عرصے کے لئے کمپنی کی ترقی کی سکیموں کو التوا میں نہیں ڈال سکتے۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے اہم پروگرام کمپنی کے کاروبار کی وسعت ہے۔ ہم اسلام لائنز میں ہر سال دو جہازوں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس سال دو جہاز خریدنا چاہتے ہیں جن کے نام پیغامِ اسلام اور نورِ اسلام ہوں گے۔ اور اگلے سال اسلام لائنز میں جن دو جہازوں کا اضافہ ہوگا ان کے نام شانِ اسلام اور فیضِ اسلام ہوں گے۔ اس کے بعد روحِ اسلام، کیفِ اسلام، معراجِ اسلام اور تہذیبِ اسلام۔ اور تمام دنیا کے سمندروں میں مغل لائنز اور سٹی لائنز کے ساتھ ساتھ اسلام لائنز کے جہاز بھی جلوہ فروز ہوں گے۔ کیپٹن آفندی، ہمیں اس وسعت کے پروگرام میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہم آپ کو ان جہازوں کی خرید و فروخت کے لئے یورپ بھیجنا چاہتے ہیں۔"

کپتان آفندی نے جواب دیا:

"میں کمپنی کا ممنون ہوں۔ یہ میری عزت افزائی ہوگی۔"

"کیپٹن آفندی، بورڈ کے علم میں ہے کہ کمپنی نے طلوعِ اسلام میں بہت خسارے کا سودا کیا ہے۔ ہم نے اس کو بیچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر ہم نے کسی منافعے کا خیال چھوڑ کر کم از کم اس کی قیمت وصول کرنے کے لئے اس کو سمندر کے قابل بنانے کا فیصلہ کیا لیکن انشورنس کمپنی نے اس کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بہت اصرار کے بعد آخر انشورنس کمپنی نے ایک شرط پر اس کا بیمہ کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔ اگر ہم طلوعِ اسلام کے لئے کسی ایسے کیپٹن کا انتظام کر لیں جس کے پاس جہاز رانی کا انٹرنیشنل سرٹیفکیٹ ہو تو اس کا بیمہ ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی ڈوبنے کا نہیں، ایکسیڈنٹ کا۔ اور ایکسیڈنٹ بھی وہ جس میں انشورنس کمپنی کو جہاز کا سکریپ مل جائے۔ چنانچہ ہم نے بین الاقوامی جہاز راں ایسوسی ایشن کی فہرست دیکھی۔ اس فہرست میں ہمیں اپنے ملک کا صرف ایک نام نظر آیا۔ کیپٹن اختر الزماں آفندی۔ آپ اُس وقت اُس پرتگالی کمپنی میں تھے جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔ ہم نے آپ کو ڈیڑھ گنا تنخواہ پر اپنی کمپنی میں لے لیا۔ جہاز کا بیمہ ہوگیا۔ بہت بھاری رقم پر۔ اس میں ہمارا چانس یہ تھا کہ اگر کوئی تجربہ کار تربیت یافتہ کیپٹن اس جہاز سے اس کی لاگت وصول کرلے تو ہم خود اس جہاز کا سکریپ بیچ کر اس سے کافی فائدہ اٹھائیں گے لیکن آپ کی رپورٹ نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا ہے۔ ابھی مونسون تک اس جہاز کی آدھی لاگت بھی واپس نہیں آئے گی۔ اس طرح طلوعِ اسلام ہماری ترقی کے راستے میں ایک روڑا بن کے اٹک گیا ہے۔ اس سے نہ صرف کمپنی کو ناقابلِ تلافی مالی نقصان ہوا ہے بلکہ اس نے ہمارے کاروبار کی وسعت کے پروگرام کو بھی روک دیا ہے۔ کیپٹن آفندی، ہم آپ سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کرتے ہیں؟" "میں حاضر ہوں۔ حکم دیجئے۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ طلوعِ اسلام کو آگ لگا دیں۔"

کپتان آفندی کا کوک ٹیل کا گلاس اس کے ہونٹوں کے پاس ٹھہر گیا۔ اُس نے گلاس کے اوپر سے یوسف بن یعقوب کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں نے کوک ٹیل سے انکار کر دیا۔ اس کا ہاتھ کوک ٹیل کے گلاس کو واپس لے آیا۔ اس کی نظریں یوسف بن یعقوب کے چہرے پر منجمد ہوگئیں۔ اُس نے کہا۔

"مسٹر یوسف، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں اپنے جہاز کو کیوں آگ لگا دوں؟"

"کیپٹن آفندی، طلوعِ اسلام بھاری رقم پر انشور ہے انشورنس کمپنی کی ادائیگی سے ہم اپنے تمام نقصانات پورے کر لیں گے، ایک نیا طلوعِ اسلام خرید سکیں گے اور اپنی ترقی کی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو جائیں گے۔"

کپتان آفندی تلملا کر کھڑا ہوگیا اور بولا:

"یوسف صاحب، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب تک میں اس جہاز کا کپتان ہوں، اس کو کوئی آگ نہیں لگا سکتا۔ اس لئے میں اس جہاز کی کمان سے استعفا دیتا ہوں۔ اب یہ جہاز آپ کا ہے۔ آپ اس کو آگ لگا سکتے ہیں۔"

"کیپٹن آفندی، ہم بہت پہلے ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن انشورنس کمپنی کی ہدایت ہے کہ طلوعِ اسلام کو اس بندرگاہ میں آگ نہ لگائی جائے۔ اگر اس کے جلنے کی رپورٹ کسی غیر ملکی بندرگاہ سے آئی تو ادائیگی میں آسانی ہوگی۔ ٹوکیو اس کے لئے بہترین جگہ ہے۔ اور غالباً یہ سمجھنا تو مشکل نہیں ہے کہ اس آگ سے انشورنس کمپنی کے چند افسروں کو، آپ کو اور ہمیں بہت فائدہ پہنچنے والا ہے۔"

کیپٹن آفندی چلایا:

"یوسف بن یعقوب!"

پھر غصے کے جذبات کی فراوانی سے اُس کی زبان بند ہوگئی اور پھر اُس نے وہی کچھ کیا جو اپنے جذبات کو فرو کرنے کے لئے ایسے موقعوں پر وہ کیا کرتا ہے۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کو ہوا میں بلند کیا اور کوک ٹیل کے گلاس کو ڈیک پر پٹخ کر چکنا چور کر دیا۔ اور اس کی زبان کی لکنت دور ہوگئی۔

"یوسف بن یعقوب، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں بین الاقوامی جہاز راں ایسوسی ایشن کا ممبر ہوں۔ میں ایک بین الاقوامی شخصیت ہوں۔ میرے وقار اور دیانت داری کا معیار بہت بلند ہے۔ آپ نے مجھے حریص اور بدکردار انسانوں میں شمار کر کے میری توہین کی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جہاز، جہاز راں اور جہاز رانی میں وفاداری کا ایک مقدس عہد ہے۔ محبت کا ایک ابدی رشتہ ہے۔ انتہائی

جذباتی رشتہ ماں اور باپ کے رشتے سے زیادہ قوی، بیوی اور بچوں کے رشتے سے بھی زیادہ قوی، عزیز ترین عزیزوں سے زیادہ عزیز۔ آپ اپنے بیمار عزیزوں کی کراہیں سُن کر بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے بیمار جہاز کی کراہیں سن لیتا ہوں تو ساری ساری رات نہیں سوتا۔ اور آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں اپنے بیمار جہاز کو چیتا پر پھینک کر اس کو ستی کر دوں۔ میں اپنے گھر کو اپنے چراغ سے آگ لگا دوں۔ میرے بیمار جہاز کو ــــ میرا بیمار جہاز ــــ میرا بیمار جہاز!"

اب جذبات کے دریا نے اُس کی زبان بند کر دی۔ اور اپنے لئے دوسرا راستہ بنا لیا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور وہ کرسی کی بیک پکڑ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

پھر جب وہ سنبھل گیا تو اس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا:

" پارٹی ختم ہو گئی ہے۔ آپ جا سکتے ہیں ــــ اور میں اس آخری ٹرپ کے لئے اپنا استعفا واپس لیتا ہوں۔ میرا جہاز لوڈ ہو چکا ہے۔ میرا ملک جاپان کو اس کی ضرورت کی اشیاء بھیج رہا ہے۔ میں اس مقدس فریضے کو پورا کروں گا۔ جاپان سے واپس آکر میں اس کمپنی میں کام کرنا پسند نہیں کروں گا!"

چیف آفیسر کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کوریڈر کی طرف دیکھنے لگے، چیف آفیسر نے آکر رپورٹ دی:

"کیپٹن، رستم آگیا ہے"

" کپتان آفندی نے جواب دیا:

" مہمان جا رہے ہیں۔ گینگ وے کلیر کرو۔ اور ٹگ کو لائنیں دے دو"

" یس سر۔"

چیف آفیسر حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ مہمان جہاز سے اتر گئے، کپتان آفندی برج پر پہنچ گیا۔ ٹگ نے جہاز کو کھینچ کر چینل کے درمیان کر دیا۔

اور جہاز روانہ ہو گیا۔

آسمان صاف اور سیاہ تھا۔ ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہاربر گہرے نیلے اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا بالکل ساکن تھی۔ چینل خاموش اور ہموار تھی۔ چینل کی سطح بندرگاہ کی سرچ لائٹوں، جہازوں کی نیویگیشن لائٹوں اور ہاربر کی سرخ، سبز اور سفید لائٹوں کے عکس سے قالین بنی ہوئی تھی۔ فضا پُرامن تھی اور پُرسکون تھی۔

کپتان آفندی برج پر کھڑا دوربین سے بندرگاہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اُس کو وقت کا یہ حسین حصّہ بہت اچھا لگتا ہے۔ وقت کا یہ حسین حصہ ایک جہاز راں آرٹسٹ کو آرٹسٹ جہاز راں بنا دیتا ہے۔ وہ رات کے اس نشاط انگیز حصے میں اپنے سفر کا آغاز کرنا پسند کرتا ہے۔ پورٹ ٹرسٹ کی مرضی کے خلاف اور پائلٹ کی مدد کے بغیر۔ جہاز ایک فرمانبردار بچے کی طرح اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہوا سرخ اور سبز لائٹوں سے بنے ہوئے راستے پر چینل کو آہستہ آہستہ عبور کر رہا ہے۔ کپتان آفندی کا دل اطمینان اور خوشی کے جذبات سے معمور ہے۔ آج اُس کی خوشی اور اطمینان کے جذبات زیادہ شدید ہیں کیونکہ اُن میں یہ احساس مل گیا ہے کہ وہ ایک بلند کردار کا بین الاقوامی جہاز راں ہے۔ اس نے دوربین سے وارننگ ٹاور کی طرف دیکھا۔ اُس پر چار بلب جلے ہوئے تھے۔ نیلا، سبز، سرخ اور زرد۔ اس کا مطلب تھا۔ ایک جہاز ہاربر سے باہر جا رہا ہے۔

چیف آفیسر لنگر کی مشینری کے پاس جہاز کے ہیڈ پر کھڑا تھا۔ کپتان آفندی نے برج سے پکار کر کہا:

" ویل ڈن، چیف۔ پرفیکٹ لوڈنگ۔ جہاز میں لسٹ بالکل نہیں۔"

چیف آفیسر نے نیچے سے جواب دیا:

" تھینک یُو۔ کیپٹن"

جب جہاز بوٹ کلب کے سامنے پہنچا تو موسم یکایک تبدیل ہو گیا۔ منوڑے کی طرف سے تند و تیز ہوا کے جھونکے جہاز کی سٹار بورڈ سائڈ سے بڑی طاقت کے ساتھ ٹکرائے۔ جہاز کئی ڈگری پورٹ سائڈ کو جھک گیا اور اس نے اپنی اصلی پوزیشن پر آنے کے لئے تین ہچکولے کھائے۔ موڑس پیئر کے سامنے پورٹ ٹرسٹ کی عمارتوں کی وجہ سے ہوا کی شدت کم ہو گئی۔ اور جہاز کے ہچکولے بند ہو گئے۔

چیف آفیسر گھبرایا ہوا برج پر آیا اور بولا:

" کیپٹن، ویدر ٹاور پر طوفان کی وارننگ آگئی ہے"

باقی صفحہ ۱۱۵ پر

سحر کے جلو میں

عنایت اللہ

(کیا یہ حقیقت ہے یا افسانہ، یا ـــ رپورتاژ؟ قارئین کا تاثر اس بارے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ـــ مدیر)

میں نے گھوم کر دیکھا۔ آہنی دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔

کس قدر ہیبت تھی اس آہستگی میں، کس قدر بھیانک تھا انداز اس کے بند ہونے کا، جیسے مہیب چٹان میرے وجود کو کچلتی، پیستی، ہڈیوں کو مسلتی، گزرتی جارہی ہے۔

آہستہ، نہایت آہستہ۔

دل کچلا گیا، اعصاب پس گئے، ضمیر مسلا گیا، انانیت ریزہ ریزہ ہو کے قید خانے کی بُو باس میں تحلیل ہو گئی۔

دروازہ بند ہو کر مقفل ہو چکا تھا سنتری چابیوں کا گچھا کمر بند کے ساتھ باندھ چکا تھا اور دروازہ کی موٹی موٹی سلاخوں میں سے اُن ملول اور اداس اداس سی دو عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو کسی قیدی کی ملاقات کے لئے آہنی دروازہ سے دور پرے کھڑی تھیں۔ میں نے بھی سلاخوں میں سے جھانکا۔ پھر اس ہولناک دروازے کی دہلیز کو دیکھا جس پر گر کر میری آزادی نے آخری ہچکی لی تھی اور دم توڑ گئی تھی۔ ان سلاخوں سے پرے مجھے آزاد دنیا نظر آرہی تھی۔ میں اُس کی بُو سونگھ رہا تھا اور اسے دیکھ بھی رہا تھا ـــ وہ دو ہاتھ پرے، دو قدم دور۔ لیکن مجھ میں اور میری آزاد دنیا میں قدم نہیں، اب سال حائل ہو چکے تھے۔

سات سال! اس احساس نے میری ذات کو بنیادوں تک ہلا دیا کہ اس ایک جست کے فاصلے کو طے کرنے میں مجھے سات برس کا عرصہ لگے گا۔

میں قید ہو چکا تھا۔ سات برس کے لئے! آنکھیں دھندلا گئیں، پھر اندھیرا چھا گیا گہرا، گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ اُس رات کا اندھیرا جس کی طوالت سات سال تھی۔ میں اس گھپ اندھیرے میں بھٹک بھٹک گیا۔ میں نے ٹھوکر کھائی۔ میں گر بھی پڑا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ٹٹولتا ٹٹولتا اندھیرے میں ہی چلتا گیا۔ پھر یوں کہ جیسے ذہن نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ یا جیسے ذہن پیچھے رہ گیا ہو۔ میں رُک گیا کہ ذہن کو ساتھ لے لوں۔ اسے ساتھ لیا تو میں چکرا گیا۔ غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی جو طاری ہوتی ہی چلی گئی۔

"اٹھو...." کوئی مجھے پیار سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ "اٹھو...." میں نے آنکھیں کھولیں۔

"جاگو سویرا ہو گیا ہے"۔

میں اٹھ بیٹھا۔

زنداں میں یہ میری پہلی سحر تھی ـــ بے نُور، دکھیاری سحر، جیسے اس کے حسن اور نکھار کو شب کی تیرگی ڈس گئی ہو۔

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ اپنے تئیں پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے قید خانے کے کپڑے پہنائے جا چکے تھے۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ قیدیوں کا انبوہِ عظیم انگڑائیاں لے رہا تھا۔ میں یوں اٹھا جیسے مجھے لاشوں کے انبار میں سے اٹھایا جا رہا تھا۔

"اللہ تیرا شکر!" قریب سے آواز آئی۔ "قید کی ایک اور رات گذر گئی"

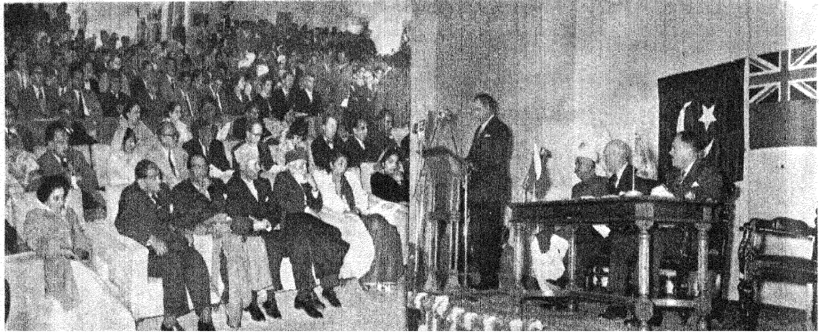
اس ایک فقرے نے جیسے میری ڈوبتی ناؤ سنبھال لی ہو۔ مجھے ایک گونہ قرار آیا۔ "چلو سات سالوں کی پہلی رات تو گذری"۔

"بیٹا!" کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے دیکھا ستر برس کی عمر کا ایک بوڑھا قیدی مجھ سے مخاطب تھا۔ شاید اسی نے مجھے جگایا تھا۔

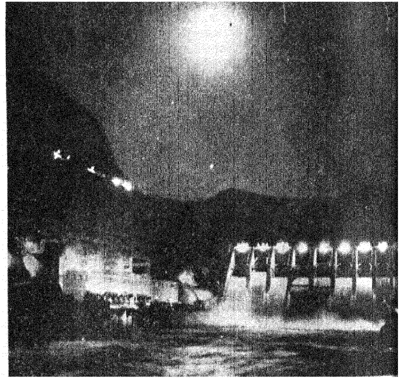
"سنئے ہو؟"

"ہاں بابا"

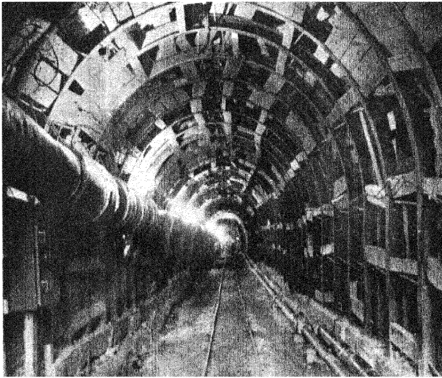
وہ مسکرا دیا۔



تقریب افتتاح : منصوبۂ ورسک — برقابی و آبپاشی کا مہتم بالشان منصوبہ جو دور انقلاب میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ھے

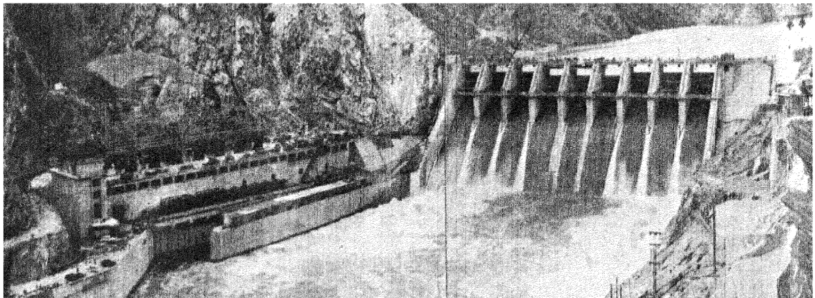


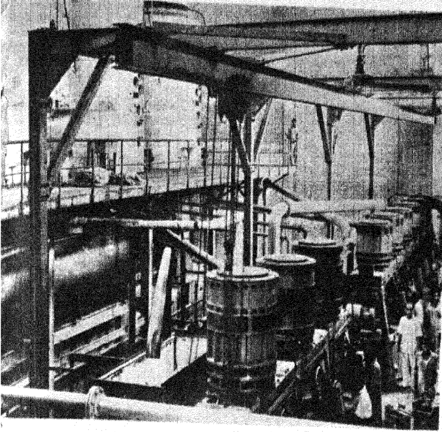
اجالے ھی اجالے — طور سینا کا طلسم!



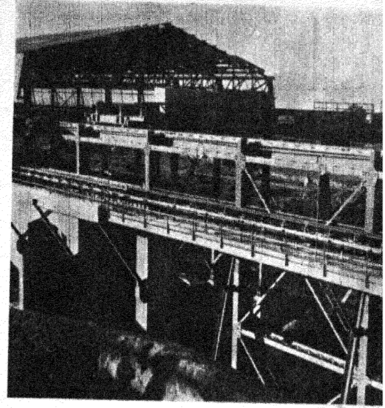
طویل سرنگ : جو زر کثیر سے پہاڑوں کا دل چیر کر گیارہ ھزار ایکڑ زمین کو سیراب کرنے کے لئے تیار کی گئی ھے

برق و آب : عظیم الشان پاور ھاوس اور ۲۶ میل لمبی جھیل!





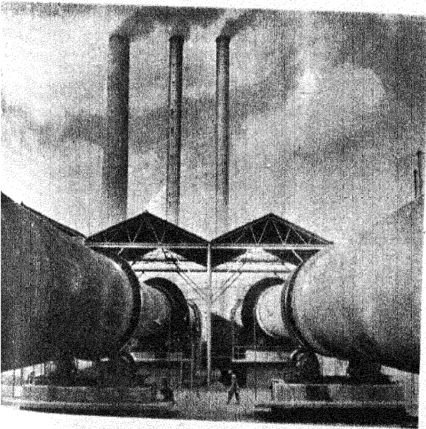
سامان تعمیر : میپل لیف کارخانہ سیمنٹ سازی، داؤدخیل



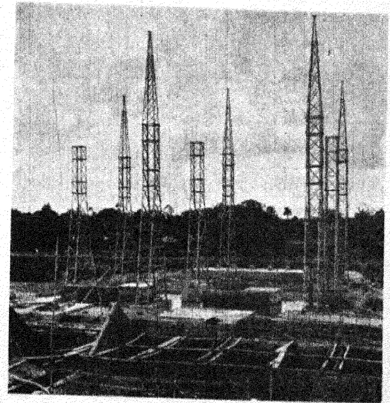
قندونبات : زیل پاک کارخانہ شکرسازی (دیوان گنج)

غرب

شرق



سیمنٹ فیکٹری - حیدرآباد



قریب تر : ڈھاکہ اور چاٹگام کے درمیان جدیدترین
لاسلکی پیام رسانی کا اهتمام

دور انقلاب میں صنعتی اعتبار سے جو تازہ بتازہ نو، بہ نو، معجزنما ترقیات ہوئی ہیں یہ کارخانے ان کی
صرف چند ہی جھلکیاں پیش کرتے ہیں

"آپ بابا! اس عمر میں یہاں کیسے ؟"

"اٹھائی گیری میں..." سفید داڑھی والے اس قیدی نے کہا۔

"تالے بھی توڑتا ہوں، جیب بھی کاٹتا ہوں۔"

"آپ؟"

"ہاں بیٹیا! حیران نہ ہو" اس نے پیار بھری مسکراہٹ سے کہا۔ "نو برس کی عمر میں پہلی جیب کاٹی تھی" اس نے آہ بھری اور بولا "وہ بخت کُش (وقت کچھ) اور تھا آج کا بخت کُش اور ہے۔ اُس بخت بندے کو بندے کی چاہت تھی، آج بندہ بندے کا دشمن ہے۔ وہ جمانا (زمانہ) الفت کا تھا یہ جمانہ ظلم کا ہے۔ پیسہ جیا ستی ہے ٹھگی چوری بھی جیا ستی ہے۔ سن بیٹیا! جب میں نے پہلی جیب کاٹی تھی... ہائے ہائے! کیا جمانہ تھا بیٹیا!" اور بڈھے نے ایسے انداز میں ایک کہانی سنا ڈالی جیسے دادا پوتے کو سنا کر سلا دیتا ہے۔

"پر بیٹیا! جیل میں گھبرائیو مت۔ روئیو مت۔ مر جاؤ گے:" اس نے میری ٹھوڑی کو رعشہ دار انگلیوں میں تھام کر کہا۔ "اپنے دل کی سنائیو، پر دوجے کی جرور سنیو۔ پھر اپنی بھول جاؤ گے۔ دنیا بڑی دُکھی ہے بیٹیا! یہ ستاون کا سن پاکستان پر بڑے ظلم کا سال ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو بیٹیا! پہ جانو گُش بھی نہیں، میں جاہل چور اچکا، پر جانوں تیرے سے جیاستی بے گناہ تختے پر لٹک گئے ہیں اس ملک میں بیٹیا! اس ملک میں نو یوں سمجھو کہ جھوٹ بولو تو تم سچے۔ سچ بولو تو گناہگار۔ قتل میں کروں، پھانسی تم پاؤ۔ اب پوچھو کیوں؟ پر میں بتاؤں نہیں تیرے کو۔ جری قیدیوں کے سینوں پہ ہاتھ رکھنا، تیرے کو جواب مل جائے گا۔ پھر سن لے بیٹیا! دل کو دُکھی نہ کریو۔ اپنی سنا کر مت روئیو۔ دوجے کی سن لیجو۔"

بڈھا کہے جا رہا تھا اور میرے سینے میں مرا پڑا ایک انسان بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ میں قید تھا، یہ انسان آزاد ہو گیا۔ میرا دل جو ڈوب چلا تھا ابھرتے سورج کے ساتھ اُبھر آیا اور میں بدلے ہوئے روپ میں قیدیوں کے انبوہِ عظیم میں تحلیل ہو گیا۔

ہم مشقت کے لئے چل پڑے۔ پھر ہم ایک میدان میں بکھر کے مشقت میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ایک بکھرے ہوئے پا بجولاں ہجوم کو دیکھا۔ میرے سامنے سوسائٹی کی لغزشوں کا ہجوم بکھرا ہوا تھا۔ آزاد زندگی اور زنداں میں صرف ایک لغزش کا ہی تو فاصلہ ہے۔ لغزش اپنی بھی ہو سکتی ہے، کسی کی بھی۔ کیا خبر کبھی قانون کی لغزش بھی کسی کو اندر لے آئے۔ یہ ۱۹۵۷ء کا سال تھا۔ جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسا جا رہا تھا۔

میں چند روز میں ہی اسیروں اور ان کی آپ بیتیوں میں جذب ہو گیا۔ اب میں سات سال کا سفر دو ہی سال میں طے کر کے سلاخوں سے نکل آیا ہوں لیکن آزاد نہیں ہوں۔ میرے ذہن میں پھانسی کا تختہ کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ ایک دھماکہ سا ہوتا ہے، میں سوتے میں چونک اُٹھتا ہوں اور پھر قید ہو جاتا ہوں — اپنے خیالوں میں قید، سیاست زدہ قیدیوں کی کہانیوں میں قید — چند ایک بیگناہوں کی گھٹی گھٹی سی آخری ہچکیاں میرے ذہن میں گونجتی رہتی ہیں۔ گونجتی ہی رہتی ہیں اور جانے کب تک گونجتی ہی رہیں گی۔ پتھروں کی دیواروں کی اوٹ سے میں چند کہانیاں چرا لایا ہوں۔ یہ حزینہ ہیں، سناؤں کیسے؟ اپنے آپ کو ہی سنایا کرتا ہوں۔ دکھ بھرے قصے کون سنتا ہے؟

جی میں آتی ہے کہ ایک بات سب کو سنا دوں۔ یہ راجہ کی کہانی ہے۔ راجہ رانی کی نہیں، ایک پڑھے لکھے دیہاتی کی کہانی۔ اس کا پورا نام تو پورا آتا تھا، ہم اسے راجہ کہا کرتے تھے کیونکہ وہ ذات کا راجہ ہے۔

میں اس وقت مغربی پاکستان کی ایک جیل میں راجہ کے ساتھ "بی کلاس" میں محبوس تھا۔ سال ۱۹۵۹ء کا تھا۔ راجہ پینتیس چھتیس برس کی عمر کا بھرپور جوان تھا، پانچ دریاؤں کی مٹی کا شاہکار۔ قتل کے جرم میں عمر قید بھگت رہا تھا۔ زندہ دل آدمی تھا لیکن میں اسے اکثر خلاؤں میں تکتے یا کسی تصور میں گم دیکھا کرتا تھا۔ وہ تصور یقیناً حسین تھا کیونکہ ایسی خود فراموشی میں اس کے ہونٹوں پر مسرت سے لبریز مسکراہٹ ہوتی تھی۔

راجہ باتیں کم کرتا تھا اور سوال زیادہ پوچھا کرتا تھا۔ اس کے بیشتر سوالات عشق و محبت کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ "دل کی لگی اپنی لگائی ہوئی ہوتی ہے یا خود لگ جاتی ہے؟ یا کوئی آ کے لگا جاتا ہے؟ محبت میں عورت ثابت قدم ہوتی ہے یا مرد؟ کیا عورت کے سینے میں دیوتاؤں کی قوت نہیں ہوتی کہ وہ محبت کی راہ سے پہاڑ کو بھی ہٹا لیتی ہے؟" بعض اوقات وہ ایک آدھ محبت بھری کہانی بھی سنا دیا کرتا تھا لیکن سوالیہ انداز میں۔ حاضرین محفل سے سوال پوچھے جاتا تھا اور انہی کے جوابوں سے کہانی مرتب ہو جاتی تھی۔

راجہ کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ سی کھیلتی

رہتی تھی جو سوتے وقت اور زیادہ کھِل جاتی تھی۔ بعض اوقات وہ نیند میں کھِل کے مسکرایا کرتا تھا۔ جب وہ محبت کی کوئی داستان سنایا کرتا تھا تو سنا کے گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا۔ ایسے میں ہزار جھنجھوڑو وہ محفل سے لاتعلق ہی رہتا تھا، خیالوں کی لہروں پہ تیرتا، جانے کونسے دیس جا پہنچتا تھا۔ اس کا تبسم اور خود فراموشی اسے دوسرے قاتلوں سے ممیز کرتی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے ذہن میں ایک من بھاتی دنیا بسائی ہوئی تھی۔ اس مقید زندگی سے بھاگ کر وہ اسی دنیا میں جا پناہ گزیں ہوتا تھا۔

اس نے اپنے جرم کی داستان کبھی نہیں سنائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے جو قتل کیا ہے اس کا پس منظر بڑا ہی عجیب وغریب اور غیر معمولی ہوگا یا شاید خون اس کے اعصاب پر ابھی تک سوار تھا اور وہ تصور پرستی کو ذریعۂ فرار بنائے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے دل میں جھانکنے کی بہت کوشش کی لیکن راجہ نے کچھ ایسے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ اسی قدر بتایا کرتا تھا کہ وہ قاتل نہیں ہے بے گناہ ہے۔

جیل میں میرا زیادہ تر وقت لکھنے میں گذرتا تھا۔ کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ ایک دن راجہ میرے پاس آ بیٹھا اور پوچھا کہ میں کیا لکھتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "کہانیاں" بولا "کیسی کہانیاں؟" میں نے کہا "عشق ومحبت کی، دکھ درد کی، ہنسی مذاق کی، قربانی اور ایثار کی اور جو کچھ جی میں آئے لکھ ڈالتا ہوں" راجہ یوں ہنس پڑا جیسے اپنے آپ میں کسی مذاق سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس نے میرے دو چار افسانے سنے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بیٹھا میرے پاس تھا لیکن اس کی آنکھیں دور، بہت دور، خلاؤں سے بھی آگے، جانے کس چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید لمحات کے اس کارواں کو جو افق سے اس پار ماضی کی گرد میں روپوش ہو چکا تھا۔

راجہ میرے قریب آنا شروع ہوا اور چند روز میں بے تکلف ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بات کرنے سے گریز کرتا ہے لیکن اس کے قریب ہو کر معلوم ہوا کہ وہ بات کرنے کو تڑپ رہا تھا۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ اس کا سینہ جیسے پھٹا جاتا تھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ میں دکھ کا تاثر جھلک اٹھا تھا۔

"تم معجزوں کو مانتے ہو؟" ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں!"

"تم مانتے ہو کہ ہم جیسے انسانوں کی زندگی میں بھی معجزہ ہو سکتا ہے؟"

"نہیں!" میں نے اسے گرمانے کے لئے کہہ دیا۔

اس نے میرے زانو پر ہاتھ مارا اور قدرے اچھل کر شگفتہ لہجے میں کہا "ہو سکتا ہے۔ میری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہو چکا ہے، اب ایک اور ہوگا!" اور خلاؤں میں یوں دیکھنے لگ گیا جیسے اسے وہ معجزہ نظر آ رہا تھا۔

جون ۱۹۵۹ء کی تپتی دوپہر تھی۔ ہم دونو "بی کلاس" کی کوٹھڑی میں بیٹھے تھے۔ کوٹھڑی تنور کی طرح تپ رہی تھی۔ راجہ کے چہرے کا تاثر یکسر بدلا ہوا تھا۔ تبسم کی شگفتگی اور کھِل اٹھی تھی۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے اس کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنی داستان سنا رہا تھا۔

راجہ پنجاب کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ واجبی سی تعلیم بھی تھی۔ ۱۹۵۲ء کی ایک رات اس کی گھوڑی چوری ہو گئی۔ اس گھوڑی کے ساتھ اسے بے پناہ محبت تھی۔ راجہ پاپیادہ گھوڑی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور ایک مہینہ گاؤں گاؤں مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن گھوڑی کا سراغ نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر اپنے گاؤں کو روانہ ہوا۔

راستے میں ایک گاؤں سے بارہ میل دور رات آ گئی۔ راجہ قریب ہی ایک گاؤں میں چلا گیا اور ایک گھر میں جا مہمان ہوا۔ کوئی جان پہچان نہیں تھی تاہم گھر والوں نے اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ گھر والوں کا اکلوتا بیٹا، شیر خاں، جو فوج میں لیس نائک تھا، ایک ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ چوبیس پچیس برس کا خوبرو نوجوان اور سپاہیانہ حسن وجلال کا نمائندہ مجسمہ۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو راجہ نے شیر خاں کو اپنی گھوڑی کی چوری کا واقعہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ خریدنے کو ایسی چار گھوڑیاں خرید سکتا ہے لیکن اس گھوڑی سے اسے عشق ہو گیا تھا۔ اس نے گھوڑی کی محبت کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جیسے کسی حسین وجمیل لڑکی کی محبت کی رومان انگیز داستان سنا رہا ہو۔ اس کے آنسو بھی نکل آئے تھے۔

لیس نائک شیر خاں کے دل پر اس محبت بھری داستان اور داستان سنانے والے کے دکھ بھرے انداز نے کچھ ایسا اثر کیا کہ ایک

داستان جسے شیر خاں جانے کب سے سینے میں چھپائے چھپائے پھر رہا تھا، ابھر کے باہر آگئی۔ اس نے آہ بھر کر کہا "راجہ! نہیں ایک گھوڑی سے محبت ہے مجھے ایک لڑکی سے عشق ہے"۔ اس نے راجہ کو ہمراز اور ہمدرد بنا کر تفصیل سنا ڈالا کہ دس میل دور ایک گاؤں میں ایک لڑکی راجو ہے جسے وہ دل میں بٹھا چکا ہے اور راجو اسے دل میں بسا چکی ہے۔ راجو سترہ اٹھارہ برس کی عمر کی کنواری لڑکی تھی جو سر دھڑ کی بازی لگا کر شیر خاں کو رات کے اندھیروں میں ملا کرتی تھی۔

باقی تمام رات راجہ اور شیر خاں کا موضوع گھوڑی اور راجو رہا۔ صبح طلوع ہوئی تو رات کے اجنبی گہرے دوست بن چکے تھے۔ شیر خاں، راجہ کے ساتھ اس کے گاؤں تک آیا اور رات رہ کر واپس چلا گیا۔

پانچ روز گذرے ہونگے۔ نصف شب کا عمل تھا۔ راجہ کا گاؤں ہریالی کی سیج پہ گہری نیند سو رہا تھا کہ دیہات کی پُرسکون فضا کا معصوم سا ٹھہراؤ سرپٹ بھاگتے ہوئے کسی گھوڑے کی ٹاپوں سے تہہ و بالا ہونے لگا۔ گھوڑے کی آہٹ پاکر بھونکتے ہوئے کتوں سے بے نیاز راجہ کے دروازے پہ آرکی۔ راجہ سو رہا تھا کہ دروازے پہ دستک نے اُسے جگا دیا۔ اس نے لالٹین جلا کر، اسے ہاتھ میں اٹھائے دروازہ جا کھولا۔ اسے خواب کا دھوکہ ہوا۔ ہونا ہی تھا، دروازے پر اس کی گمشدہ گھوڑی کھڑی تھی۔ گھوڑی کو دیکھ کر راجہ تو جیسے دیوانہ ہو گیا۔ لالٹین رکھ کر اس کے گلے لگ گیا، بوسے لیئے اور رہ رہ کر اس کی گردن سے لپٹا۔ اپنی محبوب گھوڑی میں وہ اسقدر کھو گیا کہ اس کے سوار کو دیکھ ہی نہ سکا۔

سوار نے بڑھ کر راجہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو طلسم ٹوٹ گیا۔ راجہ نے چونک کر دیکھا۔ شیر خاں گھوڑی کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ مسکرا کر بولا "لو راجہ! تمہاری ہیر کو لے ہی آیا ہوں"۔ راجہ شیر خاں کے ساتھ لپٹ گیا۔ اسے کھینچ ہی رہا تھا کہ ٹھٹھک گیا۔ شیر خاں کے جسم سے تازہ خون کی بو آرہی تھی۔ راجہ نے لپک کر بتی اٹھائی اور شیر خاں کو غور سے دیکھا۔ پیٹھ پر اس کی قمیض خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ کان کے قریب سر سے بھی خون بہہ رہا تھا اور فوجی جوان مسکرا رہا تھا۔ راجہ نے گھبرا کر پوچھا "یہ کیا؟" پیشتر اس کے کہ شیر خاں جواب دیتا اسے غش آگیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی لگا تھا کہ راجہ نے اُسے بازوؤں میں تھام لیا۔

راجہ کی بیوی بھی جاگ کے باہر آگئی۔ دونوں نے شیر خاں کو اٹھا کر اندر چارپائی پہ لٹایا۔ زخم دیکھے۔ پیٹھ پہ کلہاڑی کے دو زخم تھے اور سر پہ لاٹھیوں کی ضربیں۔ زخم گہرے نہیں تھے لیکن خون زیادہ بہہ جانے سے شیر خاں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میاں بیوی نے گرم پانی سے اس کے زخم دھوئے۔ پھر ان میں کورے سوت کو جلا کر اس کی راکھ بھر دی۔ اوپر دیسی شراب میں بھیگی ہوئی پٹیاں باندھ دیں۔ ہلدی رگڑ کر میٹھے تیل میں پکائی اور سر کی چوٹوں پہ باندھ دی۔ دودھ میں گھی ڈال کے پلایا اور تمام رات اس کی تیمارداری میں جاگتے رہے صبح اس کے گاؤں آدمی بھیجا۔ اس کے ماں باپ اُسے لینے آئے تو راجہ نے جانے نہ دیا۔ بولا تندرست ہوئے بغیر نہیں جانے دونگا۔

شیر خاں نے اسے بتایا کہ محض اتفاق سے اُسے راجہ کی گھوڑی کا سراغ ملا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ گھوڑی کشمیر کی سرحد سے چند میل اس طرف ایک گاؤں میں تھی۔ یہ گاؤں شیر خاں کے گاؤں سے آٹھ میل دور تھا۔ گھوڑی سرحد پہ جارہی تھی۔ سودا طے ہو چکا تھا۔ راجہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق شیر خاں نے گھوڑی پہچان لی جو ایک درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ زین کسی ہوئی۔ شیر خاں نے گھوڑی کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ وہ تین آدمی تھے۔ انہوں نے انکار کیا تو شیر خاں نے انہیں للکارا۔ وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لئے مقابلے پر آکھڑے ہوئے۔ شیر خاں خالی ہاتھ تھا، ایک لاٹھی کا وار سر پہ لے کر وہی لاٹھی چھین لی اور جم کے مقابلہ کیا۔ وہ لڑتا بھی رہا اور گھوڑی کھولنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اسی کوشش میں پیٹھ پہ دو وار لئے۔ آخر اس نے گھوڑی کھول ہی لی اور ایک ہی جست میں گھوڑی کی پیٹھ پہ جا بیٹھا۔ ایڑ لگائی اور ہوا ہو گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی، آگے بیس میل کی اندھیری مسافت تھی، پیٹھ اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اس جوانمرد سپاہی نے ہوش ٹھکانے رکھے۔ اپنا خون ٹپکاتا اور گھوڑی کا پسینہ بہاتا راجہ کے ہاں پہنچ گیا۔

چودہ پندرہ دنوں میں اس کے زخم ٹھیک ہو گئے اور وہ اپنے گاؤں جانے کے قابل ہو گیا۔ ان چودہ پندرہ دنوں میں شیر خاں نے راجہ کو بتایا کہ چھٹی کے دوران وہ راجو سے دو بار ملا ہے اور وہ اس کے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہے۔

"سب سے بڑی مشکل یہ ہے" شیر خاں نے دکھ بھرے لہجے میں

کہا "کہ اسمبلی کا ایک ممبر، جو بہت بڑا زمیندار بھی ہے، لڑکی کا امیدوار ہے وہ راجو کے ماں باپ پر روپوں اور نوازشوں کی بارش کر رہا ہے۔ اس نے دو چار ایکڑ زمین بھی ان کے نام کر دی ہے۔ اس کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں اور عمر پچاس سے کہیں زیادہ ہے۔ راجو کے ماں باپ نے ہاں کر دی ہے اور وہ دن رات رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے" شیر خاں نے بتایا "پچھلی بار میں راجو سے ملا تو وہ میرا دامن چھوڑتی ہی نہیں رہی تھی۔ کہتی تھی ابھی لے چلو۔"

راجہ اسمبلی کے اس ممبر کو جانتا تھا۔ اسمبلی کے ان ممبروں کو کون نہیں جانتا تھا۔ جو نہیں جانتا تھا اسے ان کی موجودگی کا احساس کسی نہ کسی طرح دلا ہی دیا جاتا تھا۔ راجہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اس سے ابھر کر بولا "تم نے میری محبوبہ مجھے لا دی ہے، میں تمہیں تمہاری محبوبہ دلاؤں گا۔ تم میری محبت کی خاطر جان پہ کھیلے ہو، میں تمہاری محبت کی خاطر جان پہ کھیل جاؤں گا۔"

"لیکن یہ نہ بھولنا راجہ! کہ آجکل اختیار ان ہی ممبروں کے ہاتھ میں ہے۔"

"خدا کے ہاتھ میں ہے۔" راجہ نے جذباتی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"پھر بھی، راجہ!" شیر خاں نے کہا۔ "ذرا سنبھل کے۔"

"اللہ مالک ہے۔" راجہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "تم یہ کام میرے سپرد کر دو۔"

شیر خاں نے راجہ کو راجو کے گاؤں کا اتا پتا بتایا ہوا تھا۔ جب وہ تندرست ہو گیا تو راجہ نے اسے اپنی محبوب گھوڑی پہ بٹھایا اور خود پیدل چلتا ہوا اسے اس کے گاؤں جا چھوڑا۔ شیر خاں نے رات رکنے پہ اصرار کیا لیکن راجہ نہ مانا۔ وہ کسی اور دُھن میں تھا۔ شیر خاں سے رخصت ہو کر اسمبلی کے اس بوڑھے ممبر کے قصبے کی طرف چل پڑا۔

یہ قصبہ وہاں سے چودہ میل دور تھا۔ قصبے کے وسط میں ایک محل نما مکان تھا۔ وہ ممبر اسی محل میں رہتا تھا۔ ایک بار شکار کے دوران اس نے راجو کو دیکھا تھا اور شکار بھول کر راجو کے لئے جال ڈال دیا تھا۔ راجہ اس سے ملا اور بغیر تمہید کے اسے کہا کہ وہ ایک نوخیز کلی کو یوں بے دردی سے نہ مسلے وہ غریب ہی سہی اور غریب خریدے بھی جا سکتے ہیں، لیکن ان کی امنگوں کو نہ خریدو۔ راجہ نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ اس کے ہاں پہلے ہی دو بیویاں موجود ہیں اور وہ راجو کے دادا کی عمر کا ہے اور یہ بھی کہا کہ وہ دولت اور حاکمیت کے نشے میں ایک معصوم دوشیزہ کی بددعائیں نہ لے لیکن وہ ممبر بے نیازی سے آنکھیں بند کئے حقّے کے کش لگاتا رہا۔ آخر راجہ نے یہ بھی کہہ دیا کہ جس لڑکی کو وہ خرید رہا ہے وہ شیر خاں کو اپنا بنا چکی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بوڑھے ممبر نے ایک آنکھ کھولی اور اس قدر کہا "تم خوش قسمت ہو کہ میرے مہمان ہو ورنہ میں کسی کو دوسری بات کرنے کا موقع نہیں دیا کرتا۔"

راجہ نے اس کی منتیں بھی کیں۔ خدا اور رسول کے فرمان بھی یاد دلائے لیکن جو بزعم خود "ایک خدا" بنا ہوا تھا وہ اصلی و حقیقی خدا کے فرمان کو کیونکر قبول کرتا۔ راجہ نے یہ بھی کہا "آپ کے پاس دولت ہے، حکومت آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ چاہیں تو سینکڑوں لڑکیاں خرید سکتے ہیں۔ ایک راجو نہ ہوئی تو کیا۔"

اسمبلی کے بوڑھے ممبر نے اب دوسری آنکھ بھی کھول دی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ حاکم وقت ہے اور سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ فرعون جاگ اٹھا۔ اس نے راجہ کو ایک فحش گالی دی اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔

راجہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "تم راجو کو نہ پا سکو گے۔ راجو کا بیاہ لیس نائک شیر خاں سے ہو گا۔ تمہارے پاس دولت ہے، میرے پاس خون ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بوڑھے جاگیردار کے سینے پہ ہاتھ مارا اور محل سے باہر نکل گیا۔ گھوڑی پہ بیٹھا اور راجو کے گاؤں کا رخ کیا۔

راجہ راجو کے باپ سے ملا۔ اس کی منتیں کیں کہ راجو کا رشتہ شیر خاں کو دے دے۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ آخر راجہ نے اسے شرم دلائی کہ وہ نوجوان لڑکی کو بوڑھے کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔ اس پہ باپ کے آنسو نکل آئے۔ بولا "تجھے پہاڑوں سے ٹکراتے ہو؟ ہم تو اسی کا دیا کھا رہے ہیں جو ہم سے لڑکی مانگ رہا ہے۔ ہم نے اسے لڑکی نہ دی تو ہمارا آن پانی بند ہو جائے گا۔ وہ بادشاہ ہے، ہماری زمینیں ضبط کرا دے گا۔" یہ سن کر راجہ بھی چپ ہو گیا اور وہاں سے نکل آیا۔

راجو صحن میں بکھر رہی تھی۔ راجہ نے مجھے یہ روئداد سناتے ہوئے کہا "میرے دوست! تم نے حسن دیکھا ہو گا، ایک بار راجو کو دیکھو تو غش کھا جاؤ۔ قسم پروردگار کی! حسن کے اس پتلے پر سو شیر خاں

قربان! خدا جیسے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں اور نقش بناتا رہا ہے۔ جسم کی بناوٹ ایسی کہ بالیوں کے بل رک جائیں۔ شیر خاں سچ مچ پاگل ہو رہا تھا۔"

راجو نے راجہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے راجہ کی باتیں سنیں تو گھر سے نکل آئی۔ راجہ مایوس ہو کر گاؤں سے نکلا اور باجرے کے اونچے اونچے کھیتوں میں سے گزرتا اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ "ذرا ٹھہرنا!" پیچھے سے آواز آئی۔ وہ رک گیا۔ گھوم کے دیکھا۔ راجو آ رہی تھی۔ وہ گھوڑی سے اتر پڑا۔

"کون ہو تم؟"

"شیر خاں کا دوست" راجہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "لوگ پگڑی بدلتے ہیں، ہم نے خون کے قطرے بدلے ہیں۔"

"اللہ تیری جوانی میں اور خون ڈالے۔" راجو راجہ کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں چھو کر کہا "میرے خون کا قطرہ قطرہ شیرو پر قربان۔ مجھے اسی کے پاس لے چل۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے مجھے کس دوزخ میں پھینکا جا رہا ہے۔" راجہ نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا تو راجو زار و قطار رونے لگ گئی۔ "تیری گھوڑی جئے میرے سگے ویرا! اسی پہ بٹھا کے لے چل۔"

راجہ کے جذبات امنڈ آئے۔ ایک ولولہ شعلے کی طرح بھڑکا۔ اس نے ہاتھ راجو کے سر پہ رکھ دیا۔ بولا "سگا ویر بہن کو اسی گھوڑی پہ لے جائے گا۔"

راجو کانپ سی گئی۔ اس نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر چوما، پھر اپنے گالوں پہ رکھا اور جذبات سے مغلوب ہو کر بولی "قسم کھاؤ تم پیٹھ نہ دکھاؤ گے۔ قسم کھاؤ دستگیر پیارے کی کہ تم ہمیں دھوکہ نہ دو گے۔"

راجہ نے قسمیں کھائیں اور اسے جذبات کے جوار بھاٹے سے نکال کر اپنے ساتھ فرار ہونے کی عملی صورت پہ بات چیت کی۔

"جب آؤ گے چلوں گی۔" راجو نے کہا۔ "لیکن رات کو آنا۔ اسی جگہ کھڑے ہو کر گیدڑ کی طرح تین دفعہ چیخنا اور میں پہنچ جاؤں گی۔ شیرو مجھے اسی طرح بلایا کرتا ہے۔ اس سے پوچھنا میں آواز سنتے ہی آ جاتی ہوں، یا نہیں۔"

"میں آؤں گا، دو رات بعد۔"

"لیکن تم ہی آنا" راجو نے کہا۔ "شیرو کو نہ بھیجنا۔"

"کیوں؟" راجو چونکا۔

"اس لئے..... صرف اس لئے کہ.....؟" وہ جھجک سی گئی، پھر یکبارگی بولی "ایسے موقعوں پر پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ قتل ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قتل ہو جائے۔"

"تو تم مجھے قتل کرانا چاہتی ہو؟" راجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے تین بچوں کو یتیم کرنا چاہتی ہو؟"

"میرے ویرا" راجو نے لجاتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "دوست دوستوں کی خاطر قتل ہوا ہی کرتے ہیں نا!..... مگر۔ نہیں، میرا ویر زندہ رہے گا پہلے تو اس کی یہ بہن مرے گی۔"

راجہ نے مجھے بتایا کہ راجو نے یہ فقرہ کچھ ایسے پُرعزم لہجے میں کہا تھا جیسے اس کے سینے سے کوئی غیبی طاقت بول رہی تھی۔ آواز مختلف، لب و لہجہ مختلف اور اس کے چہرے کا تاثر بالکل ہی بدل گیا تھا۔

وہاں سے راجہ، شیر خاں کے گاؤں گیا اور اسے تمام روداد سنائی۔ شیر خاں نے اسے بتایا کہ اس کی چھٹی میں چار روز باقی ہیں۔ تیسری رات وہ گاڑی پہ جا رہا ہے۔ ویران سا ریلوے سٹیشن چھ کوس دور تھا جہاں نصف شب کے بعد ایک مسافر گاڑی دو منٹ کے لئے رکتی تھی۔ راجہ اور شیر خاں نے سکیم طے کر لی تھی۔

تیسری رات کی تاریکی میں راجہ گھوڑی پہ سوار، ہاتھ میں بھری ہوئی دونالی بندوق اٹھائے راجو کے گاؤں کے قریب جا کر تین دفعہ گیدڑ کی طرح چیخا۔ گھوڑی ہنہنائی اور گاؤں کے کتے یکبارگی بھونک اٹھے۔ پندرہ منٹ کے بیتابانہ انتظار کے بعد باجرے کی فصلوں پر تیرتا ہوا ایک سر راجہ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ گاؤں والوں کو کتوں نے یکبارگی بھونک کر جگا دیا تھا۔ راجو پہنچ گئی۔ راجہ نے جھک کر راجو کو اٹھا لیا اور اپنے آگے گھوڑی پہ بٹھا لیا۔ راجو بولی "جلدی، لوگ جاگے ہوئے ہیں۔" ادھر گاؤں میں سے آواز آئی "خبردار بھگا دئیے! ہوشیار ہو کے۔" پیشتر اس کے کہ گاؤں والے کچھ دیکھ پاتے راجہ کی گھوڑی راجہ اور راجو کو اٹھائے گاؤں کو دو میل پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

پو پھٹی ویران سے سٹیشن میں مسافر گاڑی کی روشنی داخل ہو چکی تھی۔ شیر خاں ایک درخت کے اندھیرے سائے میں کھڑا یوں گاڑی

کی تپتی کو بے قراری سے دیکھ رہا تھا، جیسے اسے وہیں روک دینا چاہتا ہو۔ ابھی راجو نہیں پہنچی تھی۔ ادھر گاڑی بڑھتی چلی آ رہی تھی، ادھر گھوڑوں کے قدموں کی آواز شیر خاں کی طرف بڑھنے لگی۔ شیر خاں بھاگا۔ راجہ نے باگیں کھینچ لیں اور راجو چھلانگ لگا کر شیر خاں کے بازوؤں میں آ گری۔

گاڑی سٹیشن پر بمشکل رکی ہی تھی کہ انجن نے روانگی کی وسلیں دینی شروع کر دیں۔ شیر خاں نے راجو پہ چادر ڈال دی اور راجہ سے بغلگیر ہو گیا۔ راجو نے راجہ کے ہاتھ چومے، پھر گھوڑی کی گردن کے بوسے لئے اور بولی "میرا دیر جئے، دیر کی گھوڑی جئے۔"

شیر خاں اور راجو گاڑی کی طرف بھاگے۔ راجہ نے بندوق لہرا کر انہیں الوداع کہی۔ گاڑی چلی گئی۔ ریلوے سٹیشن پھر ویران ہو گیا۔

راجہ نے سکون کا سانس لیا اور فتح سے لبریز آہ بھری۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے دوست کے ایثار کی قیمت ادا کر دی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ یہ اس قیمت کا عشر عشیر بھی نہیں تھا جو اسے ابھی ادا کرنا تھی۔

تیسری شام راجہ کے ہاں دو آدمی آئے اور بغیر سلام دعا کے اسے دھمکی بھرے لہجے میں کہا کہ لڑکی واپس کر دو۔ اسمبلی کے ممبر کو یقین تھا کہ راجو کے اغوا میں راجہ کا ہاتھ ہے۔ راجہ نے لاعلمی کا اظہار کیا تو دونوں آدمی اسے دھمکی دے کر گھورتے ہوئے چلے گئے۔ مسلسل آٹھ روز ممبر اور راجو کا باپ راجہ اور شیر خاں کے ماں باپ کے پیچھے پڑے رہے۔ آخر ایک روز ممبر راجہ کے گھر آیا۔

"لڑکی لوٹا دو یا چکی میں پسنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اس نے راجہ کو دھمکی دی۔

"لڑکی کو میں نے ہی اغوا کیا تھا۔" راجہ نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا۔ "وہ شیر خاں کے ساتھ بیاہی جا چکی ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا راجو، شیر خاں سے بیاہ کرے گی؟ جاؤ اب زور لگا لو۔"

"میں تمہیں قتل نہیں کراؤں گا" حاکم زمیندار نے کہا۔ "ایسے شکنجے میں جکڑ دوں گا تمہیں کہ تمہاری رگ رگ کا خون نچوڑ لوں گا۔"

راجہ نے یہ چیلنج بھی قبول کر لیا۔

چوتھی صبح طلوع ہو رہی تھی کہ راجہ کو بیوی نے جگایا۔ وہ ڈری سہمی ہوئی تھی۔ بولی "پولیس آئی ہے۔"

راجہ باہر نکلا تو پولیس کے ایک انسپکٹر نے اسے وارنٹ گرفتاری دکھائے۔ اسے بتایا گیا کہ اسمبلی کے اس ممبر کے ایک مزارع کے قتل کے الزام میں اسے گرفتار کیا جا رہا ہے۔ راجہ نے بات تک نہ کی کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا، نہ یہ پوچھا کہ قتل کہاں ہوا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کر دیئے اور ایک سپاہی نے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

استغاثہ کی کہانی ایسی خوبی سے گھڑی گئی تھی کہ راجہ کا وکیل چکرا گیا۔ کہانی کا تانا بانا ایسے طریقے سے تیار کیا گیا تھا کہ راجہ بری طرح الجھ گیا۔ استغاثہ کے گواہوں نے ایسی چابکدستی سے جھوٹ بولے کہ وہ فی الواقع موقع کے گواہ معلوم ہوتے تھے۔ حد یہ کہ ایک سرکاری ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی پیش کر دی اور کیس مکمل ہو گیا۔ شہادتیں اور ثبوت مکمل ہو گیا۔ مقتول کی لاش کہاں تھی؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔

راجہ کو سزائے موت دے دی گئی۔

راجہ نے زمین بیچ کر ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

پشاور سے راجو اور شیر خاں اسے ملنے آئے۔ وہ پھانسی کی کوٹھڑی میں تھا۔ راجہ کو توقع تھی کہ راجو روئے گی اور اپیل کی منظوری کی دعائیں کرے گی لیکن اس کے چہرے کا تاثر یوں تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس نے راجہ کو حوصلہ اور تسلی دی اور سلاخوں میں سے ہاتھ اندر کر کے راجہ کے ہاتھ تھام کے کہا۔

"میرا دیر زندہ رہے گا۔"

ہائی کورٹ نے ایک سال بعد اپیل مسترد کرتے ہوئے سزائے موت بحال رکھی۔ استغاثہ کی کہانی مکمل تھی۔ بظاہر قانون کے سارے تقاضے پورے تھے۔

شیر خاں نے کچھ زمین بیچی۔ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ راجو اور شیر خاں ایک بار پھر راجہ سے ملنے آئے تو راجو نے پھر وہی بھرپور اعتماد ظاہر کیا۔

دس ماہ بعد سپریم کورٹ نے بھی اپیل مسترد کر دی اور سزائے موت بحال رکھی۔

راجہ کی بیشتر زمین مقدمے کی نذر ہو چکی تھی۔

پھر گورنر کے حضور رحم کی درخواست بھیجی گئی جو دفتری مراحل طے کرتی ہوئی ایک سال بعد نامنظور ہو گئی۔ باقی صفحہ ۱۳۰ پر

کوِی دا

آدم جی ادبی انعام (بنگلا ۱۹۶۰ء)

تصنیف : سید عبدالستار (بلیس رسنا)

ترجمہ : یونس احمر

کردار

نام		نام	
قاضی نذرالاسلام	کوِی دا	شرت پنڈت	اسکول ماسٹر
بلبل	نذرل کے تین لڑکے	عباس الدین احمد	عظیم موسیقار
لبتو ساچی		پروفیسر ہیم دت گپتا	نذرل کے خیرخواہ
اونی رودھو		برنیدر اسین گپتا	(بیراج سندری کا لڑکا)
پراباہ — (کوی دا کے بچپن کا دوست)	کوی دا کے دوست احباب	ہمنت کمار سرکار	کانگریسی لیڈر
منظر احمد		عبدالحمید	نذرل کا پرستار
پوتر گنگولی		نرگس اثر خانم	نذرل کی پہلی بیوی
شیلجانند مکرجی		پرامیلا دیوی (آشالتا سین گپتا)	نذرل کی دوسری بیوی
نراپندراکرشن چٹرجی		گریبالا دیوی	پرامیلا کی ماں
نلین کانت سرکار		بیراج سندری دیوی	پرامیلا کی چچی
قاضی عبدالودود		کملا	بیراج سندری کی لڑکی
خان معین الدین		چھایا	پرامیلا کی سہیلی
شانتی پد سنگھ		لتیکا گھوش	نرس

"منظر : تخیل"

نذرل کی خوابگاہ

خاموش اور ساکت رات۔ پچھلے حصہ میں ایک چارپائی پر نذرل اکیلا ہی محوِ خواب ہے۔ بستر پر پہلے ہلکی تاریکی رہتی ہے، پھر اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سازینہ جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بستر پر رنگین روشنی کی پھوار سی گرنے لگتی ہے۔ خواب کی دیوی داخل ہوتی ہے۔ درمیان میں باریک ہلکا پردہ ہو لٹک رہا ہے۔ پردے کے اس سمت نیند کا ماتا نذرل ہے۔ تمثیل کے آہنگِ پُرخروش میں ڈوبا ہوا رقص سامنے آتا ہے۔ جس سے نیند کے ماتے نذرل کے شباب کی والہانہ کیفیت کا اظہار مقصود ہے چہرے پر بھرپور جوانی کا جوش جھلکا پڑتا ہے۔

(پس منظر سے آواز)

"کون جانے میں اکیلا مسافر کہاں جا رہا ہوں؟
دونوں طرف دکھ سکھ کے دو کنارے ہیں اور درمیان میں میں ہوں
اور پانی کی لہریں!
زندگی کے پربت سے ٹوٹتے ہوئے اپنے ہی بہاؤ میں بہا جا رہا ہوں۔
ایک رہ گذر سے دوسری رہ گذر کی طرف، دن رات چین
آرام سے بے پروا!
میں بھاگا جا رہا ہوں، نہ جانے کہاں اور کچھ نہیں کہ دونوں طرف

میرے لئے دام بچھاتے ہیں۔
شاید وہ سمجھتے ہیں کہ میں پہاڑوں کو چیر کر اُن ہی کی طرف آرہا ہوں۔"
نیند کا ماتا نذرل ــــ اوّل اوّل اس کے چہرے پر مسرت و انبساط
کی چمک ہے۔ وہ پرسکون ہے۔ لیکن پھر اس کے رگ و پے میں بجلی کی
سی کیفیت سماجاتی ہے۔

(پس منظر سے آواز)

"میں جانتا ہوں، مجھے سب معلوم ہے کہ دونوں کناروں سے وہ
والہانہ انداز میں بلا رہی ہیں اور جھیل کی طرف سے کنول کی آواز آرہی ہے۔
اب رک بھی جاؤ، ہمیں اک گھر بسانا ہے۔"
باہر سے نرگس داخل ہوتی ہے۔ ایک تمثالِ خوبی، جمالِ عالمتاب
بھرپور جوانی، چال میں رقص کی دلربائی لئے ہوئے۔

(پس منظر سے آواز)

"میں کُمن کُمن کرتی ہوئی رواں دواں ہوں ــــ بہتی جا رہی ہوں۔
گھر میں عورتیں سرگوشیاں کر رہی ہیں کہ میرا ساحل کہاں ہے ــــ
مگر میں نہیں سنتی۔
سوداگر کی بیٹی جو ٹھہری ہیں ــــ میری ناؤ لعل و گہر سے لدی
ہوئی چلی جا رہی ہے۔"
نیند کے ماتے نذرل کے سامنے نرگس نمودار ہوتی ہے ــــ
نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ حیرت و استعجاب اور مسرت و خوشی کی فضا میں
دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یکایک اندیشہ ہائے دور دراز کی گہری
پرچھائیں چہرے پر پڑتی ہے۔ اور نذرل بڑی تیزی سے باہر نکل جاتا
ہے۔ نرگس بھی عالمِ اضطراب میں اس کے ساتھ ہی نکل جاتی ہے۔ کچھ
دیر کے لئے اسٹیج پر اندھیرا سا رہتا ہے۔ روشنی مدھم ہے ــــ ساز
بج رہا ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"بدبخت حسینہ چھپ چھپ کر آدھی رات کو میری طرف آتی ہے۔
میں اُس سے کہتا ہوں ــــ چل اے ماہِ درخشاں میرے
ساتھ کہ تیری شکل جانی پہچانی ہے۔"
پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ روپ کی رانی، سندری۔ جو
دیکھے اُس کے دل پر خنجر سا چل جائے۔ نذرل اُسے دیکھ رہا ہے۔ پھر
آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ محبت کا وار چل چکا ہے لیکن فوراً ہی
نذرل کے دل میں نرگس سما جاتی ہے۔ وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ اور پرامیلا
یکایک اُس کے نزدیک آجاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ساز بجنے لگتا ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"وہ لہروں میں غائب ہو جاتی ہے،
میں اپنی راہ لیتا ہوں اور میرے حافظے کی ریت کے ڈھیر
میں اُس کا حُسن کب کا ڈھک چکا ہے۔"
پرامیلا خوف سے کانپ رہی ہے اُدھر نیند کا ماتا نذرل
بے چین ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"ربِ عظیم! یہ کیسی تشنگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی!
تشنگی کہاں ہے؟ کہاں ہے تشنگی؟"
نذرل کے پیچھے پیچھے نرگس کی پرچھائیں ہے ــــ سیاہ
لباس اور غمزدہ چہرہ تاکہ نذرل کی نگاہ اُس پر نہ پڑ سکے۔ اُس کی
آنکھوں میں نفرت کی جوالا مکھی ہے پرامیلا مایوس ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"نہیں معلوم کس نامعلوم کشش کے زیر اثر کہاں چلا جا رہا ہوں،
جتنا آگے بڑھتا ہوں، دریا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔
چلو آگے ــــ اور آگے، کہ مڑ کر دیکھنا لاحاصل ہے!"
سازینہ جھنجھنا اٹھتا ہے۔ نرگس باہر چلی جاتی ہے۔ نذرل
پرامیلا کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"کیچڑ سے لت پت ہوں ہنسی کو اپنے اپنے آنچل میں بھر کر وہ
گھر واپس چلی جاتی ہیں۔
وہ چلی جاتی ہیں اور میں چتا میں جلتی ہوئی لاش کو لے کر جاگتا
رہتا ہوں اور درد کی آندھی میں ڈوب کر میرا دل چیخنے لگتا ہے۔"
نذرل کے سر کے نیچے سے تکیہ کھسک جاتا ہے اور اُس کے منہ
سے اُف اُف، آہ، آہ کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔

(پس منظر سے آواز):

"وہ دیکھ سیلاب کا پانی بڑھتا آرہا ہے۔ چل آگے چل آگے۔
یہاں کیچڑ سے تیرا جسم ہمیشہ گندہ رہے گا!
مسافر! یہاں آنکھوں کا سیلِ رواں تجھے کہاں ملے گا۔

تیرا انتظار تو سات سمندر کی موج بیکراں کر رہی ہے!"

اتنے میں نذرل پرآمیلا کو دیکھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ نذرل اُس سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے کہ یکایک خوفناک ہنسی سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ ساز بینہ جھنا کے سے بجنے لگتا ہے۔ روشنی مدھم ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

پہلا ایکٹ
پہلا منظر

زمانہ — ۱۹۲۱ء وقت: رات کے بارہ بجے۔ مقام: کومیلا۔
بیراج سندری دیوی کا بیٹھک خانہ۔

ایک طرف میز پر کھانا ڈھکا ہوا رکھا ہے۔ پانی سے بھرا ہوا گلاس ہے۔ نمکدان بھی پاس ہی رکھا ہوا ہے۔ پرآمیلا رومال میں پھول کاڑھ رہی ہے۔ کملا کچھ بُن رہی ہے اور ٹھنڈی آہ بھی بھرتی جاتی ہے دونوں ہم عمر ہیں۔

کملا: (سرد آہ بھرتے ہوئے) اب میں اٹھتی ہوں۔ تم سوؤ گی نہیں؟

پرامیلا: کچھ دیر اور۔ نیند آ گئی تو کاکی ماں خفا ہو جائیں گی۔

کملا: خفا ہوں گی — ہنھ! میں تو چلی۔

پرامیلا: مگر کاکی ماں!

کملا: ارے جانے بھی دو۔ میں ڈرتی نہیں کسی سے۔ (جاتے جاتے رک جاتی ہے) تم تارے گنتی جاؤ۔

(پرآمیلا پھول کاڑھنے لگتی ہے اور کہیں دور سے گھڑیال کی آواز سنائی دیتی ہے)

پرامیلا: (گنتے ہوئے)... دو — چار — چھ — آٹھ — دس بارہ! ایں، بارہ بج گئے!

(بیراج سندری داخل ہوتی ہے۔ وہ پرامیلا کی کاکی ماں ہے)

بیراج: دُوکھو (نذرل) نہیں آیا اب تک! اور تُو — تو اکیلی ہے؟ کملا کہاں ہے؟

پرامیلا: اُسے نیند آ رہی تھی، سو گئی — کاکی ماں مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ تردّد انے بتایا کہ قاضی دا عجیب و غریب انسان ہیں۔ گلے میں ہارمونیم لٹکا کر اور سر کے لمبے لمبے بال منتشر کر کے باغیانہ نظمیں گاتے پھرتے ہیں۔ اُن کی نظموں کی بازگشت سے پورے کومیلا میں آگ لگ گئی ہے۔

بیراج: کچھ کھایا بھی اس نے دن بھر؟

پرامیلا: تردّد انے بتایا کہ دن بھر صرف چائے پیتے رہے۔

بیراج: میرا دل کہتا ہے کہ اگر وہ اسی طرح چائے پیتا رہا تو ایک نہ ایک دن پاگل ضرور ہو جائے گا۔ (تڑپ کر) یہ سارا کیا دھرا اُسی کمبخت گاندھی کا ہے۔ عدم تعاون کا راگ الاپ کر لڑکوں کو بگاڑ رہا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

پہلا ایکٹ
دوسرا منظر

زمانہ: ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء۔ مقام: ۶ پرتاپ چٹرجی لین کلکتہ — نذرل کے ہفتہ وار بنگلا جریدہ "دھوم کیتو" کا دفتر۔

ایک طرف ٹوٹا پھوٹا تخت ہے، اور دوسری طرف لمبی سی میز۔ اس پر فلاسک، چائے کی پیالیاں، ایک طشتری میں پان کی گلوریاں، ہارمونیم اور دوسری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ نیچے اگالدان بھی ہے۔

(پرآباہ، نذرل کے بچپن کا دوست، سوٹ میں ملبوس داخل ہوتا ہے۔ منہ میں سگریٹ ہے)

پراباہ: ہیلو، کوی!

نذرل: بہت دنوں بعد دیکھا تمہیں۔ تھے کہاں؟

پراباہ: بنجارہ جیسی زندگی تم بھی گذار رہے ہو، میں بھی گزار رہا ہوں۔ سارے یورپ کا سفر کر لیا۔

نذرل: اتنے روپے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟

پراباہ: مطلب؟ تو کیا میں بھی تمہاری طرح مفلس و قلاش ہوں؟

نذرل: مفلس (طنزیہ ہنسی)

پراباہ: ہنسے کیوں؟

نذرل: اس لئے کہ چھ سال پہلے جب آخری بار ہم ملے تھے۔ اُس وقت تم بھی مفلس ہی تھے۔

پراباہ: یہ تو ماضی کی باتیں ہوئیں۔ پیارے میرا خسر بہت بڑا زمیندار تھا۔ اور بیوی اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی۔ خسر کے مرنے کے بعد ساری جائداد پر میرا قبضہ ہو گیا۔ اب تو میرا کام صرف سیر و تفریح کرنا ہے۔ جنگ کے زمانے میں یورپ ہی میں پھنس

گیا تھا۔

نذرل: تو پھر سناؤ وہاں کا حال۔

پراباہ: انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ اُدھر کمال اتاترک، اِدھر شیرِ مصر زغلول ـــ میں تو انہیں دیکھ بھی چکا ہوں۔

نذرل: تم دیکھ چکے ہو؟ کیسے ہیں وہ؟

پراباہ: بے مثال! اُن کو اپنے عوام سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ اپنے ملک کو بالکل آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

نذرل: اور میں بھی یہی چاہتا ہوں، پراباہ کہ میرا ملک آزاد ہو جائے۔ اسی لئے تو "دھوم کیتو" کا اجرا کیا ہے۔ اس کی پالیسی ہے ملک کی مکمل آزادی۔ ظلم و جور اور بے انصافیوں کا دشمن ہوں میں۔ میں مذہب کا قائل نہیں۔ راجہ مہاراجہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ خون کا بدلہ خون ـــ انصاف اصل میں یہ ہے۔

پراباہ: مگر یہ راستہ تو ـــ

نذرل: ہاں تخریب ہی میں تعمیر چھپی ہوئی ہے۔ میں انقلاب چاہتا ہوں۔ نظامِ کہنہ کی جگہ نظامِ نو۔

پراباہ: (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت دیر ہو گئی مجھے۔ اب اجازت دو۔ ارے ہاں یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ بہت جلد روس جا رہا ہوں۔

(پراباہ رخصت ہوتا ہے اور نذرل ہارمونیم پر گانا شروع کر دیتا ہے۔ اسی اثنا میں مظفر احمد داخل ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار ہیں)

نذرل: ارے مظفر بھائی ـــ کب آئے آپ؟

مظفر: جب تم گانے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آج تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔

نذرل: ضروری؟ خدا خیر کرے (ٹھیرا کہئے۔

مظفر: پہلی بات یہ کہ ایک ALLEGATION ـــ

نذرل: ALLEGATION، کس کے خلاف؟

مظفر: تمہارے خلاف۔ میرا خیال ہے کہ تم تھوڑی دیر پہلے جو گیت گا رہے تھے وہ ایک خاص نظام، ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

نذرل: مطلب؟

مظفر: یعنی اس میں متوسط طبقہ کی آواز ہے۔ میرا مطلب ہے تمہاری نظموں میں صرف بنگال کے متوسط طبقہ کی آزادی کا اشارہ ملتا ہے۔

نذرل: ذرا اور وضاحت کیجئے۔

مظفر: میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس دہشت پسند پارٹی کے لوگ آنے لگے ہیں۔

نذرل: تو حرج ہی کیا ہے؟ میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ میرے "دھوم کیتو" کی آواز یہی ہے۔

مظفر: تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا متوسط طبقہ کے چند دہشت پسند افراد ملک کو آزادی سے ہمکنار کر سکتے ہیں؟

نذرل: آپ کے خیال سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں کانٹے ہی سے کانٹا نکالنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح آزادی نہ ملے، آزادی کے لئے راہیں تو ہموار ہو سکتی ہیں۔ ان کی سرگرمیاں دیکھ کر عوام کے اندر جذبۂ آزادی کے شعلے بھڑک سکیں گے۔ میں کسی خاص نظام کا پرستار نہیں ہوں۔ میں تو دکھ درد کا شاعر ہوں۔ شاعرِ انسانیت ہوں۔ مظلوم اور ستم رسیدہ انسانوں کو آزادی دلانا میرا کام ہے۔

مظفر: بلاشبہ تمہارا نصب العین بہت بلند ہے لیکن میں کچھ اور چاہتا ہوں ـــ!

نذرل: یعنی کیا؟

مظفر: میں چاہتا ہوں کہ تمہاری نظموں میں کسانوں اور مزدوروں کی زندگیوں کی تصویریں ہوں۔ کیا بتا سکتے ہو کہ تم نے ان کی زندگی کی عکاسی کی ہے؟

نذرل: میں شاعر ہوں۔ ان ہی کی دلوں کی دھڑکنیں تو میری نظموں میں سنائی دیتی ہیں۔ زندگی کی تصویر گری ناول نگاروں اور اداکاروں کا کام ہے۔ لیکن یقین مانیے میں خود ان باتوں پر غور کر رہا ہوں۔

مظفر: کسان اور مزدور ـــ یہ دو نام اس ملک میں گالی سمجھے جاتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کو بھی بیدار کرو۔ انہیں بتاؤ کہ وہ بھی انسان ہیں ـــ وہی

ملک کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔

(نرپندرا کرشن چٹرجی گنگناتے ہوئے داخل ہوتا ہے وہ طالب علم ہے لیکن آنکھوں میں جیسے آتش فشاں چھپا ہوا ہے۔ اس کے عقب میں شیلجا نند مکرجی ہیں —— نذرل کے بچپن کے دوست)

نرپندر: (گنگناتے ہوئے)

آ دھوم کیتو (شہاب ثاقب) آ ابھی جا
اور اندھیرے میں آگ کا پل باندھ دے!

نذرل: (گنگناتے ہوئے)

میں ہر صدی، ہر دور اور ہر جگ میں آتا ہوں
میری پیشانی میں سات سو جنموں کی آگ روشن ہے

(نلینی سرکار داخل ہوتا ہے)

نلینی: دو خبریں لے کر آیا ہوں —— اچھی اور بری!

نذرل: تو پہلے خوش خبری سنا دو۔

نلینی: "دھوم کیتو" کے اس شمارے کا دوسرا پرنٹ ختم ہو گیا۔ تیسرے کا آرڈر دے آیا ہوں۔

نذرل: اب بُری خبر بھی سنا دو۔

نلینی: سنا ہے تم جلد ہی گرفتار کر لئے جاؤ گے!

نذرل: گرفتار —— اچھا! تو بس تیار سمجھو۔

مظفر: کہیں روپوش ہو جاؤ تو اچھا ہے، یا پھر چند روز کے لئے رہیں چلے جاؤ۔ میں سارا انتظام کر دوں گا۔

نذرل: نہیں میں ملک سے باہر نہیں جا سکتا۔ ناممکن، خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

مظفر: تو پھر کلکتہ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ گرفتار ہوئے تو "دھوم کیتو" بھی بند ہو جائے گا۔

نذرل: "دھوم کیتو" کی آگ کبھی نہیں بجھ سکتی۔ اس کی آگ میں سب بھسم ہو جائیں گے۔

پوتر: ٹھیک ہے تم کہیں روپوش ہو جاؤ۔ مظفر ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

نذرل: (کچھ سوچ کر) تو میں سمستی پور جاتا ہوں۔

شرت: سمستی پور!

نذرل: ہاں پرامیلا کے ماموں وہیں ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

پہلا ایکٹ
تیسرا منظر

زمانہ: ۲ اپریل ۱۹۲۶ء۔ روز جمعہ۔ وقت: شام۔ مقام: کرشن نگر نذرل کی قیام گاہ۔

(پراباہ داخل ہوتا ہے جسم پر خوبصورت سوٹ اور سر پر فیلٹ ہیٹ ہے)

پراباہ: (کچھ یاد کرتے ہوئے) ماسی ماں! او ماسی ماں۔ (گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: کون؟

پراباہ: میں ہوں پراباہ۔

گریبالا: نذرل کی زبانی تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔ بیٹھو کب لوٹے تم اپنے سفر سے؟

پراباہ: کل ہی لوٹا ہوں۔ جب معلوم ہوا کہ نذرل کرشن نگر میں ہے میں فوراً بھاگا۔

گریبالا: میں تو پریشان ہو گئی ہوں نذرل کی وجہ سے جتنا لگام کھینچتی ہوں وہ فرار ہونے کی اتنی ہی کوشش کرتا ہے۔

پراباہ: وہ تو بندھنوں سے آزاد ہے۔ اُسے آپ باندھ کر نہیں رکھ سکتیں۔

گریبالا: بس یہی فکر مجھے کھائے جا رہی ہے۔ ایک لڑکی ہے میری اور کوئی نہیں دنیا میں۔ نذرل جیسے پاگل کے ساتھ اس کی شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ میں بے فکر ہو کر سوئی ہوں۔ لڑکی بھی اتنی نیک ہے کہ سب کچھ سہہ لے گی پر منہ سے کچھ نہ پھوٹے گی۔

پراباہ: نذرل ہے کہاں ان دنوں؟

گریبالا: اور کہاں جائے گا۔ الیکشن میں مصروف ہے۔ ہمنت کو فتح دلانے کے جنون کے علاوہ اُسے اور کسی بات کی فکر نہیں۔ ہمنت کو تو جانتے ہی ہو گے؟

پراباہ: ہمنت کمار سرکار؟

گریبالا: ہاں، اس بار وہ کانگریس کے ٹکٹ پر صوبائی انتخاب لڑ رہا ہے اس کی وجہ سے تو ہم ہگلی سے یہاں آ گئے۔ یہ بھی اچھا ہوا ورنہ وہاں ہوتے تو فاقہ کشی کی نوبت آ جاتی۔

پراباہ: کتابوں اور رسالہ کی فروخت سے تو خاصی آمدنی ہو جاتی ہو گی۔

گریبالا: تم تو جانتے ہو اس کی عادت۔ اِدھر پیسے آئے اُدھر منٹوں میں خرچ۔ بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔

(گریبالا جاتی ہے، اور ہمنت داخل ہوتا ہے)

ہمنت: آپ کون؟

پراباہ: اور آپ؟

ہمنت: میں ــــ؟ آپ جاننا چاہتے ہیں، تو سنئے یہ مکان میرا ہے۔

پراباہ: وہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ ہمنت کمار ہیں۔

(گریبالا داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے)

گریبالا: کیا بات ہے ہمنت؟

ہمنت: دیکھئے تو ماسی نہ جان نہ پہچان ــــ اور بکواس شروع کر دی۔

گریبالا: ارے نہیں جانتے اس کو۔ یہ ہے پراباہ ــــ نذرل کا دوست

پراباہ: ماسی ماں، اور بھابی کہاں ہیں؟

گریبالا: پرامیلا؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے اُس کی۔ اُدھر کئی ماہ سے اُس نے کھانا پینا ہی ترک کر دیا ہے۔ کھانے کی ہر چیز دیکھ کر ناک سکیڑ لیتی ہے۔

پراباہ: تو یوں کہئے، ماسی ماں کیا یہ پہلا ــــ؟

گریبالا: نہیں۔ پہلا بچہ آزاد کمال کب کا فوت ہو گیا۔ یہ دوسرا ہے۔

ہمنت: نذرل تو آگیا ہے ماسی ماں۔ ہمارے گھر آیا تھا۔ یہاں بھی آتا ہی ہو گا۔ میں چلا۔

گریبالا: ارے کیوں، چائے تو پی لو۔

ہمنت: نہیں ماسی ماں، کام کا انبار ہے (ہمنت چلا جاتا ہے)

گریبالا: ارے چائے ٹھنڈی ہو گئی تمہاری۔ لو پیو جب تک میں اندر سے ہو آؤں۔

(نذرل داخل ہوتا ہے)

نذرل: ارے تم؟

پراباہ: بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟

نذرل: کچھ نہ پوچھو۔ ذرا بھی سکون نہیں ہے۔ امن اور سکون کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر ــــ لانگل کے پچھلے شماروں میں وہ ساری نظمیں شائع ہوئی ہیں جو مساوات کے موضوع پر ہیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ مساوات ہی میں امن پوشیدہ ہے۔ لیکن (سرد آہ بھرتا ہے)

پراباہ: لیکن کیا؟

نذرل: لیکن کہاں ہے مساوات۔ ہر طرف تو اندھیرا نظر آتا ہے۔

پراباہ: یہی حال میں روس میں دیکھ کر آیا ہوں۔

نذرل: مگر وہ تو ایسا ملک ہے جہاں امرت ندی بہتی ہے۔

پراباہ: پیارے گلاب میں بھی کیڑے ہوتے ہیں۔ اندر کی خبریں تمہیں کیسے مل سکتی ہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔

نذرل: کیا دیکھا تم نے؟

پراباہ: لینن کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اب وہاں آمریت ہے۔ ذہنی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے ــــ اچھا چلا۔

(پراباہ رخصت ہوتا ہے، اور پرامیلا داخل ہوتی ہے)

نذرل: او ہو ــــ بہت خفا نظر آتی ہو ــــ شاید اسی لئے ــــ

پرامیلا: چھوڑ دو مجھے۔ کب تک آخر یوں زندگی گزرے گی؟

نذرل: میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

پرامیلا: جب دیکھو مجھ سے دور دور رہتے ہو۔

(خان معین الدین کی آمد)

معین: کوی دا!

نذرل: کیا بات ہے معین؟ اتنے پریشان کیوں ہو؟

معین: کلکتہ میں فساد ہو گیا۔ ہندو مسلم فساد۔

نذرل: ہندو مسلم فساد؟

معین: ہاں۔ ماں کے سامنے شیر خوار بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

نذرل: اُف!

معین: سنا ہے "دیش بندھو" کے ہندو مسلم اتحاد فارمولا کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بمبئی میں موپلا نے بغاوت کر دی ہے۔

نذرل: موپلا؟

معین: مالابار کے مسلمان۔

نذرل: اور کانگریس کیا کر رہی ہے؟

معین: خاموش ہے۔ تم تو انتخابات میں اتنے مصروف ہوئے کہ فساد کی خبر ہی نہیں ملی تمہیں۔

نذرل: "دیش بندھو" کہاں ہو اس وقت؟ ہنس رہے ہو یا رو رہے ہو؟ ہا ہا ہا ــــ انتخاب؟ یہ تو ایک بہانہ ہے! لوگوں کا خیال ہے کہ عوام کا شاعر ہوں۔ ہاں ٹھیک ہے۔

(دردناک آواز میں گنگنانے لگتا ہے)

"خالد نے شمشیر سنبھال لی ہے اور ارجن تیر اندازی کے جوہر دکھا رہا ہے۔

بھارت بیدار ہو گیا ــــ ہندو اور مسلمان لاٹھی سے مسلح مقابلے کے لئے آ گئے"!

(ہنستے ہنستے نذرل دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ لکھنے کا موڈ طاری ہو گیا ہے نتین اور پرامیلا چپ چاپ ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

زمانہ: ۱۰ اپریل ۱۹۲۹ء وقت: شام۔ مقام: کرشن نگر، نذرل کی قیام گاہ۔

(دروازے کے اوپر خوبصورت حروف میں تحریر ہے۔ 'GRACE COTTAGE' سامنے باغیچہ ہے بکول درخت کی ایک شاخ جھکی ہوئی ہے جس کے نیچے ایک سفید میز پر پوسٹ کارڈ رکھا ہوا ہے اور چند کتابیں بھی ہیں۔ قریب ہی تین چار کرسیاں بھی رکھی ہوئی ہیں گریبالا آٹھ ماہ کے بچہ بلبل کو گود میں لئے داخل ہوتی ہے۔ بلبل رو رہا ہے)

گریبالا: (چپ کراتے ہوئے) میرے چاند نہ رو۔ نہ رو۔ اچھی سی دلہن لا دوں گی تیرے لئے۔ خوبصورت سا پھول دوں گی۔ نہ رو۔ (پریشان ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ بلبل چپ ہونے کا نام نہیں لیتا) (پرامیلا داخل ہوتی ہے)

پرامیلا: کیوں خفا ہو رہی ہو ماں! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کدھر کدھر دیکھوں۔ کتنی بار منع کیا انہیں کہ بخار تیز ہو رہا ہے۔ باہر نہ جاؤ مگر ــــ میری بات کوئی نہیں سنتا۔

گریبالا: تو پھر کھاؤ گی کیا؟ اگر وہ روپے پیسے کی فکر میں باہر نہ جائے۔

پرامیلا: فاقے کروں گی ــــ تم ایسا نہ کہو ماں۔ کل بھی وہ خاک چھانتے رہے مگر کہیں سے کچھ نہ ملا۔ بھوکے پیاسے اُس پر سے تیز بخار۔ کچھ ہو گیا تو ــــ

گریبالا: (بلبل برابر رو رہا ہے) یہ ننھا سا بچہ کیسے فاقہ کر سکتا ہے۔ دودھ تو پلا دو اسے۔

پرامیلا: کتنی بار کہا تم سے کہ دودھ نہیں ہے۔ دو دن سے فاقہ ہے۔ دودھ آئے گا تو کہاں سے؟

گریبالا: پھر؟

پرامیلا: پھر ــــ پھر ــــ پھر! لاؤ بلبل کو میں لے لوں۔

(پوتر گنگولی، نرپن اور نلینی داخل ہوتے ہیں)

پوتر: (پرامیلا سے) تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہیں اور بلبل رو کیوں رہا ہے؟

(پرامیلا چلی جاتی ہے)

پوتر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ماسی ماں دودو (پرامیلا) کی طبیعت ٹھیک تو ہے؟

نرپن: بیمار! جسمانی نہ سہی اقتصادی ضرور ہے۔ اچھا بتاؤ کیا کیا لاؤں بازار سے۔ ایک کاغذ پر لکھ دو۔

(کاغذ تلاش کرتے کرتے میز کی طرف بڑھتا ہے۔ اور پوسٹ کارڈ پر نظر پڑ جاتی ہے)

نرپن: خط؟ کس کے نام ہے یہ؟

پوتر: نذرل نے لکھا ہے برمن کو۔

نلینی: برج بہاری برمن؟ ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے!

پوتر: پڑھوں؟ اچھا لو سنو۔

کرشن نگر

۲۰ راگست ۱۹۲۷ء

پیارے برمن!

ان دنوں بیحد پریشان ہوں روزانہ SLOW FEVER رہتا ہے۔ روپیہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا تم نے آج بھی مایوسی ہوئی۔ گھر میں کوڑی چھدام تک نہیں ہے۔ خط پاتے ہی کم از کم بیس روپے ہی T.M.O. کے ذریعہ بھیج دو ورنہ بہت ساری مشکلات میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ سودا سلف تک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ بہت سے لوگوں کا مقروض ہو چکا ہوں کہیں سے مزید قرض ملنے کی امید بھی نہیں ہے۔

تمہارا

قاضی دا

نرپن: ناشروں اور مدیروں نے مل کر تباہ کر دیا اسے۔

پوتر : ایسے میں بخار نہ آئے تو کیا ہوگا۔
نرین : کوی دا گئے کہاں ماسی ماں ؟
گریبالا : پیسوں کی فکر میں
پوتر : بخار اور ـــــ
نلینی : ماسی ماں سودا لانے کے لئے تھیلا اور ایک کیتلی دیجئے۔ نرین تم بھی چلو میرے ساتھ۔
پوتر : یہ کارڈ بھی پوسٹ کر دینا۔
نلینی : تم بیٹھو۔ ہم فوراً لوٹ آئیں گے۔
(دونوں چلے جاتے ہیں اور پوتر کلوں پڑھنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اسی اثنا میں نذرل گنگناتے ہوئے داخل ہوتا ہے)
نذرل : " میرے بچے دودھ کے دو قطرے بھی نہیں دے سکتا تمہیں۔
خوشی و مسرت پر میرا کوئی اختیار نہیں۔
افلاس کبھی بچہ، کبھی بیوی کے روپ میں برابر میرے دروازے سے لگ کر بین کرتا ہے !
بانسری کون بجائے گا ؟ مسرت و انبساط سے بھرپور قہقہے کہاں پاؤں گا۔
نسرین و یاسمین کی خوشبوئیں کہاں ملیں گی ؟"
(نذرل ہانپ رہا ہے۔ پوتر اُسے سہارا دیتا ہے)
نذرل : (چونک کر) کون ؟ ارے پوتر تم !
پوتر : ادھر آؤ۔ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اب اندیشہ نہ کرو میں آگیا ہوں۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔
نذرل : اندیشہ ! میری لغت میں تو یہ لفظ کبھی نہ تھا۔ مگر ہاں ـــ وہ بلبل۔ پوتر اس بلبل کی وجہ سے میں اندیشہ میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔
پوتر : وہ دیکھو سامنے ـــ نلینی دا اور نرین آرہے ہیں۔
(نلینی اور نرین داخل ہوتے ہیں)
نلینی : ماسی ماں، او ماسی ماں !
(گریبالا داخل ہوتی ہے)
نلینی : یہ لیجئے۔ کیتلی میں دو سیر دودھ ہے اور لفافے میں شکر اور اس میں چاول۔ اور یہ تھیلا ـــ اس میں بہت کچھ ہے۔ سبزی، مچھلی، تیل، نمک وغیرہ (نذرل کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے) اور اس میں کوی دا کے لئے چائے، پان سپاری زردہ وغیرہ۔
(کچھ دیر تک شور غل رہتا ہے پھر سب چلے جاتے ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد معین داخل ہوتے ہیں)
معین : کوی دا ! سیدھے "سوغات" کے دفتر سے آرہا ہوں۔ خوشخبری ہے آپ کے لئے۔
نذرل : مطلب ؟
معین : ۱۱ ویلسلی اسٹریٹ یعنی سوغات کے دفتر کی نچلی منزل میں ایک کمرہ کی مرمت ہو رہی ہے۔ آپ لوگ وہیں رہیں گے۔
نذرل : کلکتہ ! تو کیا ہم سچ مچ کلکتہ جا رہے ہیں۔
معین : ماسی ماں اور بھابی کو بھی خوشخبری سنا دوں۔
(پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں شربت کا ایک گلاس ہے روٹی کے چند ٹکڑے اور انڈے بھی ہیں)
نذرل : پرامیلا، آؤ ـــ اُدھر نہیں، اِدھر۔ بلبل کہاں ہے ؟
پرامیلا : معین کے پاس ہے۔
نذرل : آہ ! (روٹی کا ایک ٹکڑہ ہاتھ میں لے کر پرامیلا کو گرفت میں لے لیتا ہے)
(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ
دوسرا منظر

زمانہ: ۱۹۲۹ء شام سے کچھ پہلے۔ مقام: مسجد باڑی اسٹریٹ کلکتہ۔ نذرل کی قیام گاہ۔
(پرامیلا میز پر سر نگوں سسکیاں بھر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد کسی کی آہٹ سے وہ چونک اٹھتی ہے اور آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہے۔ سامنے دو ماہنامے رکھے ہیں۔ چھایا داخل ہوتی ہے)
پرامیلا : آؤ، آؤ، کہاں تھیں اتنے دنوں تک ؟
چھایا : رنگ پور گئی تھی۔ مگر تم اکیلی کیوں ہو ؟ بلبل کہاں ؟
پرامیلا : ماں کے ساتھ کہیں گیا ہے !
چھایا : آنکھیں سوجی ہوئی کیوں ہیں تمہاری۔ رو رہی تھیں کیا ؟
پرامیلا : ہاں ساری زندگی تو روتے ہی بیت گئی !
چھایا : ساری زندگی !

پرامیلا: ہاں یونہی سمجھو۔ باپ کے مرنے کے بعد سے دکھوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک چل رہا ہے۔

چھایا: لیکن تم جیسی خوش بخت اور کون ہوگی؟ تمہارا میاں اتنا بڑا شاعر ہے ــــ اتنا بڑا مشہور گائک۔ اتنی خوبیوں کا آدمی کہاں ملتا ہے بھلا۔ ان کے گانے سن کر لطف اندوز کون نہیں ہوا۔

پرامیلا: کبھی لطف اندوز میں بھی ہوتی تھی۔

چھایا: اور اب؟

پرامیلا: ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا پیاری۔ آج تم سے دل کی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ سوچا تھا اپنا ایک گھر بساؤں گی، چھوٹا سا ہی سہی۔ مگر یہ بھی نہ ہوا۔

چھایا: جانے دو ان باتوں کو پرامیلا۔

پرامیلا: نہیں میں کہوں گی۔ ایک ماہ کے بعد نذرل کل گھر لوٹے ہیں۔ آنے کے فوراً بعد ہی گراموفون کمپنی چلے گئے۔

چھایا: ایک ماہ تک کہاں رہے؟

پرامیلا: اپنے کسی دوست کے گھر۔ سنگیت کی محفل جمتی ہوگی۔ ایک خانہ بدوش کی زندگی بھی مجھ سے بہتر ہوگی۔ پچھلے سال کہاں کہاں نہ گئے۔ آج ہگلی تو کل کرشن نگر۔ ابھی سوغات کے دفتر، پھر پان بگان ــــ پھر مسجد باڑی۔ یہ تو زندگی کا ایک رخ ہوا دوسرا رخ بھی ہے۔ یہ دیکھو (ایک رسالہ دکھاتے ہوئے)

چھایا: یہ تو نذرل کی نظم ہے۔

پرامیلا: ہاں اسی کو میں پڑھتی رہی ہوں آج۔ تم بھی پڑھو ذرا بلند آواز سے۔

(چھایا نظم سناتی ہے)

"کیا شاعر کی شاعری محض تخیل ہے؟

نہیں رانی تم نہیں سمجھو گی۔ آگ ہی آگ جلے تب چولہا ٹھیک گرم ہوتا ہے اور پانی سے آواز نکلتی ہے۔

کیا اُس دن صرف شاعر رویا تھا؟ کیا اس کے اندر کے انسان نے آنسو نہیں بہائے؟

تم نے آنکھوں کے پپوٹوں میں صرف نفرت دیکھی، آنسو نہیں دیکھے؟"

چھایا: مگر یہ رانی کون ہے پرامیلا؟

پرامیلا: اسی نے تو میری زندگی تباہ کر دی ہے وہ ہے میری سوکن نرگس۔

چھایا: مگر نذرل تو اُسے طلاق دے چکے ہیں۔

پرامیلا: پر وہ نذرل کو نہیں چھوڑتی۔ ڈائن کی طرح دن رات اس کے پیچھے پیچھے گھومتی ہے۔ نذرل کی اور بھی کئی عشقیہ نظمیں ہیں جو اُس کے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ اُف!

چھایا: اور وہ کیا ہے دیکھوں!

پرامیلا: وہ ہے "سوغات" کا خاتون نمبر۔ اس میں میرا بھی ایک گیت شائع ہوا ہے۔

چھایا: تمہارا گیت ــــ دکھاؤ تو۔ ایں ــــ گیت کا عنوان ہے:

"اندیشہ" ــــ کیسا اندیشہ؟ (پڑھنے لگتی ہے)

"میرے من میں درد کیوں اٹھ رہا ہے؟

کیوں بے سبب آنکھیں اشکبار ہیں؟

یہ کیسا درد ہے کہ میرا من کانپ کانپ اٹھتا ہے،

کسے معلوم کہ یہاں درد کی کتنی قبریں چھپی ہوئی ہیں؟

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کائنات میں میرا کوئی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں۔"

چھایا: کیا یہ حقیقت ہے؟

(نذرل کی آہٹ سنائی دیتی ہے)

پرامیلا: نذرل آ رہے ہیں چلو اٹھو۔

(دونوں چلی جاتی ہیں۔ نذرل داخل ہوتا ہے۔ رسالے کا وہ صفحہ جس میں اس کی نظم شائع ہوئی ہے کھلا دیکھ کر چونک پڑتا ہے)

نذرل: مدن، مدن!

مدن: (دور سے) آیا صاحب (مدن داخل ہوتا ہے)

نذرل: کون آیا تھا یہاں؟

مدن: چھایا!

نذرل: کون؟

مدن: چھایا دیوی ــــ بازو والے مکان کی میم صاحب کی بہن

نذرل: بہن!

مدن: ہاں صاحب۔ بیوہ ہیں وہ۔

نذرل: اچھا تم جاؤ۔

(کچھ گنگناتے ہوئے نرآبن داخل ہوتا ہے)

نرائن: کیا بات ہے کوی دا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ اور وہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں (اُچک کر دیکھتے ہوئے) اوہو تمہاری نظم ہے۔

نذرل: نرائن، تم نے میرے خیالات منتشر کر دیئے۔ یہ دیکھو اس نظم کے اُوپر آنسوؤں کے قطرے جذب ہیں۔

(نلین داخل ہوتا ہے)

نذرل: اچھے وقت میں آئے۔ چلو تفریح کرائیں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ پوتر او، ودود داخل ہوتے ہیں)

ودود: کوی دا کہاں گئے؟

پرامیلا: مجھے نہیں معلوم کہاں گئے۔

ودود: کیا مصیبت ہے۔ ہم جب بھی آئے ملاقات نہیں ہوئی۔

پرامیلا: تم لوگ بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔

پوتر: بلبل کو بھی لیتی آیئے اپنے ساتھ۔

ودود: نذرل کی ان ہی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔ وہ قطعی فرض شناس نہیں۔

پوتر: وہ تو انقلابی شاعر ہے، ودود بھائی، اسے چین کہاں!

(پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ بلبل بھی ساتھ ہے۔ عمر ساڑھے تین سال ہے)

پوتر: بلبل۔ آؤ، آؤ، ادھر

بلبل: (گود میں بیٹھتے ہوئے) اچھا کاکا بابو، جانتے ہیں آپ، باؤل گان کیا ہے؟

پوتر: نہیں نہیں، بات کیا ہے؟

بلبل: آج ایک باؤل گان سنا ہے میں نے۔ گا کر سناتا مگر ـــ

ودود: مگر کیوں؟

بلبل: طبیعت ٹھیک نہیں۔

پوتر: طبیعت ٹھیک نہیں (پیشانی چھوکر) ارے تمہیں تو سچ مچ بخار ہے۔

ودود: بھائی اسے لے جاؤ کمرے میں۔ بخار تیز ہو رہا ہے۔

(پرامیلا بلبل کو لے کر چلی جاتی ہے۔ پوتر اور ودود بھی رخصت ہوتے ہیں۔ نذرل دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہمراہ ایک باؤل گائک بھی ہے)

نذرل: مجھے آپ کے گیتوں سے والہانہ محبت ہے۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔

باؤل: اب چلا۔ پھر آؤں گا۔

نذرل: (جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر) حقیر سی رقم آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے گانوں کی قیمت نہیں ہے یہ۔

باؤل: (ہنس کر) نہیں نہیں کوی بھائی۔ ہم باؤل تو روپے لیتے ہی نہیں۔ البتہ دو چار پیسے قبول کر لیتے ہیں۔

نذرل: تو پھر کیا دوں آپ کو؟

باؤل: محبت!

(باؤل گائک رخصت ہوتا ہے۔ پرامیلا داخل ہوتی ہے)

پرامیلا: سنو!

نذرل: کیا بات ہے؟

پرامیلا: کچھ یہ بتاؤ کر جا کہاں رہے تھے؟

نذرل: دیوی ذرا گھوم آؤں۔

پرامیلا: ساری زندگی تو گھومتے بیت گئی۔

نذرل: میں ہوں بھی تو خانہ بدوش۔

پرامیلا: مگر میں نہیں ہوں (ذرا رک کر) مجھے انسان سمجھتے ہو یا پتھر! پتھر بھی ہوتا تو اب تک ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

نذرل: میں نے آخر کیا کیا ہے جو....

پرامیلا: تم نے کیا نہیں کیا میرے ساتھ۔ جہاں جی میں آتا ہے چلے جاتے ہو۔ جو دل میں آتا ہے کرتے ہو۔ کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ گھر میں کوئی اور بھی ہے۔

نذرل: کیا کہہ رہی ہو پرامیلا۔ میں تو تمہیں ـــ

پرامیلا: بس رہنے بھی دو۔ بہت سن چکی۔ آج تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آخر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟

نذرل: شادی؟ شادی تو تم نے بھی کی ہے۔ میں تو سب کچھ بتا چکا تھا تمہیں۔ اب الزام نہ دھرو مجھ پر۔ میں نے تم کو کیا نہیں دیا ـــ عزت، اولاد، رتبہ۔ مفلس کے گھر میں اور کس چیز کی توقع رکھتی ہو؟

پرامیلا: اولاد؟ مجھے نہیں چاہئے۔

نذرل: پرامیلا!

پرامیلا: اولاد سے مجھے کیا مل گیا؟ ایک دن کے لئے بھی تو خوشی نہیں ملی، سکون نہیں ملا۔

بات تازہ ہو۔ یہی میگھ دُوت برسی ابلا کی بانی لے کر کالی
داس کے جگ میں گیا، ریوا ندی کے کنارے گیا اور پھر
اس کے پیتم کے پاس پہنچا۔ یہ چوکڑی بھرتے ہوئے بادل
میرے پاس بھی دکھ کے پیغامات لاتے ہیں، اور یہ اساڑھ
مجھ کو تخیل کی جنت سے علیحدہ کر کے درد اور کسک کی اتھاہ
گہرائی میں پھینک دیتا ہے!

یقین مانو میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے
اگر لوگوں کی سنی سنائی باتوں پر تم یقین کر بیٹھیں تو اس
کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھ کو سمجھنے میں غلطی کی۔ خدا شاہد
ہے کہ میرے دل میں تمہارے خلاف نہ کوئی عداوت ہے نہ کینہ
ہے، نہ حسد۔ تمہیں کیسے باور کراؤں کہ میں تمہارے لئے کتنا
دکھی ہوں اور اب تو اس دکھ کی آگ میں بالکل جھلس کر
رہ گیا ہوں۔ تم میرے دل کو یہ آگ نہ دیتیں تو شاید میں
آگ کا راگ نہ الاپ سکتا اور نہ شہابِ ثاقب بن کر آسماں
پر طلوع ہوتا.....!"

پراباہ: پھر؟

نذرل: تم ہی بتاؤ؟

پراباہ: میں؟ وہ نہ رام ہے اور نہ اجودھیا۔ پھر رام راج کہاں سے
آئے گا؟ ہا، ہا، ہا۔ میں چلا (یکایک چلا جاتا ہے)

عباس: قاضی دا تم اپنا کام ختم کر لو۔ میں میگافون سے ہو کر آتا ہوں۔
(عباس الدین کے آنے کے بعد نذرل پھر لکھنے بیٹھ جاتا
ہے۔ لیکن اس اثنا میں پوتر داخل ہوتا ہے)

نذرل: ارے پوتر۔ آج کل تو نظر ہی نہیں آتے تم۔ آؤ، آؤ۔
"ہمدمو آجاؤ واپس، میں پھر تم لوگوں کی صحبتوں سے لطف
اندوز ہونا چاہتا ہوں۔
ہماری محبت کسی محبوبہ کی محبت سے بھی زیادہ استوار تھی۔
ہم روشنی، چاہت اور آرزو کی گود میں سانس لیتے تھے۔
اپنے نورِ نظر کی موت کو بھلا چکا ہوں۔ پر تم لوگوں کو نہیں
بھلا سکا،
اب بھی یاد آتے ہو تو دل کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

پوتر: نذرو، میں تو بار بار تمہارے پاس آتا رہا ہوں۔ تم ہی گھر
سے غائب رہتے ہو۔

نذرل: آزادی کی منزل مجھے مل گئی ہے پوتر۔ یہ آزادی خودی کے
بلند مقام سے سحر نغمہ کی کشش پا کر آئے گی۔ لیکن ٹھیک
اسی وقت جانِ بہار کی آواز سنائی دے گئی۔

پوتر: یعنی؟

نذرل: نرگس!

پوتر: نرگس؟

نذرل: ہاں اُس نے مجھے خط لکھا ہے!

پوتر: کیا لکھا ہے اُس نے؟

نذرل: اُس نے لکھا ہے ——
"کیا تم مجھے بھول گئے؟
لیکن تمہارے قدموں کا نشان آج بھی میری ندی کے کنارے
سے محو نہ ہو سکا!
وہ تحریر نہ مٹ سکی جو تم اُس کی چھاتی پر لکھ گئے تھے!
قدموں کے نشان کو محفوظ کر کے بیچ سے لہریں بہتی جاتی ہیں۔
میں کنارے پر اکیلی بیٹھی لہریں گنتی ہوں اور اُس کنارے
کو دیکھتی ہوں۔
لیکن آج کو جو پنچھی اڑ کر گیا تھا وہ واپس آشیانے میں نہیں
لوٹا!"
—— لیکن پوتر میں اس کو بھلا چکا ہوں —— بھول چکا
ہوں سبھوں کو —— آج میں صرف اُسی کے دھیان میں
غرق ہوں جو لا یموت ہے۔

پوتر: نہیں تم کسی کو نہیں بھلا سکے!

نذرل: ہاں شاید میں بھلا نہ سکا! اگر بھلا دیتا تو پھر سبھوں کو
آواز کیوں دیتا؟ ایک ایک کر کے سبھوں کی باتیں یاد
کیوں آتیں؟ ڈھاکا میں وہ خوشی و مسرت سے معمور دن۔
ہا ہا ہا —— جیسے، وہ آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے
ہیں۔ ڈاکٹر شہید اللہ —— ایں! نہیں رہنے بھی دو۔
زندگی کی سیڑھی بیکی رہ گزر پر کتنے لوگوں سے ملاقاتیں
ہوئیں —— کتنے نئے چہرے، کتنے معصوم دل ——
بہار —— نہار، ہاں، نہار! مگر کہاں؟ اب تو وہ

نہیں آنے۔ فضیلت — نہیں نہیں، ان کو بھول چکا ہوں...... مگر نہیں۔ بھولا کہاں! میری ماں! کہاں ہو تم؟ آخری بار مجھ سے ملنے کے لئے جیل میں آئی تھیں۔ جیل کا آہنی پھاٹک تو کھل گیا تھا مگر میرے دل کا دروازہ اس روزنہ کھل سکا (آنسوؤں کے قطرے رواں دواں ہیں)

پوتر: (نذرل کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) نُورو! اس طرح شکستہ دل ہونا اچھا نہیں — دیکھو بنگال کے عوام تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم شاعر ہو — !

نذرل: ہاں، ہاں۔ میں ان ہی کے لئے امن کا راستہ تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ فورکا ایک ہالہ، ایک پیکرِ جمیل میرے دماغ گشت لگا رہا ہے — میں اسے بیدار کرکے رہونگا۔

پوتر: وہ پیکرِ جمیل تمہاری شاعری کے تخیل کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آج اب میں چلا۔ (چلا جاتا ہے)

نذرل: (آپ ہی آپ) کوئی مجھے سمجھ نہ سکا! کیا میں اپنے آپ کو سمجھ سکا؟ مجھے کیا چاہئے؟ میری راہ کہاں ہے؟ کیا میں باغی ہوں! خدایا! ہا ہا ہا تو مجھے آزادی دے گا، سکون دے گا؟

(نذرل چلا جاتا ہے۔ پرآمیلا داخل ہوتی ہے۔ نرگس کے نام لکھا ہوا خط میز پر کھلا رکھا ہے۔ اس کی نگاہ خط پر پڑتی ہے)

پرامیلا: کون؟ (خط پڑھتے ہوئے) ایں! نرگس! (چہرہ نفرت کی آگ سے سرخ ہو جاتا ہے) اب تک وہ تمہیں نہیں بھولے؟ اب تک محبت کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ آج بھی تم دل و جان سے اس کی پرستش کرتے ہو! اُف! ماں، ماں!

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ
دوسرا منظر

زمانہ: ۱۹۴۲ء۔ وقت: شام۔ مقام: کلکتہ، نذرل کی قیامگاہ۔

(نذرل بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ دروازے کی طرف دیکھ لیتا ہے — جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ ہاتھ میں کاغذ کا پلندہ ہے۔ عمر ادھیڑ ہو چکی ہے۔ بروداکانت مجمدار داخل ہوتا ہے)

نذرل: کافی دیر لگادی۔ انتظار کرتے کرتے تھک گیا میں سوچا تھا کہ اپنے دل کے ٹکڑے کو بھول جاؤں گا۔ پر بھول نہ سکا۔ اسی لئے تو پرآمیلا کو علیل دیکھ کر میرا دل گھبرا رہا ہے کیا یہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ نہیں نہیں۔ جس طرح بھی ہوگا اُس کو موت کے ہاتھوں سے بچانا ہوگا۔ کانت دا بولو، بولو۔

بردا: CONCENTRATE YOUR MIND, MY FRIEND!

نذرل: کیسے دل کو اطمینان دلاؤں۔ ڈاکٹر، کویراج، حکیم — سب ہار گئے۔

بردا: چلو دُولی کے کمرے میں۔ (دونوں جاتے ہیں مظفر احمد داخل ہوتے ہیں)

مظفر: ماسی ماں! او ماسی ماں!

گریبالا: تم تو ہم لوگوں کو بھول ہی گئے۔

مظفر: اتنے دنوں تک پریشان رہا۔ کلکتہ سے سارے کمیونسٹوں کو نکل جانے کا حکم ملا ہے۔ ان میں میں بھی شامل ہوں۔ کبھی کبھی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کلکتہ آجاتا ہوں۔

گریبالا: ادھر ہم بھی بہت پریشان ہیں۔

مظفر: یعنی!

گریبالا: دُولی علیل ہے۔ پہلے تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے اور اب بستر سے لگ گئی ہے۔

مظفر: ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟

گریبالا: کچھ دیر پہلے تو ڈاکٹر آیا ہے۔ ابھی پرآمیلا کے کمرے ہی میں ہوگا۔ ساتھ ہی کویراج اور ہومیوپیتھ علاج بھی ہو رہا ہے۔

مظفر: علاج ایک قسم کا ہونا چاہئے — خیر میں دُولی کو دیکھ کر فوراً بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ پولیس تعاقب میں لگی ہوئی ہے زیادہ دیر تک یہاں رہنا SAFE نہیں ہے۔

(دونوں جاتے ہیں)

نذرل: ڈوٗلی، ڈوٗلی!

پرامیلا: اور میں نے تمہیں کیا نہیں دیا؟ روپ، جوانی، مان عزت، سب، سب کچھ، اور تم نے کیا دیا مجھے؟ میں بھی عورت ہوں۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی عورت۔ کیسے کیسے سپنے نہ دیکھے تھے میں نے۔

(روتے روتے چلی جاتی ہے ـــــ پرآباہ داخل ہوتا ہے)

پراباہ: ارے یہ کیا؟ کیا سوچ رہے ہو؟! ENJOY

نذرل: ENJOY! ہا، ہا، ہا۔

پراباہ: ہاں!

"عدن اور باغات کے شگفتہ پھولوں سے لطف اندوز ہو۔ گلاب گوں ہیلن، کلوپٹرا اور رطائیس کے باغ دبہار سینوں سے لطف اندوز ہو"

نذرل: مطلب؟

پراباہ: مطلب نہ پوچھو۔ میں وقت برباد نہیں کر سکتا اچھا چلا۔

(طوفان کی طرح چلا جاتا ہے)

(معین داخل ہوتا ہے)

نذرل: معین تم بھی کہو ـــــ 'میں چلا'!

معین: بات کیا ہے کوی دا؟

(گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: معین! تم ہی کو یاد کر رہی تھی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کل نورو (نذرل) نے بلبل سے کیا کہا تھا؟

معین: بلبل سے ـــــ کوی دا ـــــ

گریبالا: چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ صاف صاف بتا دو۔

معین: مجھے اتنا یاد پڑتا ہے انہوں نے صرف اتنا کہا تھا۔ 'جاؤ یہاں سے'!

گریبالا: جاؤ یہاں سے! بھلا کوئی باپ اپنے بیٹے سے ایسا کہہ سکتا ہے۔

معین: میں سمجھا نہیں ماسی ماں بات کیا ہے؟

گریبالا: اُسے بخار ہے ـــــ ایک سو تین ڈگری۔

معین: ایک سو تین ڈگری؟

(گریبالا نذرل کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی جاتی ہے)

نذرل چپ چاپ ہے۔ اسٹیج پر سیاہ پرچھائیں پھیل جاتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

تیسرا منظر

(کئی دن کے بعد کا واقعہ)

(عبدالقادر اور عبدالحمید داخل ہوتے ہیں۔ دونوں نذرل کے دوست ہیں)

قادر: ماسی ماں! او ماسی ماں!!

حمید: چلّاو مت، مریض کو تکلیف ہوگی۔

قادر: ہم اندر نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے۔ تم ہی بتاؤ اب کیا کیا جائے؟

(گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: ارے قادر! بیٹھو بیٹھو۔ اور یہ کون ـــــ؟

قادر: یہ ہیں عبدالحمید صاحب۔ ڈسٹرکٹ مذبح کے سپرنٹنڈنٹ، اور آپ ہیں ہم سبھوں کی ماسی ماں!

حمید: ماسی ماں بلبل کی طبیعت کیسی ہے؟

گریبالا: چیچک کے دانے اتنے زیادہ ہیں کہ اُسے کسی پہلو چین نہیں

قادر: ڈاکٹر نہیں آیا؟

گریبالا: کچھ دیر پہلے دیکھ کر گیا ہے۔

قادر: کیا کہا؟

گریبالا: اُس نے کہا اگر رات کسی طرح گزر گئی تو ـــــ

قادر: ایں! اور کوی دا کہاں؟

گریبالا: بلبل کے سرہانے بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں!

حمید: مریض کے کمرے میں دن دن بھر بیٹھنا تو ٹھیک نہیں ہے۔

گریبالا: میری بات کوئی نہیں سنتا۔ چند دن پہلے اسی کمرے میں بیٹھ کر حافظ کی رباعیات کے ترجمے مکمل کئے کھانا پینا تو بالکل ترک کر چکا ہے۔ نماز پڑھنے اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے علاوہ اور کسی کام میں توجہ نہیں دیتا اسے دیکھ کر پہچان بھی نہیں سکو گے۔ معین اور شانتی اب تک نہیں آئے۔

قادر: کہاں گئے ہیں دونوں؟

گریبالا: نُورو نے اُن کو ایک سادھو کے پاس دمدم بھیجا ہے۔

حمید: تعجب ہے۔ سادھو سنیاسی پر نذرل کو تو کبھی ایمان تھا ہی نہیں۔ یکایک یہ تبدیلی کیوں؟

قادر: اصل میں بچپن میں فقیروں، درویشوں اور سادھو سنیاسیوں کے ساتھ وہ گھومتے رہے ہیں۔ چرولیا میں حاجی پہلوان کے مزار کے مجاور بھی رہ چکے ہیں۔

(یکایک مکان کے اندر سے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ قادر بڑی تیزی سے اندر چلا جاتا ہے اور حمید چپ چاپ بت بنا کھڑا ہے)

نذرل: معین، معین کہاں؟

(معین اور شانتی داخل ہوتے ہیں)

معین: بس ابھی ابھی آیا۔

نذرل: (معین کے شانے پہ سر رکھ کر) سادھو کہاں؟ نہیں آئے وہ؟ کیا کہا؟ کیا وہ مردہ جسم میں روح پھونک سکتے ہیں؟

(معین حیرت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر تاکتا ہے)

قادر: بلبل ابھی ابھی چل بسا!

معین: چل بسا — بلبل — کوئی دوا!

نذرل: ہاں ہاں کہو، کیا سادھو سنیاسی مردہ جسم میں روح پھونک سکتے ہیں؟

معین: نہیں کوئی دوا نہیں۔

نذرل: نہیں۔ کوئی نہیں۔ ڈاکٹر، کویراج، سادھو، سنیاسی فقیر درویش کوئی نہیں۔ ہا ہا ہا — بیٹے بلبل، تم کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا!

(نذرل کی چیخ نکل پڑتی ہے۔ معین سنبھالتا ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا چھانے لگتا ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر

زمانہ ۱۹۳۷ء وقت: صبح۔ مقام: کلکتہ، نذرل کی قیام گاہ

(نذرل خط لکھ رہا ہے۔ اب وہ پہلی جیسی شوخی نہیں ہے، چہرہ اداس اور غمزدہ ہے)

(پراباہ داخل ہوتا ہے)

نذرل: آؤ، آؤ، بڑے موقع سے آئے۔

پراباہ: سنا ہے آج کل تم اداس اور غمزدہ رہنے لگے ہو لیکن آج موڈ تو خوب "جولی" ہے۔

نذرل: آج میری خوشی کا دن ہے۔ شاید زندگی میں ایسا خوشگوار اور حیات بخش دن پھر نہ آئے — اول اور آخری دن!

پراباہ: مگر بات کیا ہے بتاؤ تو سہی

نذرل: بیٹھو بتاتا ہوں۔ ارے عباس، وہ دیکھو۔

(عباس داخل ہوتا ہے)

نذرل: تم دونوں کا تعارف کرا دوں — یہ ہیں عباس الدین احمد مسلم بنگال کا سب سے بڑا گائک۔ میں ہوں سُر اور عباس ہے میری آواز! اور یہ ہیں پراباہ۔ میرا پرانا اور پیارا دوست ہاں عباس میرا وہ گیت تو سنا دو۔ وہی "آمار کون کولے آج ......"

عباس: اچھا! (ہارمونیم پہ گانا شروع ہو جاتا ہے)

"یہ کون سنہرا دیس ہے جس کے کنارے آکر میری کشتی رک گئی!
میری یہ ناؤ پھر بہاؤ کے خلاف کیوں جانا چاہتی ہے؟
میں شکستہ ناؤ پہ بہتا جا رہا تھا،
آنکھوں کے اشارے سے کیوں بلایا تم نے اے ملکۂ خواب؟"

نذرل: لیکن یہ شکستہ ناؤ کیا کبھی بہاؤ کے خلاف جا بھی سکتی ہے پراباہ؟

پراباہ: ذرا اور وضاحت کر دو تو شاید سمجھنے میں کامیاب ہو سکوں۔

نذرل: پندرہ سال بعد پھر خط آیا ہے۔ اسی کا جواب لکھ رہا تھا۔

پراباہ: نرگس نے لکھا ہے؟

نذرل: ہاں!

پراباہ: جواب کیا دیا تم نے؟

نذرل: جہاں تک میں لکھ سکا ہوں وہی سنو۔

"جانم!
نوروز کی سہانی صبح کو تمہارا خط موصول ہوا۔ اس وقت آکاش پر ہلکے پھلکے بادل رواں دواں تھے — آج سے پندرہ سال پہلے، اساڑھ کے اسی مہینے میں وہ دن بھی ایسا ہی تھا۔ ممکن ہے تمہارے حافظے میں بھی اس دن کی

ڈرامہ:

حکمتِ عملی

آغا ناصر

ایک کمرہ خاصا کشادہ اور آراستہ۔ مغربی اور مشرقی سمت ایک ایک۔ دروازہ۔ عقبی دیوار میں ایک کھڑکی۔
مغربی سمت دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت چھوٹی سی مسہری۔ مشرقی کونے میں ایک نہایت نفیس صوفہ سٹ۔ درمیان میں ایک خوبصورت بک شلف جس میں کتابیں بھری ہیں اور اوپر دو گلدان تازہ پھولوں سے بھرے ہوئے رکھے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک آرام کرسی۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو عائشہ مسہری پر پیٹ کے بل لیٹی کوئی میگزین پڑھنے میں مصروف ہے۔ گاہے گاہے وہ اپنی ٹانگیں ہلاتی جاتی ہے۔ اس کا چہرہ سامعین کی طرف ہے۔ چند لمحے بعد عقبی کھڑکی بہت دھیرے سے کھلتی ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ باہر سخت بارش ہو رہی ہے۔ اور گرج اور چمک ہے۔ ایک نوجوان برساتی اوڑھے آہستہ سے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ سے کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ عائشہ میگزین پڑھنے میں محو ہے۔ نوجوان جیب سے سگریٹ نکالتا ہے اور پھر ماچس سے جلانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد مسہری کے قریب آ جاتا ہے۔

نوجوان:۔ معاف کیجیے گا۔ آپ۔ ۔ ۔ ۔

عائشہ:۔ (ایک دم چونک کر چیخ پڑتی ہے)

نوجوان:۔ اوہ! آپ تو گھبرا ہی گئیں۔

عائشہ:۔ (خوف سے کانپتے ہوئے) کون ہو تم؟

نوجوان:۔ (بڑے اطمینان سے) تعارف بعد میں ہوتا رہے گا۔ فی الحال تو مجھے یہ بتایئے کہ آپ کے پاس ماچس ہوگی۔ میری ماچس بارش سے سیل گئی اور مجھے سگریٹ کی شدید خواہش ہو رہی ہے۔

عائشہ:۔ (بدستور گھبرائی ہوئی) کون ہو تم! تم یہاں کیسے آئے؟ کیوں آئے؟

نوجوان:۔ (مسکرا کر) آپ نے میری درخواست پر غور کرنے کے بجائے اپنے سوالات میں دو کا مزید اضافہ کر دیا۔ ڈریئے نہیں۔ خوف کی کوئی بات نہیں۔

عائشہ:۔ مگر آخر تم ہو کون؟

نوجوان:۔ ایک ہی سوال بار بار دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اس وقت تک آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا جب تک مجھے ماچس نہ مل جائے۔

عائشہ:۔ ماچس میرے پاس نہیں۔

نوجوان:۔ اوہ! تو پھر مجبوری ہے۔

(وہ بڑے اطمینان سے اپنی برساتی اتار کر آرام کرسی کی پشت پر لٹکانے لگتا ہے۔)

عائشہ:۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ!

نوجوان:۔ برساتی اتار کر لٹکا رہا ہوں۔ دیکھ نہیں رہی ہیں آپ!

عائشہ:۔ آخر اس سب کا مطلب کیا ہے! (اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) چاہتے کیا ہیں آپ!

نوجوان:۔ ایک ماچس چاہتا تھا۔ آپ نے انکار کر دیا، اب اور کیا چاہوں۔

عائشہ:۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تم کون ہو۔ اور کس غرض سے رات کے وقت میرے کمرے میں آئے ہو۔ تم آئے کس طرح؟

اگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرسکیں تو میں ان سارے

سوالات کا تفصیلاً جواب دے سکوں گا۔ اس طرح یہ ناممکن ہے۔

عائشہ:۔ عجیب آدمی ہو۔ (پریشان سی ہو کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

(نوجوان مسہری پر پڑی ہوئی میگزین اٹھا کر دیکھنے لگ جاتا ہے۔
عائشہ جز بز ہو کر بیٹھ جاتی ہے)
آخر آپ ہیں کون؟

نوجوان:۔ (رسالے کے ورق پلٹتے ہوئے) یہ اسمر کا لکھا ہوا ڈرامہ پڑھ رہی تھیں آپ؟

عائشہ:۔ (جھپٹ کر رسالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے) آپ سیدھے سیدھے یہاں سے جاتے ہیں یا نہیں؟

نوجوان:۔ نہیں۔

عائشہ:۔ تو میں نوکروں کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں باہر نکال دیں۔

نوجوان:۔ میں آپ کو کمرے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ آپ بہت نازک ہیں۔ میں بہرحال مرد ہوں۔

عائشہ:۔ (ہونٹ کاٹتے ہوئے) میں آواز دے دے کر ڈیڈی اور ممی کو بلا لوں گی۔

نوجوان:۔ بارش بہت تیز ہے اور بجلی کی گرج چمک اپنے زوروں پر ہے۔ آپ کی آواز آپ کے والدین کے کانوں تک پہنچنا مشکل ہے۔

عائشہ:۔ (جیسے ہار مان گئی ہو۔ بڑی خوشامد سے) آپ چاہتے کیا ہیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کس طرح آئے ہیں؟

نوجوان:۔ (ہنس کر) اب ٹھیک ہے۔ میں جو کہوں اس پر عمل کیجئے صرف اسی شرط پر میں آپ کے ان سارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں۔ (تھوڑی دیر خاموشی) بولیے منظور ہے آپ کو؟

عائشہ:۔ (بیزار سا ہو کر) جی۔

نوجوان:۔ ادھر آئیے (عائشہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب آتی ہے) مسہری پر بیٹھ جائیے (بیٹھ جاتی ہے) اپنی پریشانی دور کر لیجئے۔

عائشہ:۔ جی؟

نوجوان:۔ (مسکرا کر) تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کیجئے۔ اس طرح کہ آپ کا یہ خوف و ہراس سب دور ہو جائے اور جب آپ خود کو نارمل محسوس کرنے لگیں تو اپنے سوالات دہرائیے۔

عائشہ:۔ جی۔

نوجوان:۔ ہاں تو آپ اسمر کا ڈرامہ پڑھ رہی تھیں۔ کیا عنوان ہے اس ڈرامہ کا؟

عائشہ:۔ عنوان۔۔۔۔! چور۔۔۔۔!

نوجوان:۔ اوہ! عجب اتفاق ہے۔ پلاٹ کیا ہے؟

عائشہ:۔ مجھے یاد نہیں۔ میں نے ابھی صرف پہلا منظر پڑھا ہے۔

نوجوان:۔ پھر بھی ہوتا کیا ہے؟

عائشہ:۔ ایک چور ایک طوفانی رات میں ایک نوجوان لڑکی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

نوجوان:۔ (دلچسپی سے) ہوں، اس کے بعد؟

عائشہ:۔ میں نے ابھی یہیں تک پڑھا ہے، چور داخل ہو چکا ہے اور لڑکی جاگ گئی ہے، وہ سہمی ہوئی اس سے باتیں کر رہی ہے۔

نوجوان:۔ میرا خیال ہے اس کے بعد چور اس کے یہاں چوری نہیں کر سکے گا۔

عائشہ:۔ کیوں؟

نوجوان:۔ اگر لڑکی خوبصورت ہے اور چور جوان ہے تو پھر ناممکن ہے، غیر فطری ہے۔

عائشہ:۔ ہوگا۔ اب آپ مجھے بتا سکتے ہیں آپ کون ہیں؟

نوجوان:۔ ہاں میں ضرور بتاؤں گا آپ ایک ایک کر کے اپنے سوالات دہرائیں۔

عائشہ:۔ آپ کون ہیں؟

نوجوان:۔ سوال کی نوعیت بڑی غیر یقینی سی ہے، میں کون ہوں؟ ظاہر ہے کہ ایک انسان ہوں۔ مرد ہوں، جوان ہوں، تعلیم یافتہ ہوں۔ اس سوال سے آپ کی مراد کیا ہے؟

عائشہ:۔ (پریشان ہو کر) میرا مطلب تھا آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اور کدھر سے آئے ہیں؟

نوجوان:۔ دیکھئے خاتون، معاف کیجئے مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہے۔ (خاموش ہو جاتا ہے)

عائشہ:۔ (تھوڑی دیر انتظار کے بعد) آگے کہئے۔

نوجوان:۔ میں نے آپ کا نام پوچھا تھا۔

عائشہ:۔ میں نہیں بتاؤں گی۔

نوجوان:۔ میرے خیال میں اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

عائشہ:۔ ہو سکتا نہ ہو۔ مگر میں بتانا نہیں چاہتی۔

نوجوان:۔ تو پھر شاید میں کھل کر گفتگو نہ کر سکوں جب تک مجھے اپنے

(ڈاکٹر گپتا داخل ہوتا ہے)

نذرل: کہو ڈاکٹر کیا حال ہے دُولی کا؟

ڈاکٹر: بہت پُراُمید نہیں۔ لیکن!

نذرل: لیکن کیا؟

ڈاکٹر: مفلوج ہو جانے کا امکان ہے

نذرل: مفلوج؟

ڈاکٹر: ہاں!

(ہومیوپیتھ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

نذرل: آپ لوگوں کا تعارف کرا دوں۔ یہ ہیں ڈاکٹر رائے کلکتہ کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر اور آپ ہیں ڈاکٹر گپتا۔
(شانتی پدسنگھ داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سادھو جی ہیں)—

شانتی: کوی دا بہت مشکل سے باباجی کو ڈھونڈ کر لایا ہوں۔

باباجی: سب اُسی کی لیلا ہے۔ ہرے کرشن! ہرے کرشن!!

(مولوی صاحب داخل ہوتے ہیں)

نذرل: آئیے آئیے، تشریف لائیے۔ مولوی صاحب ساقی کی آنکھیں تو اب تک نہیں کھلیں۔

مولوی صاحب: اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو۔ پیالہ تو اب بھی بھرا ہوا ہے پیتے جاؤ، پیتے جاؤ۔ ساقی آئے گا۔ آئے گا۔

(قاضی دُودو داخل ہوتے ہیں)

نذرل: ارے دُودو! آؤ آؤ۔

مولوی صاحب: اچھا میں رخصت ہوا۔ (مولوی صاحب جاتے ہیں)

دُودو: تم سادھوؤں، فقیروں اور درویشوں کے چکر میں کب تک پڑے رہو گے۔ جم کر علاج کیوں نہیں کراتے۔

نذرل: اب تو کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا۔

دُودو: کیسے ہو گا۔ ایک طرح کا علاج کرا کے دیکھو (دُودو رخصت ہوتے ہیں)

پس منظر سے۔ (بروا کانت کی آواز میں) ماں کی قوت ختم نہیں ہوتی۔ تم اُسی کو یاد کرو۔

نذرل: کون ہو تم؟

پس منظر سے (باباجی کی آواز میں) نہیں نہیں۔ قوت میں نہیں عبادت میں آزادی ہے۔

نذرل: محبت! قوت!! عبادت!!! ہا ہا ہا— سب جھوٹ ہے جھوٹ ہے!

پس منظر سے (مولوی صاحب کی آواز میں) شراب کے جرعے چڑھاتے جاؤ۔ ساقی آئے گا۔

نذرل: نہیں نہیں نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا!

پس منظر سے آواز— ہومیوپیتھ! ہا ہا ہا— یہ تو بچوں کی مٹھائی ہے۔

(نذرل دونوں کان بند کر لیتا ہے)

پس منظر سے آواز— ایلوپیتھ! ہا ہا!! یہ بھی کوئی علاج ہوا۔

نذرل: میں سننا نہیں چاہتا— چلے جاؤ سب یہاں سے— جھوٹے—! کسی کو کچھ نہیں آتا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔
(یکایک کھڑا ہو جاتا ہے) ماں! ماں!!

(گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: کیا بات ہے نورُو؟

نذرل: میں چلا!

گریبالا: کہاں؟

نذرل: ماں کے پاس۔ میں چلتا رہوں گا— ایک دن، دو دن، جب تک چل سکوں۔ جب تک یہاں سے نکل نہ جاؤں مجھے کوئی پریشان نہ کرے۔ ماں کے پاؤں کے پاس بیٹھا رہوں گا۔ دیکھتا ہوں وہ کب تک آنکھیں نہیں کھولیں گی!

اسٹیج پر اندھیرا پھیل جاتا ہے

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

تیسرا منظر

(گیت کی آواز لہراتی ہوئی آ رہی ہے)

اے سیاہ پانی کی ندی!

دیکھ میں تیری لہروں میں ڈوب کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں

تیری غضب ناک لہریں میرا گھر بہالے گئیں۔

چرا میں بیٹھا تو یہ بھی غرقاب ہوگیا۔
اب تو سب کچھ کھو کر تیری گود میں پناہ گزیں ہوں۔
گھر تو مل جائے گا پر شکستہ دل کا جو سوتی گم ہوگیا وہ کیسے ملے؟

زمانہ: ۱۵ اردسمبر ۱۹۵۳ء۔ وقت: رات کا پچھلا پہر۔ مقام: ڈمڈم کا ہوائی اڈہ ——— ویٹنگ روم کے سامنے!

گریبالا: کوئی نظر نہیں آتا ——— کیا سب چلے گئے۔

سنیاسی: دس منٹ پہلے ہی جہاز آیا ہے۔

گریبالا: کوئی آرہا ہے! میں اُس طرف چلی جاتی ہوں ——— اندھیرے میں ——— خبردار! میرے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہئے گا۔

سنیاسی: مگر تم تو اتنی دور سے ملنے آئی ہو؟

گریبالا: نہیں، نہیں۔ میں صرف ایک نظر ——— بس ایک نظر اپنی بچی کو دیکھنے آئی ہوں ——— کوئی آرہا ہے۔ میں چلی۔
(ویٹنگ روم سے وُدُود باہر آتے ہیں)

سنیاسی: سنئے تو!

وُدود: کون ——— کہئے کیا بات ہے!

سنیاسی: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے گرو دیو اسی جہاز سے آئے ہیں؟

وُدود: آپ کے گرو دیو! میں کیسے بتاؤں۔

سنیاسی: میرا مطلب ہے قاضی نذرالاسلام ——— یعنی میرے گرو دیو برداکانت مجمدار کے دوست۔

وُدود: تو یوں کہئے۔ ہاں اسی جہاز سے روم سے آئے ہیں۔
(گریبالا ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور پھر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

سنیاسی: چلو مایوسی نہیں ہوئی مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ لوگ انہیں نیند سے نہیں جگا سکے!

وُدود: کیا مطلب؟

سنیاسی: گرو دیو اب تک دھیان گیان میں ہیں۔ جب تک وہ نہیں جاگ جاتے کوئی ان کو نہیں جگا سکتا۔

وُدود: FANTASTIC IDEA

(پوتر داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نذرل کے چھوٹے صاحبزادے قاضی انرودھ اسلام ہیں۔ عمر انیس بیس سال ہوگی)

پوتر: ارے تم اب تک یہیں کھڑے ہو!
اُنی رودھو: کاکا بابو آپ آ گئے۔

پوتر: میں آتا ہوں تم جاؤ۔ لتیکا تمہاری مدد کریں گی (اُنی رودھو چلا جاتا ہے) سامان وغیرہ سب گاڑی میں لے جانے کا انتظام کر آیا ہوں ——— وہ دیکھو کوبی دا کو لئے سب آرہے ہیں۔
(ساتھ میں نذرل کے بڑے صاحبزادے قاضی سبیّو ساچی اسلام بھی ہیں۔ عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ سنیاسی نذرل کو پرنام کرتا ہے۔ گریبالا آگے بڑھتی ہے۔ دوسرے اسٹیج پر پرآمیلا ہے۔ اسے اُنی رودھو اور نرس مس لتیکا گھوش لارہی ہے۔ پرآمیلا کی آنکھیں کسی کو تلاش کررہی ہیں)

گریبالا: دُولی!!

پرامیلا: کون؟ کون ———

پوتر: کیا ہوا، کیا ہوا دُولی!

پرامیلا: جیسے کسی نے آواز دی مجھے۔ ماں ——— شاید میری ماں آئی ہے۔

پوتر: (ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) کہاں، یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ اچھا اب چلو۔ ساچی (سبیّو ساچی) تم اپنے ابا کو سنبھالو۔

پرامیلا: نہیں نہیں ——— میں ماں کو دیکھوں گی ——— ماں ضرور آئی ہیں ——— ماں ——— ماں!!
(سب چلے جاتے ہیں۔ اسٹیج خالی ہے۔ گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: دُولی! دُولی!! چلی گئی؟ میں بھی جاؤں گی ——— نہیں نہیں! میں سامنے کھڑی ہو کر نہیں دیکھ سکتی۔ نورو! دُولی!! میری چھاتی پھٹ جائے گی۔ جاؤ، تم دونوں جاؤ ——— ایں! کیا کہا میں نے؟ نہیں، نہیں، میں ہی جاتی ہوں ——— تم لوگ زندہ رہو! مگر اس زندگی سے تو مرجانا ہی بہتر ہے! اُف!!..... وہ کیا؟ اندھیرا! اندھیرا کیوں؟ روشنی ——— روشنی کہاں گئی۔
(قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا پھیل جاتا ہے)

(پردہ)

تخاطب کا نام معلوم نہ ہو میں بے تکلفی سے بات چیت نہیں کر سکتا۔

عائشہ:- آپ مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں۔ فیروزہ، رضیہ، سلمیٰ۔

نوجوان:- (ہنس کر) چلئے یہی سہی۔ ہاں، تو فیروزہ صاحبہ آپ کا یہ سوال کہ میں کس طرح اور کس غرض سے یہاں آیا ہوں، واقعی بہت اہم ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو جواب ان سوالوں کا ہوگا اُسے شاید آپ تسلیم نہ کریں۔

عائشہ:- کہئے۔

نوجوان:- مجھے شک ہے کہ میں واقعی یہاں کہیں سے آیا ہوں۔ کیا آپ نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا؟

(عائشہ انکار میں سر ہلاتی ہے)

تو پھر کیا ممکن نہیں ہے کہ میرا اپنا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ شاید میں صرف آپ کے تخیل کی پیداوار ہوں۔

عائشہ:- (غصے سے) میں یہ سب فضولیات نہیں سننا چاہتی آپ فوراً چلے جائیے ورنہ میں آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔

نوجوان:- آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔

عائشہ:- کیوں؟

نوجوان:- اتنے آپ پولیس کو بلانے کا انتظام کریں گی میں چلا جاؤں گا۔

عائشہ:- تو پھر آپ چلے جائیے۔

نوجوان:- لیکن ابھی آپ نے پولیس کو بلانے کا ارادہ کہاں کیا ہے۔

(باہر سے کسی کے پکارنے کی آواز آتی ہے)

عائشہ:- (گھبرا کر) یہ میرے ڈیڈی ہیں۔

نوجوان:- گھبرائیں۔

عائشہ:- آپ فوراً چلے جائیے۔ وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔

نوجوان:- تو میرے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے!

عائشہ:- آپ سمجھتے کیوں نہیں! اتنی رات گئے کسی مرد کا تنہا میرے کمرے میں ہونا ٹھیک نہیں ہے۔

نوجوان:- یہ بات آپ کے لئے پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے، میرے لئے نہیں۔

(بڑے اطمینان سے سامنے رکھی ہوئی چھوٹی میز پر پیر رکھ کر آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عائشہ:- خدا کے لئے آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں!

(ڈیڈی کی آواز قریب آ جاتی ہے: "عائشہ")

وہ آ گئے۔ میں کیا کروں! اُف میرے اللہ!

(نواب علی داخل ہوتا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا موٹا تازہ آدمی ہے۔ نائٹ گون پہنے ہوئے، سر گنجا ہے، آنکھوں پر موٹے سیاہ فریم کی عینک)۔

نواب علی:- بیٹی عائشہ آج تو بارش ـــــ

(اچانک نوجوان کی طرف دیکھ کر جو کرسی پر بڑے اطمینان سے لیٹا رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے)

یہ کون صاحب ہیں!

عائشہ:- (گھبرا کر) یہ ـــ یہ رضیہ کے بڑے بھائی ہیں ڈیڈی۔ بیچارے کسی پارٹی سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں بارش نے آگھیرا۔ بھیگتے بھاگتے بمشکل سے یہاں تک پہنچے۔

نواب علی:- ہوں۔

نوجوان:- (اٹھ کر) آداب عرض!

نواب علی:- آداب۔ لیکن تم نے بیچاروں کو یہاں کیوں بٹھائے رکھا۔ ڈرائنگ روم میں لے کر آ جاتیں۔

عائشہ:- (لاجواب سی ہو کر) جی۔ ۔ ۔ ۔

نوجوان:- جی ہاں، انہوں نے تو بہت کہا۔ لیکن میرے کپڑے اور جوتے سب کیچڑ میں لت پت تھے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اور پھر خواہ مخواہ آپ سب کو تکلیف ہوتی۔

نواب علی:- تکلیف کیسی۔ رضیہ تو بالکل میری اپنی بیٹی کی طرح ہے۔ تم اس کے بھائی ہو۔ تمہیں ہم سے تکلف نہیں کرنا چاہئے تھا۔

نوجوان:- جی تکلف کیسا۔ اگر ہوتا تو پھر ایسے موسم اور ایسی رات میں یہاں آتا ہی کیوں!

نواب علی:- رضیہ اور فیروزہ تو میری نظر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عائشہ:- (زور سے کھانستی ہے) ہاں ڈیڈی۔ رضیہ تو خود ہی مجھ سے کہا کرتی ہے کہ عائشہ میرے سارے گھر والے انہیں بلکہ ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا خود مجھے۔

نواب علی:- ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ مگر وہ فیروزہ کا کیا قصہ تھا یہاں۔ فیروزہ کون ہے؟

نوجوان:- فیروزہ ـــ ؟ جی، فیروزہ میری منگیتر کا نام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہاں دراصل یہ تینوں بہت دوست ہیں آپس میں۔ رضیہ فیروزہ اور یہ۔

نواب علی:۔ اوہ! (ہنستا ہے) تمہاری منگیتر کی دوست ہے عائشہ۔ تب ہی تم یہاں باتیں کرنے میں مگن ہو گئے۔
(پھر ہنستا ہے) کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ (عائشہ سے) لیکن تم نے انھیں۔ کیا نام ہے تمہارا صاحبزادے؟

نوجوان:۔ جی نام — میرا نام عشرت!

نواب علی:۔ (گھور کر دیکھتا ہے) عشرت — لیکن یہ تو رضیہ کے چھوٹے بھائی کا نام ہے وہ جو گول مٹول سا آیا کرتا ہے اس کے ساتھ۔ بھائی بیٹا وہ تمہارا!

نوجوان:۔ جی۔ جی ہاں — ہے تو بھائی لیکن اب کیا عرض کروں، معاملات کچھ اور ہیں۔ دراصل ہمارے والد نے دوسری شادی کی اور وہ چھوٹا بچہ ہماری نئی امی کے ساتھ آیا تھا حسنِ اتفاق سے نام اس کا بھی عشرت ہی تھا (خود بھی زور سے ہنستا ہے) عائشہ اپنے ہونٹ چبا رہی ہے۔ نواب علی گھور رہا ہے)

نواب علی:۔ کیا کہا۔ دوسری شادی۔ لیکن تم نے ہمیں تو کبھی نہیں بتایا عائشہ کہ رضیہ کی سوتیلی امی ہیں!

عائشہ:۔ جی۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔!

نوجوان:۔ یہ بات کبھی کسی سے کہنے کی نہیں ۔ ۔ ۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے کہہ دیا۔ ورنہ آج تک ہم میں سے کسی نے کبھی یہ راز افشا نہیں کیا تھا۔

نواب علی:۔ (لمبی سانس) ہوں! بھلا کتنے سال ہو گئے تمہارے والد کے انتقال کو؟

نوجوان:۔ والد کے انتقال کو۔ ٹھہریئے ذرا یاد کر لوں۔ آں۔ آں ۔ ۔ ۔ ۔

عائشہ:۔ تین (کھانس کر) تین بجے سے لگا تار بارش ہوئے چلی جا رہی ہے۔

نواب علی:۔ یہ جھڑی تو مجھے لگتا ہے ہفتہ بھر لگی رہے گی —

نوجوان:۔ جی ہاں — آثار تو کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جی تو آپ نے پوچھا تھا۔ والد صاحب کے متعلق۔ تین سال کے قریب ہو گئے۔ ان کی وفات کو — رضیہ تو بالکل ننھی سی گڑیا تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تھا۔

عائشہ:۔ حرکتیں اس کی اب بھی بچپن ہی والی ہیں۔ کہنے کو کہتی ہے کہ دسمبر میں پورے ۲۲ سال کی ہو جائے گی۔

نوجوان:۔ ہاں، مجھ سے دو ہی برس تو چھوٹی ہے۔

نواب علی:۔ اچھا بیٹی تو تم عشرت میاں کو کچھ چائے وائے تو پلواؤ۔ یہ بھی کیا کہیں گے۔

عائشہ:۔ جی بہتر۔

نواب علی:۔ اچھا تم رہنے دو۔ تم باتیں کرو۔ میں ممتد سے کہے دیتا ہوں، چائے کے واسطے۔ اچھا میاں۔ اگر بارش بند نہ ہو تو جانے کی ضرورت نہیں، ٹیلیفون کر دینا۔ یہاں سونے کا انتظام کر دیا جائے گا —

نوجوان:۔ جی شکریہ۔

نواب علی:۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ! اچھا بیٹی شب بخیر۔
(جس دروازہ سے آیا تھا اسی سے نکل جاتا ہے)

نوجوان:۔ (اطمینان کر لینے کے بعد کہ نواب علی چلا گیا)
ہوں، تو آپ نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن جھوٹ کبھی نہیں چھپتا۔ کیوں؟ آپ کا کیا خیال ہے عائشہ صاحبہ؟

عائشہ:۔ اب آپ فوراً چلے جایئے۔

نوجوان:۔ چائے آجانے دیجئے۔

عائشہ:۔ میں کہتی ہوں اب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ چلے جایئے فوراً۔

نوجوان:۔ (اطمینان سے مسہری پر بیٹھ جاتا ہے) آپ پھنس چکی ہیں محترمہ عائشہ سلطانہ۔ اب یہ سب برداشت کرنا ہی ہوگا۔ میں نہیں جاؤں گا صرف ٹیلیفون کر دوں گا۔ اور آپ کے والد میرے لئے بستر کا انتظام کروا دیں گے۔ ہا ہا ہا۔ کیا سمجھیں آپ ۔ ۔ ۔ ۔؟

عائشہ:۔ (سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)
میرے اللہ! میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔

نوجوان:۔ (شرارت سے) خوبصورت لڑکیاں جب خفا ہوتی ہیں تو ان کا حسن کچھ اور بھی نکھر جاتا ہے۔

عائشہ:۔ بند کرو یہ بکواس!

نوجوان:۔ کمال ہے، میں نے سنا تھا ہر نوجوان لڑکی اپنے حسن کی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے۔

عائشہ:۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ یاد رکھئے آپ کو ان باتوں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

نوجوان:۔ مجھے جو کچھ حاصل کرنا تھا کر چکا۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

عائشہ:۔ کیا حاصل کر چکے آپ؟

نوجوان:۔ جو حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔

عائشہ:۔ یعنی ----؟ (ممدو ہاتھوں میں ٹرے لئے داخل ہوتا ہے)

ممدو:۔ چائے۔

عائشہ:۔ دیکھئے یہ میرا نوکر ہے۔ میں اس سے اگر کہوں تو وہ ابھی آپ کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہے)

(ممدو خاموشی سے چائے کا سامان میز پر لگا رہا ہے)

نوجوان:۔ ممدو اتنا بدتمیز نہیں ہے کہ گھر آئے ہوئے ایک معزز مہمان کے ساتھ، جس کے لئے وہ ابھی چائے بنا کر لایا ہے، ایسا ناروا سلوک کرے۔ وہ ایسا نہیں کریگا۔

عائشہ:۔ وہ ایسا ہی کرے گا۔

نوجوان:۔ میرا خیال ہے وہ فوراً آپ کے ڈیڈی کے پاس دوڑا ہوا جائے گا اور ان سے کہے گا کہ بی بی کے دماغ میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے سرکار۔ کیوں ممدو؟

ممدو:۔ (چونک کر) جی ہاں سرکار (نوجوان زور زور سے ہنسنے لگتا ہے)

عائشہ:۔ (زور سے) کیا جی ہاں سرکار؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے وہ بہرا ہے۔

ممدو:۔ جی سرکار۔ بڑے سرکار نے کہا تھا کافی اور چائے دونوں چیزیں لے جانا۔

نوجوان:۔ تم جا سکتے ہو ممدو؟

ممدو:۔ انڈا تو گھر میں تھا نہیں سرکار، ورنہ میں ضرور لے آتا۔

عائشہ:۔ چائے بنا دو (ممدو چائے بنانے لگتا ہے) آپ چائے پی کر فوراً چلے جائیے ورنہ میں ویسا ہی کروں گی جیسا میں نے کہا تھا۔

نوجوان:۔ کیا کہا تھا آپ نے؟

عائشہ:۔ یہی کہ میں ممدو سے کہہ کر آپ کو باہر نکال دوں گی۔

نوجوان:۔ (زور دے کر) آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔!

عائشہ:۔ میں کر سکتی ہوں۔

نوجوان:۔ نہیں کر سکتیں۔

عائشہ:۔ کیوں نہیں کر سکتی؟

نوجوان:۔ اس لئے کہ چائے پی کر میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

عائشہ:۔ (سانس لے کر) اوہ! آپ نے پہلی بار شرافت کا ثبوت دیا ہے۔

نوجوان:۔ شکریہ۔ ممدو تمہارے پاس ماچس ہوگی۔

ممدو:۔ جی ہاں سرکار، عمر اسی گھر میں گذری ہے۔

نوجوان:۔ (ہنستے ہوئے) ماچس۔ مجھے ماچس چاہیئے

ممدو:۔ ماچس۔ ہاں ہاں سرکار۔ کیوں نہیں۔ (اپنی جیب سے ماچس نکال کر دیتا ہے)

نوجوان:۔ سگرٹ سلگاتا ہے جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھی) شکریہ۔

ممدو:۔ (چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا رہا ہوتا ہے) شکر۔ دو چمچے سرکار۔

عائشہ:۔ (جھڑک کر) تم اب جاؤ۔

ممدو:۔ اور کیا لاؤں سرکار؟

عائشہ:۔ کچھ نہیں، جاؤ۔ باہر چلے جاؤ۔ (ممدو اپنا جھاڑن کندھے پر ڈالے چلا جاتا ہے)

نوجوان:۔ (چائے کا ایک گھونٹ بھر کر) آپ نہیں پئیں گی چائے؟

عائشہ:۔ جی نہیں۔

نوجوان:۔ بہت خفا ہیں؟

عائشہ:۔ (منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

نوجوان:۔ میں جانے والا ہوں۔ صرف چند لمحے اور آپ کے پاس بیٹھوں۔ شاید اس کے بعد ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ چلتے چلتے اس قدر بے رخی تو نہ برتیئے۔

عائشہ:۔ (کچھ سوچ کر) آپ ہی نے کونسی اپنائیت کا ثبوت دیا ہے؟

نوجوان:۔ آپ نے چاہا بھی کب؟

عائشہ:۔ یہ تک نہیں بتایا آپ نے کہ آپ ہیں کون اور کیوں آئے تھے؟

نوجوان:۔ اگر آپ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کریں تو بتا سکتا ہوں۔

عائشہ:۔ (بظاہر بے تعلقی سے) آپ کو غلط فہمی ہے کہ میں آپ کو اس قدر اہمیت دے سکتی ہوں کہ ہر کسی سے آپ کا ذکر کرتی پھروں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔

نوجوان:۔ تو پھر میں بتا دوں؟

عائشہ:۔ آپ کی مرضی۔

نوجوان:۔ سنئے ــــ میں ڈرامے لکھتا ہوں۔ میرا ایک ڈرامہ ہے جس کا پہلا منظر یہ ہے کہ ایک نوجوان ایک غیر آباد علاقے میں ایک گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ رات کا وقت ہے۔ شدید بارش ہے۔ نوجوان کو سگرٹ کی سخت طلب ہے۔ لیکن اس کی ماچس پانی

(باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

افسانہ:

دوسری کہانی

یونس جاوید

چاندنی میں نہائی ہوئی اس خنک رات کو گاؤں سے آدھ میل دور، بیریوں کے جھنڈ کے پاس چاچا عمرے کے ڈیرے پر پڑا ہوا کھاٹ سائے میں ہونے کی وجہ سے گویا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ بیریوں کے گہرے گہرے سائے اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے جوہڑ کے کنارے تک چلے گئے تھے۔ کھاٹ کے نیچے ڈبو گٹھڑی بنا سو رہا تھا اور اس سے کچھ دور بیا گئی چھپر تلے بندھی تھی۔ اور چھپر کے بالکل سامنے چاچا عمرا تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

گھاس پھونس کی اس چھوٹی سی جھونپڑی کا چھپر سرکا ہوا تھا۔ اور چاندنی کی ایک چھوٹی سی تہہ، اندر بچھی ہوئی پرالی پر جمی تھی۔ چاچے نے اپنا موٹا کھیس ڈھیلا کر کے از سرِ نو کس کر لپیٹا اور چلم میں پڑی ہوئی آگ کریدتے ہوئے پھونک ماری۔ پھونک مارنے سے تھوڑی سی راکھ بھی اڑی۔ اور چاندنی میں یوں تیرنے لگی جیسے دور کہیں برف گر رہی ہو۔

چاچا حقے کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد جب ڈبو بھونکتا ہوا کھاٹ کے نیچے سے نکل آیا۔ باہر گھی ہنہنائی تو چاچا چونک کر کھڑا ہو گیا اور حقے کی نے گھما کر اسے بڑی احتیاط سے ایک کونے میں رکھنے کے بعد جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔ دور جوہڑ کے کنارے کنارے کوئی جوان گھوڑی پر جھک کر پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز بڑی دھیمی تھی اور گھوڑی کے پیچھے اڑنے والی گرد دھند معلوم ہو رہی تھی۔ بیریوں کے قریب آ کر جب سوار نے رخ جھونپڑی کی طرف پھیرا تو چاچا دروازے سے ہٹ کر اندر آ گیا۔

سوار نے عین جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی روکی۔ تو وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور اس کا سایہ کانپتا ہوا جھونپڑی کے اندر تک آ گیا۔ گھوڑی سنبھالنے کے بعد سوار نے اتر کر اسے ایک درخت سے باندھ دیا اور خود کھانستا ہوا جھونپڑی میں آ گیا۔ چاچا اس وقت تک چارپائی پر بیٹھ کر حقے کی نے پر بوجھ ڈال چکا تھا۔

"جلدی پلٹ آئے ہو سردارے!" چاچے نے کش لئے بغیر سوار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہوں۔" پھسپھسی آواز میں سردارا بڑبڑایا۔ پھر پرالی کو اکٹھا کر کے اس کی ایک موٹی سی تہہ بنائی اور اس پر بیٹھ کر بولا۔

"جیجا مجھے چودھریوں کی بیٹھک ہی میں مل گیا تھا۔"

"کوئی پنچایت تھی کیا؟" چاچے نے ابھی تک حقے کا کش نہیں لیا تھا۔

"نہیں" سردارا ایک بار پھر مری ہوئی آواز میں بولا۔ "جیراں اور تھیلے کی منگنی تھی۔"

"کون تھیلا؟ نبی بخش ذیلدار کا؟"

"ہاں، وہی۔" سردارے نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ اور کچھ دیر خاموش رہا جب چاچا نے حقے کی نے اس کی طرف گھمائی تو اس نے ہلکا سا کش لے کر کہا۔

"منگنی تو خیر کل ہوئی تھی، مگر آج بانٹا گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"کس بات کی سمجھ؟ کچھ کھول کر بیان کرنا۔" چاچا تجسس بھری نگاہوں سے اس کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ مگر سردارے نے جواب دینے کے بجائے گردن پوری طرح جھکا لی۔

چاچا جب دو تین کش لے چکا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بات کا جواب نہیں دیا گیا۔ وہ پہلے سے تند لہجے میں بولا۔

"منگنی تو جیراں اور تھیلے کی ہوئی ہے۔ تو کیوں گونگا بن رہا ہے؟ تجھے تو اس منگنی پر خوش ہونا چاہیئے۔ کیا ہوا اگر اب تھیلے سے تمہاری دوستی نہیں رہی۔ تھا تو تیرا ہی یار۔ بچپن کا ساتھی۔ دیر تو اس کی منگنی ــــ"

"کون کسی کا ویر ہے چاچا۔" سردارا بات کاٹ کر بولا۔ "میں اس کا ویری نہ وہ میرا۔ پہلے اندر سے وہ میرا دشمن تھا۔ اب کھلے طور پر میں اس کے خون کا پیاسا ہوں ــــ"

چاچا کچھ دیر منتظر رہا کہ سردارا اپنی بات مکمل کرے گا۔ مگر جب سردارا کچھ نہ بولا تو چاچا تنگ آ کر کہنے لگا۔

"کچھ بول تو سہی۔ کیا آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے۔ جیجا کہاں ہے اور

وہ چیز ہے ـــ"؟

سردارا گردن گھما کر جھونپڑی سے باہر تکنے لگا۔

چاند بیریوں کے اوپر سے ہو کر جوہڑ کے کنارے اُگے ہوئے کھجور کے درخت میں اٹک سا گیا تھا۔

اور چاندنی میں گاؤں، سمندر کے کنارے بنے ہوئے ریت کے گھروندوں کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چاند کو گھورتے ہوئے ہاتھ حقے کی نے کی طرف بڑھائے اور دو ایک کش لینے کے بعد بولا" وہ بھی آجائے گا۔ میں اسے راستے میں خود چھوڑ آیا ہوں۔ گوری تھکی ہوئی تھی نا۔ دونوں کا بوجھ اٹھا کر چل نہیں سکتی تھی۔"

وہ چپ ہوا تو سناٹے کی چادر پھر تن گئی۔ البتہ جب دونوں میں سے کوئی حقے کا کش لیتا تو سناٹا مجروح سا ہو جاتا۔ کتنی ہی دیر وہ گم سُم بیٹھے رہے یہاں تک کہ سرکے ہوئے چھپر میں سے جھانکتی ہوئی چاندنی بھی آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی۔ جب سردارا آیا تھا تو جھونپڑی کے اندر گز بھر چاندنی پھیلی ہوگی۔ اب آدھی بھی نہ رہ گئی تھی۔

یکایک ڈبو غراتا ہوا کسی جنگلی بلی کے پیچھے بھاگا تو دونوں باہر دیکھنے لگے۔ پھر سردارا چپ چاپ اٹھا اور دروازے تک آکر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد واپس آگیا اور بولا" جیجا آرہا ہے شاید۔"

چاچے عمرے نے اپنی خشخشی داڑھی کھجاتے ہوئے نگاہیں جھونپڑی سے باہر جما دیں۔

تھوڑی دیر بعد جیجا اندر آگیا۔ اس نے سر پر کوئی موٹا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں کھونٹا تھا۔ اور دوسرے میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی جب وہ اندر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا تو چاچے نے کہا" آ بھئی جوان۔ کتنی دیر سے تیری ہی راہ دیکھ رہے ہیں۔ لائے ہو نا"

کیسے نہیں۔ آج تو سردارے کو بھی لوٹ رہے ہیں۔ کیوں دیر جی؟" اس نے آخری جملہ سردارے کی طرف رُخ پھیر کر کہا۔

سردارا کچھ بھی نہ بولا۔ جیجے نے کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز چاچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا" اصلی کیکر کی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیکر کی جڑیں ڈال کر بوتل دبائی تھی۔ میں تو پیؤوں گا نہیں تم دونوں موج میلہ مناؤ۔"

" خیر یہ تو ہوا" چاچے نے بوتل پرالی کی گٹھڑی میں اڑستے ہوئے کہا" اس کو کیا ہو گیا ہے میری سمجھ میں تو نہیں آرہی اس کی بات۔"

"بات تیری سمجھ میں آبھی نہیں سکتی" جیجا حقے کا پہلا کش لے کر بولا" پھر بھی سُن لے۔ باتیں تو اس جوان سے تو ہر روز بھاتی کی سنتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی کب کی بیاہی جا چکی ہے۔ مگر نئی کہانی تو تم نے سنی ہی نہیں۔ دیکھو نا" چارپائی کے سامنے بیٹھ کر اس نے چاچا کو پوری طرح متوجہ کر لیا" اب اگر ہم سے نہ چھپاتا۔ تو یہ رشتہ بھی ہاتھ سے جا سکتا تھا۔"

" رشتے کی بات نہیں" پہلی بار سردارا اتنی اونچی آواز میں بولا" بات تو اس ضد کی ہے جو میرے اور بھیلے کے درمیان چلی آرہی ہے۔ کل تک بھیلا تھا۔ آج شہر سے لوٹا ہے تو محمد طفیل ہو گیا ہے۔"

"کس بات کی ضد؟" چاچے نے سردارے کو سانس لینے کی مہلت دیئے بغیر پوچھا۔

"جیراں کو بیاہ لانے کی ضد اور کون سی؟ میں ضدی تو نہیں ہوں۔ دعویٰ بھی اس لئے کر بیٹھا کہ جیراں مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی تو کیا ہوا۔ مائی طالعاں نے مجھے صاف بتا دی تھی کہ جیراں تو اب تیرے ہی گُن گاتی ہے۔ ورنہ ضد کس بات کی۔؟"

"پھر؟" چاچا تجسس بھری آواز میں بولا۔

"پھر کہنا کیا بتاؤں۔ بس بھی تو ایسی ہی لڑکی چاہتا تھا جو صرف مجھے چاہے میری ہو کر رہے۔ ورنہ گاؤں میں لڑکیوں کا کال تو نہیں ہے۔ چودھری کے گھر مائی طالعاں کے ذریعہ بات چیت ہو رہی تھی۔ جانے یہ بھیلا شہر سے ایک دم کیسے آن ٹپکا۔ خبر ہی نہیں سنی اس کے آنے کی۔ جیجے کی طرف گیا ہوں۔ تو راستے میں بڑی حویلی کے پاس چودھری کی بیٹھک میں ٹھٹھے مذاق کی باتیں سُن کر معلوم کیا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔"

"تو ہوا کیا" جیجا بیچ میں بول پڑا" تو تو یوں کڑھ رہا ہے جیسے تیری رستی بستی بیوی کو بھگا لے گیا ہو بھیلا۔ تو آج بول آدھی زبان سے۔ بھیلے کی بہن ــ بیاہ دوں تجھے۔ دس گھماؤں زمین کا اکیلا مالک ہے، تو روتا کیوں ہے؟"

"تو بات نہیں سمجھا جیجے۔ خواہ مخواہ بیچ میں بول پڑتا ہے۔ سُن میرے مولا نے چاہا تو جیراں کو بیاہ کر نہ جا سکے گا بھیلا بھی۔ اور اگر وہ جیراں کی ڈولی لے گیا تو اسی دن تمہیں بھی جیرے کے جنازے کو کندھا دینا ہو گا۔ ارے پاگل! جوانوں کی بھری محفل میں قول دے کر آیا تھا۔ کیا منہ لے کر جاؤں گا سب کے سامنے؟"

سردارے نے حقے کی نے اپنی طرف کھینچی، منہال کو ہاتھ میں لیا۔ اور مٹھی کے دہانے پر ہونٹ جما کر کش لینے لگا۔

کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے، پھر سردارا فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہو کر بولا" ذرا کی ذرا بانکی لے جا رہا ہوں۔ گوری صبح سے بہت چلی ہے تھکی ہوگی۔"

"بانکی سوار لے جا تو۔ پر اس وقت جا کدھر رہا ہے، اور پھر اس کا کیا بنے گا؟"

چاچے نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخری جملہ کہا۔

"میرپور تک جاؤں گا گھنٹے بھر میں واپسی ہوگی۔ تب تک تم شغل کرو، سمجھو بوس آیا" سردارے نے چٹکی بجائی۔

"جانا ہی کتنی دور ہے۔ میرپور زیادہ سے زیادہ دو مربعے ہوگا" اس نے جھونپڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور بانکی کھول کر اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔

فضا میں بانکی کی ٹاپیں ابھریں پھر آہستہ آہستہ معدوم ہوگئیں۔

رات کے تیسرے پہر جب سردارا لوٹ کر ڈیرے پہنچا تو چاند مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کان اور منہ کپڑے سے اچھی طرح لپیٹ رکھے تھے۔ یہ بانکی کا تیکھا پن تھا کہ وہ اس قدر جلد لوٹ آیا تھا۔

جب وہ جھونپڑی کے سامنے پہنچا تو بانکی قدم قدم چل رہی تھی۔ اس بار نہ گھوڑی ہنہنائی نہ ڈبو غرایا۔ بس گہرا سناٹا چھایا رہا۔ بڑی پھرتی سے اس نے بانکی سے اتر کر اسے کھونٹے سے باندھا اور جھونپڑی میں چلا آیا۔

جیجا اور چاچا پرالی پر آڑے ترچھے سو رہے تھے۔ بوتل پر ابھی تک چاچے کا ہاتھ تھا۔

سردارے نے گھبرا کر جیجے کی پنڈلی پر آہستہ سے ٹھوکر ماری۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں شراب پی کر نشے میں پڑے ہیں۔ مگر جب وہ چاچا پر جھکا تو اس کے ہاتھ کے نیچے بھری ہوئی بوتل دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

اس نے دونوں کو باری باری جھنجھوڑ کر جگایا۔ دونوں کچھ دیر اپنی اپنی آنکھیں ملتے رہے۔ پھر جب ان کی آنکھوں میں روشنی اور تجسس ایک ساتھ امڈے، تو وہ سردارے کی طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سردارے نے آہستہ آہستہ کھیس کی بکلی کھولی۔ اور دونالی بندوق نکال کر دونوں کے سامنے رکھ کر مسکرانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" چاچے نے سوئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جیجے کی تقدیر!" سردارا ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

چاچا پہلے تو چپ چاپ سردارے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اٹھ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا "جیجے کی تقدیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے تو اپنی جوانی کے ساتھ بھی کھیل رہا ہے۔ دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے سے عمر لمبی نہیں چھوٹی ہوتی ہے۔ اور پھر دس گھماؤں زمین بیچ کر تم اگر بچ بھی گئے۔ تو کیا وہ زندگی زندگی ہوگی؟"

"تو کیا جانے چاچا" سردارا پھر بولا "چودھری کی لڑکی سے منگنی کرا کے اس نے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے ہیں۔ اپنے سر میں سات چولھوں کی راکھ اڑتی محسوس کرتا ہوں۔ مرد کے لئے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ایک بار تو مناسم علی پٹواری کے بھرے ڈیرے پر ہم نے ایک دوسرے کو بھبک مار کر مقابلے میں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اصل بات تو حیراں تھی۔ مرنے مارنے کی بات ہوتی تو بھری محفل سے اس طرح نہ لوٹتا۔ لاش ہی آتی۔ اب ہر محفل میں اس کی شیخی سنکر شرم کے مارے گردن جھکا لینے سے یہ بہتر نہیں کہ ہم میں سے ایک نہ رہے۔ وہ تو خیر مرجائیگا سو جائے گا۔ میں کیوں نہ اس کا خون پی کر کلیجہ ٹھنڈا کر لوں؟ چودھری بھی تو یاد کریگا" سردارے نے جیجے کی طرف دیکھکر کہا۔ مائی طالعاں سے تھوڑی سی بات کر کے بھی رات بھر میں بدل گیا۔ اب دیکھوں گا نا۔ کیسے گھر بستا ہے جیجے کا؟"

سردارا خاموش ہوا تو چاچے نے کھنکار کر بولنے کے لئے زمین ہموار کی۔ مگر سردارے نے اس کی کھانسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً کہا۔

"چاچا! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسے اگر میرے ہاتھ سے اور مجھے پھانسی سے مرنا ہے تو کون روک سکتا ہے ہم دونوں کو؟ ویسے تو فکر نہ کر۔ سردارا کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ انتظام پورا پہنچیری دھا ہے۔ سنے گا تو سر دھنے گا" سردارے نے زمین سے بندوق اٹھا کر چارپائی کے پائے کے ساتھ کھڑی کر دی "یہ بندوق میرپور جا کر ڈتے ماچھی سے لایا ہوں۔ بغیر لائسنس کی ہے۔ فائر تو ہوگا اس بندوق سے۔ اور پھر مقدمہ چلے گا نا۔ سن رہا ہے نا میری بات؟ غور سے سن۔ مقدمے میں اپنی بندوق پیش کر دوں گا۔ سمجھا!"

"کون سی اپنی؟" چاچا بے ساختہ بولا "جس کی نالی نیچے سے پھٹی ہوئی ہے اس کی تو ہر کل خراب ہے۔ وہی نا؟" چاچے کی بات سے متصل جیجے نے کہا۔

"ہاں، وہی۔ مگر تم کیا جانو اس چکر کو؟ چھ سال سے اس ناکارہ بندوق کا ٹیکس دے رہا ہوں۔ بات بتانے کی نہیں مگر یاروں کی منڈلی میں جانے کیوں راز اچھل اچھل کر حلق کی طرف آنے لگتے ہیں تو بات اتنی ہے کہ اس زنگ آلود بندوق کا لائسنس بنوایا ہی اس غرض سے تھا۔ اور پھر گاؤں کے برتن ہیں نا۔ کچے ہی سہی مگر جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو شہر کے پکے برتنوں کی طرح خوبصورت شور پیدا نہیں کرتے بلکہ دونوں میں سے ایک ٹوٹ جاتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟ یہی کچھ سوچ کر میں نے اس کا لائسنس بنوایا تھا۔ کہ جب دو برتن ٹکرا جائیں اور میرے مقابلے کا برتن ٹوٹ جائے تو بچنے کے لئے ایک راستہ باقی رہے۔ یعنی فائر تو کروں گا ڈتے ماچھی کی بندوق سے اور عدالت میں یہ پیش ہوگی۔ عدالت اتنی پاگل تو ہے نہیں کہ اس کھڑکھائی بندوق کو دیکھ کر مجھے پھانسی دے دے، ہوں!"

سردارا خاموش ہوا تو کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ چاند

جھونپڑی کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف اس حد تک نکل گیا تھا کہ جھونپڑی کا سایہ چھپر تلے بندھی بانگی کے قدموں کو چھونے لگا تھا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ گاؤں میں اذان دینے والے مرغ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تینوں یوں چپ بیٹھے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر چاچا اپنے لمبے لمبے سفید بالوں کی ایک لٹ شہادت کی انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "ساری بات تو جوانی کی ہے، جوانی جب کسی پر آئی ہے، کچھ دے لے کر گئی ہے۔ جب میں جوان تھا تو تُو شاید دودھ پیتا بچہ ہوگا۔ عجیب سرور اور نشہ سا رہتا تھا ہر وقت۔ منڈلی بیٹھتی تو دات پھر دوسروں سے لڑنے کا پروگرام بنتا۔ خون تھا نا رگوں میں خواہ مخواہ لڑنے کو جی چاہتا تھا۔ کبھی کبھی جب کوئی بھی لڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تو جی کرتا اونچے اونچے درختوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھیڑ دوں۔" چاچا منہال کو ہاتھ سے چھوڑ پرالی کو نئے پر لپیٹنے لگا۔ "تم جانو جب جوانی اتنی بے قابو ہو۔ تو اس کی لگام ضروری ہے۔ لگام ایسی ہو کہ دل خود قبول کرے۔ میری اس منہ زور جوانی کی لگام مجھے نوری کے ہاتھ میں نظر آئی۔ پہلے دن تو میں نے اسے یونہی نظر انداز کر دیا۔ مگر جب کچھ دنوں بعد اس نے مجھے دیکھ کر ناک چڑھائی اور منہ پھیرا تو یہ لگام ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ مذاق کر رہی ہے۔ مگر شاید یہ مذاق نہ تھا۔ اس کی ہر حرکت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ کیا کیا جتن نہ کئے ہونگے میں نے۔ ململ کی قمیص پہن پہن کر پوس ماگھ کے مہینوں میں پھرا ہوں۔ بھرے چوپال میں بنی پکڑنے کے بہانے سے نور بخش دھوبی کے بیٹے کا انگوٹھا توڑ دیا۔ اور پھر ایک بھاگتے چور کے پیچھے چھوی لے کر اس وقت بھاگا جب سارا گاؤں منہ دیکھ رہا تھا۔ چور کے پاس دیسی پستول تھا نا۔ مگر ان سب باتوں کا مطلب نوری کے دل کو پھیرنا تھا۔ میں چاہتا کہ نوری کسی طرح اس اندھی جوانی کی لگام بن کر میرے گلے سے آ لگے۔ مگر اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر کبھی نہ دیکھا۔ اور پھر اسی طرح بالکل تمہاری طرح، میں بھی نفرت کے شعلوں میں جل کر محبت چھیننے نکلا۔ مگر ہار گیا۔ تم نے تو دتے ماچھی سے بندوق مانگی ہے اور اپنے بچاؤ کے لئے سب منصوبے بنا لئے ہیں۔ مگر میں اکیلا، بغیر کچھ سوچے سمجھے، اس آگ میں کود پڑا۔ رات کو اپنے ڈیرے سے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ ان دنوں میرا ڈیرا گاؤں کی پہلی جانب ہوتا تھا۔ جہاں آج کل جاگیرے کے کھیت ہیں۔ خیر، پرانی چکی کے موڑ پر مجھے نوری ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس وقت اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ جی میں آیا چیخیں مارتی ہوئی کو اٹھا کر بھاگ جاؤں سیدھا ڈیرے۔ مگر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ مجھے تو وہ اس وقت کانچ کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اسی لئے میں نے ہاتھوں میں نرمی پیدا کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ مگر آہٹ پا کر وہ یوں چونکی جیسے گولی چلی ہو۔ اور پھر خوف سے وحشی ہرنی کی طرح اتنی تیز بھاگی کہ کھالی بھی نہ پھلانگ سکی۔ اور بری طرح گر پڑی۔ اس نے ایک بار تو اٹھنے کی کوشش کی مگر یوں ہانپ کے رہ گئی جیسے پاؤں میں من من لوہا بندھا ہو۔ میں اپنی قسمت پر مسکرانے ہی والا تھا کہ جیرا ایک تیز تیکھی گھوڑی کو بھگاتا ہوا چکی کے موڑ سے یوں آ پہنچا جیسے پہلے سے چھپا بیٹھا ہو۔ میرے قریب آ کر اس نے صرف میری طرف گھور کر دیکھا اور جلدی سے گھوڑی سے اتر کر نوری کو اٹھانے لگا۔ میری طرف اس لئے نہ بڑھا ہوگا کہ میرے ہاتھ میں چم چم کرتی چھوی تھی۔ نوری اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے تو اس وقت اپنے کپڑے بھی آگ کے بنے ہوئے لگے۔ ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ کان شائیں شائیں کرنے لگے اور بات کی تہہ تک پہنچنے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ پہلے ہی مجھے جیرے پر شک تھا کہ وہ ہر روز شام کے بعد گھوڑی پر بیٹھ کر اکیلا ڈیرے کی طرف کیوں جاتا ہے۔ جیرا ایک منٹ تک چپ چاپ مجھے گھورتا رہا۔ اور پھر اوپر تلے دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر غصے سے ہانپنے لگا۔ تھا تو وہ بھی اونٹ جتنا جوان۔ اور کم میں بھی نہ تھا۔ چھوی پاس نہ بھی ہوتی تو مقابلہ کئے بغیر کبھی نہ جاتا۔ مگر میں نے گالیوں کا جواب گالیوں سے دینے کے بجائے کہا۔ کیوں حرام موت مرتا ہے؟ گھوڑی پر بیٹھ اور گاؤں بھاگ جا، وہ میری اس بات پر اور بھی بھپر گیا۔ اور زمین سے ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا کر پوری طاقت سے میرے سر پر دے مارا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش تو بہت کی۔ مگر مجھے ڈھیلا آن ہی لگا۔ سر پر لگتے ہی دو تین چکر سے آئے۔ غصے بھرے ناگ کی طرح میں نے چمکتی ہوئی چھوی سے جیرے پر بھرپور وار کیا۔ مگر وہ اس کا کندھا چھوتی ہوئی نوری کے سینے میں اتر گئی۔ میں نوری کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں نے چھوی اس کے سینے سے باہر کھینچی اور خون کا دھارا بہہ نکلا۔ تو اس وقت مجھے اس کے مرنے کا ذرہ بھر بھی افسوس نہ ہوا۔ بلکہ میں نے اس پر دوسرا وار کر کے اسے جلدی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جیرا زخمی کندھے پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں نے اس پر دوسرا وار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خبر نہیں کیوں۔ مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈر کر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اس پر دوسرا وار نہیں کیا تھا۔"

"پھر؟" چاچا ایک لحظ کے لئے چپ ہوا تو جیجا اور سردارا کل دار کھلونوں کی طرح پھڑک کر بول پڑے۔

"پھر کیا۔ جیرے کی گھوڑی سامنے کھڑی تھی۔ میں اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر چک نمبر ۸۰ بھاگ گیا۔ مگر جانے کیسے صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ پانچ چھ روز میں وہ وہ خبریں اڑی ہیں گاؤں میں کہ پہلے ان کی بھنک بھی نہ پڑی تھی۔ سارا گاؤں کہتا پھر رہا تھا کہ نوری ہر روز جیرے کو ملنے جایا کرتی تھی اور جب دونوں کو جیرے نے دیکھ لیا۔ تو دونوں جانوں کی ٹھن گئی۔ لبعض

لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نوری کا قاتل جیرا ہے۔ جب نمبردار کے ساتھ اماں جیناں مجھے حوالات ملنے آئی تو اس نے مجھے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ نوری پرانی چکی کے موڑ پر تمہاری راہ دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اور جیرا اس پر مرتا تھا۔ ورنہ اس نے تو کبھی جیرے سے بات بھی نہ کی تھی۔ میں نے سب کی باتیں کان لگا کر سنیں اور خاموش رہا حتیٰ کہ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہا نہ نوری کے خلاف۔ چپ چاپ جیل چلا گیا۔ معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں کیا۔ جانے وہ کونسی شے تھی جو اندر ہی اندر مجھے جیل جانے پر اکسا رہی تھی۔ سات سال جیل میں سڑا۔ میں نوری کو نہ بھول سکا۔ اتنی لمبی قید اور اس کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اور پھر آج چوبیس برس کے بعد بھی وہ مجھے اسی طرح یاد آ رہی ہے۔ وہی معصوم کانچ کی بنی ہوئی نوری جو پرانی چکی کے موڑ پر چھپ کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جس کا داغ میں پھانسی کی سزا پا کر بھی نہیں دھو سکتا۔ میں نے اکثر اسے خواب میں دیکھا ہے۔ وہ محبت کرتی تھی نا۔ مجھ سے نہ سہی جیرے سے ہی سہی۔ کسی ایک کے لئے تو اس کے دل میں محبت تھی۔ مجھے بعض اوقات ان خیالوں سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ جیسے میں نے گلال جیسے چہرے والی معصوم نوری کو نہیں بلکہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار اپنے کلیجے میں بھونک دی ہو۔ وہی کنوارات کہ سوتے جاگتے اس نے میرا دامن کھینچا ہے۔ آدھی آدھی رات کو اکثر مجھے جگا جگا کر رلایا ہے۔ یہ کیسی عورت تھی، میں نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اسے قتل بھی کیا تھا۔ میں اس کی یاد میں تڑپا بھی ہوں۔ میری روح کو کسی وقت بھی چین نہیں ملا۔"

"جیرے کا کیا بنا؟" بیجا سوئی سوئی آواز میں بولا۔

"میرے جیل سے واپس آنے تک وہ یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" چاچا مولے کھیس کے کونے سے اپنی نم آلود آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے، جھونپڑی کا چھپر سرکا کر باہر نکل گیا تو صبح کا ہلکا نور اندر آنے لگا۔ بیجا اور سردارا چپ چاپ جہاں بیٹھے تھے وہیں لیٹ گئے۔ دونوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ صرف ایک بار بیجے نے اٹھ کر چھپر کو جھونپڑی کے دہانے پر جما دیا اور پھر لیٹ گیا۔

پورنماشی کی رات سے کر چاند کی بیس تک گاؤں بھر میں وہ ڈھولک بجی ہے کہ کچی کومل کنواریوں کے دل بھی شادی بیاہ کے تصورات میں ڈوب ڈوب گئے۔ کسی نے لال جوڑا چھنکا کر، ہونٹوں پر اجلی مسکراہٹ سجائی ہے تو کسی نے سرخ سرخ آنچل کمر کے گرد لپیٹ کر پورے آنگن میں پاؤں تھرکائے ہیں۔ جیراں چودھری کی بیٹی نہ ہوتی تو مرغی کی طرح ڈربے میں بند کر کے سسرال پہنچا دی جاتی۔ مگر وہ تو چودھری جلال کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی قریب کیا آگئی تھی، سر پہ پہاڑ ٹک رہا تھا سب کو۔ سلامت کی دکان کی کناری اور کرن دو دن میں پھیل کر چھوٹی بچیوں کے دوپٹوں سے الہڑ جوانیوں کے لہنگوں تک جا پہنچی تھی۔ شادی سے دو دن پہلے جب رات کو بڑ کے پرانے درخت کے نیچے بچھی ہوئی بیشمار چارپائیوں پر بیٹھے جیرا اور چھیلے کا نکاح ہو گیا۔ اور چھوہاروں کی بارش شروع ہو گئی تو سردارا اندھیرے سایوں میں سے ہوتا ہوا چاچا عمر کے ڈیرے آ پہنچا۔ اس وقت چونکہ وہ نکاح کو ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا۔ اس لئے اس کے کان سرخ اور آنکھیں وحشیوں جیسی ہو رہی تھیں۔ چاچا کلف لگی سفید پگڑی کو سر پر جما چکا تو اسی طرح بندھی بندھائی پگڑی کو اتار کر کھونٹی پر لٹکا کر بولا: "نکاح ہو گیا خیر سے تیری جیراں کا؟"

سردارا اس وقت یہ بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے عجیب بڑی بڑی آنکھوں سے چاچے کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔

جب چاچا عمر نے دوبارہ بغیر کچھ کہے اس کا کندھا ہلایا تو وہ تقریباً روتے ہوئے بولا "نکاح ہی ہوا ہے، ڈولی تو نہیں اٹھ گئی۔ اور سردارا مر گیا ہے کیا؟" پھر جب چاچے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی چاچے عمر کی طرف بڑی تمکنت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"برات پرسوں جا رہی ہے چراغ جلتے ہی چل پڑے گی۔ ڈے ماچھی سے بلی میں مانگ لوں گا۔ وہ ذرا تیکھی گھوڑی ہے۔ باقی پر جیجا ہوگا، اور اگر دلا رضامند ہو گیا تو اسے اپنی گوری پر بٹھا کر ساتھ لے لوں گا۔ ان دونوں کو ساتھ لے جانے سے فائدہ یہ ہے کہ یہ میرے آگے آگے رہیں گے اور دوسرے گھوڑیوں والے جوانوں کو چھیلے کے قریب نہ آنے دیں گے۔"

سردارا اس بات کے انتظار میں چپ ہو کر چاچے کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید وہ کوئی مشورہ دے گا۔ مگر جب چاچا سردارے کی طرف پٹر پٹر دیکھنے لگا تو سردارے نے خود ہی موضوع بدل دیا اور بولا "سوچا تھا تو شادی سے پہلے ہی ایک بار مل جانا۔ لیکن وہ تو اندر سے نکلنے ہی کو رہا۔ رات رات بھر گلیوں میں چھپ کر بیٹھا ہوں کہ مل جائے، مگر شاید میرے ارادوں کو بھانپ چکا ہے وہ۔ کیوں چاچا؟"

چاچا ابھی جواب دینے کے لئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ جیجا بھاگتا ہوا اس زور سے سامنے کی کھولی پھلانگ آیا کہ بانسی سڑ ہٹا کر کھڑی ہو گئی۔ سانس برابر کئے بغیر وہ سردارے کی طرف منہ کر کے بولا۔

"سردارے — ! کھیلا —"

"کہاں؟" چاچا اور سردارا ایک ساتھ بولے۔

"نکاح کے بعد جب سب لوگ گھروں کو جا رہے تھے تو وہ اپنے ساتھیوں سے گھنٹے بھر کی چھٹی لے کر سیدھا کھیتوں کی طرف گیا تھا۔"

"سچ؟" سردارا ایک دم کھڑا ہو کر بولا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

سردارے نے مزید کچھ کہنے کے بجائے پرالی ادھر اُدھر ہٹائی اور بندوق نکال کر سامنے کھڑی کر دی۔ پھر ڈبے میں دو تین کارتوس رکھے اور جھونپڑی سے باہر آکر جیجے سے کہنے لگا "تو بھی میرے ساتھ آنا۔ بانکی پر تو بیٹھ جا میرے پاس تو دتے کی گھوڑی ہے۔ گورزی کو تو پورا گاؤں جانتا ہے۔ پہچان لی جائے گی، ہوں!"

جاجا چپ چاپ دونوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر دونوں چھپر تلے آئے اور گھوڑیاں کھول کر جوہڑ کے کنارے کنارے کھیتوں کی طرف نکل گئے۔

پہلے آموں کا جھنڈ آیا، پھر میراں بخش کا باغ۔ اور اس کے بعد جمالے کے کھیت شروع ہو گئے۔ جمالے کے کھیتوں میں جب وہ میراثیوں کی جھونپڑیوں کے پاس پہنچے تو طرح طرح کے سوکھے سڑے کتے تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر بھونکنے لگے۔ مگر وہ ان کی پروا کئے بغیر گھوڑیاں بھگاتے ہوئے جمالے کے کھیتوں کی حدود پھاند گئے۔

جیجا دو گز پیچھے آرہا تھا۔ جب وہ کھلے راستے پر آگئے اور جیجے نے بانکی سردارے کے برابر کر دی تو سردارے نے امید کی تو کو سنبھالا دینے کیلئے پوچھا۔

"وہی تھا نا۔۔۔؟ دھوکا تو نہیں کھا گئے؟"

"واہ یار" جیجا فوراً بولا "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ وہی تھا، میں نے تو ایک عمر اس کے ساتھ کھیل کر گزاری ہے۔"

حاجی گل محمد کے ڈیرے تک دونوں خاموش رہے۔ اس وقت دونوں کی گھوڑیاں قدم قدم چل رہی تھیں۔

جب وہ ڈیرے کی چاردیواری کے پاس سے گذرنے لگے تو جیجا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی سفید گھوڑی کو دیکھ کر چیخ اٹھا "لو دیکھو، بالکل سفید ہے نا۔ اسی کی ہے۔"

سردارے نے سانس روک کر لگام کھینچ لی۔ اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا "تو بانکی کو پیچھے ہی لے جا۔ جب بندوق چلنے کی آواز آئے تو تم میراں بخش کے کھیتوں میں سے ہو کر نکل جانا، جاچے کے ڈیرے پر۔ خیال رہے بانکی کو کوئی پہچان نہ سکے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولا "اول تو بندوق کی آواز سنے گا کون؟ اور اگر کسی نے سُن بھی لی تو لوگوں کے آنے تک میں میر پور پہنچ جاؤں گا۔ اور دتے ماچھی کو گھوڑی اور بندوق سونپ کر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔"

"اچھا" جیجا دھیمی آواز میں بولا "بانکی کو کتنا پیچھے لے جاؤں؟"

"میراں بخش کے کھیتوں کے موڑ پر۔" سردارے نے لمبی سانس کھینچ کر بندوق میں کارتوس بھرے۔ اور بولا "جا اب پلٹ جا۔ بانکی کو قدم قدم لے جانا۔"

جیجا آہستہ آہستہ گھوڑی موڑ کر واپس چلا گیا۔

سردارا ایک لمحے تک گھوڑی پر ہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے قدم نیچے اتارا۔ اور بلی کو ایک درخت کے نیچے گہرے سایوں میں باندھ دیا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا حاجی گل محمد کے اجڑے ہوئے سنسان ڈیرے کی سمت بڑھنے لگا۔ ڈیرا کیا تھا چاردیواری سی تھی۔ اس کے ساتھ ایک شکستہ سا کمرہ تھا۔ چاردیواری سے باہر آموں کے گھنے گھنے درخت تھے۔ وہ درختوں کے تنوں کے ساتھ لگ لگ کر دیوار تک پہنچا۔ یہاں تک کہ آخری کونے میں کھرلی اور کچی اینٹوں کا چبوترا آگیا۔ چبوترے پر چڑھ کر اس نے آہستہ آہستہ سر کو دیوار سے اونچا کیا اور ایک لمحے تک وہ اندھیرے میں سانس روکے کھڑا رہا۔ اس نے چھیلے کو دیکھ تو لیا تھا مگر اسے دیکھ کر مطمئن ہونے کی بجائے سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے پاؤں برف میں دھنسے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ مگر اب اسے سردی کا مطلق احساس نہیں رہا تھا۔ جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ذہن میں ایک لفظ ابھرا۔ چھیلا پھر ایک اور لفظ۔ جیراں۔ یہ دونوں الفاظ ابھرے، ناچے اور گڈمڈ ہو گئے!

وہ یہاں صرف چھیلے کی تلاش میں آیا تھا۔ چھیلے کے ساتھ رات کے گہرے سناٹوں میں لپٹی ہوئی جیراں کو دیکھ کر اسے ایک بار تو یقین ہی نہ آیا۔ دوسری بار پھر اس نے ہمت کر کے چبوترے کی طرف قدم بڑھایا تو اس میں اوپر چڑھنے کی سکت نہ تھی۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ زمین پر ہی کھڑا رہا۔ بندوق کو بائیں ہاتھ میں تھام کر چبوترے پر قدم رکھا۔ اور بغیر کچھ سوچے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اور کسی خاص وقت کا انتظار کئے بغیر بندوق اٹھا کر سایوں کی شست لی۔

اسی اثنا میں جیراں چھیلے کا ہاتھ تھام کر بولی "کتنے بے صبر ہو تم، دو دن بھی انتظار نہ کر سکے۔ پرسوں تو میں تمہارے پاس چلی ہی آتی۔"

چھیلا اس کے جواب میں کھلکھلا کر ہنسا تو سردارے نے بندوق نیچے کر لی اور ان کی باتیں سننے لگا۔

چھیلے نے جیراں کے قریب ہو کر اس کے کانوں میں دمکتے ہوئے جھمکوں کو آہستہ سے کھینچا اور بولا "چھپ چھپ کر ملنے میں جو مزہ ہے وہ تو تمہیں ہمیشہ کے لئے پا لینے میں بھی نہیں۔" جیراں کچھ نہ بولی۔

"بول، جس وقت تو گھر سے نکلی ہو گی" چھیلا پھر بولا "تو۔۔۔ کتنا مزہ آیا ہوگا!"

(باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

مثنوی:

ملکۂ برشگال

صہبا اختر

اک عالمِ برق و آب دیکھا — کل رات عجیب خواب دیکھا
اوڑھے ہوئے چار سو فضائیں — ظلمت کی ہزار ہا ردائیں
جنگل کی دھاڑتی ہوائیں — صحرا سے اٹھی ہوئی بلائیں
یکسار گھری ہوئی گھٹائیں — ہر سمت بلا کی شائیں شائیں
اک موسلا دھار تیز بارش — آئی تھی اجل سے کر کے سازش
پانی وہ برس رہا تھا چھاجوں — بیزار تھی روح جس کے ہاتھوں
ایسے میں کڑک کر ایک بجلی — یوں صحن میں میرے چھم سے اتری
اک پل میں دل و نظر کو روندا — نس نس میں اتر گیا وہ کوندا
دیکھا نہ گیا نظر سے کچھ بھی — مہلت نہ دی شعلہ بر نے کچھ بھی
شعلوں سے پھر ایک جسم ابھرا — ترشا ہوا اک طلسم ابھرا
اتنے میں گھٹا نے اک لبادا — اس پیکرِ شعلگی پہ ڈالا
جب ہو گئی وہ نقاب گہری — تب جا کے مری نگاہ ٹھہری
جادو بھرے بول اس نے بولے — ہاتھوں سے عجیب رنگ گھولے
جس طرح دھنک لچک کے ٹوٹے — یوں سرخ لبوں سے بول چھوٹے
ناہید سے لے کے تا بہ زہرہ — نغموں کا بہت ہے تیرے شہرہ
کیا ہو گیا نطقِ گلفشاں کو — کس بات نے سی دیا زباں کو
اک جانِ سکوں کی ہوں پیامی — آتی نہیں ورنہ خوش کلامی
اٹھ دیکھ رہی ہے تیرا رستہ — رم جھم کی سبھا میں میری ملکہ
سامانِ نشاطِ شب کیا ہے — خوش ہو کہ تجھے طلب کیا ہے
حیرت نے نہ میرے لب کو کھولا — میں سحر زدہ تھا کچھ نہ بولا

مسحور تھا سحر آفریں سے — سائے کی طرح اٹھا زمیں سے
اک ہاتھ میں میرا ہاتھ لے کے
چپ چاپ چلی وہ ساتھ لے کے
یک لخت کچھ اس کو دھیان آیا — آنکھوں پہ عجب خمار چھایا
اک موڑ پہ راستے میں رک کر — بادل سے کہا کچھ اس نے جھک کر
پلکوں سے کیا عجب اشارا — دیکھا کہ افق سے اک ستارا
تیزی سے زمیں کی سمت ٹوٹا — اِندر کی کماں سے تیر چھوٹا
بادل سب اس کی زد سے بھاگے — پل بھر میں مری نظر کے آگے
موجود تھا کوئی برق پارہ — بلور کا جو ہریں غبارہ
اہرام کی طرح راز بستہ — دروازہ کھلا نہ کوئی رستہ
ہر سمت سے بند اس محل کے — پل بھر میں ستارہ گوں کنول کے
جادو بھری جنبشِ نظر سے — کس سحر سے جانے کس اثر سے
اڑنے لگے چر چرا کے ہیرے — کھلنے لگے پنکھ دھیرے دھیرے
آغوش کشادہ در تھے ایسے — اک پھول کھلا ہوا ہو جیسے
پہنچا جو میں بے ارادہ کھنچ کر — خود مڑ گئے مو رپنکھ سے پر
اک ہاتھ سے ہم سفر نے میری — دھیرے سے کوئی طناب کھینچی
شعلوں کا بگولا تھرتھرایا — اک زور کا زلزلہ سا آیا
بادل کی طرح فضا میں ڈولا — پھر برق تھا وہ اڑن کھٹولا
آفاق کی وسعتوں کی جانب — انوار کی جنتوں کی جانب
میں نیلمیں بادلوں سے گذرا — ہر رنگ کے آنچلوں سے گذرا

دیکھے وہ قدم قدم کرشمے   آفاق کے خم بہ خم کرشمے
احساس کو منجمد جو کر دیں   آنکھوں میں دھنک کے برف بھر دیں
اسرار کے بحرِ بیکراں میں   مہتاب کو جوئے کہکشاں میں
دامن میں ستارے بھرتے دیکھا   انوار سے غسل کرتے دیکھا
گذرا میں غلاف سے فضا کے   چھونے لگے سلسلے خلا کے
موجوں کی لئے ہوئے روانی   اک دشت ہزار آسمانی
پھیلے ہوئے راستے شہابی   بکھرے ہوئے سلسلے سرابی
تھم تھم کے سر بساطِ آبی   کرتی ہوئی رقص نیم خوابی
باندھے ہوئے روشنی کے طرے   اڑتے ہوئے سیمیائی کرّے
چھائے ہوئے نشۂ طرب میں   اک قلزمِ بیکرانِ شب میں
گرتے ہوئے آبشار نیلے   ڈوبے ہوئے سیمگوں جزیرے
اک ہالۂ نور میں پرافشاں   نو چاند زحل کے گرد رقصاں
ہر چاند خود آفتاب جیسے   ہر خواب بنائے خواب جیسے
سیماب جبینِ مشتری پہ   قطرہ جو کوئی گرے پھسل کر
ٹکرا کے فضا سے اپنا پارہ   بن جائے خود اک نیا ستارا
برفاب، بسیط، کہکشائیں   ہر تازہ جنم پہ مسکرائیں
صد رنگ کروڑہا ستارے   کرتے ہوئے اجنبی اشارے
کچھ پر ہے غبارِ شب نوردی   کچھ اوڑھے ردائے لاجوردی
کچھ سرخ کنول کی طرح روشن   کچھ ایسے کہ جن کے سبز دامن
پھیلیں تو زمرّدیں فضائیں   آنکھوں سے لگا کے مسکرائیں
نارنجی، سنہرے، سبز، نیلے   ساغر ہیں الگ الگ نشیلے
کچھ ایسے کہ جن کا اک تبسّم   انسان سے چھین لے تکلّم
کچھ ایسے کہ جن کی آگ میں گم   ہو جائیں ہزارہا جہنّم
کچھ ایسے جو اُن کی برف پگھلے   آفاق کی وسعتوں کو بھر دے
کچھ ایسے کہ جن کی برق باری   ظلمت میں کرے ستارہ کاری

ہیروں کی رواں دواں یہ کانیں   بن پنکھ خلاؤں میں اڑانیں!
سیّار و ثوابتِ درخشاں   اک نور کی جستجو میں گرداں
وحشت ہے انھیں سفر کی کیسی   دوڑے چلے جا رہے ہیں وحشی
رخ کس کی طرف ہے ان پروں کا   سنگم ہے کہاں سمندروں کا
کی صحبتِ برق و رعد میں نے   اس خواب میں اس کے بعد میں نے
دیکھا کہ مرا اُڑن کھٹولا   اندر کی محلسرا میں اُترا
اک خلد فسانہ و فسوں میں   ہر سمت فضائے نیلگوں میں
اک شعلۂ آرزو سے سوزاں   نیلم کے چراغ تھے فروزاں
پریوں کے سنہرے آنچلوں کے   قالین بچھے تھے بادلوں کے
یکبار فضا جو جگمگائی   کانوں میں صدائے شوق آئی
ہشیار نقیبِ خوشنوائی   وہ ملکۂ برشگال آئی
طاری تھی فضا پہ گنگناہٹ   نزدیک تھی دم بہ دم وہ آہٹ
کرنے لگے رقص رنگ جیسے   بجنے لگے جل ترنگ جیسے
نغموں کی پھوار پڑ رہی تھی   ہیرے جو فضا میں جڑ رہی تھی
چاندی کے ورق سے مُڑ رہے تھے   ہر سمت چراغ اڑ رہے تھے
نزدیک ہجوم رنگ پا کر   حیرت سے کھلا یہ راز مجھ پر
جب حسن دکھاتا ہے کرشمے   پتھر کی بھی آنکھ دیکھتی ہے
تصویر کی طرح چپ کھڑا میں   حیرت سے کھلی نگاہ تھا میں
دیکھا کہ کوئی ستارہ پیکر   ڈالے ہے نقاب نصف منہ پر
سر تا بقدم لباس کالا   ہر انگ سے پھوٹتا اُجالا
اک ہاتھ میں سُرخ پھول گہرا   اک ہاتھ میں مور چھل سُنہرا
زلفوں میں چھپی ہوئی گھٹائیں   پلکوں میں نشوں کی خوابگاہیں
طوفان کی طرح لہری آنکھیں   پاتال کی طرح گہری آنکھیں
ابرو وہ کھنچے کٹار جیسے   پلکوں سے پڑے پھوار جیسے
کانوں کی لوؤں سے لو لگائے   گالوں میں شفق دئے جلائے

شانوں پہ کھنچے قمر سے ہالے — کانوں میں وہ بجلیوں کے بالے
ہر انگ چھلکتی چاندنی سے — سینے میں بھنور شگفتگی کے
شانوں پہ سنہرے بال ایسے — اک انجمیں آبشار جیسے
شبنم سے رچے ہوئے شرارے — آنچل میں ٹکے ہوئے ستارے
معبودۂ خلدِ رنگ و بو نے — اس برق طرازِ آرزو نے
دھیرے سے جہاں بھی پاؤں رکھا — شعلہ سا وہیں زمیں سے لپکا
کرتی ہوئی ہر قدم چراغاں — اک طرفہ وقار سے خراماں
وہ مثلِ نسیم صبحگاہی — رک رک کے مرے قریب آئی
پھر ڈال کے مجھ پہ چشمِ غائر — بولی کہ خوش آمدید شاعر
بن تیرے چراغِ رہگذر تھی — میں ہجر کی شامِ بے سحر تھی
آخر تجھے جذبِ دل نے کھینچا — انمول ہے میرا پیار دیکھا
سب مجھ سے ہواؤں نے کہی ہیں — باتیں جو مرے فراق کی ہیں
چہرہ ہے الم سے زرد میرا — کچھ کم نہیں تجھ سے درد میرا
ٹھنڈک نہیں روح کو ذرا سی — میں خود ہوں جنم جنم سے پیاسی
اس قرب پہ اضطراب کیوں ہے — آخر یہ تجھے حجاب کیوں ہے
کب تک یہ سکوت ڈسنے والا — ظالم تری چپ نے مار ڈالا
گردن میں لچک کے باہیں ڈالوں — روٹھے ہو تو جانِ جاں مناؤں
قابو میں دھڑکتے دل کو لے کر — مشکل سے زباں کو نطق دے کر
میں نے یہ کہا کہ جانِ شاعر — قربان ترے ہزار ساحر
رندوں کے لئے شراب تو ہے — تعبیرِ ہزار خواب تو ہے
میں تجھ سے خفا نہیں ہوں جاناں — میں اپنے نصیب پر ہوں نازاں
بن بات نہ کر گماں کوئی — چپ کر گیا مجھ کو دھیان کوئی
لیکن مجھے خاک سے ہے رشتہ — حاصل نہیں قسمتِ فرشتہ

گو عشق ہے تجھ فلک نشیں سے — خاکی کو مفر نہیں زمیں سے
کھوئے ہیں جہاں نجوم شہپر — اترا ہوں سفیرِ خاک بن کر
تجھ کو ترے ظلم کے فسانے — آیا ہوں زمین سے سنانے
سن اب نہیں اعتبار تیرا — بے رنگ ہوا ہے پیار تیرا
باقی نہیں اعتدال تجھ میں — اب لطف نہیں بحال تجھ میں
اب موت کا راگ ہے چھما چھم — ہر سمت چھڑا ہوا ہے ماتم
اک وحشتِ مرگ زاد ہر سو — ہے ہلّۂ برق و باد ہر سو
پانی نے ادھر کسے شکنجے — بجلی نے ادھر چھوئے پنجے!
سن تو نے اٹھائے ہیں وہ طوفاں — ملّاح بچے نہ جن سے دہقاں
ویران کیا ہے بستیوں کو — الٹا دیا لاکھ کشتیوں کو
وحشت ہے زمیں کو بادلوں سے — الجھی ہے فضائی زلزلوں سے
برسے ہیں ترے سحاب ایسے — خود موت کا ہو نزول جیسے
زخموں سے زمین ادھ موئی ہے — چھائی ہوئی رات قحط کی ہے
آندھی کے طویل جھکّڑوں نے — طوفان بدوش ظلمتوں نے
آنکھوں کے گہر چرا لئے ہیں — ہر گھر کے دئے بجھا دئے ہیں
حیرت ہے نہیں جنون مجھ کو — ایسے میں کہاں سکون مجھ کو
رکھ کر مرے منہ پہ ہاتھ اپنا — کہنے لگی سنگدل، یہ سپنا
باتوں سے تری بکھر نہ جائے — ڈرتی ہوں یہ شب گزر نہ جائے
انساں سے آج تک چھپا ہے — وہ راز جو آسماں کا ہے
لیکن میں تجھے بتا رہی ہوں — مجبور ہوں تجھ کو چاہتی ہوں
سن ہجر اساسِ دو جہاں ہے — یہ اصلِ زمین و آسماں ہے
ہر صید کو دام ایک سا ہے — فطرت کا نظام ایک سا ہے
قسمت جو بتائیں وہ سنا لے — تقدیر کے آپ بھی ہیں مالے

جاتے نہیں دائرے سے باہر
مقسوم ہیں اپنے اپنے محور

سوچا ہے کبھی یہ تو نے جاناں
ہر چیز ہے کیوں الم بداماں

مہتاب کے دل میں داغ کیوں ہے
سورج ہے تو بے فراغ کیوں ہے

اک آگیا تیرگیٔ شب تک
اک آگ میں جل رہا ہے ابتک

چہروں پہ ہے خوف سے سپیدی
یہ بھی ہیں اُسی کشش کے قیدی

مربوط ہے جس سے بزمِ ہستی
افلاکِ بلند و خاکِ پستی

وحشت ہے اگر سرِ زمیں بھی
راحت سے نہیں فلک نشیں بھی

چلتی ہے یہاں ہوائے غم بھی
اک جبر سے منسلک ہیں ہم بھی

یہ راز ہے مستقل اندھیرا
اس عالمِ خیر و شر میں میرا

ہے بھی تو برائے نام حصّہ
آ تجھکو بتاؤں اصل قصّہ

کہنے کو یہ آندھیاں ہیں میری
بس نام کی باندیاں ہیں میری

دن رات ہیں حیلہ جو یہ بدخو
وحشت ہے انہیں ہزار پہلو

افلاک کی وسعتوں پہ چڑھ کر
سورج پہ یہ خاک پھینکیں بڑھ کر

آنکھوں میں فضا کی راکھ جھونکیں
خنجر یہ سحر کے دل میں بھونکیں

ظلمت سے ہوئی ہیں ظلم پیشہ
پھرتی ہیں یہ چیختی ہمیشہ

آفت ہے نگر نگر مچائی
ان میں ہے ہر اک "ہزار پائی"

ہر چند ہیں بجلیاں کنیزیں
قابو میں نہیں یہ بدتمیزیں

دن رات پروں کو پھڑ پھڑاتی
پھرتی ہیں فضا میں کڑکڑاتی

کس عم کی بھلا کسک ہے ان کو
بس اپنی چٹک مٹک ہے ان کو

یہ حبشی غلام! کالے بادل
اک کیف سے ہو چکے ہیں پاگل

آنکھوں میں اتر گیا ہے کاجل
اندھوں کو سکھائے کون اٹکل

نخوت میں کہیں اَڑے کھڑے ہیں
گرجے ہیں کہیں کہ ہم بڑے ہیں

الجھے ہیں کہیں، کہیں لڑے ہیں
آپس میں کہیں برس پڑے ہیں

چُپ چُپ جو کھڑی ہیں یہ تنہائیں
مت پوچھئے ان کی بھی ادائیں

اک روز اُڑا کے ابرِ نیساں
کرتی ہیں یہ روز مجھ پہ احساں

رکھتی نہیں یاد آسماں کو
جاتی ہیں جو سیرِ گلستاں کو

واپس نہیں ساری رات آتیں
یہ کون سے گل نہیں کھلاتیں

دن رات ہجومِ فتنہ گر سے
بیزار رہوں ان کے شور و شر سے

رہتی ہوں حیا سے پانی پانی
افسوس سرشتِ آسمانی

دیکھا جو اُسے اداس میں نے
محسوس کری وہ پیاس میں نے

اس نے جسے جان کر نہ سمجھا
اتنے میں کوئی طلسم چھنکا

اک شعلہ صفت کنیز آئی
ساغر میں کشیدِ ماہ لائی

وہ جام مری طرف بڑھا کر
دیکھا مجھے اس نے مسکرا کر

جیسے مری بات پا گئی ہو
کچھ اس نے کہا نہ جانے کس کو

خود تن گیا خیمۂ سحابی
خود بچھ گئی سیج اک گلابی

سب شعلہ نژاد جا چکے تھے
بادل کہیں منہ چھپا چکے تھے

دیکھا مجھے کس جنوں میں اس نے
اُس خلوتِ پُرفسوں میں اس نے

انفاس سے مشکبار ہو کر
خود حسن سے بیقرار ہو کر

یوں اپنی قبا کے بند کھولے
ہر انگ ہزار رنگ گھولے

خوابوں کی فضا میں ڈھیر ڈھیرے
نشّوں کے دریچے کُھل رہے تھے

ایسے میں کہ بن رہوں میں پتھر
اس عالمِ امتحاں میں بڑھ کر

یوں شوق نے دامِ ضبط توڑا
اک تارِ حجاب بھی نہ چھوڑا

شعلوں سے اُلجھ رہے تھے شعلے
اس قربِ تمام کے نشے سے

یوں اس کا بدن مہک رہا تھا
جیسے کہ چمن چٹک رہا تھا

ہر حد سے گذر چکے تھے طالب
اک روح میں ڈھل گئے تھے قالب

اُس خلوتِ عنبریں میں جا کے
کوثر سے اٹھا تھا میں نہا کے

تعبیرِ تصوراتِ دوشیں   آنکھوں میں خمارِ خوابِ نوشیں
بکھری ہوئی دوش پر وہ زلفیں   نشّے سے جھکی جھکی وہ پلکیں
وہ ہونٹ کھلے گلاب جیسے   وہ جسم کہ خود شراب جیسے
اک قوس قزح کی طرح رنگیں   زرتار، گلابی، سرخ، سیمیں
سانسوں میں کنوارپن کی خوشبو   اب اور جگا رہی تھی جادو
پردے جو نشاط کے گرے تھے   سب اس کی سگندھ میں بسے تھے
اتنے میں فضائیں کپکپائیں   سب انجمیں شمعیں تھرتھرائیں
پہلو سے اٹھی وہ یوں تڑپ کے   جیسے کوئی تیز برق کوندے
تیزی سے چلے ہوا کے جھونکے   اُڑنے لگے سیمیائی پردے
کرنے لگے جام آپ گردش   یک سلسلہ ہو گئی تھی کاہش
یک رنگ ہوئے تھے ساغر و مے   اک دائرہ بن گئی تھی ہر شے
تیزی سے دریچے مڑ رہے تھے   اور سیج کے پھول اُڑ رہے تھے
چکر میں دل و دماغ گم تھے   روشن تھے مگر چراغ گم تھے
کہنے لگی کانپ کر وہ مجھ سے   اے جانِ وفا، یہ خواب بکھرے
آثار بُرے ہیں شور و شر کے   معلوم ہیں مجھ کو راز گھر کے
اِندر کی سواری آ رہی ہے   یا موت ہماری آ رہی ہے
یہ بات کسی نے کہہ نہ دی ہو   اندر کو خبر نہ لگ گئی ہو
منحوس زُحل کی آنکھ چمکی   اب ختم ہے رات کیف و کم کی
کس مُنہ سے کہوں مگر مری جاں   اب دل ہے مرا بہت پریشاں
جانا ہے تجھے مگر یہاں سے   مجبور ہوں جبرِ آسماں سے
تجھ تک نہ کوئی کمند پہنچے   ڈرتی ہوں تجھے گزند پہنچے
اک رات کے خواب رنگ مہماں   دل تھا ترے قرب سے چراغاں
رخصت تجھے کر رہی ہوں ایسے   سم موت کا پی رہی ہوں جیسے

دل پر ہیں ترے نقوش گہرے   اب جو بھی مرا نصیب ٹھہرے
تابع ترے ہوں گے بادوباراں   میں باندھ چکی ہوں تجھ سے پیماں
ہنس ہنس کے ہر اک سزا سہونگی   لیکن میں تری سدا رہوں گی
سینے میں کہیں نہ جائے دل ڈوب   رخصت مری جان، میرے محبوب
یہ سُن کے میں فرشِ خاک پر تھا   پل بھر کو وہ خواب کا نگر تھا
لیکن مرا دل تڑپ رہا تھا   آنکھوں میں وہی فسوں بسا تھا
آنکھوں میں ہزار عکس اُترے   اس فکر میں صبح و شام گذرے
خاکی کے لئے یہ صبر کب تک   پستی پہ فلک کا جبر کب تک
کام آئے مری درازدستی   اندر سے جو چھین لائے شکتی
ہر وقت سوال تھا یہ لب پر   شبخون کوئی دیارِ شب پر
آخر مرا صبر رنگ لایا   شعلہ مرے عشق نے اٹھایا
تسخیرِ فلک کا عزم بن کر   جاگا مری خاک کا مقدّر
انسان کی کمان سے جو چھوٹے   ناوک وہ فلک کی سمت ٹوٹے
وہ میری زمین کے ستارے   بھرنے لگے عرش پر طرارے
سیّارے بلند ہو رہے ہیں   خاکی سوئے آسماں چلے ہیں
اک دن یہ خلاؤں کے مسافر   چھو لیں گے تجھے بھی جان شاعر
محبوس جو خاک کو کئے ہیں   افسوں وہ شکست ہو چلے ہیں
ہم جبر کے ہاتھ موڑ دیں گے   ہم سارے طلسم توڑ دیں گے
آفاق کو مسکرانا ہوگا   سینے سے ہمیں لگانا ہوگا
حائل نہ رہے گی شامِ ہجراں   نزدیک ہے روزِ وصل جاناں

جس وقت یہ پورا خواب ہوگا
شاعر بھی تو ہمرکاب ہوگا

ملتانی کافی:

"سوہنیاں رمزاں"

خواجہ غلام فریدؒ
مترجمہ حشمت فضلی

درد سے دل ہے ٹکڑے ٹکڑے
پُرزے پرزے ذرّے ذرّے

ناز، نزاکت، عشوے، غمزے   طاقت حکم، ادائیں، نخرے
خوں کرتے ہیں لمحے لمحے

آپ ہی اپنا دوست بنایا   آپ اپنا مسکن دکھلایا
اب کیوں ہم سے روٹھے روٹھے

مست آنکھیں اور کالی زلفیں   پیاری رمزیں موہنی چالیں
جنکے بغیر اک پل نہیں گذرے

تیر نظر کے چھیدیں ہر دم   اس پر زلف کے یہ پیچ و خم
اک بے بس کیا آخر بولے

رنج و غم اور درد اندیشے   ہیں دن رات فرید کے آگے
ہجر سے جاں کانپے، تھرّائے

چن ماہی

شیر افضل جعفری

یہ دُھلے دُھلے اجالے
تری چودھویں نے پالے

تجھے چاندنی پلائیں
سدا آسمان والے

یہ حسین چاند سورج
ترے کانچ کے پیالے

ترے مست وار گیسو
بنے خوشبوؤں کے جھالے

تجھے دیکھ کر ہمیشہ
ہوئے باغ باغ لالے

ترے لوچ لوچ بازو
ہری ٹہنیوں نے ڈھالے

کڑی دھوپ کا اُپاؤ
تری چھاؤں کے سِیالے

تو ہے ماہتابِ نغمہ
مرے شعر تیرے ہالے

ترے پھول سے گلے میں
مرا پیار ہار ڈالے

لے جائے

شیراب

(کوئٹہ میں غیر معمولی برفباری سے متاثر ہوکر)

ماہر افغانی

نورِ ازل تھا پردۂ ظلمات سے عیاں
اک صبح سردیوں نے کیا پیش وہ سماں

اٹھتی تھی جس طرف بھی نظر برف زار تھا
گویا زمین پر اتر آئی تھی کہکشاں

تھی ہر طرف سفید سی چادر بچھی ہوئی
افشاں چھڑک رہی تھیں پہاڑوں کی چوٹیاں

گالوں سے جھول جھول رہی تھیں جو ڈالیاں
ہوتا تھا احتمال، ہیں چاندی کی بالیاں

پہنے ہوئے کھڑے تھے جو اشجار ہر طرف
جنکی کلائیوں میں تھیں بھرپور چوڑیاں

پودے کھڑے تھے دودھ کا پیالہ لئے ہوئے
شیراب پی رہی تھیں درختوں کی ٹہنیاں

اٹھتے ہیں جس طرح کہ بخارات بحر سے
اس طرح ہو رہی تھیں فضائیں دھواں دھواں

جیسے کسی کی زلف کا عالم ہو دوش پر
قائم ہوئی تھیں کچھ اسی عنواں کی سرخیاں

زرغون اک طرف تھا بہ اندازِ دلبری
مردار اک طرف تھا یہ اور رنگِ آسماں

کچھ کم نہ تھی کسی سے تکاتو کی شان بھی
تھا وہ بھی ہر لحاظ سے ہمرنگِ دیگراں

کہتا تھا دل کہ ہاتھ بڑھا کر میں تھام لوں
لہرا رہا تھا ناز سے دامانِ چلتاں

فطرت مئے نشاط میں مستِ خرام تھی
محسوس ہو رہا تھا کہ ہے زندگی جواں

کانوں میں آرہی تھی صدا جل ترنگ کی
قطرات بن کے برف کے ذرّات تھے چکاں

ملبوسِ کائنات خضر کا لباس تھا
دامانِ جوئے شیر کا ہمرنگ و ہم عناں

وہ منظر حسیں تھا نگاہوں کے سامنے
جیسے خیال و خواب کی ہوتی ہیں وادیاں

"دوشیزۂ برفستاں"

نصیر حیدر

(گلگت میں جاڑوں کی چاندنی رات کا ایک تاثر)

لے کے آیا ہے مجھے قافلۂ عمر کہاں
قافلۂ عمرِ رواں ــــ
کہر میں لپٹی ہوئی برف کے ہیکل پہنے
شب مہتاب کی شام
شب کم خواب کی شام
چوٹیاں برف قبا!
چوٹیاں کوہ کی پہنے ہوئے ابرک کے چغے
برف کی چادر شب تاب لپیٹے سر بہ سر
برف کے فرغل پہنے
برف کی چادر صد چاک سنبھالے ہوئے
شانوں پہ اِدھر اور اُدھر
کوہساروں کے سمٹتے ٹیلے
برف سے ٹھٹھرے ہوئے نیل بدن
صف بہ صف رقص کے انداز میں گھیرا ڈالے
سب تشنج زدہ اجسام کشیدہ قامت
کہر میں ابھرے ہوئے اودے تن
صف بہ صف، صف بہ صف اونچے نیچے
برہنہ جسم فقط کہر کے فرغل پہنے

برف کے ہیکل پہنے
ابھی خورشید کا منہ چوم رہے تھے سارے
سرخ رو، سرخ قبا
کامرانی کے نشہ میں سرشار
ابھی ٹھٹھرے ہوئے سہمے ہوئے اک رقص
کے گھیرے میں سمٹ آتے ہیں
شام کے گھرتے ہوئے بڑھتے ہوئے اندھیارے
شب مہتاب کی شام، یہ شامِ کہسار
چاند نکلا کسی مسحور حسینہ کی طرح
ساحرہ اپنے ہی افسوں میں ہوئی ہے تحلیل
قلۂ کوہ پہ پھیلائے ہوئے اپنی ردا
کوہساروں سے بچاتی دامن
مڑتی، بچتی ہوئی دیوزادوں سے، ڈرتی رکتی
ہچکچاتی ہوئی، کتراتی ہوئی
بے حجابانہ نکل آئی ہے
کوہ تنہا میں یہ مہتاب کی دوشیزۂ سیمیں تنہا
صبح کی پہلی کرن جیسی لبوں کی رنگت
خمِ ابرو کا دھندلکا کوئی کہسار کی شام

ایک دھندلا سا روپہلا سا مہکتا ہوا جسم
لہریں لیتا ہوا برفاب کا موہوم بہکتا ہوا جسم
برہنہ کہر کی چادر باندھے
مرمریں برف کے گہنے پہنے
اس کا دوشیزہ و معصوم بدن
لہلہاتا ہوا بھرپور لہکتا جوبن
اپنے ہی نشہ سے بیتاب بہکتا جوبن
ایک بھٹکی ہوئی روح
بسترِ اطلس و کمخواب کے خوابوں میں مگن
منجمد اور دہکتا ہوا سینہ لبِ جُو
اور سینے میں وہی سینوں کی دیرینہ جلن
وہی برہا کی اگن
قُلّہ کوہ پہ ڈھلکائے ہوئے سر سے ردا جلوہ فگن
ہمہ تن رقص، سراپا آغوش
خواب سا دیکھتی بے خود، مدہوش
وہ بڑھی جاتی ہے رقاصہ کسی کی جانب
اس کی مخمور نگاہوں سے ستارے مینوش
اس کا انگڑائیاں لیتا ہوا جسم
رسمساتی ہوئی سرمست آغوش
آرزو برق فگن دل میں پگھل جانے کی،
بڑھ کے خود گود میں آنے کی، مچل جانے کی
لمس پاکر کسی سینہ کا، مسل جانے کی
دو لچکتی ہوئی بانہوں میں تمنا کہ اٹھائے کوئی
سر سے ڈھلکے ہوئے آنچل کو سنبھالے کوئی
کسی آغوش میں وا ہونے کی طاقت ہی نہیں!
کوہ جکڑے ہوئے پابستہ، ہمہ تن زنجیر
ہمہ تن شوق مگر
گرمیٔ شوق کے اظہار سے قاصر، مفلوج
شل کچھ اس طرح کہ سب تن بوجھل!
منجمد برف سے ٹھٹھرے ہوئے جسم
برف کے شیشہ میں پتھر کا طلسم
سر سے شانوں پہ ڈھلک آئی ردائے مہتاب
دیکھتے دیکھتے شانوں سے ڈھلک جائیگی
دامنِ کوہ سے الجھے گی، مسک جائیگی مانند کتاں
لے کے آیا ہے مجھے قافلۂ عمر کہاں
قافلۂ عمر رواں
مسکراتے ہی رہے ہیں یہ ستارے لبِ جُو
جگمگاتے ہی رہیں گے یہ شرارے لبِ جُو
اٹھ چکی بزمِ طرب
اب نہ وہ ہائے نہ ہُو
بجھ گئی شمع، فسردہ ہوئے چنگ اور رباب
بازگشت اپنی ہی خود ہے یہ صدائے مہتاب
اب چکوروں کی وہ چہکار کہاں!
اب وہ دیوانوں کی للکار کہاں!
قافلۂ عمر رواں!

★

بیلڈ:

لیلیٰ مور

عاصم حسین

کون ہے جو سردیوں کا موسم آنے پر بلوچستان کے سراوان اور جھالاوان نامی علاقوں سے گزرا ہو اور اس نے یہاں کے قافلہ در قافلہ پہاڑی قبیلوں کو سندھ روانہ ہوتے ہوئے "لیلیٰ مور" کا صدہا سال پرانا گیت گاتے نہ سنا ہو۔ وہ لیلیٰ جو مور کی طرح خوبصورت ہے۔ جب یہ لوگ سندھ کے گرم علاقوں کو روانہ ہونے سے پہلے جشن مناتے، سجی یعنی بھونی ہوئی سالم بھیڑ کھاتے، لوک گیت گاتے اور ملکۂ حسن کے گرد انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ چاندنی رات کی پُر کیف فضا میں کوہستانی ناچ ناچتے ہیں تو ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل کی نظم میں اسی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

جگمگ جگمگ کرتا چاند
اُجلی اُجلی پھیلی دھرتی
جوت ہی جوت کا فرش بچھا
سرمئی نیلا نیلا امبر
جیسے ناچتے مور کے پنکھ
جھلمل جھلمل کرتا میداں
جادو ہی جادو کا سماں!

جانے کیوں ہر چار طرف سے
نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے
لوگ ہی لوگ چلے آتے ہیں
جیسے دیپ کنول کے دوارے
ٹوٹ کے آتے ہیں پروانے
ڈیروں پہ ڈیرے گاؤں پہ گاؤں
چل چل کرتا روں کی چھاؤں
پاس نہ دور کی پروا کوئی
وہ کیا جانیں کیا ہے دوری
دل میں سمایا رات اور دن جب
لیلیٰ مور ہی کا سودا ہو
لیلیٰ مور کو دیکھنے جائیں
ہر ہر دل میں یہی سمائی
لیلیٰ مور کا مکھڑا دیکھیں
ایک جھلک اُس حسن کی پائیں
جس سے نشے تن من پر چھائیں

لیلیٰ مور جو مایۂ جاں ہے
لیلیٰ مور جو جانِ جہاں ہے
ہر انساں کی روح رواں ہے
اُن کی آن میں لاکھوں ہزاروں
تن گئے خیمے، کھنچیں طنابیں

جاگ اٹھا جنگل کا جنگل
جنگل میں منگل ہی منگل
لو دیے اٹھیں گھر گھر آگیں
لیلیٰ مور کے جشن کی دھومیں
دل ہی دل میں یہ سب چاہیں
شب بھر دید کی عید منا لیں
پھر کہیں دور ٹھکانا ہوگا
غم کے وطن کو جانا ہوگا
کہاں میسر بات پھر ایسی
حسن پھر ایسا رات پھر ایسی
جس کی دید سدا کا جینا
سدا کی مے اور سدا کی مینا
اس محفل میں جو بھی آئے
رقص کا دیوانہ بن جائے

لو اُٹھے کہسار کے جائے
درسِ ادب آنکھوں کو سکھائے
دیکھو کیسے الغوزوں سے

نَے کے سُر والے باجوں سے
میٹھے رسیلے بول اُٹھے ہیں
دشت اور در سب جھوم رہے ہیں
ڈھولوں کی سنگت کا جادو
جس سے بلاوا پہنچا ہر سو
"آؤ آؤ آؤ آؤ
ناچ مدھر کے روپ دکھاؤ"
ایسے رقص کی دھوم مچے گی
یہ شب کبھی نہ بھول سکے گی
وہ سجی وہ بھونی بھیڑیں
اور سردی کی لمبی راتیں!
ان میں یہ جشنِ شاہانہ
چنگ وچغانہ، مئے مغانہ
قہقہے، چہچہے، باتیں چیتیں
مہمانی کی رسمیں ریتیں
ہنسیاں خوشیاں دل گرمائیں
ولولے اور مچلتے جائیں

لے کر اپنا مال اور ساماں
اپنا اناج اور ڈھور اور ڈانگر
اپنے برتن، بوریا بستر
اونٹ خوشی کے ساتھ خراماں
شوق بھرے یہ قافلے اُن کے
دور قریب سے آنے والے

لیلی مور جو ایک نظر سے
دیکھ لے ان کو، یہ متوالے
جیون جیون شاد رہیں گے۔
اور وہ رقص، وہ رقصِ یگانہ
اس کی خاطر نذرِ شبانہ
اس کی خاطر ان کی جنگیں
اس کے لئے جیون کی ترنگیں
دلوں کی رانی حسن کی رانی
روپ کی وہ مورت لافانی
لیلی مور وہ اس کے دوارے
حلقہ باندھے تن من وارے
گھوم گھوم کے جھک جاتے ہیں
فرطِ ادب سے رک جاتے ہیں
وہ جو کہے تو کون نہ آئے ؟
کون نہ اپنی جان لٹائے ؟
ناچ میں اُن کے دل کی دھڑکن
ناچ میں کھویا اُن کا تن من
ناچ میں ان کی رُوح بچی ہے
اُن کی آن اور شان اسی میں
کوئی نہ کھوٹ نہ میل دلوں میں
عورتیں تک بھی اس کو چاہیں
دل میں رشک کی آنچ نہیں ہے
لیلی مور پہ بل بل جائیں
میٹھی رسیلی لیلی مور
کامنیوں کی کامنی نار
جس کے حسن اور زیبائی سے
وہ خود اپنی جوت جگائیں
چاند اور چاندنی رات کا جوبن
جس سے کنول دل کے کھل جائیں
اس میں یہ اور بھی پیارا سماں
ایسا رقص اور لیلی مور
جادو بھرے وہ اس کے نیناں

مدبھری پاکیزہ مسکانیں
چاندنی رات کو جو لَو بخشیں

رات بھی اور سمے بھی بیتا
محو ہوا یہ سماں سہانا
چاند، نہ جشن، نہ گانے بجانے
رقص نہ رقص کے وہ متوالے
اور نہ کوئی لیلی مور !
شمع نہ شمع کے وہ پروانے
پو پھٹی، قافلے دور سدھارے
سندھ کے پھیلے میدانوں میں
گرم آغوش ہے جن کی فضا
لیلی مور کا پیارا پنچھی
راج دلارا، کلغی والا
اس کے سنگ رہے متوارا
اس کے ہاتھ سے کھائے چوگا

ختم ہوا جب یہ ہنگامہ
بیت چکی جب سگری رین
تب آیا کہیں بھور بھئے وہ
ایک جواں قسمت کا مارا
لیلی مور کا سچا پریمی
وہ البیلا وہ متوالا
اب آئے سے کیا ہو وت ؟
کیسے وہ قسمت کو رویا!
لب پر سسکیاں، آہیں، نالے،
یہ ہیں نشاں اس کے پاؤں کے
یہاں تھے خیمے، یہاں قناتیں
یہاں تھے جشن کے ہنگامے
یہ ہیں نشاں گزری ہوئی شب کے
یہاں حسیں لیلی کا محمل
یہاں تھی پیار بھری محفل

لیلی مور ! او لیلی مور !!

آگیں ساری سرد ہوئیں
اور بجھ گئے سارے انگارے
کچھ بھی نہیں، اب کچھ بھی نہیں یاں
کیا ہے یہاں، اب کیا ہے یہاں ؟
ہُو حق کا سماں، ہُو حق کا سماں!
جیسے جیسے دیکھے ڈھونڈھے
ملیں نشانیاں بکھری بکھری
یہ ہے دوپٹہ، یہ ہیں بُندے
یہ ہے رنگا برنگا فیتہ
اور یہ پھول جو کبھی گندھا تھا
اس کے مہکتے جُوڑے میں

آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ نکلے
لے لے نام وہ لب پر آہیں !
اُونچی سانسیں، اونچی کراہیں!
پر اب رونے سے کیا حاصل ؟
نالے پہاڑوں کے سینوں سے
ٹکرا کر یونہیں لوٹ آئیں
درد بھری فریادیں ان میں
گونج گونج کے رہ جائیں!

شاید ہے جو اس کو آنکھیں
پھر کبھی جیتے جی دیکھیں
لیکن پھر بھی لیلی مور
ہیں تیرے پاس وہ میٹھے دارو
دور ہوں جس سے دکھ پریمی کے
تو جو حسنِ ازل کا نشاں ہے
حسنِ ازل سب ہستی جس سے
ہر اک کیف اور مستی جس سے
جس کا ہر ہر دل میں ارماں
جو ہے ہر اک درد کا درماں
(خیال ماخوذ)

فرشتوں کا نغمہ

یوسف ظفر

تمہید:

کچھ ایسی بھی راتیں مری راہِ ہستی میں آئی ہیں جن میں
ہوس کے تقاضوں کی آواز یکبارگی سو گئی ہے
وہ راتیں کہ جن میں حوادث کی زنجیر گم ہو گئی ہے
وہ راتیں کہ جن میں نہ تھا خونِ ماضی، نہ کل کا جنوں تھا
سکوں ہی سکوں تھا،
سکوں ــــ جیسے گرما میں آبِ رواں پر سبک چاندنی کی پھوار
سکوں ــــ جیسے سرما کی سوئی ہوئی دھوپ میں برف زار ــــ
وہ راتیں کہ جن کے تبسم سے شبنم کے موتی بنے ہیں،
اُنہی حاصلِ زندگی چند راتوں میں، میں نے سُنا ہے
فرشتوں کا نغمہ
برستا ہوا لامکاں سے، کچھ ایسے
کہ جیسے برس کر کھلے ابر تو تیرگی میں چمن کی فضا پر
برستے ہیں جگنو
کہ جیسے وہ بے سوز چنگاریاں بے صدا آتشِ گل کی شہزادیاں ہوں
کہ جن سے لپٹ کر نظر مسکراتی ہے اپنی ادا پر ــــ
یونہی میں نے اُن پُرسکوں ساعتوں میں سُنا ہے فرشتوں کا نغمہ
برستا دل و جاں پہ اور پھیلتا نشۂ تند بن کر
بکھرتا ہُوا آخر کار، جیسے اُجالا سحر کا ــ

(فرشتوں کا نغمہ)

دل دھڑکا، آئی آواز	کیا آواز اور کیسا ساز
سرما کی صُبح کی پہلی کرن	پہلی کرن، شرمیلا پن
دُور سے اک خاموش آواز	چھیڑتی ہے یوں روح کا ساز
جیسے حُسنِ ازل ہے یہی	جیسے روحِ کنول ہے یہی

یوں آتی ہے پچھلی رات   جیسے گیت بنیں لمحات

وہ آوازِ بے آواز   قدم قدم کرتی اعجاز
رفتہ رفتہ تیز ہوئی   کیفیت آمیز ہوئی
موجیں آہیں بھرتی ہیں   ناچتی دل میں اُترتی ہیں
آنکھوں میں ہے نشہ سے   کانوں میں ہے اچھوتی لَے
جسم کا لوچ نظر کا نور   وہ آواز سراپا حور
پاکیزہ، نوخیز آواز   روح میں کرتی ہے پرواز
اس میں پھولوں کی خوشبو   اس میں رنگوں کا جادو
ایک ہیں قرب و دُور اس میں   تاروں کا ہے نور اُس میں
قوسِ قزح کا اچھوتا پن   اس نغمے کا حُسنِ بدن
شرمیلی لچکیلی لَے   دل میں اترتی جاتی ہے
جیسے وصل کی پہلی شب   نازک نرم رو پہلی شب
یوں لیتی ہے باہوں میں   جیسے پھول نگاہوں میں
یوں اس کی آغوش میں ہوں   جیسے صبحِ نو کا فسوں
پیار سے ہاتھ لگاتا ہے   سارا بدن سہلاتا ہے
سرمائی کرنوں سے لہو   جیسے صحرائی آہو
دل میں زقندیں بھرتا ہے   گاتا رگوں سے گزرتا ہے
چہرے پر ہے اس کا نور   اور آنکھوں میں کیف و سرور

اور ہوا وہ نغمہ تیز ــــ اور ہوا ــــ اور ہوا کچھ کیف آمیز
جیسے سورج کی کرنیں دُمدار ستارے بن جائیں
اور وہ تارے سارے کے سارے رس کے دھارے بن جائیں
اس کے دھارے پھوٹیں اور رنگوں کے غبارے بن جائیں
وقت کے کہرے میں جو نغمے پیارے پیارے بن جائیں
جیسے چندا کی نگری میں نغموں کی ہو پھوار
سیتل قطرے جگنو بن کر باندھیں ایک قطار
اُڑتے مڑتے جگنو مل کر یوں برسیں یکبار
جیسے برف گرے پربت پر، لگ جائے انبار
جیسے اک نغموں کی ندی، شام افق پر ٹھہری ہو
رنگِ شفق سے ساری موجیں اُبھریں سرخ سنہری ہو
پنچھی آئیں اس میں نہائیں، پکاریں، سُر پھوٹ بہیں
ہر سُر ہو جیسے مہتابی اور شرارے ٹوٹ بہیں

برگِ گُل

در سخن پنہاں شدم مانند بو در برگِ گُل
(زیب النسا مخفی)

عبد العزیز خالد

(ایک طویل منظوم ڈرامے کی خود کلامی)

اس کی پیشانی پہ اقبال کی تابانی ہے
پنجۂ دست میں توقیعِ سلیمانی ہے
وہ ذرا سخت طبیعت کا ہے مالک لیکن
سازش و ریشہ دوانی کے کچلنے کے لئے
دابِ تسلیم و توکّل سے کہاں کام چلے!
اس کو ہے فکرِ جہاں، فکرِ جہاں کرتا رہے
فرصتِ عمرِ رواں، صرفِ زیاں کرتا رہے
زلفِ دوراں کے خم و پیچ کے سلجھانے میں
دلِ سیپارہ کو خونابہ فشاں کرتا رہے
آج تک حل نہ ہوا مسئلہ سُود و زیاں
ہے ازل سے وہی اندازِ جہانِ گزراں
موت برحق ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیسا
مرنے سے پہلے ہی دن رات یہ مرنا کیسا؟
میں تو کہتا ہوں کہ فردوسِ بریں ہے دُنیا
تندرستی ہو تو طنّاز و حسیں ہے دُنیا
مبدأ فیض نے توفیقِ طرب بخشی ہے
فکرِ عقبیٰ ہی میں کیوں ذہن گرفتار رہے
ہر دم آشفتہ و رنجیدہ و بیزار رہے
روز و شب اپنے ہی سے برسرِ پیکار رہے
زندہ دل کیوں نہ مے و نغمہ سے سرشار رہے؟
میں نے خوبانِ وفا خو سے محبّت کی ہے
سیرِ کنعانِ شباب و چہِ اُلفت کی ہے

ربّۂ حسن کی سرکارِ مغاں شیوہ سے
ملے چاہت کے مزے، لذّتیں محبوبی کی
نالۂ بلبل کا، نزاکت گُلِ داؤدی کی
عنبریں کاکلیں جھٹکائے، نقاب اُلٹائے
اُپسرائیں شبِ تاریک میں چھایا پتھر پہ
گوندنی کی طرح آراستہ اہلی گہلی
تنِ شفّاف پہ ہلکا سا لباسِ آبی
دُوج کے چاند کی مانند نمودار ہوئیں
چال جھرنے کی طرح، نیل کمل سی آنکھیں
تیر سی دل میں لگیں، نقدِ جوانی مانگیں
شمع فانوس میں مستور ہو جیسے — وہ بدن
گیہواں رنگ — کہ قربان ہو جس پر چندن
زلف واللّیل تو والنّور بیاضِ گردن
الغرض ہوتی رہی ذوقِ نظر کی تسکیں
رہیں موجودگیٔ گل سے مجالس رنگیں
کیا کہوں کس طرح اس بارگہِ سرمد سے
دلِ شاداں نے کیا کسبِ فیوض و برکات
زندگانی ہے کہ نغماؤ یادی کی برات
وادیاں فیضِ تجلّی سے ہیں ایمن ایمن
سینے داغوں کی بہاروں سے ہیں گلشن گلشن
زندگی میرے لئے ایک نگارِ پُرفن
جس کے جلووں سے فضائے دل و دیدہ روشن

غزل

فراق گورکھپوری

اب قیدیوں کے پاؤں کی زنجیر سو گئی
زنداں کے قفل بند ہوئے رات ہو گئی

رو رو کے کچھ تو کر ہی گئی زندگیٔ عشق
وہ جان کھونے آئی تھی دنیا میں کھو گئی

مجھ سے یہ کہہ رہی ہے مری آبروئے عشق
یہ چشمِ اشک بار مجھے تو ڈبو گئی

اے دل وہ بارگاہ خطر کا مقام ہے
جاتا تو ہے وہاں جو کوئی بات ہو گئی

اے دل نہ کھینچتا تھی یہ نیم آہِ سرد بھی
نورس کلی لبوں کی کچھ افسردہ ہو گئی

وہ پھیر ہی رہے تھے ادھر گوشۂ نگاہ
اصرارِ دید کر کے یہ دولت بھی کھو گئی

اے دوست میری آنکھ تری جلوہ گاہ ہیں
رونے کے واسطے ہی تو آئی تھی رو گئی

یاد آ گئی وہ دل کی جواں مرگ آرزو
دیکھی نہ ایک صبح سرِ شام سو گئی

میں کھو کے رہ گیا سرِ زلفِ سیاہ یار
ایسا ہوا کہ مجھ کو وہاں رات ہو گئی

ہے دیدنی تبسّمِ لب خواب ناز میں
اک پنکھڑی پہ کوئی کرن آ کے سو گئی

بس وہ تری نظر تھی بھری کائنات میں
جو زندگی و موت کو باہم سمو گئی

کہتے ہیں لوگ تا بہ ابد ڈھونڈتے رہو
دل نام کوئی چیز تھی پہلو میں کھو گئی

میرا خیال تھا کہ صدا دو گے تم مجھے
اے اہلِ کارواں مجھے تاخیر ہو گئی

دل رکھ دیا ہے پیکرِ خاکی میں اے قضا
یا مزرعِ حیات میں تو آگ بو گئی

اے خوابِ مرگ سن نہ سکے صورِ حشر بھی
اُف اب کھلی ہے آنکھ قیامت بھی ہو گئی

آتی ہے یاد وہ مری تقدیر اے ندیم
چونکا کے مجھ کو خوابِ عدم سے جو سو گئی

وا حسرتا کہ ہو سکی پوری نہ حشر تک
ہر آرزوئے دید ترا عہد ہو گئی

کیسی یہ عرضِ غم تھی تری اے نگاہِ یاس
اس کی مژہ کا جو سرِ دامن بھگو گئی

اکثر یہی ہوا کہ سرِ شام دوستو
افسانۂ فراق چھڑا صبح ہو گئی

غزلیں

جلیل قدوائی

جہانِ عشق میں ایسے بھی کچھ مجبُور ہوتے ہیں
حریم ناز میں رہتے ہیں اور مہجور ہوتے ہیں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے منشا اِن اداؤں کا
نہ میرے پاس آتے ہیں نہ مجھ سے دور ہوتے ہیں

وہی ہے سرگرانی بعد یک عمرِ وفا ان کی
نہ جانے کون سے دن دیکھئے منظور ہوتے ہیں!

اُنھیں کو دہر میں دیکھا ہے ہنستے بھی ہنساتے بھی
دلوں کی تہہ میں جن کے بیشتر ناسُور ہوتے ہیں

چلے ہیں ہم وہاں دردِ محبت کی دوا لینے
جہاں اہل وفا کے شیشۂ دل چُور ہوتے ہیں

نگاہِ ناز کے ہیں وار یارب کس قیامت کے
اُچٹتے پڑتے ہیں دل پر مگر بھرپُور ہوتے ہیں

حقارت سے نہ دیکھو اہل دل کو اے جلیل اُن میں
کوئی فرہاد ہوتے ہیں کوئی منصُور ہوتے ہیں!

اختر احسن

رہے گا وادیٔ دل میں ستاروں کا سفر کب تک
چلے گا بے ندا یہ کارواں شام و سحر کب تک

کبھی سایہ سا بڑھ جانا کبھی سایہ سا گھٹ جانا
اُسی اک خواب کی دیتا رہے گا دل خبر کب تک

سحر کا وقت آپہنچا ہے نقشِ صبح کو لے کر
رہے گا گلستاں پر سایہ وشِ عکسِ قمر کب تک

کرن اک آرزو کی اور پھوٹی بطنِ خاکی سے
یہاں ہوتا رہے گا رات دن رقص شرر کب تک

غم جاں آزمائے کب تلک رنگ دگر اپنا
یونہی ڈھلتا رہے گا خواب میں خونِ جگر کب تک

شبِ یلدائے غم کا آخرش انجام تو ہو گا
کرے گا اس حیاتِ جاوداں کو دل بسر کب تک

غزل

مشفق خواجہ

عشرتِ بوئے گل، شورشِ جامِ مے، حسنِ رخسار، رنگینیٔ پیرہن
حسبِ معمول پھر شام ہوتے ہی سجنے لگی ہے خیالات کی انجمن

اشک برسے تو جانا خزاں آ گئی، ہنس لئے تو کہا موسمِ گل ہے یہ
بیٹھے تنہائی میں کرتے رہتے ہیں اکثر ہم اندازۂ رنگِ بزمِ چمن

سطحِ ساغر پہ موجِ مئے ناب کا اضطراب ایک ہلکا سا ہے اس طرح
جیسے شب بھر کی بے خوابیوں سے کسی بنتِ مہتاب کا ٹوٹتا ہو بدن

رات ہوتے ہی آہستہ سے یوں کوئی دل کی آبادیوں میں اترنے لگا
ریگزاروں پہ جیسے حسیں چاندنی یا جزیروں میں سورج کی پہلی کرن

رفتہ رفتہ بڑھا تیرا غم اس قدر زندگی ہو گئی اک مسلسل خلش
ہم جسے سرخیٔ لالہ سمجھے وہ اک آگ تھی جس سے جلتا رہا ہے چمن

دیں اب الزام کیا ہم کسی شخص کو، دوستی ہی کے معیار بدلے گئے
منزلوں کی تمنا وہاں کیا کریں، راہ خود بن گئی ہو جہاں راہزن

ہر قدم پہ ملے بستیوں آرزوؤں کے لیکن میں بچ کر نکل ہی گیا
پھر بھی کچھ خواہشیں جو نہ پوری ہوئیں بن گئیں ضربتِ تیشۂ کوہ کن

زندگی جانے کس موڑ پر آ گئی سوچنے کی بھی فرصت نہ ہم کو رہی
عقل کہتی ہے جو کچھ ہوا سو ہوا، دل یہ کہتا ہے کچھ اور دیوانہ پن!

آج پھر ذہن میں کوئی شخص آ گیا، آج پھر مجھ کو محسوس ہونے لگا
میری بے تابیاں باعثِ صد سکوں میری تنہائیاں خالقِ انجمن

آج ہی دل کی بے تابیوں نے ہمیں ترکِ الفت کا مشفقؔ دیا مشورہ
آج ہی اور بھی کچھ نکھرنے لگا ان نگاہوں کا معصوم سا بانکپن

عبداللہ خاور

یوں عارض و گیسو کی حکایات بہت ہیں
کہیئے تو ابھی رمز و کنایات بہت ہیں

آنسو ہیں سلامت، تو شبِ تار کا غم کیا
آنکھوں میں تجلی کی روایات بہت ہیں

آئے ہیں دیارِ غمِ جاناں سے گزر کر
ہم تیرے لئے گردشِ حالات بہت ہیں

ماضی کے چمن زار سے آتی ہیں ہوائیں
اے عمرِ رواں! عیش کے لمحات بہت ہیں

یادوں کے ترنم میں ہے آہنگِ مزامیر
لرزاں لبِ افکار پہ نغمات بہت ہیں

باقی ہیں ابھی اہلِ وفا، اے ستم آرا!
مٹنے کے لئے راہ میں ذرات بہت ہیں

کہتے ہیں کہ ہم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
جینے کو یہی چند اشارات بہت ہیں

کیوں شعلۂ جاں شام سے افسردہ ہے خاورؔ
ہے رات بڑی اور حجابات بہت ہیں

مشکیں دوشیزہ کا نغمہ

اور

پاٹ کا کھیت

(مشرقی پاکستان کی حیات کا ایک منظر)

مخمور اکبر آبادی

زمیں میری ہے میں بنگال کی گمنام دختر ہوں — مجھے عسرت نے پالا ہے، جمالِ فاقہ پرور ہوں
نہ خضرا ہوں، نہ حمرا ہوں، نہ میں پریوں کی ہمسر ہوں — فسونِ جانفشانی ہوں، تن آزاری کی خوگر ہوں

جسے اب تک نگاہوں نے نہیں پرکھا، وہ جوہر ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

زمانہ میرا دشمن ہے فلک مجھ کو کچلتا ہے — کھڑی تپتی ہوں دن دن بھر، تپش سے تن پگھلتا ہے
لہو کی آگ کا لیکن زمیں پر زور چلتا ہے — جنوں کا جوش، آخر خاک کی فطرت بدلتا ہے

مری ہمت سے اک دن کھیت میں سونا اُبلتا ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا

یہ لو، میں نے اگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

یہ لو پٹ سن بناؤ اس سے شہزادی کا پیراہن — نہیں محتاجِ آرائش، ازل سے حسن کا تن من
مری تن زیب کو کافی ہے، میرا مدہ بھرا جوبن — چھریرا تن، کمر پتلی، سُتی پنڈلی، نظر پرفن

مری بدلی مرا کاجل، مرا دریا مرا درپن
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

مری سنگیں جوانی، تند ہے شبرنگ ہے نم ہے — خطوط و خم کا جادو ہے، نویدِ رامش و رم ہے
لبوں کی نرم جنبش، ارغنِ فطرت کی سرگم ہے — میں جس دم گنگناتی ہوں حیاتِ دل، وہی دم ہے

مری اٹکھیلیوں کی چال رقصِ موجۂ یم ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

ڈلی کے کُنج میں جب لی ہے میں نے تن کے انگڑائی — تو دیکھا ہے کہ اکثر جھوم کر کالی گھٹا چھائی
فضا بدلی، اچھوتی سوندھی سی پھوٹی، مہک آئی — انوکھے روپ میں ہوتی ہے مستی کی پزیرائی

تڑپ جاتی ہوں، یوں دیتی ہے فطرت دادِ برنائی
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

جدھر نظریں اٹھاؤں پنکھیوں کی چہل ہے ہر سُو — مرے اُڑتے کھلونے ہیں پلونٹے، کوکلا، تیہو
پپیہے کی وہ پیہم پی کہاں، کویل کی وہ کُوکُو — فضا طوطوں سے پُر اور ڈالیوں پر آن گنت لیچو

مجھے مدہوش سا رکھتی ہے پکے مور کی خوشبو
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

مرا ہر گام گت پاشے میں جب چاول پَپاتی ہوں — مرا ہر گام سم، ہاشے سے جب کھیتی پہ جاتی ہوں
اندھیری رات کو ایمن کی لوری سے سُلاتی ہوں — گجر دم جو گئے سے نور کا جادو جگاتی ہوں

بھری برسات میں ملہار سے جھڑیاں لگاتی ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

مجھے دیکھو، مجھے دیکھو، میں ایمانِ فلاکت ہوں — مری ثروت یہ کیا کم ہے کہ میں محرومِ ثروت ہوں
مرا نام و نسب کیا، جذبۂ ایثار و خدمت ہوں — محبت کے لئے پیدا ہوئی ہوں میں محبت ہوں

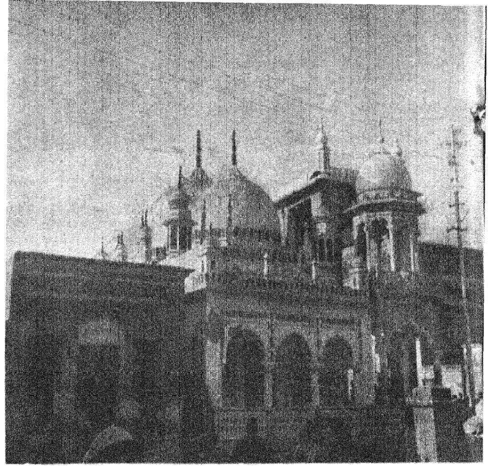
مجھے پوچھو نہ پوچھو قوم کی دولت ہوں قسمت ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

بصیرت مٹ چکی تو مٹ چکی، لیکن یہ رونا ہے — کہ ذوقِ پاک بینی جس کو کہئے وہ بھی عنقا ہے
اندھیرا چھا رہا ہے لیکن ایک انجم جھلکتا ہے — مجھے اعجاز نے مخمور کی نظروں سے دیکھا ہے

وہ فخرِ اہلِ بینش، شوق کی آنکھوں کا تارا ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

بوڑھی گنگا کا خواب : ڈھاکہ

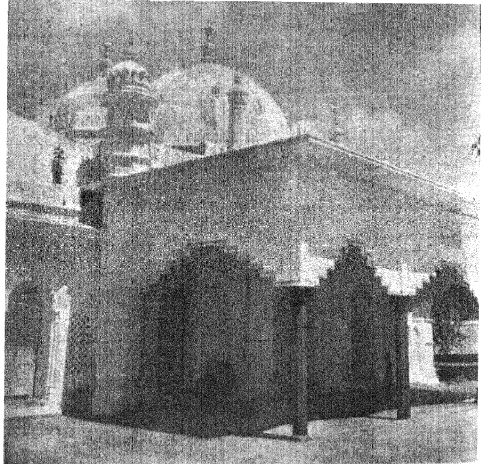
وہ خواب جسے دریا بھی دیکھتا ہے اور دور مغربی پاکستان کے رہنے والے بھی، جن کی نگاہیں وطن کے ذرے ذرے میں ایک حسین و جمیل دنیا آباد پاتے ہیں





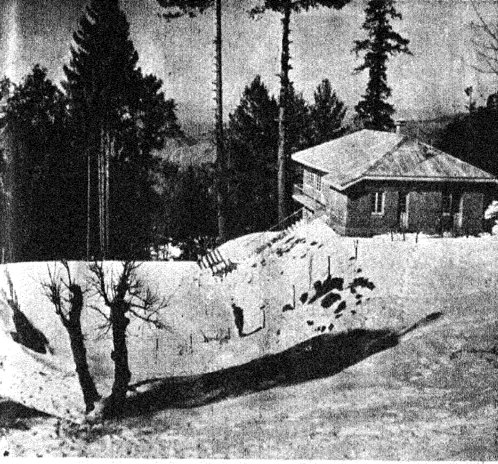
خواب تعمیر

خواب دیں : چند در چند شاندار مساجد جو یہاں کے باشندوں کے مذہبی ذوق کی آئینہ‌دار ہیں



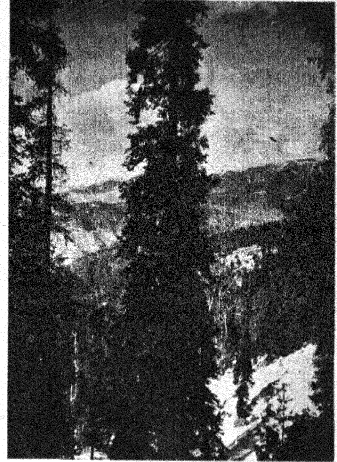


برف پوش خطے: آزادیوں کے ابدی نشمین



برف یا صبح کا خندۂ نورانی؟

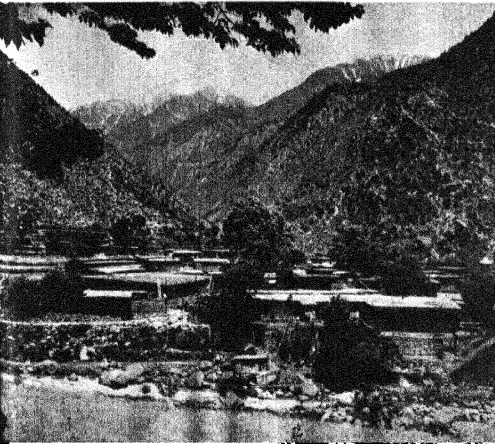
مری: جہاں اس سال برف نے دور دور تک ایک دبیز چادر پھیلا دی۔ کشمیر پوائنٹ سے کشمیر پہنچتی ہوئی۔ جہاں برف کی سن کر دینے والی یخی کے نیچے زندگی بدستور آزادی کی آنچ لئے ہوئے ہے اور برف کے تودوں کو پرے ہٹا کر انگاروں کی شکل میں آنے کے لئے بیتاب ہے

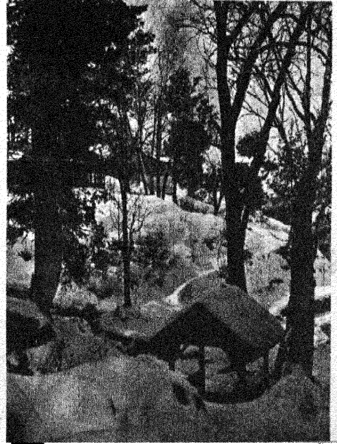


برف یا منجمد چاندنی؟

بلتستان: کشمیر کے آس پاس برف میں دم سوز دروں کی بیداری کے خواب دیکھتا ہوا اور برف کے باوجود سرو و صنوبر کی آزادی کے منظر سے شادکام

کوئٹہ: جو مری کی طرح امسال برف کا بھاری لبادہ پہنے رہا





رپورتاژ:

بوڑھی گنگا کا خواب — ڈھاکہ

عارف حجازی

نگاہوں کے سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ بوڑھی گنگا۔ جس کے دونوں کناروں پر کشتیاں اور دخانی جہاز لنگر انداز تھے۔ اور ان کے عقب میں قدیم ڈھاکہ کے در و دیوار بلند و بالا حویلیاں، کائی سے ڈھکے بوسیدہ مکانات، مسجدوں کے گنبد، مندروں کے کلس دور سے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے پانی کی اتھاہ گہرائی سے کوئی جہازنما شہر اُبھر آیا ہو۔ یا یہ البیلا دریا کوئی خوش آئند خواب دیکھ رہا ہو۔ قلعہ لال باغ سے کر ڈھاکہ نرائن گنج روڈ تک کچھ ایسا ہی منظر تھا جس نے قدیم ڈھاکہ کی عظمتوں کی یاد تازہ کردی تھی۔ ساڑھے تین سو سال قبل یہ شہر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ۱۶۱۲ء میں جب یہ بہار اور اڑیسہ کا صدر مقام بنا تو اسے چار چاند لگ گئے تھے۔ ۱۷۰۱ء تک کا دور اس کا سنہری دور تھا۔ انتظامی اور فوجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ یہ شہر دنیا بھر میں اپنی نفیس تارکشی اور ریشم جیسی ملائم ململ کا واحد مرکز بن گیا تھا۔ جو ململ دنیا کے دور دراز علاقوں میں جاتی تھی اور جس کی نفاست کی شہرت ان ملکوں کے شاہی محلوں سے نکل کر زبانِ زدِ عام ہو گئی تھی اور جب یہ جادو بھری تارکشی کی ململ شہزادیوں اور نئی نویلی دلہنوں کے شرمیلے، سنہری جسموں کو اپنے آغوش میں چھپا لیتی تو ماہ عسل کی پہلی رات کا سماں جادو کی کیفیت پیدا کر دیتا اور وہ اس شہر کے دلفریب مناظر کے خوابوں میں کھو جاتیں۔ یہ ڈھاکہ کے محنت کش جولاہوں کی انگلیوں کا جادو تھا جس نے دنیا کے بے شمار حسینوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اور آج بھی وہ طلسم ہوشربا کے کسی قصہ کی طرح "سحرِ بنگال" کے نام سے مشہور ہے۔ یورپ والوں نے اس جادو کو اپنے قبضے میں لانے کے لئے جو بھی تدبیریں سوچی ہوں کم ہیں۔ ململ کی کشیدہ کاری سے جو اس کی اقتصادی ترقی کا سب سے بڑا وسیلہ تھا شہر ڈھاکہ نے دنیا کی جمالیاتی تشنگی کو آسودہ کرنے میں کتنا اہم کردار انجام دیا ہے۔ یہ اقتصادی ترقی اس وقت تک برقرار رہی اور اندرونی نظم و نسق میں خلل نہ پیدا ہوا۔ اس زمانے میں یہ لندن کی ٹکر کا شہر تھا۔ مشرقی ہندوستان میں کوئی اور شہر نہ تھا جو اس کا مقابلہ کر سکتا۔ لیکن گردشِ وقت کہیئے کہ ڈھاکہ کی اپنی بے پناہ اقتصادی ترقی و خوشحالی کو تھوڑی ہی مدت کے بعد زوال آنا شروع ہو گیا، آبادی گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار رہ گئی اور اس طرح دنیا کا یہ مشہور شہر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک گمنامی اور اقتصادی بدحالی کے اندھیروں میں کھویا رہا۔ ۱۹۰۶ء میں جب لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے تھا تو اس شہر کو پھر ایک بار مشرقی بنگال اور آسام کا صدر مقام بننے کا موقع ملا۔ لیکن سات برس کی قلیل مدت کے بعد پھر اسی مرکز پر آ گیا۔ اور کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکا۔

میں یہ سوچتا ہی رہا۔ قیامِ پاکستان سے قبل کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ڈھاکہ اپنی قدیم روایات اور سنہری دور کی یاد پھر تازہ کر دے گا۔ اس کے در و دیوار سے ماضی کی شان و شوکت پھر جھلکنے لگی۔ اور تقسیم سے تھوڑے عرصہ پہلے اس کے گلی کوچوں میں آگ اور خون کی جو ہولی کھیلی گئی تھی وہ اس کے زندہ دور کی نقیب ثابت ہوگی۔ چنانچہ آزادی کے فوراً بعد جب ڈھاکہ کو دنیا کی پانچویں بڑی آزاد مملکت کے مشرقی بازو کا صدر مقام ہونے کا اعلان ہوا تو اس کی کھوئی ہوئی عظمت پھر لوٹ آئی۔ لیکن ایک عرصہ تک شہر کے حالات ٹھیک نہ ہو سکے۔ دوسری طرف تخریبی عناصر اور غیر مسلم فرقے کے لوگوں کی متعصب ذہنیت نے ایک نئی سیاسی کشمکش پیدا کر دی تھی۔ ان غیر تسلی بخش حالات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی جس کا واحد علاج ۷؍ اکتوبر ۵۸ء کا فوجی انقلاب ہی تھا۔ یہ انقلاب سارے پاکستان کے لئے ایک نئی زندگی، شاندار مستقبل اور ترقی یافتہ رجحانات لے کر آیا تھا اور اس کے آتے ہی ملک دشمن عناصر کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے دوررس اثرات نے ڈھاکہ کے مستقبل کو بھی نہایت درخشاں کر دیا۔ قیامِ پاکستان سے لیکر انقلاب کے آنے تک ڈھاکہ بڑی سست رفتار سے ترقی کر رہا تھا۔ نئے دور کے آغاز سے یہ رفتار تیز ہو گئی۔

بڑی دیر تک دریا کی منجدھار سے قدیم شہر کا نظارہ کرنے کے بعد کشتی صدر گھاٹ پر آ لگی۔ اور ہم سب اتر پڑے۔ گھاٹ کیا تھا اچھی خاصی بندرگاہ تھی۔ دریا کے پختہ کنارے پر کشتیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان سے پرے مال بردار دخانی جہاز کھڑے تھے۔ جگہ جگہ پیلے پیلے کیلوں، انناس اور ناریل کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہزاروں قسم کی مچھلیاں تھیں، بیوپاریوں اور گاہکوں کے جمِ غفیر میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ گھاٹ کی سڑک کے دوسرے کنارہ پر چھوٹی چھوٹی دکانیں اور ہر قسم کے مٹھائی کے خوانچے لگے ہوئے تھے جن پر رسیلے اور خوش ذائقہ رس گلوں سے بھرے ہوئے تھال رکھے تھے۔

کہیں گرم گرم تلی ہوئی مچھلیاں۔ فضا ان کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہی تھی اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ان دکانوں پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ ہم زندگی کے متحرک ماحول میں گھومتے گھامتے، بھیڑ بھاڑ سے تھوڑی دور نکل آئے تو دیکھا کہ چند بدیا[1] عورتوں کے گرد لوگوں کا بہت بڑا مجمع لگا ہے۔ دوتارا سے ملتے جلتے ساز کی نہایت دلکش صداؤں کے ساتھ ان عورتوں کے "سپیوریا گیت" کی مدھر تانوں سے سرمئی فضائیں بھی ان جھنکارتے ہوئے بدمست سانپ کے جوڑے کی مانند مرتعش ہو رہی تھیں۔ ہر شخص جیسے "موت کے دیوتا" یاما مہاراج کے دربار میں بڑی تعظیم سے کھڑا غم نصیب بیہولا دیوی کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ساز کے پُر درد سُروں کے ساتھ دوسری بدیا عورت نے ایک داستان شروع کر دی۔ "جب چاند سوداگر کا چاند سا بیٹا لکھندر، سانپ کے کاٹنے سے دوسری دنیا کو کوچ کر گیا تو اس کی نئی نویلی بیوی بیہولا غم کی آنچ سے زرد پڑ گئی، خوبصورت رخساروں پر سیاہی دوڑ گئی۔ بتی کی اچانک موت نے اس من موہنی سندرتا کا سہاگ لوٹ کر کتنا ظلم کیا تھا مگر اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور اپنے پیارے شوہر کی نعش کو بیڑے میں رکھ کر دریا کے بہاؤ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بالآخر کئی دنوں کے سفر کے بعد موت کے دیوتا یاما مہاراج کے دربار میں پہنچی اور اپنے رقص کے ایسے کمالات دکھائے کہ یاما کو اس سہاگن پر بڑا رحم آیا اور اس کے پتی لکھندر کے مردہ جسم میں پھر جیون کی لہر پیدا کر دی۔"

سپیوریا گیت، اس کے ساتھ یہ دلچسپ قصہ، لکھندر اور بیہولا کی محبت کا مدھر نغمہ۔ نازک بدن بدیا عورتوں کا والہانہ اندازِ بیان، ان کی میٹھی سُریلی تانیں سنکر ہم پر جیسے ایک جادو ہو گیا تھا۔ چنانچہ سانپ کا تماشہ ختم ہوتے ہی ہم سراج الدولہ پارک کے قریب ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ یہیں سے شہر کی "شہ رگ" نواب پور روڈ گزرتی تھی۔ قومی انقلاب نے جہاں شہر کے دوسرے حصوں میں بڑی بڑی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہاں نواب پور روڈ کو اور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ ہٹ کولا روڈ، بنگلہ بازار، سٹ فورڈ روڈ، اسلام پور روڈ کے کیا کہنے۔ انہی شاندار سڑکوں کی طرح یہ بھی صاف ستھری، چم چم کرتی نظر آتی تھی۔ گہماگہمی نے اس کی شان اور بھی دوبالا کر دی تھی۔ سائیکل رکشوں گھوڑے گاڑیوں، بیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ موٹروں اور بسوں کا بے پناہ تانتا اور زبردست طنطنہ۔ وہ سیدھے سادے مرد اور عورتیں، ان کی شیریں زبان میں رس گلوں کی مٹھاس اور تر و تازہ گلاب کی خوشبوؤں کا احساس۔ قدیم شہر کی عمارتوں کی سنگین مشرقیت کا رعب ایسا پڑ رہا تھا کہ ہر نووارد خصوصاً اہلِ مغرب کے لئے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا محال ہوتا تھا۔ پھر شہر کے ہوٹلوں میں مغربی دلچسپیوں کا سامان کہاں، دکانوں میں ڈھاکیسوری کی ایک سے ایک نفیس ساڑھی، موسیقی اور ساز سنگیت کے آلات، طبلہ، سارنگی، ستار، ہارمونیم اور موہن بانسریاں، سیپ اور مچھلی کی ہڈی کے بٹن، انگرکھے اور ٹوپیاں، کرتے، لنگیاں، پاجامے، بید کا سامان اور فرنیچر، ویدوں حکیموں کے مطب، ہومیوپیتھ ڈاکٹروں کی حویلیاں اور دواخانے، بیڑی بنانے والوں پان فروشوں اور پنواڑیوں کی چھوٹی چھوٹی سی دکانوں کے بیچ میں کہیں کہیں بڑی بڑی فیشن ایبل عمارتیں، انہی دکانوں میں مغربی اشیاء، اور ساز و سامان کی جھلکیاں اجنبیت کا احساس پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن چوک بازار میں پہنچ کر تو صدیوں کی قدامت کا شدید احساس ہونے لگا۔ کبھی یہاں ایرانی، یونانی، فرنگی، کشمیری، افغانی، ارمنی اور دیگر مقامی و غیر مقامی لوگ رہا کرتے تھے۔ بیرونی تجارت کا یہی سب سے بڑا مرکز تھا۔ اسی بازار میں مسلمان امراء و شرفا کی شان و شوکت اور کروفر کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ نقیب اور چوبداروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور شاہانہ جلوس اور سواریاں گزرا کرتی تھیں۔ اسی چوک میں علماء اور مشائخ کے جلسے منعقد ہوا کرتے تھے۔ یہیں ایک چوگوشہ چبوترہ بھی تھا جو مقرروں کے کام آتا تھا۔ اسی مقام پر شہر کے خوش باش نوجوان تفریح کرتے نظر آتے تھے۔ پان اور شربت کی دکانوں پر ان کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہیں قصہ گو اور پُر مذاق لوگ مغل دربار اور حرم کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑ گھڑ کر اور قہقہوں اور خوش گپیوں میں اپنے فرصت کے لمحات گزار دیتے تھے۔ صرف فرق اتنا معلوم ہوا کہ پرانے چوک کے تاریخی ماحول کی جگہ اب مقامی رنگ کی گہماگہمی نے لے لی ہے۔ جہاں کبھی چوکور چبوترہ ہوگا وہاں اب لبساط خانے ہیں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں گوردا اور خصی یعنی گلٹے اور بکری کا گوشت ملتا ہے۔ چنگڑی ماچھ (جھینگا) اور دوسری طرح طرح کی مچھلیوں کے سالن اور کھانے ملتے ہیں۔ شام کے وقت ریڈیو اور ریکارڈوں کے بنگالی گیتوں اور گانوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور چوک کے مربع نما علاقہ میں اچھا خاصا میلہ لگا معلوم ہوتا ہے۔

قدیم ڈھاکہ کے تنگ بازاروں، چوکوں اور پُرپیچ گلی کوچوں میں پرانی عمارتوں کے یہ بے شمار کھنڈر، ان میں دریا کے "بک لینڈ" بند کے پاس نوابین ڈھاکہ کا محل دیکھنے کے لائق ہے۔

یہ ہے بڑا کٹرا، چوڑی ہٹہ بازار یعنی چوڑی والوں کا بازار۔ جہاں شاہجہاں کے دوسرے بیٹے شاہ شجاع نے ایک شاندار مسجد تعمیر کی تھی۔ ایسے ہی ست گنبد ہے۔ مشہور سپہ سالار، شائستہ خان کی تعمیر "چھوٹا کٹرا" ہے کیسی بانکی اور نرالی وضع ہے! سات گنبد پہلو بہ پہلو، نفیس و نازک جھرمٹ۔ گویا البیلی، خوشخرام بوڑھی گنگا کی سطح پر ایک ساتھ ابھرے ہوئے شفاف بلبلے۔ مغلوں نے یہاں کیا کیا یادگاریں نہیں چھوڑیں۔ ہم قلعہ لال باغ سے کیسے دل و دماغ میں عہدِ رفتہ کے حسین و جمیل

[1] بنگال کے خانہ بدوش۔ جن کا عام پیشہ سانپ کا تماشہ دکھانا ہے۔

تصورات کی شمعیں جلائے بغیر گزر سکتے ہیں۔ یہ اورنگ زیب جیسے جری باپ کے فرزند، محمد اعظم کی یادگار ہے۔ جس کا مشرقی حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ اور اپنی شکستگی میں بھی شان و شوکت کے آثار لئے ہوئے ہے۔ افغانی عہد کا قلعہ جسے زمانہ کی ستم ظریفی نے جیل بنا دیا ہے حسینی دالان، لال کرتی، پرانا دروازہ، حویلی روپ لال، ڈھاکیسوری کا مندر، رنگ و نیرنگ، افسانہ در افسانہ۔ دیدہ و دل پر نئے نئے نقش ثبت کئے جاتے ہیں۔ یہ ہے دورِ کہن کی کرشمہ آفرینی اور جب ماضی نے حال کا چولا بدل لیا تو شعور فن نے نئے نئے روپ دھارے سلیم اللہ ہال، کرزن ہال۔ ڈھاکہ یونیورسٹی، شاہ باغ کا فوارہ، ہائی کورٹ (جس کی عمارت میں ڈھاکہ کا بانی، اسلام خان، مدفون ہے) اور زیادہ قریب آیئے۔ پاکستانی عہد میں۔ یہیں انسانی شعور اور ذوقِ فن کے جدید ترین نقوش۔ شانتی نگر، موتی جھیل اور پرانا پلٹن کی رہائش گاہیں۔ دوسری طرف عظیم پورہ اور اس کی نئی مارکیٹ۔ دھان منڈی اور شاہ باغ کے علاقہ کے صوبائی دفاتر، شاہراہ گلستان، اسٹیڈیم وغیرہ۔ جیسے مست کیف بوڑھی گنگا نے اپنے کناروں پر موتی ہی موتی اگل ڈالے ہوں۔ اور اب تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہی سلسلے باقی رہ گئے ہوں۔ بالکل پاس۔ جیسے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نئے نئے نقوش ابھرتے جا رہے ہوں۔ یہ عمارات جیسے ابھی ابھی بنی ہوں۔ جنت کے ایک گوشے ہیں۔ آخر رمنا بھی تو جنت ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس قدر باغ و بہار۔ ہرے بھرے مناظر، سبزہ شاداب کنج، گھنے سایہ دار درختوں کی لہریا بناتی ہوئی قطاریں، جل تھل تالابوں کی سطح پر ناچتے ہوئے کنول، چاروں طرف ہرا بھرا سبزہ ہی سبزہ جس کی تازگی و شگفتگی سے آنکھوں میں ایک نئی قوت اور طراوت کا احساس پیدا ہو۔ اور دل و دماغ اس بہار میں سبزہ زار اور قدرتی حسن سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رمنا کے خوبصورت مناظر اور خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی فضاؤں میں پہنچ کر ہم پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ تمام دن قدیم شہر کے بازاروں، گلی کوچوں اور تاریخی عمارتوں کو دیکھتے دیکھتے اور چلتے پھرتے جو تھکن طاری ہوئی تھی اس کا خمار ٹوٹ چکا تھا۔ اور ایک نشہ آفریں کیفیت طاری ہونے لگی تھی — بادِ شبینہ نے اس میں اور بھی کیف پیدا کر دیا۔ نیم خنک، متوالی ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ جب کسی مہ جبین کے نغمگیں قہقہوں کی آواز کانوں سے ٹکراتی تو دل نسائی زلفِ دراز کے نغمے چھیڑ دیتا اور ہم ان شیریں قہقہوں سے متاثر ہو کر اپنی رفتار اور دھیمی کر دیتے۔ لیکن جب کسی دوسری کٹیا یعنی بنگلے سے سرگم کے جادو بھرے بول، پائل کی مدھم جھنکار کے ساتھ طبلے کی ہلکی ہلکی تھاپیں اور ستار کی سریلی گنگناہٹ سنائی دی۔ تو دل کسی البیلی رقاصہ کی طرح خود بھی رقص کرنے لگتا اور لمحہ بھر کے لئے ہمارے قدم نغموں کی سحر آفرینی سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے کے لئے آپ ہی آپ رک جاتے۔ موسیقی اور سازکاری کا یہ دلچسپ امتزاج لوگوں کی عام زندگی سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ امیر و غریب سب ہی اس کے پرستار نظر آئے۔ پھر پٹواٹولی کی بھول بھلیوں جیسی گلیوں کا ذکر ہی کیا جہاں شام ڈھلتے ہی شمع روشن ہونے کی دیر ہوتی ہے کہ ساز سنگیت کے دلنواز سُر تال چھڑ جاتے ہیں۔ اور دل پھینک لوگ پروانوں کی مانند ان گلیوں کا طواف کرنے نظر آنے لگتے ہیں۔

اس خواب کے سے عالم میں ہوتے ہوئے ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ وہ سرکاری قیام گاہ جو دور و نزدیک سے آنے والے مسافروں کو چند روز اپنے آغوش میں سکون و آرام بخشتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے گھڑی بھر سانس لی۔ اور لمبی تان کر سو گئے۔ صبح اٹھتے ہی دیکھا کہ تمام ساتھی کوچ کی تیاری میں مصروف ہیں ہم نے بھی الٹا سیدھا اپنا سامان باندھا اتنے میں ٹیکسیاں آگئیں اور ہم دن نکلتے نکلتے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ وہاں تھوڑا بہت ناشتہ کیا۔ ڈھاکہ کو الوداع کہہ کر جان خدا کے سپرد کی اور پی، آئی، اے کے سپر کونسٹیلیشن ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔

رپورتاژ:

المنظر سے المہران

اقبال حامد

غلام محمد بیراج اور اس کے دائیں کنارے پر واقع حسین و مختصر ہوٹل ،
"المنظر" دونوں دور سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کوئی ذی وقار شہنشاہ سر کا تاج سرہانے رکھے لیٹا ہو اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس تاج کے سائے میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔! شدید سردی کا دن اور دوپہر کی تیز دھوپ ، سردی اور گرمی کے اس امتزاج نے ہم میں سے ہر ایک پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ نہ معلوم کب تک یہ کیفیت اور طاری رہتی اگر بیرا چائے کی ٹرے لاتا ہوا نظر نہ آجاتا۔ اس کو دیکھ کر ہم میں سے کسی نے خموشی کا طلسم توڑا۔

"دریائے سندھ خشک ہے۔ دوسری طرف یہ نہر کلری بگھار فیڈر اپنی خشک چھاتی کے زخم دکھا رہی ہے اور ان دونوں کے درمیان یہ "المنظر" اپنی رعنائی کے باوجود اکتانے لگا ہے۔ کہیں اور چلیں۔"

"جیکب آباد کیسا رہے گا وہاں بارش ہو رہی ہے۔"

"تماشمو رُمی ہو آئیں گے۔ جہاں اس بیراج کا حریف یا حلیف ابھر رہا ہے۔ واپسی میں سکھر چاہیے ایک ہی دن کے لئے۔"

"منظور۔ منظور۔"

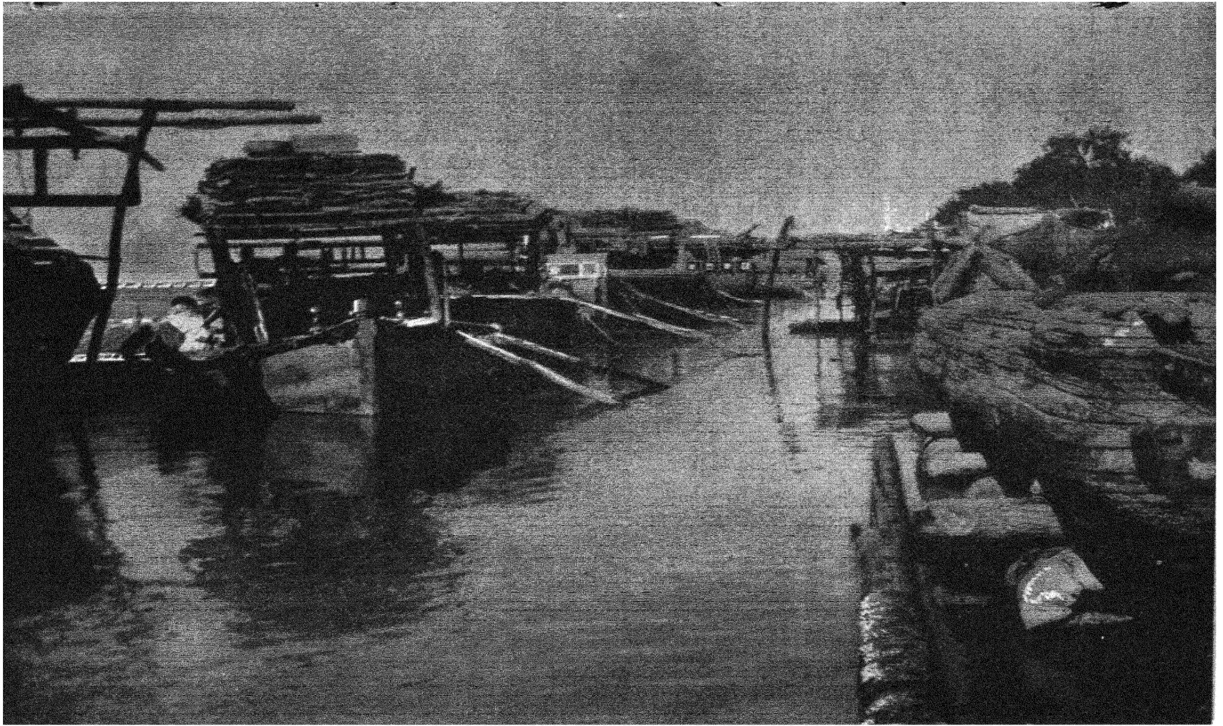
"طے ہے"

کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اور معلوماتی سفر کی ایک ایسی اسکیم بن گئی جس کے عملدر آمد کے بعد ہم غور کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ سفر نہ کیا ہوتا تو معلومات کس قدر نامکمل رہتیں۔ کیونکہ اس سفر کی ہر ہر منزل پر فرد کی عقل اور قوم کی محنت کے وہ وہ حاصل سامنے آئے جو عجیب بھی ہیں اور قابلِ فخر بھی اور جن کی قدر افزائی یا توصیف کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کو تصویر اور تحریر کے ذریعہ منظر عام پر لایا جائے۔

حیدر آباد سے رات ۱۱ بجے "چناب سے" روانہ ہو کر صبح ساڑھے سات بجے ہم شمالی سندھ کے آخری ضلع ، جیکب آباد پہنچ گئے جو "اپر سندھ فرنٹیئر" کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ یہ مقام بے انتہا گرم ہونے کی وجہ سے پاکستان کا منطقۂ حارّہ کہلاتا ہے یا پھر اس کا نام اس لئے سننے میں آتا تھا کہ یہاں ساٹھ فیصدی ہندو اور ۴۰ فیصدی مسلمان ہیں۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ جیکب آباد حسن و عجائبات کا بھی مالک ہے۔ ۵۰ ہزار کی آبادی کا یہ شہر بڑے سلیقے سے بسایا گیا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف اس قدر جگہ چھوڑی گئی ہے کہ مزید دو دو سڑکیں تعمیر ہو سکتی ہیں۔ اس قدر فاصلے کے بعد سیدھی قطار میں مکانات ہیں اور مکانوں کے سامنے ببول کے درختوں کی سیدھی لائن ضرور لگائی جاتی ہے۔ یہ ببول بھی اس لحاظ سے نرالے ہیں کہ سب پستہ قد اور پتلے تنے کے ہیں اور ایک بھی بلند اور گھنا پیڑ پورے شہر میں کہیں نہیں ملے گا۔ سڑکوں اور مکانوں کی اس قدر دوری اور لازمی شجرکاری مغربی پاکستان کے اور شہروں میں نہیں دکھائی دیتی۔

ہم جیکب آباد کو بسانے والے کی سلیقہ مندی کی تعریف کرتے ہوئے جب بیچ شہر میں آئے تو ہمارے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ڈپٹی کمشنر کی سرکاری رہائش گاہ اور نجی دفتر نظر پڑا۔ پشت پر تھوڑے ہی فاصلے پر گھنٹہ گھر تھا۔ تھوڑی دیر گنجان بازار، اجناس کی منڈی ، فروٹ مارکیٹ اور سبزی مارٹ کا چکر لگایا۔ پھر ڈپٹی کمشنر کی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ یہاں پہنچ کر اطلاع کرائی۔ دو منٹ بعد ایک نوجوان سی ایس پی ، سراپا اخلاق ڈپٹی کمشنر جیکب آباد سے ملاقات ہوئی جو ہمیں جیکب آباد کے بارے میں اس طرح بتائے جا رہے تھے جیسے پرانا لیکچرار کلاس روم میں بول رہا ہو۔ حالانکہ ان کو یہاں تعینات ہوئے صرف چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ اگر ہم موصوف کی دل آویز تقریر لفظ بہ لفظ نوٹ کر لیتے تو ایک اعلیٰ نمونۂ انشا پردازی کا گمان ہوتا بہرکیف ، ہم ان کی شیریں بیانی اور ذخیرۂ معلومات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ انکی معلومات سے ، ہم نے جو حقائق اخذ کئے وہ یہاں آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک سو دس برس قبل تک یہ شہر "خان گڑھ" کہلاتا تھا اور ایران ، افغانستان اور ہندوستان کے اکثر باغی اور جنگجو قبائل کا مرکز تھا۔ کیونکہ قندھار ، چمن اور بلوچستان کے بعد جیکب آباد سے براہ سرسٹہ، بھٹنڈہ ، دہلی کو حملہ آوروں کے لئے ایک مستقل جنگی راستہ تھا اور درۂ بولان کو بھی یہی راستہ جاتا تھا۔ اسلئے



مغربی یا مشرقی پاکستان ؟

سابق سندھ کے تاریخی شہر، سکھر، میں '' پدما ،، اور '' میگھنا ،، کے مثل، دریائے سندھ پر گونا گوں سفینوں کا دل آویز نظارہ شاید اسی لئے وادئ مہران کے ہردلعزیز شاعر، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ بار بار ماتجھیوں اور کشتیوں کا ذکر کرتے ہیں

رنگین عکس : محمد اسماعیل صدیقی،

انیسویں صدی کے نصف میں جبکہ انگریز ہندوستان میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور حریت پسند اُن کو اکھاڑ پھینکنے کی تاک میں تھے۔ ایک سمجھدار جنرل کو یہاں تعینات کیا گیا جس کا نام جان جیکب تھا۔

یہ فوجی نہ صرف ایک اچھا مدبر اور دوراندیش حاکم ثابت ہوا بلکہ موجد کی حیثیت سے بھی اس قدر مقبول ہوا کہ شورش پسند قبائل نے شہر کو ہی اس کے نام پر موسوم کر دیا۔ اور آج ایک صدی گزرنے کے بعد بھی جنرل جان جیکب کی قبر واقع جیکب آباد پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور چراغ جلائے جاتے ہیں!

جنرل جان جیکب کا زمانہ بڑا پُرآشوب تھا۔ اس کا عہدہ پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ اور کمانڈنٹ اپر سندھ فرنٹیئر تھا۔ یہ اس با اعتبار فوجی اور سیاسی عہدے پر ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۸ء تک فائز رہا (اس اثنا میں صرف ایک برس کے لئے میری ویدر نے اس کی جگہ کام کیا تھا۔ یہ وہی میری ویدر ہے جس کے نام کا ٹاور کراچی میں اب بھی موجود ہے) اس دوران میں وہ چاہتا تو کافی کشت و خون ہوتا اور تاریخ میں اس کا تذکرہ تعجب سے نہ کیا جاتا۔ مگر اس نے عقل و تدبر سے کام لیا۔ اور حکمت عملی سے بہت اچھے کام کئے۔ ایک بہت ہی خطرناک مقام پر بہت نازک ذمہ داریاں سنبھال کر اس فوجی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور تجارتی بنیاد پر یہاں ایک "ہارس شو" کا بھی آغاز کیا۔

اس علاقے کے بلوچ قبائل گھوڑے پالنا اور شہ سواری کے بےحد شوقین تھے۔ اسی بنا پر گھوڑوں کی بے قاعدہ درآمد اور خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ جنرل جان جیکب کے قائم کردہ "سالانہ ہارس شو" میں گھوڑوں کے تاجر آتے اور خریداروں کو اچھے اچھے گھوڑے بہت آسانی سے مل جاتے۔ چند ہی سال بعد اس جنرل نے اس سالانہ ہارس شو کے موقع پر شہ سواری اور نیزہ بازی کے کرتبوں کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کے لئے پُرکشش انعامات بھی مقرر کئے۔ ان مقابلوں میں بلوچوں نے زور و شور سے حصہ لیا۔ اور یہی نقطۂ آغاز تھا جہاں سے غیر ملکی فوجی حاکم کے مخالف عوام کے درمیان تعاون و اعتماد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیکب نے دوسرے ہی سال اس ہارس شو کی اہمیت میں اضافہ کیا اور دور و نزدیک کے قبائلی سرداروں کو بلا کر ان کے مفاد اور عام نظم و نسق کے مسائل پر گفتگو کی اور ان کے مشوروں کی قدر افزائی کا ثبوت دیا۔ یہ ہارس شو گزشتہ ایک سو برس سے اب تک نہایت باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ البتہ آزادی کے بعد اس میں جدت اور اضافے ہوتے رہے ہیں چنانچہ اب یہ ہارس شو کے علاوہ ایک بڑا میلہ اور نمائش بھی ہو گیا ہے۔ البتہ اس کے انعقاد کی تاریخوں میں فرق نہیں آیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیکب آباد کی ۵۵ سے ۱۳۰ ڈگری تک کی گرمی کے مارے ہوئے عوام کسی خوشگوار مصروفیت اور تفریح کے متلاشی ہوتے ہیں جو اُن کو سردی کے آغاز میں ہارس شو کی شکل میں ان ایام میں میسر آتی ہے جبکہ خریف کی فصل کٹ کر بازار میں آ جاتی ہے اور ربیع کی فصل بوئی جا چکی ہوتی ہے۔ گویا ان دنوں میں اہلِ دیہات بالکل فارغ ہوتے ہیں اور دور و نزدیک سے آ کر اس ہارس شو میں حصہ لیتے ہیں جو اب صنعت و زراعت کی نمائندگی کے ساتھ ہی ثقافت کا بھی آئینہ دار ہو گیا ہے۔ صوبائی گورنر کی آمد سے اس کی اہمیت میں اور اضافہ ہونے لگا ہے۔ اس ہارس شو کی روایت یہ ہے کہ اس میں ہر سال ایک خصوصیت کا اضافہ ہوتا ہے مگر اس سال ایک بنیادی خصوصیت یہ پیدا ہوئی کہ ہارس شو کے قیام اور نمائش گاہ کو مستقل بنیاد پر پختہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ دوسرے اب تک اس پر حکومتیں ہر سال کچھ نہ کچھ صَرف کرتی تھیں مگر اس سال اس کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیا گیا چنانچہ ۵۰ ہزار روپیہ اس کی آمدنی میں سے مشرقی پاکستان کے طوفان زدگان کے امدادی فنڈ میں بھی دیا گیا ہے اور ۲۴ ہزار روپے سے جیکب آباد میں ایک ڈیری فارم کھولا جا رہا ہے۔ اس تعمیری تبدیلی کا سہرہ موجودہ حکومت کے سر ہے جس نے پورے ملک کو تعمیر اور اصلاحات کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔ اور اب تو ماضی کے فضول خرچ حکام کا طرز عمل بالکل بدل گیا ہے۔

ہارس شو تو جنرل جان جیکب کے سیاسی تدبر کا ثبوت ہے۔ لیکن اس سپاہی نے اس ہی دور میں ایسی ایجادات بھی کیں جنہیں آج بھی حیرت سے دیکھا جاتا ہے۔ ان ایجادات میں ایک گھنٹہ ہے جو زمین کے اوپر دس فٹ بلند ہے اور جملہ کل پرزوں سے لیس ہے اور تیس فٹ گہرائی میں زمین کے اندر اس کی دو زنجیریں چلی گئی ہیں جن کی متواتر گردش سے یہ گھنٹہ ۱۰۰ برس سے برابر چل رہا ہے۔ زمین کے اوپر آخری سرے پر اس کے پتیل کے ڈائل ہیں جو چار سمتوں کی طرف رکھے گئے ہیں ان پر گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کے عدد کندہ ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی عیسوی و قمری سن، ماہ اور اس کی تاریخیں بھی کھدی ہوئی ہیں۔ چنانچہ تیس فٹ زیر زمین زنجیروں سے چلنے والا یہ گھنٹہ وقت کے ساتھ دونوں سنوں کی تاریخیں بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے درمیان میں پتیل کا ایک چاند ہے جس پر ایک سرکنے والی پوشش ہے۔ یہ چاند اس پوشش کے سرکنے سے عین اس دن طلوع ہوتا ہے جب فلک پر چاند دکھائی دیتا ہے اور جس طرح آسمان کا چاند بڑھتا ہے اسی طرح اس گھنٹہ میں بھی قمر بڑھتا رہتا ہے۔ چودہ کی شب کو یہ چاند مکمل ہو جاتا ہے اور دوسرے دن سے گھٹنے لگتا ہے۔ غرضیکہ اس کی رفتار اصلی چاند کی طرح ہوتی ہے۔ ایک صدی اور دس برس کی مدت میں یہ گھنٹہ صرف ایک بار بند ہوا تھا۔ اور اس کے بند ہونے سے ایک حیرت ناک واقعہ بھی اس سے وابستہ ہو گیا۔ یعنی یہ کہ کوئی چھ مہینے تک اس کے بند رہنے کے دوران خرابی معلوم کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ اس کو

چلانے کے لئے بڑے بڑے ماہر مکینک اور نامور انجینئر تک بلوائے گئے۔ مگر سب ناکام ہو گئے۔ آخرکار جیکب آباد کا ایک نوجوان گھڑی ساز، محمد عظیم، ڈپٹی کمشنر کے پاس آیا اور کہا کہ میں اس گھنٹے کی مرمت کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ انہوں نے اس معمولی گھڑی ساز کی حوصلہ افزائی کی اور اس کو کام کی پوری آزادی دی ــــ یہ ۲۲ سالہ گھڑی ساز ـــ اپنی معمولی دکان اور چھوٹے سے کاروبار کو بھول کر ایک جنونی کی طرح ۴۳ دن تک اس گھنٹے کے پیچھے پڑا رہا اور سارا سارا دن بلکہ اکثر رات کو بھی اس کے کل پرزے کھول کر جوڑتا رہتا۔ آخر کامیابی نے اس کے قدم چومے اور کلاک کی پوری درستی ہو گئی اور وہ باقاعدگی کے ساتھ چلنے لگا۔

جنرل جان جیکب نے اپنی قیام گاہ میں جس کو "ریذیڈنسی" کہا جاتا تھا خود ایک ورکشاپ بنا رکھا تھا جو پوری عمارت کے لئے ایئر کنڈیشننگ تک کرتا تھا۔ ! یعنی ہر حصے کو موسم سے محفوظ رکھتا تھا لیکن وہ ورکشاپ اب محفوظ نہیں۔ اسی طرح اس جنرل کی ایجاد کردہ کرسیاں اور دوسری چیزیں ناقدری کے ساتھ گودام میں بھردی گئی تھیں۔ ان کو بھی اس عہد قدردانی میں نکلوایا گیا ہے اور پورے سلیقے سے ان کی نمائش کی گئی ہے۔ لکڑی کی کرسیاں بہت آرام دہ ہیں۔ ان کے معیار کی کرسیاں اب نہیں بنتیں۔ ان ہی یادگاروں میں وسط انیسویں صدی کے دو عجیب قسم کے پستول اور بندوقیں بھی ہیں جو جنرل جان جیکب نے جنگوں میں جیتی تھیں

جیکب آباد سے سڑک کے راستے ہم کاشمور روانہ ہوئے جہاں سابق سندھ کی شمالی سرحد پر گڈو بیراج تعمیر ہو رہا ہے۔ ۱۱۰ میل کے اس راستے میں زمین زرخیز تھی شکارگاہیں بھی تھیں سیم اور تھور سے تباہ شدہ ہزاروں ایکڑ کا رقبہ بھی دیکھا جو زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ بیماری اور روگ انسان اور جانوروں کیلئے ہی نہیں زمین کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ اور جس طرح ایک فرد کی بیماری سارے گھر کی خوشیوں کو اداسی میں بدل دیتی ہے۔ اسی طرح زمین کو تباہ کر دینے والی سیم اور تھور کا "مرض" قوموں کو خوشحالی سے محروم کر دیتا ہے۔ بہرحال "حکمت" ہر روگ کی دوا مہیا کرتی ہے اس خرابی سے بھی نجات دلانے کا ذریعہ ہے۔ بہت سے ماہر سیم اور تھور کا جائزہ لے رہے ہیں۔ تاکہ اصل بات معلوم ہو سکے۔ اس کے بعد موجودہ حکومت اس کا صحیح علاج کرے گی یعنی ٹیوب ویل لگا کر یا سمندر تک نالیاں بنا کر اس خرابی کا سدباب کرے گی۔ ہمیں اس سفر میں ہی معلوم ہوا کہ غیر ملکی ٹیمیں سیم اور تھور سے تباہی کا سروے کر رہی ہیں۔ ان کی رپورٹ ملتے ہی حکومت انسدادی تدابیر پر عملدرآمد شروع کر دے گی۔

جیکب آباد سے کاشمور تک ہمیں بہت سے بلوچ قبائل نظر پڑے ہم ان لوگوں سے ملے ان میں قدیم نظریات کے حامی بزرگ بھی تھے اور جدید تعلیم سے بہرہ ور نوجوان بھی۔ یہ سب کے سب اسلامی اخلاق کے حامل، نہایت سادہ، دلیر اور صاف گو تھے۔ ہر جگہ ہمارا خندہ پیشانی سے استقبال کیا گیا اور معمولی گاؤں میں بھی خاطر تواضع سے زیر بار احسان کیا گیا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم مدارات سے زیادہ معلومات کے لئے ادھر اُدھر کا سفر کر رہے ہیں تو ان میں سے ایک شخص کندھے پر کلہاڑی لئے ہوئے اونٹ چرانے والا اور ایک تعلیم یافتہ ممبر بلیادی جمہوریت سب ہی ہماری مدد کو تیار ہو گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ہمیں پتہ چل گیا کہ کھیتوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بظاہر پرسکون زندگی گذارنے والے یہ سرخ و سفید رنگت کے گرانڈیل اور توانا بلوچ کس قدر جیالے، کیسے سمجھدار اور معاشی تگ و دو کے کس قدر خواہاں ہیں۔ ان لوگوں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ جیکب آباد بلوچستان کے علاقہ میں شامل نہیں مگر قدیم سے سندھ کا یہ سرحدی ضلع بلوچوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ جمالی جکھرانی۔ ڈومبکی۔ کھوسو۔ معرفانی۔ رند۔ بنگلانی۔ چانڈیو اور دو جنوں دوسرے بلوچ قبائل اپنے قدیم رسم و رواج کے ساتھ اسی ضلع میں رہتے بستے چلے آئے ہیں۔

راستے کے مناظر دیکھتے ہوئے ہم گڈو بیراج تک پہنچ گئے جو زیر تعمیر ہے۔ ہمارے ذہن وہاں کام کرنے والی دیوہیکل مشینوں اور ان پانچ ہزار کارکنوں کی طرف منعطف ہوئے جو ۲۴ گھنٹے بیراج بنانے میں مصروف ہیں۔ یہاں ہمیں بتایا گیا کہ یہ بند جون سنہ ۱۹۶۲ء میں مکمل ہو جائے گا۔ اس کے دائیں کنارے پر دو نہریں سندھ بیگاری اور صحرائی نہر کہلائیں گی۔ اور بائیں کنارے پر ایک نہر گھوٹکی فیڈر ہوگی۔ اس بیراج کی تکمیل سے خیرپور ڈویژن کی ۲۶ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہو گی۔ دریائے سندھ پر مغربی پاکستان میں یہ پانچواں اور سب سے بڑا بیراج ہوگا جس کے ۶۵ پشتے ہوں گے۔ اور ہر دروازے میں خودکار آہنی دروازہ ہوگا جو بند ہو کر پانی کو روک سکے گا۔ اور اٹھ کر پانی کو راستہ دے سکے گا۔ فولاد کے یہ دروازے جن کی درآمد پر کروڑوں روپیہ صرف ہوتا تھا کراچی شپ یارڈ ورکشاپ میں تیار ہو رہے ہیں۔ جہاں تیاری کے بعد ان کا عکس ریز XRAY بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کا معیار غیر ملکی فولادی دروازوں سے کہیں بلند ہے اور یہ صدیوں تک کام دے سکیں گے۔ جس وقت ہم بیراج پر پہنچے تو ۶۵ میں سے ۴۶ پشتے تعمیر ہو چکے تھے۔ اور ایک میں فولادی دروازہ بھی لگایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں کنارے کی دونوں نہروں کے ہیڈورکس اور کنٹرول سسٹم پر کام پورے زور شور سے جاری تھا۔ ان دونوں مقامات پر بھاری مشینوں کی ضربات سے فولاد کی چادریں زمین میں نصب کی جا رہی تھیں۔ فلک بوس کرینیں بہت دور سے کنکریٹ کا مسالہ سینکڑوں ٹن کے حساب سے لا لا کر ڈال رہی تھیں اور بجلی کے ذریعہ پمپ کی راہ سے گھلا ہوا سیمنٹ دور دور سے یہاں پہنچ رہا تھا۔

غرض تعمیراتی کام کا عجیب منظر سامنے تھا۔ اس عمل میں وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ذرا سی تاخیر خرابی کا باعث ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آدمی پوری سمجھداری سے اور مشینیں بڑی برق رفتاری سے کام کر رہی تھیں۔ جس جگہ بیراج تعمیر ہو رہا ہے وہاں دریائے سندھ بہتا تھا۔ یہ دریا اکثر بپھر جاتا ہے اور یکدم رُخ بدل دیتا ہے مگر اب دریا کو بائیں کنارے پر ڈیڑھ میل دور دھکیل دیا گیا ہے تاکہ یہ ۵۴۴۴ فٹ لمبے زیر تعمیر بیراج پر حملہ نہ کر سکے۔ دریائے سندھ اور زیر تعمیر بیراج کے درمیان ملک کا سب سے بڑا حفاظتی بند ہے۔ بیراج کی تکمیل کے بعد اس سرکش دریا کو پاکستانی انجینئر سدھائے ہوئے جانور کی طرح پکڑ کر لائیں گے اور بیراج کے اندر سے اس کی تین نہروں میں اس کی رفتار اور بہاؤ کو اپنے قبضے میں لے آئیں گے۔ دریائے سندھ کے رُخ بدلنے کی تاریخ بڑی ہولناک اور دلچسپ ہے مگر اس پانچویں بیراج کی تکمیل کے بعد مغربی پاکستان میں کالا باغ سے (جہاں یہ پاکستان میں داخل ہوتا ہے) کیٹی بندر تک (جہاں یہ سمندر میں جا گرتا ہے) اس دریا کی تندی دائرۂ اختیار و ضبط میں آجائے گی اور تباہ کاریاں ختم ہو جائیں گی۔

۷۰ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہونے والے آبپاشی کے اس منصوبے کا خوب اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد ہم لوگ سکھر واپس آگئے۔ جہاں ہم ثقافتی اور قومی سرگرمیوں کے مرکز، المہران میں داخل ہوئے یہاں گورنر مغربی پاکستان نے "سوال و جواب" کی ایک نہایت مفید و دلچسپ صحبت میں شرکت فرما کر ہمیں بہت سے مسائل کی آگہی بخشی۔ دراصل اس طرح کے جمہوری اجتماعوں کی ابتدا فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاک جمہوریت نامی اسپیشل ٹرین کے سفر سے کی تھی اور عوام کو بالکل آزادانہ سوالات کرنے کی اور جوابات حاصل کرنے کی اجازت دی تھی۔ جو اُن کی ہر دلعزیزی اور عوام دوستی کی عکاس ہے اور اس طرح عوام سے قریب تر آ کر ان کے مسائل اور مشکلات کو براہ راست سمجھنے کی ایسی مبارک کوشش تھی کہ جس نے بہت جلد ملک میں ایک نئی فضائے اعتماد پیدا کر دی۔

"المہرآن" اہلِ سکھر کی ترقی کا نشان ہے۔ جہاں ایک وسیع میدان کے گرد پختہ احاطہ ہے۔ خوبصورت مستقل اسٹیج بھی ہے۔ بیٹھوں، فنکاروں یا خطیبوں کے لئے تیاری کے کمرے وغیرہ بھی بنائے گئے ہیں۔ "مہران" سندھی میں دریائے سندھ کو کہتے ہیں۔ یہ نام دراصل عربوں نے دیا تھا۔

ان اجتماعوں میں عوام کے نمائندے یعنی بنیادی جمہوریتوں کے اراکین، سرکاری افسران و ملازمین اور دیہات کے ہزاروں آدمی شریک ہوتے رہے۔ گورنر مغربی پاکستان، ملک امیر محمد خان، نے سب سوالوں کا جواب بہت برجستگی، سلاست اور خلوص نیت کے ساتھ دیا جس سے عوام کو اپنی مشکلات کے پیش کرنے اور ان کے حل کی فوری تدابیر سامنے آگئیں۔ چونکہ اعلیٰ حکام گورنر کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو فوری احکام اور تعمیل امور کی ہدایات ملتی رہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے عوام اور کم پڑھے لکھے لوگ اور اہلِ دیہات دارالحکومت تک طویل طویل سفر کرنے یا خط و کتابت کرنے کی زحمت سے بچ گئے۔ ان اجتماعوں کی افادیت مسلّم ہے۔ اہلِ ملک سے براہِ راست رابطہ پیدا کرنے اور ان کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے مخلصانہ اور عملی تدابیر سوچنا اور اکثر اوقات بروقت فیصلے کرنا اس دور کی ایسی برکت ہے جسے ہر جگہ سراہا جا رہا ہے ؛

سندھی ظروف پر نقوش

ابوالجلال ندوی

گزشتہ پانچ چھ برس کے دوران "ماہ نو" میں مولانا ابوالجلال ندوی کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں قدیم عراق اور سندھ کے نسلی، تہذیبی اور ثقافتی اشتراک کے قرائن پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تمام اپنی نوعیت کے اولیں مضامین تھے۔ حال ہی میں شکاگو یونیورسٹی کے ایک امریکی فاضل، پروفیسر جارج یو، پاکستان آئے اور انہوں نے بھی سندھ اور سمیریا کے متعلق ایسے ہی خیالات ظاہر کئے۔ کیا عجب ہے کہ مشرق و مغرب کے محققین کی یہ کاوشیں نوع انسان کے اس دورِ کہن اور اسکے ساتھ سندھی مہروں کی زبان اور رسم الخط کو اجاگر کرنے میں مدد دیں۔ بہرحال اس سلسلہ میں پیشقدمی کا شرف ایک پاکستانی محقق ہی کو حاصل رہے گا جس کے نتائج تحقیق "ماہِ نو" کے ذریعہ سے پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ بہ اجازتِ مصنف مضمون میں اختصار سے شاید عبارت کسی قدر بدل گئی ہو۔ (مدیر)

قبل ازیں ہم "ماہ نو" کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۰ء میں اس زبان بے زباں کو سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں جو بلوچی ظروف پر نقوش کی شکل میں ثبت ہے۔ ایسے ہی نقوش یا تحریریں اُن قدیم سندھی ظروف پر بھی پائی جاتی ہیں جو ہڑپا، موئن جو دڑو اور چنہو دڑو میں دستیاب ہوئے ہیں۔ چونکہ سندھی ظرف اور ظرف پارے ہوں یا سندھی مہریں، ان سب پر کچھ نقوش یا تحریریں پائی جاتی ہیں۔ اسلئے ہم زبانِ تحریر سے واقف ہوں یا ناواقف، بعض الفاظ کے مطالب یا ان مطالب کی نوعیت سے ہم ان ظروف اور مہروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح زبانِ تحریر کے تعین میں جو دشواریاں حائل ہیں وہ کچھ کم ہو سکتی ہیں۔

موئن جو دڑو میں کچھ ایسے ظروف اور ظرف پارے بھی ملے ہیں جن پر براہمی رسم خط کی تحریریں ہیں۔ ان سے فی الحال ہمارا سروکار نہیں میکے نے اپنی تصنیف "FURTHER EXCAVATIONS AT MOHENJADARO" کی پلیٹ نمبر XXI پر اس عہد کے سات ظروف کی تحریریں نقل کی ہیں جن میں سے تھ کو آنجہانی این۔ جی مجمدار پڑھ چکے ہیں۔ اور انہوں نے ان کی قرائتیں اور ترجمے بھی درج کئے ہیں۔ ظروف کو تختۂ تحریر کے طور پر استعمال کرنے کا رواج عہد قدیم سے بودھی زمانہ تک پایا جاتا ہے۔ ان بودھی ظروف کی قرأتوں پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہے کیونکہ اس سے ان الفاظ کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے گا جو قدیم سندھی ظروف پر تحریر ہیں۔ مثلاً

۱۔ ایس ڈی (سندھ)	۲۷۴۰	43≷ hn
۲۔ ایس ڈی	۲۷۹۱	33≷hnn)U
۳۔ ایس ڈی	۲۸۵۶	4ɸ≷hn4 hf n<->

پہلے ظرف پر ایک، دوسرے پر دو اور تیسرے پر تین الفاظ تحریر ہیں۔ پہلے نوشتے کو مجمدار نے یوں پڑھا ہے:

PRAWJITASA = ... OF THE ASCETIC

پہلے ظرف کا آخری نقش n تیسری تحریر کے پانچویں نقش n کی بدلی ہوئی صورت ہی ہے۔ n کو رومن S سے مشابہت ہے۔ "پری ہسٹارک انڈیا" صفحہ ۱۰۳ پر گلی کے ایک ظرف کے نقوش دیکھئے۔ اور پھر بلوچی ظروف کے نقوش "ماہ نو" بابت جون ۱۹۶۰ء میں ملاحظہ فرمائیے۔ S قدیم سندھی رسم خط کا ایک نقش ہے۔ ہنری فیلڈ کی کتاب "AN ANTHROPOLOGICAL RECONNAISSANCE IN WEST PAKISTAN 1955" کے صفحہ ۲۷۵ پر بہاولپور کے سماتِ ابل یعنی اونٹوں پر داغے ہوئے نقوش میں سے نقش ۳۸ کو دیکھئے۔ یہ نقش وادیٔ سندھ کی وہ میراث ہے جو آج تک مستعمل ہے اگرچہ اسکے استعمال کرنے والے نہیں جانتے کہ یہ کس مطلب یا آواز کی علامت ہے۔ چونکہ n کو بعض سکوں پر انگریزی لفظ of کا مترادف پایا گیا اور سنسکرت میں sya پالی میں sa حرف اضافت ہے، اسلئے اس کو s کی آواز دی گئی۔ ظروف نمبر ۲ اور ۳ کے پہلے

چار نقوش کو بَہ دَجیتا پڑھ کر اس کا ترجمہ THE ASCETIC یعنی سنیاسی، تیاگی یا جوگی کیا گیا ہے۔ ان ظروف کی بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ عہد قدیم کے ظروف پر ان کے مالکوں کے القاب، خطابات یا پدویاں مکتوب ہو سکتی ہیں۔

ظرف نمبر ۲ کا آخری لفظ لا((ہے جس کا حرف اوّل (پہلے لفظ کے آخری حرف ᑎ سے ملحق ہو گیا ہے۔ براہمی نقوش کو حل کرنے والوں نے ان کی جو آوازیں تحریر کی ہیں ان کے مطابق لا((کا رومن حرفِ بدل TTP ہے۔ چونکہ یہ رسم خط جس زبان کو قلمبند کرتا ہے اس کے مطابق لا((ایک بے معنی لفظ ہے، اسلئے فاضل قاری نے اس لفظ کی قرأت چھوڑ دی ہے۔ اس کا تلفظ جو کچھ بھی ہو بہرحال ...... سنیاسی کا لا((" ایک ظرف پر مکتوب ہے۔ اسلئے صریحاً یہ لفظ اس ظرف کا نام ہے جس پر یہ تحریر منقوش ہے۔ لا((کے دونوں نقوش قدیم سندھی کے نقوش ہیں۔ لا کے لئے دیکھئے مادھو سروپ وتس کی شائع کردہ ہڑپا کی مہر نمبر ۱۷ اور ((کے لئے مہر نمبر ۱۶۹ کا پہلا نقش۔

تیسرے ظرف کی تحریر کو "بَہ وَجیتا سنا منکا سا اِما" پڑھ کر یوں ترجمہ کیا گیا: "سنیاسی مکتا کا کے پینے کا برتن"۔ > کو ‹ کی بدلی ہوئی صورت خیال کر کے >-= کو IMA پڑھا گیا۔ > اور !! قدیم سندھی رسم خط کے نقوش ہیں۔ ممکن ہے لا((اور > !! قدیم سندھی الفاظ ہوں جو کوشانی دور تک کی سندھی تحریروں میں مستعمل رہے ہوں۔

اب ان سات ظروف میں سے تین اور کو لیجئے:۔

۴۔ ایس ڈی ۲۷۳۷ : ʎ‹ʎ 98)ûı))=

۵۔ ایس ڈی ۲۹۵۱ : ɾ94ʎɛʃtⅎɣ ᴧ ɟᴛ

۶۔ ایس ڈی ۲۷۳۸ : ʎ3ɺƐʎᴧ=-ɂɟɟɟ=--

نمبر ۴ اور ۵ کے پہلے تین حرفوں کو بھداتا پڑھ کر ترجمہ BHADATA یعنی تقدس مآب کیا گیا ہے۔ نمبر ۴ کے چوتھے اور پانچویں نقوش کو ملا کر بدھا پڑھا گیا ہے۔ نمبر ۵ کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے نقوش کے رومن حروفِ بدل SH . R . K ہیں۔ لیکن انہیں نہ معلوم کیوں (SGHA) RAKSHA پڑھا گیا ہے۔ اسی طرح خبر نہیں کس وجہ سے نمبر ۴ کے آخری لفظ ((اُ) کو RAAKSHITASA پڑھا گیا ہے۔ نمبر ۵ کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں نقش کو رکشتا پڑھا گیا ہے۔ غالباً ع (ش) ہی کو ᑫ (کش) خیال کیا گیا ہے۔ بہرحال منقول قرأت اور ترجمہ حسب ذیل ہیں:۔

نمبر ۴۔ بھداتا بدھا رکشتا سا = تقدس مآب بدھا رکشتا کا۔

نمبر ۵۔ بھداتا (ساگھا) رکشا سا ایا کار (کی) = تقدس مآب سگھا رکشتا کے پینے کا برتن۔

نمبر ۶۔ تاسا (ساگھا) رکشتا سا اِدکاراکی — یہ ہے سگھا رکشتا کے پینے کا پیالہ۔

ان تحریروں سے معلوم ہوا کہ ظروف پر حسب ذیل نوعیت کے الفاظ ملیں گے:۔

(۱) مالک یا صانع کا نام یا ظرف

(۲) ظرف کا نام

(۳) ظرف کا مصرف

(۴) اس چیز کا نام جس کے لئے ظرف مخصوص تھا۔

قدیم تر عہد کے ظروف پر بھی اسی نوعیت کے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ اگر قدیم ظروف پر لکھے ہوئے الفاظ ہم کو ان تحریروں میں ملیں جن کے نیچے کسی جانور کو مع ظرف پیش کیا گیا ہے تو ہم وثوق سے یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ وہ تحریریں یقیناً اس ظرف سے تعلق رکھتی ہیں۔

ساتواں ظرف نمبر ایس ڈی ۳۰۸۸ ہے جس پر تین نقوش ہیں: ان میں سے ایک تو براہمی خط میں ملتا ہے اور باقی دو نہیں ملتے۔ اسلئے مجومدار اس کی تحریر کو نہ سمجھ سکے۔ اور کہہ دیا کہ غالباً یہ بے معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریر کے تینوں نقوش قدیم تر سندھی مہروں کے نقوش ہیں۔ اگر یہ ظرف قدیم نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سندھ کے کمہار بودھی زمانے تک قدیم سندھی رسم خط کے چند نقوش کو استعمال کرتے تھے۔

چنانچہ ان تینوں نقوش کی نظیریں سندھی مہروں پر دیکھئے۔

(۱) = دیکھئے میکے کی شائع کردہ موئن جو دڑو کی مہر نمبر ۳۵۲ کی دوسری سطر کا تیسرا نقش

(۲) = دیکھئے میکے نمبر ۲۴۹ ۱۱۱۱

(۳) D = دیکھئے میکے نمبر ۱۴۸ D E

نقش اول صوتی رمز نہیں بلکہ معنوی رمز یعنی اِیڈیوگراف ہے۔ پیالہ یا جام کی شکل ہے۔ مراد پیالہ یا پینے کا برتن۔ اس کے لئے جو سندھی لفظ لودھی زمانہ میں مستعمل تھا وہ نمبر ۶ کے ذریعہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ (ل — =) یعنی اِدْ۔ جس دور کی چیزوں کے ساتھ یہ تحریر ملی ہے اس کے لوگ اس معنوی رمز کو جن الفاظ کی صورت میں پڑھتے ہوں گے ان میں سے ایک اِدْ ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک عربی لفظ اِداوۃ ہے جس کا مطلب بتایا گیا ہے: اناء صغیر من جلد یعنی ایک چھوٹا برتن چمڑے کا (منجد) یعنی ننھی چھاگل۔ صاحب صراح نے اس کا مطلب مطہرہ (وضو کا برتن) اور آبدستان (ہاتھ دھونے کا برتن) بتایا ہے۔ کو ہم اِدْ یا اداوۃ پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک معنوی رمز ہے۔ اسے کسی ایسے لفظ کی شکل میں بھی پڑھا جا سکتا ہے جو اداوۃ (ظرفِ آب) کا مطلب ادا کرے۔

دوسرا نقش بعد میں متغیر ہو کر ، ، ہو گیا۔ پہلا اور آخری نقش سندھی مہروں پر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ تینوں نقوش مسند کے رسم خط میں سعفص کا حرف اول ہیں جس کا نام سِن یا سین ہے۔ چونکہ مسند بتوسط اسنادہ کے سند سے مشتق ہے اسلئے بدلیل کے ہم کو س یا سن پڑھ سکتے ہیں۔

تیسرا نقش رومن میں ابجد کا چوتھا حرف اور براہمی رسم خط کا دھ ہے۔ اسلئے ہم D کو سد، سدھ، یا سندھ پڑھ سکتے ہیں۔ عربی کا نُون ساکن جب دَ سے پہلے ہو تو عبرانی اور سماتی عربی میں نون ساقط ہو کر دال کو مشدّد کر دیتا ہے۔ ہند کا ذکر سفرِ استر (انجیل) میں ھِدّو کے نام سے آیا ہے۔ اسی کا سندھ کا نام عبرانی اور سماتی میں سِدّ ہونا چاہئے۔ ہیراس نے D کو سِد پڑھ کر سندھ کا مترادف قرار دیا ہے۔ اس کی اس قرأت کی صحت مشکوک ہے لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ سندھ کا ڈراوِڈی تلفظ سِد ہے۔ اسلئے ہم ایس ڈی ۸۸۔۳۰ کو یوں پڑھ سکتے ہیں:۔

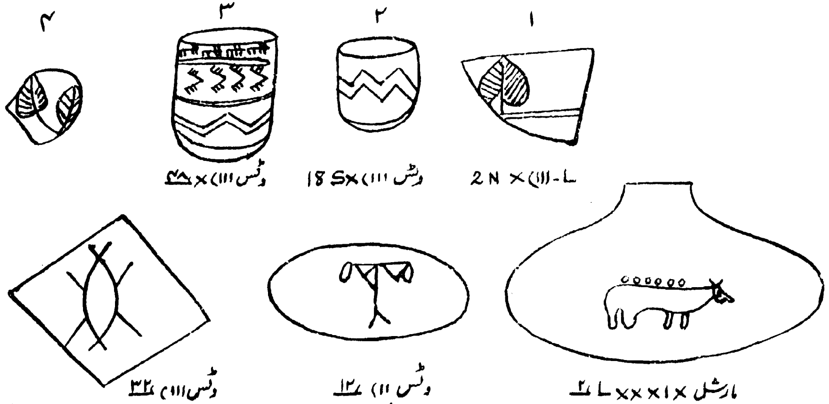
D

سد	اداوۃ
سندھ کا	پیالہ

اگر یہ قرأت صحیح ہے (اور مجھے اس کی صحت میں شبہ نہیں) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدمائے سندھ اپنی مصنوعات پر مقام صنعت کے نام بھی لکھا کرتے تھے۔ ان نقوش کو بے معنی قرار دینے سے کوئی نہ کوئی توجیہہ بہرحال بہتر ہے۔ اور یہ نقوش اور سندھی مہروں کے مقابلے سے یہ توقطعاً ثابت ہو گیا ہے کہ ایس ڈی ۸۸۔۳۰ اگرچہ بعد کے دور کا ظرف ہے لیکن اس کا نوشتہ زمانہ ماقبل تاریخ کے سندھی رسم خط کا نوشتہ ہے۔ سندھ کے کمہار سمجھ بوجھ کر یا نقوش کے معنی کو سمجھے بغیر اپنی مصنوعات پر قدیم موروثی تحریریں اسی طرح لکھا کرتے تھے جس طرح عرب اور بہاولپور کے شتربان نقوش کے رموز کو جانے بغیر اپنے اونٹوں پر قدیم سمات O، S، Q، +، E، J، S، 6، 8، 8 وغیرہ داغتے رہتے ہیں۔ عربی اونٹوں کے سمات ہو بہو یا معمولی فرق کے ساتھ سندھی مہروں پر بکھرے ہوئے ملیں گے۔ یہ نقوش مختلف ابجدوں کے حروف بھی ہیں لیکن ان کا اونٹوں پر مکتوب ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ کبھی معانی و مطالب کے رموز بھی تھے۔ ان نقوش کا سندھی مہروں اور بہاولپور کے اونٹوں پر پایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ قدیم رسم خط اس دیار میں مدتوں رائج رہا۔ ان نقوش کے معانی اور تلفظ تو دماغوں سے محو ہو گئے لیکن ان کی ظاہری صورتیں لوگوں نے قدیم تبرک کے طور پر محفوظ رکھی ہیں۔ لہٰذا D کو جو لودھی عہد کے ظروف پر مکتوب ہیں، عہد ماقبل تاریخ کے رسم خط کی تحریر باور کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بہرحال ایسا خیال کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں۔

بعض سندھی ظروف پر بظاہر تحریریں نہیں بلکہ اشیاء کی شکلیں ہیں جو ممکن ہے آرائشی بھی ہوں۔ ایسے ظروف کو ہم مصور ظروف کہیں گے۔

بعض ظروف کی تصویروں سے ہمیں سندھی مہروں کے الفاظ کے معانی سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔



ظرف پارہ نمبر۱ اور ۴ پر پتے کی صورت ہے۔ اس کو محض آرائشی خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ مہروں کے نوشتوں میں بھی اسی شکل سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے نوشتوں کے نیچے چوپایہ کی صورت بھی ہے۔ لہٰذا ہم ان نوشتوں کو جانور کی خورش سے متعلق تحریریں خیال کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ ممکن ہے ظرف پارہ ۱، ۲۲ ایسے ظرف کا ٹکڑا ہو جو ساگ پات کے استعمال کے لئے مخصوص ہو۔ ہیراس، جس کا گمان یہ ہے کہ مہروں پر دراوڑی الفاظ مکتوب ہیں، نے اسے پیپل کا پتہ خیال کیا ہے اور اس کو آرامرم پڑھا ہے۔ اس نقش کو پان بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے کسی خاص درخت کا پتہ نہیں بلکہ صرف پتہ اور ساگ مراد ہو۔ پیپل کا پتہ انسانی خورش میں داخل نہیں۔ چونکہ یہ نقش انسانی خورش کے لئے مخصوص برتن کے ٹکڑے پر ملا ہے۔ اسلئے اسے آرامرم پڑھنا غلط ہے۔ جس ظرف پر یہ مکتوب تھا اغلباً ساگ پات اور ترکاری کا برتن ہوگا۔

ظرف ۲ کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیالی ہے۔ نمبر۳ بھی پیالی ہے۔ ان دونوں میں کوئی چیز پی جاتی تھی۔ پہلے پر ⩘⩘ مکتوب ہے۔ مصری ہیروغلافی میں یہ پانی کی صورت ہے اور مصری پڑھنے والوں نے اسے کبھی نو پڑھا ہے اور کبھی مو۔ اس رمز کو جنوبی عرب کی سبائی زبان میں مو اور متداول عربی میں ماء پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ پانی پینے کا برتن ہے۔ اس نقش کو سندھ کے قدیم باشندے جس لفظ کی صورت میں بھی پڑھتے ہوں، اس کا ایک تلفظ خود اس ظرف کا نام بھی ہوگا۔ بودھی یا کوشانی عہد کی تحریر نمبر۳ سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس زمانے کے سندھی پانی پینے کے اس برتن کو، جسے ہم آبخورہ کہتے ہیں ... اِنا کہتے تھے۔ یہ نام عربی ماء سے ملتا جلتا ہے۔ ⩘⩘ سے ملتے جلتے نقش سے سندھی مہروں میں بھی کام لیا گیا ہے۔ ظرف ۲ اگر واقعی اِما کہلاتا تھا تو ⩘⩘ اور ⩘⩘ جیسے نقوش کو ہم کلمن کے حرف سوم کی صورت میں پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ یہ قرأت نوشتوں کو بامعنی قرار دے سکے۔

ظرف نمبر۳ کے اوپری دوہرے خط پر چوپایوں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے نیچے اس ⋚ شکل کی تکرار ہے۔ میکے نے چنہوداڑو کی مہروں کے نقوش کو اپنی چنہوداڑو سے متعلق کتاب کی پلیٹ ۱۷ نمبر۲۱ پر ... مکتوب دکھایا ہے۔ اس تحریر کے نیچے یک سنگھے بیل کی تصویر ہے جس کے سامنے ... رکھا ہوا ہے۔ ان میں سے اوپر کا نقش آپ کو مارشل (VIII ×) ۱۷ اور نیچے کا ہنٹر M ۲۰ میں جانور کے سامنے ملے گا۔ یہ نقش درحقیقت دو نقشوں کا مجموعہ ہے: (۱) ▦ یعنی چارہ کی ٹوکری اور (۲) ۷ یعنی پانی کی ناند۔ چن (چنہوداڑو) ۱۷ / ۲۱ میں ▦ کی حقیقت بتائی گئی ہے کہ یہ چارہ کی ٹوکری ہے جس کا مفہوم ادا کرنے والا نقش ...، ...، ۷ اور ... بنا۔ ظرف ۳ چوپایہ کا ⩘⩘ پینے کا برتن ہے۔ یہ نقش ⩘⩘ (ما) کا عکس اور سبائی رسم خط میں شرب (پینا) شُربہ (پینے کی) چیز کا حرف اوّل ہے۔ ظرف ۲ محض پینے اور ظرف ۳

دودھ پینے کا برتن ہے۔

ظرف ۵ پر چوپایہ کی تصویر ہے اور ظرف کی صورت اُسے تِبھری (دودھ دوہنے کا برتن) ظاہر کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ حیوانات سے حاصل کی جانے والی دوسری خورش یعنی گوشت پکانے کا برتن بھی ہو۔

ظرف ۶ کا نقش دراصل [نقش] کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ہمارا تختۂ نقوش اس حقیقت کو ظاہر کردے گا۔ یہ ایک شخص کی تصویر ہے جو اپنے کندھے پر ایک لٹھ رکھے ہوئے ہے جس کے دونوں سروں پر رسّیاں بندھی ہوئی ہیں اور ان رسّیوں سے دو گھڑے بندھے ہیں۔ ان گھڑوں میں کیا ہے؟ دانہ یا پانی۔ اس کا جواب میکے ۵، ۲ کا مہر نویس یوں دیتا ہے: [نقوش] اس کی تشریح کے لئے میکے ۱۱ × ۱۲۷ دیکھئے جس پر [نقش] کے بائیں جانب [نقوش] لکھا ہے۔ [نقش] والی چیز ہے۔ [نقش] جب لاحقہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے "والی چیز" چنانچہ [نقوش] کے معنی ہیں "مچھلی والی چیز"۔ اس طرح [نقوش] کے معنی ہیں پانی لادنے والا۔ یہ بیل کی تصویر پر مکتوب ہے۔ بیل پر پانی مشکیں لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا تھا۔ [نقوش] الفاظ و اصوات کا رمز نہیں بلکہ مطلب و مراد کا رمز ہے۔ [نقش] پانی اور پانی والے کا رمز ہے۔ ظرف ۶ پانی رکھنے کا ظرف ہوگا۔

ظرف ۷ پر [نقش] مکتوب ہے۔ مارشل ۹۳ پر چوپایہ کے سامنے [نقش] کے بجائے اس نقش کو اور اس کے نیچے ایک اور رمز مراد رکھا گیا ہے۔ سندھی مہروں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسم ظرف ہے۔ غالباً یہ نقش [نقش] اور [نقش] کا مجموعہ ہے۔ مچھلی کی شکل سے مہروں میں اس کثرت سے اور اس طرح کام لیا گیا ہے کہ اس کو رمز معنی ہی نہیں بلکہ رمز صورت بھی خیال کرنا ضروری ہے۔ [نقش] سبائی مسند کی عق ہے اور عربی نامت کا نصف ہونے کی وجہ سے نون (مچھلی) ہے۔ [نقش] کو ہم سطن پڑھ سکتے ہیں۔ عرب پانی کی چھاگل کو، جو پرانی ہوگئی ہو سطن کہتے تھے۔ سندھی ہر ظرف کو [نقش] کہتے تھے۔ میکے ۱۱ ۷ L ۳۵ پر [نقش] مکتوب ہے۔ یہ نقش دو مہروں پر بھی ہے مگر میں اس نقش کی حقیقت ابھی تک متعین نہیں کرسکا ہوں۔

وٹس ۱۱ ۱۶۷: [نقش]: یہ نقش اس ظرف پارہ کے علاوہ کسی اور جگہ نظر سے نہیں گذرا لیکن [نقش] اور [نقش] جدا جدا ملتے ہیں۔ اگر یہ نقش ان دونوں کا مرکب ہے تو ان نقوش کی حقیقتیں معلوم کرنے کے بعد اس کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر یہ ایک شخص ہے جو [نقش] کا پھل لئے ہوئے ہے تو یہ ظرف پھل پھلاری اور میوہ کے استعمال کے لئے تھا۔

۸ - وٹس ۱۱ ۳۹ [نقوش]

۹ - میکے ۱۱۱ × L ۸ [نقوش] — دیکھئے ۵" ۱۵ [نقوش]

۱۰ - میکے ۱۱ ۷ L [نقوش] — دوسرے لفظ کے لئے دیکھئے میکے ۱۵۲/۸ [نقوش] نقوش

ظرف ۸ کی تحریر ۸ کے نقش اول اور ۸ کا مجموعہ ہے جو نقش [نقش] کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ [نقش] اور [نقش] کے معنی ہیں [نقش] والی چیز۔ [نقش] کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ مہریں دیکھئے:-

میکے ۱/ ۵۱، میکے ۱۰۸، میکے ۳۴۲ [نقوش] — ان تینوں مہروں کا نقش مشترک دراصل ایک میوہ دار درخت ہے۔ میکے ۱۰۸، ۳۴۲ پر درخت بار ور کے پاس ہاتھ میں عصا لئے ہوئے جو آدمی کھڑا ہے اس سے پوچھئے "اے موسیٰ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"

جواب ملے گا "یہ ہے میرا عصا۔ اس پر میں ٹیک لیتا ہوں، اپنی بکری کے لئے پتیاں توڑتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور بھی فائدے ہیں"۔ میکے کا آدمی ہاتھوں سے چارہ توڑ کر اپنے چوپایہ کے سامنے کی ٹوکری میں ڈال رہا ہے۔ میکے ۱۰۸، ۳۴۲ کا صاحب عصا پتے یا پھل توڑے گا۔ [نقش] کا مطلب چرواہا ہے، چارہ توڑنے والا، پھل توڑنے والا، پھل توڑنے والا۔ [نقوش] وہ چیز ہے جسے درختوں سے توڑا گیا ہے۔ ظرف پارہ ۹ کے کاتب نے ۸ کو [نقوش] بتایا ہے۔ جب ہم اپنا تختۂ نقوش پیش کریں گے تو ۸ کے معنی معلوم ہوجائیں گے۔

Λ، Λ، [نقش]، [نقش]، [نقش]، [نقش] چونکہ [نقش] کی صورت بدلتے بدلتے ناقابل فہم ہوگئی، اسلئے اس Λ رمز کے مدلول کی توضیح ظرف نویس نے رمز مراد [نقش] کے ذریعہ کی ہے۔ اس ظرف کا مصرف وہی تھا جو نمبر ۱ کا تھا۔

ظرف ۔ ۱ کا تیسرا نقش سبائی سندھ کے حرف [نقش] دال سے ملتا ہے۔ اسلئے یہ تحریر رمز معنی اور رمز لفظ دونوں کا مجموعہ ہے۔ [نقش] کا مطلب ابھی بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے کہ [نقش] مالک یا صانع کا نام اور لقب ہو۔

کئی ظروف بے تصویر ہیں۔ میرے خیال میں سندھی مہروں پر تین طرح کی تحریریں اور نقوش ہیں :۔

۱۔ وہ تحریریں جن کے مطالب مختلف طریقوں سے خود مہر نویسوں نے سمجھا دئے ہیں۔

۲۔ وہ جن کے مطالب صرف نقوش کی صورتوں پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ وہ تحریریں جن کو تمام نقوش کی تقویم کے بغیر اور زبان تحریر معلوم کرنے سے پہلے قطعاً نہ پڑھا جا سکتا تھا اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

ظروف کی تحریریں بھی انہی تین اقسام کی ہیں۔ سب سے پہلے آخری قسم کے نقوش کو لیجئے جن میں سے بعض مہروں میں بھی بتکرار آتے ہیں :۔

۱۔ میکے II LX ت ۱ — ΛΛ — یہ نقش صرف اسی ظرف پر ہے اور غالباً Ψ کی بدلی ہوئی صورت ہے

۲۔ وتس II ت ۱۴ — ⋈ — دیکھئے مارشل ۱۶ جانور کی تصویر جانور کے منہ کے نیچے ⋈ [نقش]

۳۔ چن XXVIII — ⋈ — دیکھئے میکے ۲۶۸ جانور مع ظرف ۔ [نقش] ⋈ [نقش]

۴۔ وتس III ت ۸ — [نقش] — میکے ت ۱۲ یک سنگھے بیل مع [نقش] کی تصویر کے اوپر [نقش]

۵۔ وتس II ت ۳ — ⋈ — میکے ۳۷۷ بیل مع ظرف ⋈

۶۔ وتس III ت ۴۴ — V V V [نقش]

۷۔ وتس III ت ۶۴ — V V V [نقش]

۸۔ وتس II ت ۲۳ — [نقش] Λ Λ Λ

۹۔ وتس II ت ۲۶ — [نقش] X X

۱۰۔ وتس II ت ۱۱ — [نقش]

۱۱۔ وتس II ت ۵۶ — X [نقش]

۱۲۔ مارشل ۵۶۰ — [نقش] — لفظ [نقش] مختلف الفاظ کے ساتھ بہتیری مہروں پر ملے گا۔

۱۳۔ میکے II ت ۱۳ (صندوق) [نقش]

۱۴۔ وتس II ت ۲۷ — [نقش]

۱۵۔ وتس II ت ۲۳ و ت ۵۱ — [نقش] >>>>>

۱۶۔ وتس II ۳۳ — III)

۱۷۔ وتس II ت ۱ — [نقش] III

۱۸۔ وتس II ت ۹۱ — [نقش] E

۱۹۔ وتس III ت ۷۱ — III ¦ III

ان میں سے [نقش]، [نقش]، [نقش]، [نقش] اور ¦ کے علاوہ تمام نقوش مغربی ایشیا کے ابجدی نقوش میں ہو بہو یا کسی قدر فرق کے ساتھ ملتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ نقوش ابجدی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب رموزِ اصوات ہیں خواہ یہ مکمل لفظ کو قلمبند کرتے ہوں یا شطر لفظ کو یا

مفرد ابجدی آوازوں کو۔

دوسری قسم کے نوشتوں کے بہت سے نقوش رموزِ معانی ہیں۔ اور تمام مہروں کے نقوش کا مقابلہ کرنے سے ہر نقش کی معنوی قیمت، اور ممکن ہے صوتی قیمت بھی معلوم ہو جائے۔

۲۰۔ وٹس ۱۱۱) ــــ ظرف پارہ شکستہ نقش ناقص

۲۱۔ چن XXXIV ــــ کسی اور مہر پر نہیں

۲۲۔ وٹس ۱۱۱) ــــ پہلا اور تیسرا نقش صرف اس ظرف پارہ پر ملا ہے۔

۲۳۔ مارشل)X ــــ

۲۴۔ وٹس ۱۱۱) ــــ

۲۵۔ چن XXXVIII

۲۶۔ چن LXIX ــــ

۲۷۔ وٹس ۱۱۱) ــــ

۲۸۔ میکے LXIII ــــ

۲۹۔ چن XXXIX و XXXIV ــــ بکثرت عام مہروں پر

۳۰۔ میکے LVII ۴۳

۳۱۔ میکے LII ۲۸

پہلی قسم کے نوشتوں کے لئے زبانِ تحریر کا جاننا ضروری نہیں۔ خود نقوش کی صورتوں اور مہروں کے مقابلہ سے ان کا مطلب ظاہر ہو جاتا ہے۔

مثلاً۔ ۳۲۔ وٹس ۱۱) ــــ مہروں پر دیگر نقوش کے ساتھ

۳۳۔ چن XXXIII) ــــ

۳۴۔ مارشل ۵۵۸ ــــ کئی مہروں پر اور ۱۱۱ بھی

۳۵۔ وٹس ۱۱) ــــ صرف اسی ظرف پر

۳۶۔ مارشل)X ــــ مارشل نے یوں فرض کیا ہے

یہاں نقطے دراصل چارہ کے ریزوں، غلّہ کے دانوں یا پانی کے قطروں کے رموز ہیں۔

وٹس ۱۱) ــــ غلہ رکھنے کا ظرف ہے۔

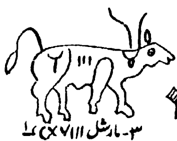
دراصل صورت ظرف ہے۔ وٹس کی ایک بے منظر مہر ہے۔ اس پر مکتوب ہے۔ اس مہر نویس نے کو آبخورے کی شکل پر لکھ کر اسکے مطلب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ بھرے ظرف کی صورت ہے اور یہی مطلب دیتا ہے۔

کے معنی ہیں چارہ، غلّہ یا پانی جو ظرف کے اندر ہو۔ جب سابقہ ہوتا ہے تو لفظ کو اسم ظرف بنا دیتا ہے۔ لاحقہ ہونے کی صورت میں لفظ کو کبھی اسم مظروف بنا دیتا ہے اور کبھی "والی شے" کا مطلب دیتا ہے۔ بھی بھرا ہوا ظرف ہے۔

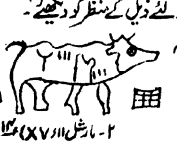
پہلے نقش کو ہم جان چکے ہیں۔ دوسرا نقش جام کی بدلی ہوئی صورت بھی ہو سکتا ہے اور یعنی پودے کی بدلی ہوئی صورت بھی۔ کا ٹھیک مطلب سمجھنے کے لئے ذیل کے منظر کو دیکھئے۔



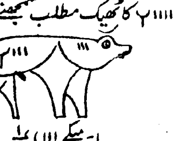
۴۔ مارشل XVII) ــــ



۳۔ مارشل XVIII) ــــ



۲۔ مارشل XVIII) ــــ



۱۔ میکے ۱۱۱) ــــ

۵ - مارشل (XVII) ۱۳ ۶ - مارشل (XVII) ۱۲ ۷ - مارشل (XVII) ۱۰ ۸ - مارشل (XVII) ۱۱

ان مہروں کی دوسری جانب جو تحریریں ہیں ان کو یہاں نقل نہیں کیا گیا۔ ۲ ||| گھڑے کے ٹکڑے پر مکتوب ہے اور جانور کے پیٹ پر بھی۔ اسلئے یہ اس چیز کا نام ہے جو کہ جانور کے پیٹ میں بھی ہو سکتی ہے اور گھڑے کے اندر بھی۔ |||| کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اسلئے اس سے اناج مراد ہے۔ یہ رمزِ معنی ہے۔ اس کو یہ مطلب دینے والے کسی لفظ کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس رمز معنی کے ساتھ ان تصویروں پر حسب ذیل الفاظ بھی ملے ہیں:-

(ا) ۱۲ پر M॥	ان الفاظ کے تمام نقوش مغربی ایشیا کے ابجدی حروف میں ملتے ہیں ۱۱ مصری ہیروغلافی میں کسرہ معروف
(ب) ۱۵ پر HU(	طویلہ کے بجائے ملے گا، ||||| و |||| و ||| و ||، ||، ||،	اور ا۔ بکثرت ایک ہی نقش کے سے پہلے
(ج) ۱۶ پر ◊ ጸ ኂ	ملیں گے۔ ||||| کا لفظ آٹھ لفظوں سے شروع ہوا بتدریج ایک ایک نقطہ گھٹتا گیا اور آخر میں ۲
(د) ۱۵ پر T ꟻ	ہو کے رہ گیا۔ چونکہ مصری میں ۱۱ براہمی میں ॥ اور = رومن حرف نے کے ہم صوت ہیں اسلئے M॥ کے

پہلے نقش کو ہم پڑھ سکتے ہیں۔ ان چار لفظوں کو مغربی ایشیا کے حروف کی مدد سے یم، زبر، فصن اور طو پڑھا جا سکتا ہے۔ ان لفظوں کو عربی زبان ہی با معنی بنا سکتی ہے۔ یجم یم اس نے قصد کیا M॥ ۲||| = خورش کا خواہشمند زبر۔ عربی بذر (دانہ پاشی کی)۔ عربی "یرکموت" کے بجائے عبرانی میں یکرعو ملے گا۔ خود عربی میں بھی اس قسم کے قلب و عکس کی نظیریں ملتی ہیں۔ مثلاً جذب اور جبذ (زبر ۲||||) کے معنی ہیں دانہ پاشی۔ دوسری طرف کی تحریر کو اس موقع پر سمجھانا مشکل ہے لیکن اس کا مطلب ہے "بیل کھیت کو سینچنے والا"۔

فصن کا لفظ عربی میں موجود نہیں لیکن عربی میں عموماً لفظ کے آخر میں آن بڑھایا جاتا ہے جیسے عمران، عثمان، قحطان، کیسان وغیرہ، جنوبی عرب کی سبائی تحریروں میں عمران، ثوبان اور رحمان جیسے لفظ عمرن، ثوبن، رحمن کی طرح لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کو ہم خاصان پڑھ سکتے ہیں۔ ጸ (ص) اور ኂ (س) متبادل حروف ہیں۔ اسلئے فاصان کو ہم فاسان بھی پڑھ سکتے ہیں۔ حرف زائد کو حذف کر کے پڑھئے فاس۔ عربی میں گردن کی اٹھی ہوئی ہڈی کو جذی کہتے ہیں۔ صاحب صراح نے فاس کا ایک مطلب تندی نقا لکھا ہے۔ ◊ ጸ ኂ کو دیکھئے، جانور کی گردن پر مکتوب ہے اور ہم یہ بتا چکے ہیں کہ سندھی مہریں زیادہ تر تعلیمی تختیوں کی نوعیت رکھتی ہیں۔

طو کو عربی طاوِ سے مماثلت ہے۔ طوی کے معنی ہیں بھوک۔ طِوی وہ بھوکا ہے۔ TU||| کے معنی ہیں خورش کا بھوکا۔ اب تک جن لوگوں نے سندھی مہروں کو پڑھا ہے ان میں سے وڈل نے جانور اور سامنے والی طرف کو ⊂ اور ⊕ اور ⊐ اور ◊ اور ⊥ کی آوازیں دے کر الفاظ تعبیر کئے ہیں۔ بعض نے جانور کو دیوتا قرار دے کر قرأتیں تصنیف کی ہیں۔ بعض کے نزدیک تحریر کو اپنے ساتھ کی تصویر سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تحریروں کی قرأتیں تصنیف کی ہیں۔ لیکن سندھی مہروں کو غور سے دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ

تفہمید ند حرفے را کہ گفتی دلے تفسیر ہائے آفریدند

|||ᛘ اور |||ᛉ جیسے الفاظ کبھی تنہا اور کبھی دوسرے الفاظ کے ساتھ ایسی متعدد مہروں پر مکتوب ہیں جن پر تحریر کے نیچے اک سنگھے بیل کی تصویر ہے اور اسکے سامنے ⊞ کا نقش ہے۔ جو کہ ناند پر دھری ہوئی ٹوکری کی صورت ہے۔ یہ تمام نوشتے جانور کی خورش سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۷ - وڈس |||) ۱۱ ⋒ = وڈس ۳۲ دیکھئے، اک سنگھے بیل کا سر اور ظرف ⊞ باقی رہ گیا ہے۔ باقی دھڑ غائب ہے۔ اسلئے تحریر بھی ناقص ہے۔ اس پر مکتوب ہے۔ ⋒ (ریورنڈ ہیراس نے اسکو چینی لفظ ⋒ کا ہم صورت خیال کیا ہے اور اس کا تلفظ یا بتایا ہے۔ اس کا

فارسی ترجمہ ہے بارش، عربی ترجمہ مطر، ہندی برشا اور ڈراویڈی آل۔ موصوف نے زبردستی چینی یا کے ڈراویڈی ترجمہ کو سندھی لفظ فرض کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ رمز صوت نہیں بلکہ رمز معنی ہے۔ ایسے نقوش کا ڈراویڈی میں ترجمہ کر کے زبانِ تحریر کو چین ثمر بتانا زبردستی ہے۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ اور آسمان سے برستے پانی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ کی بالائی قوس آسمان، زیریں قوس بادل اور نقطے پانی کے قطرے کا رمز ہیں۔ بارش کے مفہوم کو ادا کرنے والے کسی لفظ کی صورت میں اس کو پڑھا جا سکتا ہے۔ نمبر ۳۷ پر اس نقش کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ سندھی کمہار اس نقش کو بارش کے بجائے پانی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ابجدی نوشتوں کے ذریعے جب مہروں پر پانی کے لئے کوئی لفظ مل جائے تو ہم اس کو اسی لفظ کی صورت میں پڑھیں گے۔

وٹس ۳۲ کے نقش دوم کی حقیقت سمجھنے کے لئے میکے XI ۵۹ دیکھئے۔ یہ صریحاً ایک تعلیمی مہر ہے۔ مہر نویس نے جانور کے پیٹ پر تین نقوش دکھائے ہیں۔ دو تو صریحاً پتے ہیں جن کو جانور کے پیٹ میں ہونا چاہئے۔ نقش سوم کے لئے میکے II ۵ دیکھئے۔ اس کے درخت کے پتے نقش سوم جیسے ہیں۔ جانور کے سامنے جو چیز ہے اسے مہر نویس نے S بتایا ہے۔ S جو ہماری ی کی اصل ہے ایک ہانڈی کی شکل ہے۔ اس کے اندر دو چیزیں ہیں۔ ایک (جس کی صورت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ نقش بہتے پانی کا رمز ہے۔ دوسری چیز ہے۔ میکے نے اسے اوکھلی یعنی چکی کا رمز معنی قرار دیا ہے۔ ہانڈی کے اندر چکی یا موسل نہیں ہو سکتا سے مراد خورش ہے۔ مہر نویس نے اس مہر کے ذریعے یہی بتایا ہے۔

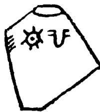
(= سے مراد ہے پانی

= سے مراد ہے خورش

(اور < سبائی مسند میں قرشت کے حرف دوم کی صورت ہے جسے ہم عربی لفظ رَاوٗء (آبِ شیریں) کا حرف اوّل بھی کہہ سکتے ہیں جس سے راوی (سیراب کرنے والا) مشتق ہوا۔ پنجاب کا ایک دریا جو پہلے سندرود کہلاتا تھا بعد میں راوی سندھ بنا اور پھر راوی رہ گیا۔ اس کا نام اس لحاظ سے قابل غور ہے۔ عربی ابجد کے حرف سے مشابہت ہے جو کہ طعام (خورش) کا حرف اوّل ہے۔ آئندہ چل کر یہ رموز معانی رموز اصوات بن گئے۔ چونکہ ایسے شخص کے لئے جس کے سامنے میکے XL ۵۹ نہ ہو (کا مطلب اس کی صورت سے ظاہر نہ تھا، اس لئے وٹس نمبر ۳۲ کے مہر نویس نے اس سے پہلے قابل فہم رمز معنی رکھ کر اس نقش کا مطلب سمجھایا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مہر نویس کا مقصد (کا مطلب سمجھانے کے بجائے کا تلفظ بتانا ہو۔ بہرحال ، (تینوں کے معنی ایک ہیں یعنی "پانی" ممکن ہے تینوں کے تلفظ مختلف ہوں مگر مطلب میں کوئی فرق نہ تھا۔ سوائے اسکے کہ (آئندہ چل کر حرف ہجا R بن گیا۔ اب چند اور نقوش لیجئے۔

۳۸۔ وٹس II ۱۷ مقابلہ کے لئے دیکھئے میکے ۲۵۳

۳۹۔ مارشل LXXVIII



۴۰۔ چن XXXIV

۴۱۔ وٹس II ۱۷

سابقہ ہونے کی صورت میں لفظ کو اسم ظرف بنا دیتا ہے اور لاحقہ ہونے کی صورت میں اسم مظروف۔ اس نقش (۲) کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ظرف کے اندر چارہ دکھایا گیا ہے۔ کے معنی ہیں (۲) کے اندر ڈالی چیز یعنی ۲ جو کہ پودہ کی شکل ہے۔ اسکے معنی ہیں خورش۔ نمبر ۳ کا دوسرا اور تیسرا نقش سورج کی شکل ہے لیکن اس سے مراد سورج نہیں۔ اس کی دو دلیلیں ہیں۔ سورج برتن میں نہیں رکھا جا سکتا۔ سورج ایک ہی ہے۔ دو سورجوں کا کچھ اور مطلب ہو سکتا ہے۔ زبانِ تحریر میں سورج کے لئے جو لفظ تھا وہ کسی خورش کا بھی نام تھا۔ اگر زبان تحریر، جیسا کہ لفظ ۲۱۱۱ کی تشریح میں پیش کی ہوئی مہروں کے چار الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے، عربی کی ہم نسل تھی تو کا ایک نام شارق ہے۔ محمر مشرق کے معنی ہیں گوشت بغیر چربی کا۔ ظرف نمبر ۴ گوشت پکانے کا برتن ہوگا۔

نمبر ۲ کے نقش دوم کے لئے دیکھئے میکے III نمبر ۷ ایک طرف دوسری طرف /////۔ مہر نویس نے کھڑی لکیروں کا مطلب

بتایا ہے۔ [sign] والی چیز یعنی درخت سے حاصل کی جانے والی خورش۔ نمبر ۳۹ خورش کا ظرف ہے۔ نمبر ۳۸ کا مطلب بھی ایسا ہی ہے یعنی [sign] والی چیز لیکن [sign] ہر جانور کی خورش کا نام ہے۔ ثبوت کے لئے دیکھئے (الف) میکے ۶۷۲ کی تصویر پر [sign]

(ب) مارشل ۲۲۸، ۴۸۹، میکے ۵۹۴ [sign] ایک سنگھے کی تصویر پر

(ج) میکے ۴۳، ۷ د [sign] ہاتھی کی تصویر پر

(د) میکے ۶۴۰ باگھ کی تصویر پر [sign]

(ہ) مارشل ۳۸۵ کتے کی تصویر جس کے منہ میں ہڈی ہے اور سامنے بھی [sign]

اس سے معلوم ہوا کہ بیل، ہاتھی، باگھ، کتا ہر جاندار کی خورش کو [sign] کہتے تھے۔ یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مہروں کے کسی لفظ کا مطلب معین کرنے اور اسکو کسی زبان میں پڑھنے سے پہلے مکتوب لفظ کو ہر مہر پر دیکھ لینا چاہئے کیونکہ مہر نویسوں کا طرز تفہیم حسب ذیل تھا:۔

(و) میکے نمبر ۴۰ [sign]

(ز) میکے ۳۲۱ [sign]

(ح) میکے ۵۱ [sign]

دیکھئے ایک مہر پر ایک، دوسری پر دو، تیسری پر تین لفظ ملتے ہیں۔ مطلب تیسری سے جا کر پورا ہوا۔ لفظ [sign] کا مطلب معلوم ہونے پر [sign] کا مطلب بھی معلوم ہو جائیگا۔ بہر حال ظرف ــ کا طلب ہے خورش کا ظرف۔

ولس ۱۱، ۴۹

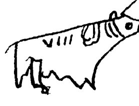
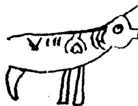
ایک اور مہر ولس ۱۱) نمبر ۴۹ ناقص ہے۔ لیکن ولس کی مہر نمبر ۴۰ کی مدد سے ہم اس کو [sign] پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک گھڑے کی شکل ہے جس میں غلّہ بھرا ہے۔ چونکہ یہ ایک ظرف کے ٹکڑے پر مکتوب ہے۔ اسلئے اس کو نہ صرف خانہ کا مترادف خیال کرنا چاہئے بلکہ ظرف کا نام بھی سمجھنا چاہئے۔ [sign] کا مطلب ہے "بھرا ہوا" اس وقت تک یہ ایک قرین قیاس مفروضہ ہے لیکن اس لفظ کی مہروں پر غور کیا جائے۔ تو یہ امر واقعہ ثابت ہوگا۔ ان کے لئے میکے کی دو مہریں دیکھئے

۴۳۔ میکے LXIII ایک طرف ظرف پر [sign] دوسری [sign]

۴۴ میکے LVIII ــ ظرف پر [sign] خط پر [sign]

ان ظروف کی تحریروں میں سر دست صرف [sign] اور [sign] کو سمجھئے۔ [sign] دراصل [sign] کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اور یہ نام ہے اس چیز کا [sign] (دیکھو ولس ۶۵۰) [sign] بعد میں بدل کر VIII اور VII ہوئے۔ ذیل کی مہروں کو دیکھئے اور مطلب ذہن نشین کیجئے۔ VIII اور VIIII وغیرہ جانور کی ایک خورش کے نام ہیں۔

مارشل (VIIII x) ۱۰ — مارشل (VII x) ۵۰۱ — میکے ۱۱) ۲

ولس ۱۶، ۱۱۱۱

سندھی رسم خط پہلے تشکیلی تھا اور الفاظ کے بجائے معانی و مطالب کی تشکیل کرتا تھا۔ پھر بتدریج رسمی آوازوں کو قلمبند کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ابجدی نوشتوں کی نوبت آئی۔ چنانچہ ظروف کے اوپر بھی ابجدی نوشتے ملے ہیں۔ ذیل میں چند نوشتے پیش کئے جاتے ہیں جن کو پڑھ لینا بہت آسان ہے۔

۱- وِلس (III) ۲۵ ۲ ظرف شکستہ، بعد کے حروف غائب
۲- وِلس (II) ۴۱، ۵۳
۳- وِلس (II) نمبر —
۴- وِلس (II) نمبر ۱۰
۵- وِلس (II) نمبر ۲۴
۶- وِلس (II) نمبر ۴۵

کے علاوہ ان تحریروں کے تمام نقوش مغربی ایشیا کے ابجدی نقوش میں ملیں گے۔ ان کی مدد سے ہم ان تحریروں کو حسب ذیل لفظوں کی صورت میں پڑھ سکتے ہیں :-

۱- فی - اندر (فی کے اور معانی پر بھی دلالت کر سکتا ہے۔ یہ کسی لفظ کا شطر ہجا بھی ہو سکتا ہے)
۲- آن - عربی آئینہ (برتن)
۳- آن ساد - لفظ دوم ساد صرف اسی ظرف پر ملتا ہے۔ عربی سؤر (پس خوردہ۔ جھوٹا کھانا) سے ملتا ہے۔ یہ ظرف ہے۔ جھوٹی چیز رکھنے کے لئے۔
۴- نل - ممکن ہے کسی چیز یا مقام صنعت کا نام ہو۔
۵- ناذ - عربی نذ نذیذ بمعنی پیشاب، نیکٹ، بھوک۔ یہ ظرف آلائشوں کے رکھنے کے لئے مخصوص ہوگا مثلاً طشت یا اُگالدان کا کام دیتا ہوگا۔
۶- طلو - عربی طُلّ - دودھ۔ یہ برتن شیر دان تھا۔
۷- بلیتو - باسی چیز کا برتن - خبز بابت - باسی روٹی۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار برس پہلے وادی سندھ میں کیسی زبان بولی جاتی ہوگی۔

ممکن ہے میری اس رائے کو کہ سندھی ظروف اور مہروں کی تحریر عربی ہے۔ یا اس سے ملتی جلتی ہے، صحیح نہ سمجھا جائے۔ تحقیق کا میدان ہر وقت کھلا ہے۔ اگر قرائن و شواہد میری رائے کی تردید کرتے ہیں تو لامحالہ وہی صحیح ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں طرزِ استخراج شاید محلِ نظر نہ ہو۔ فرض کیجئے ایک تحریر ملتی ہے۔ BIRD کیا اس کو کوئی شخص اردو، عربی، فارسی یا سنسکرت باور کر سکتا ہے؟ ایک حرف شناس جو صرف اتنا جانتا ہے کہ یہ حروف انگریزی کے ہیں اور اسی چیز کا نام ہے جس کی تصویر اس کے ساتھ ہے، کیا آپ اسے کسی بھی دلیل سے اس تحریر کے جاپانی ہونے کا قائل کر سکتے ہیں؟ اگر یہ دلیل ذرا بھی وزن رکھتی ہے تو دیکھئے ۵۹۳ ... کو دیکھئے ... کو ہم نہایت آسانی سے ط ا ر (طئر - طیر) پڑھ سکتے ہیں۔ چڑیا کی شکل ابجدی لفظ طئر کا تلفظ بتاتی ہے۔ اس مہر اور دوسری مہروں پر چڑیا کی شکل کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب دینے کے لئے وہ تمام مہریں سامنے رکھنی ہوں گی جن پر چڑیا کی شکل ... یا ... مکتوب ہے۔ اس لئے اگر محض اوپر پیش کی ہوئی تصویر و تحریر کو انگریزی باور کرنا ضروری ہے تو ... لکھنے والے کی زبان کو ڈراویڈی یا آریائی فرض کرنا کیوں اس قدر ضروری ہے اور عربی یا اس کی مثیل زبان قرار دینا کیوں ضروری نہیں؟

تا بکے بر قولِ این و آں یقیں
چشمِ بینا در سرت داری ببیں

★

"بحر ہے پایاب مجھے" :- بقیہ صہ ۴۳

کیپٹن نے دوربین سے ویدر ٹاور کی طرف دیکھا۔ اور اُسی پوزیشن میں بولا:

" میرا بھی یہی خیال تھا۔ موسم حد سے زیادہ پرسکون ہوگیا تھا۔"

پھر کیپٹن نے دوربین کو اپنی بغل میں دبا لیا۔ اور برج کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولا:

"جہاز میں چار درجے کی لسٹ پیدا ہوگئی ہے۔"

چیف آفیسر نے جواب دیا:

" میرا خیال ہے کھالوں کے بنڈل ڈھیلے ہوگئے ہیں۔ اور چاولوں کی بوریاں پورٹ سائڈ میں کھسک گئی ہیں۔ اور شاید ہچکولوں سے وہ ویٹ بھی ہل گئے ہیں جو ہم نے سٹار بورڈ سائڈ میں شفٹ کئے تھے۔"

یکایک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے پیسنجر بیئر کی ٹین کی چھت اُڑ گئی اور کڑکڑاتی ہوئی سمندر میں گر گئی۔ منورا بیچ کی سیمنٹ کی سڑک پر کوڑے کا ڈرم لڑھکتا ہوا، کھڑکھڑاتا ہوا پیسنجر بیئر کی ریلنگ کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ اور جہاز کے ماسٹ، ڈیرک اور تاروں سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

چیف آفیسر نے کہا:

" کیپٹن، ہم منورے کی لی سائڈ میں ہیں۔ اس لئے ہم کو طوفان کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ ہاربر سے باہر طوفان کی شدت خطرناک ہوگی۔"

کپتان آفندی نے دوربین سے پیسنجر بیئر کی چھت کو دیکھتے ہوئے کہا:

" میں تمام دنیا کے طوفانوں کو جانتا ہوں۔ اور تمام دنیا کے طوفان مجھے جانتے ہیں۔ کوئی طوفان خطرناک نہیں ہوتا۔ طوفان، صرف طوفان ہوتے ہیں۔ طوفان آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ اور جہاز طوفانوں سے لڑتے جھگڑتے ہنستے کھیلتے اپنی منزل کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں۔"

" کیپٹن، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جہاز طوفان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔"

" طوفان کا مقابلہ جہاز نہیں کرے گا، میں کروں گا۔"

" کیپٹن، اس جہاز میں دس درجے کی لسٹ ہے۔ ہم نے اپنی پوری قوت سے کام لے کر آپ کی ہدایت کے مطابق لوڈنگ کر کے اس کی لسٹ رفع کی تھی۔ جہاز برتھ سے بالکل سیدھا ہٹایا گیا تھا۔ اب تیز ہواؤں نے اس میں پھر لسٹ پیدا کر دی ہے۔ اور یہ لسٹ بڑھ رہی ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی یہ لسٹ چار درجے تھی اور اب چھ درجے ہے۔ اگر یہ لسٹ بڑھتے بڑھتے دس درجے ہوگئی تو جہاز کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔"

" اس لئے تم لسٹ کا مقابلہ کرو گے۔ میں طوفان کا مقابلہ کروں گا۔ جہاز کے تمام عملے کو جگالو اور ہولڈ میں اور لوئر ڈیک میں لے جاؤ۔ اور پورٹ سائڈ کے تمام وزن سٹار بورڈ سائڈ سے تاروں کے ساتھ باندھ دو۔ اور جو وزن اس طرح قابو میں نہ آئے اس کو سمندر میں پھینک دو۔ یہ طوفان بینتالیس منٹ رہے گا۔ میرے آدمیوں کو بینتالیس منٹ تک مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اس کے بعد میں دس درجے کی لسٹ کے ساتھ بھی منزل پر پہنچ سکتا ہوں۔"

چیف آفیسر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا:

" یس سر۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

جب وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچ گیا تو کیپٹن نے اُس کو پھر بلایا:

" دیکھو۔"

چیف آفیسر سیڑھیوں کے پاس پلٹ کر کھڑا ہوگیا۔

کیپٹن نے کہا:

" اگر میرے آدمیوں نے اس طوفان کے دوران میں لسٹ کو روکنے کے لئے پوری قوت سے کام نہ لیا تو جہاز بچ نہیں سکے گا۔"

چیف آفیسر نے ایک لمحہ کیپٹن کے پُرتمکنت چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں برج کی ریلنگ پر لٹکے ہوئے لائف بوائے پر چلی گئیں۔ وہ لائف بوائے کے پاس گیا۔ اس نے لائف بوائے کو کھونٹی سے اتارا۔ اور اس کو کیپٹن کے پاؤں کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ سیڑھی کی طرف بھاگا۔

کیپٹن نے کہا:

"تھینک یُو۔"

پندرہ منٹ کے بعد کیپٹن نے میگا فون پر لوئر ڈیک سے خطاب کیا:

"ویل ڈن، چیف۔ لِسٹ ٹھیک ہو رہی ہے۔ ہاربر کے منہ پر پہنچ کر میں جہاز کا کورس ستر درجے سٹار بورڈ کو تبدیل کروں گا۔ اس طرح میں طوفان کا مقابلہ سامنے کی طرف سے کر سکوں گا۔ اور اس کا زور جہاز کے ہیڈ پر لے لوں گا۔ پھر آپ کو توازن قائم رکھنے کے لئے زیادہ دِقّت نہیں ہوگی۔ او۔ کے۔ گڈ لک۔"

ہاربر کے منہ پر طوفان نے لائٹ ہاؤس کی چٹانوں کے پیچھے سے نکل کر جہاز پر اپنی پوری قوت سے حملہ کیا۔ کیپٹن آفندی نے طوفان کے ساتھ سامنے سے لڑنے کے لئے اور جہاز کی سٹار بورڈ سائڈ کو حملے کی زد سے بچانے کے لئے اپنا کورس تبدیل کر لیا۔

"ہارڈ سٹار بورڈ! ہارڈ سٹار بورڈ!" کیپٹن آفندی سٹیئرنگ کیبن کے میگا فون پر چلّایا۔

"ہارڈ سٹار بورڈ، سر۔ ہارڈ سٹار بورڈ، سر۔" سٹیئرنگ وھیل پر کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

جہاز آہستہ آہستہ طوفان کی طرف بڑھنے لگا لیکن طوفانی ہواؤں نے دس دس فٹ اونچی لہروں کو اٹھا اٹھا کر جہاز کے ہیڈ سے پٹخ دیا۔ جہاز اپنے اصلی کورس پر آ گیا۔ پانی اوپر ڈیک پر چڑھ آیا۔ اور پانی کے چھینٹے کیپٹن آفندی کے منہ اور کپڑوں تک پہنچ گئے۔

"ہارڈ سٹار بورڈ"! کیپٹن آفندی میگا فون میں پھر چلّایا۔

"ہارڈ سٹار بورڈ، سر" کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

"جہاز گھومتا کیوں نہیں؟ رڈر چیک اپ کرو۔"

"——یس سر، رڈر جام ہو گیا ہے۔"

یکایک سٹار بورڈ سائڈ پر ہواؤں اور لہروں کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ جہاز ان لہروں اور ہواؤں کے وزن کے نیچے پورٹ سائڈ پر لیٹ گیا۔ جہاز کے تمام وزن گڑ گڑ گڑ گڑا کرتے ہوئے پورٹ سائڈ میں کھسک گئے۔ پورٹ سائڈ پانی میں ڈوب گئی۔ پانی ہولڈ، لوئر ڈیک اور انجن روم کی طرف دوڑا اور جہاز کا پچھلا حصّہ جہاز کے تمام عملے اور سامان کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا۔ پانی کے وزن سے جہاز سیدھا ہو گیا۔ اور اُس کا اگلا حصّہ پچھلے حصے کے مقابلے میں ہلکا ہونے کی وجہ سے سمندر کی سطح سے اونچا اُٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ سمندر کی تہ کی طرف جانے لگا۔

اب جہاز کا اگلا حصہ بھی پانی میں ڈوب گیا ہے۔ صرف برج پانی سے باہر نظر آ رہا ہے۔

کیپٹن آفندی برج کی ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا ہے۔ برج آہستہ آہستہ پانی میں اتر رہا ہے۔ پانی کیپٹن آفندی کی کمر تک آ گیا ہے۔ لائف بوائے اس کے نزدیک ہی تیرتا پھر رہا ہے۔ اور وہ اپنی سفید وردی میں برج کی ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا ہے۔ اور پھر وہ پانی میں اس طرح غائب ہو گیا جس طرح شام کے وقت لمبے دور دراز سفر کے بعد سورج سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

اور سفید رنگ کا لائف بوائے گہرے سیاہ رنگ کے سمندر میں تیرتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سنگِ خارا کے بنے ہوئے مزار پر چنبیلی کے سفید پھولوں کا ہالہ چڑھا ہوا ہے۔

وطن کے سپاہی

(ایک بچے کے قلم سے)

رفعت جاوید

ہمارے یہاں بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک وطن کے سپاہیوں کو جس محبت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں اس کا اندازہ ایک کم سن بچے کی اس بھولی بھالی تحریر سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اس نے اپنے دلی احساسات کا اظہار کیا ہے۔ مدیر

ابھی کچھ دن ہی کی بات ہے کہ میں اپنے کورس میں یہ نظم پڑھ رہا تھا۔

بہ صد ناز و تمکیں، بہ صد کج کلاہی
چلا جا رہا ہے وطن کا سپاہی

اس سے بے اختیار اپنے وطن کے سپاہی یاد آ گئے جن کا دن ہم نے ابھی ابھی منایا ہے اور جو واقعی ہمارے دلی دوست ہیں اور ہم سب کو ان پر ناز ہے۔ کتنے بہادر ہیں وہ! کہانیاں تو سبھی اچھی ہوتی ہیں اور انہیں پڑھ کر خوب لطف آتا ہے۔ مگر جو بات ہمارے سپاہیوں کی بہادری کی کہانیوں میں ہے اس کے کیا کہنے۔ جو مزا ان میں ہے وہ اور کسی میں نہیں ــــ مجھے تو بس ایسی ہی کہانیاں پسند ہیں۔ جی چاہتا ہے انھیں سنتا ہی جاؤں۔ اور اگر یہ کہیں ہاتھ لگ جائیں تو پڑھتا ہی چلا جاؤں۔ محمد بن قاسم ہو یا محمود غزنوی۔ ان کی بہادری کے کارنامے پڑھ کر دل سینے میں بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ اور پھر ہمارے پاکستانی سپاہیوں کے بہادری کے کارنامے تو ایسے ہیں کہ انھیں پڑھ کر آپ ہی آپ سینہ فخر سے تن جاتا ہے۔ دل میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جی کرتا ہے میں بھی بڑا ہو کر اپنے ملک اور قوم کی ایسی ہی سچے دل سے دلیری اور بہادری کے ساتھ خدمت کروں۔ اب جب یوم پاکستان آ رہا ہے۔ وہ دن جب ہم نے اپنی آزادی کے لئے پہلا دلیری کا قدم اٹھایا تھا ــــ ان جاں نثاروں کا ذکر اور بھی ضروری ہے۔ کیونکہ انہیں نے بار بار نازک وقت پر قوم کو سنبھالا اور انہیں کی وجہ سے پاکستان سلامت ہے۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے مجھے اپنے ملک کے بعض جری سپاہیوں کے کارنامے سننے کا اتفاق ہوا جس سے میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور میں ان کی دل ہی دل میں تعریف کئے بغیر نہ رہا۔ ان میں سے ایک بہادر سپاہی تھے کپتان محمد سرور کتنے بہادر، بے باک! اور جو کارنامہ انھوں نے انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بیشک ہمارے ملک کے اس بے نظیر سپاہی کو اپنی جان دینی پڑی۔ اور اس نے یہ شاندار قربانی بڑی خوشی اور بڑی مسکراہٹ کے ساتھ دی۔ لیکن اس قربانی نے ان کو ہمیشہ کے لئے زندہ بنا دیا۔ اور ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور پھر بہادری کے سب سے بڑے اعزاز کا سہرا بھی تو انہیں کے سر بندھا۔ واقعہ یوں ہے کہ دشمن ایک چوکی پر بڑی سختی سے قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ اور اس کا وہاں سے ہٹانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ مگر اس جانباز سپاہی نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اس نے خود اس چوکی پر حملہ کرنے کی خواہش ظاہر کی حالانکہ اس کو ایسا کوئی حکم نہیں ملا تھا۔ اس نے آپ ہی کہا کہ وہ اپنی پارٹی کے ساتھ اس چوکی پر حملہ کرے گا۔ جب اس کے ساتھی چوکی کے قریب پہنچے تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑی مشین گنیں، گولے، بم، بارود بموں کی اندھا دھند بوچھاڑ۔ اور ہر طرف موت ہی موت منڈلاتی ہوئی! اب بھی وہ چاہتا تو اپنی اور اپنے بچے کھچے ساتھیوں کی جان بچا کر واپس جا سکتا تھا۔ مگر شاباش ہمارے سپاہیوں کو جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس شیر جیسے دل والے کپتان نے منہ نہ موڑا اور اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے خود آگے آگے چلتا ہوا ایک طرف سے ہو کر آگے بڑھا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ اگرچہ گولے بارود کی لگاتار بوچھاڑ جاری رہی۔ وہ رینگ رینگ کر آگے بڑھا اور دشمن کی مشین گن کو خاموش کرنے کے لئے ایک دستی بم پھینکا ــــ اتنے میں پارٹی کا ایک برین گن چلانے والا مر گیا۔ ہمارا شیر دل کپتان ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس نے دوڑ کر

برین گن خود اٹھالی - اور اسے بے تحاشا چلاتا چلا گیا - دشمن نے آگے ۲۵ گز کے فاصلے پر بڑی بھاری کانٹے دار باڑھ لگا رکھی تھی - یہ جوان مرد یہاں بھی ذرا نہ ٹھٹکا اور ایک بار پھر جان پر کھیل کر خطرہ مول لیتے ہوئے آگے بڑھا تاکہ باڑھ کو کاٹ ڈالے - نتیجہ ظاہر تھا - گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کا جسم چھلنی کر دیا - اور اسے جان دینی پڑی لیکن اس کے بے مثال نڈرپن، خطرے سے مکمل بے پروائی، اس کا زبردست ارادہ اور کمال کی بہادری اثر کر گئی - اور اس کے ساتھیوں کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ انہوں نے بڑھ کر چوکی پر قبضہ کر لیا اور دشمن کے چالیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا -

اب ذرا مشرقی پاکستان کی طرف آئیے - یہاں بھی بہادری کی ایسی بے نظیر مثال نظر آتی ہے کہ ہم اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں — بہادر ہو تو ایسا ہو — لیڈر اس قدر نڈر، قربانی اتنی بڑی اور جواں مردی ایسی جس پر ہم ناز کر سکیں - اگست کے دن تھے اور مشرقی پاکستان کی سرحد، دھوپ اور گرمی سے اُبلتی ہوئی لُو اور گرم ہواؤں سے بھرپور - دشمن پاکستانی علاقے پر دھرنا دیئے بیٹھا تھا - اور ہمارے جوانوں کا کام یہ تھا کہ اسے نکال باہر کرے - یہ مہم پنجاب رجمنٹ کے میجر طفیل احمد جیسے جری سپاہی کے سپرد کی گئی - رات کا وقت تھا میجر موصوف اور اس کے بہادر ساتھی ایک لمبے مارچ پر روانہ ہو گئے پاکستانی جواں مردوں نے دشمن کو گھیرنے کے لئے ایسی ہوشیاری سے چال چلی کہ بس اس کو پتہ ہی نہ چلا - اور پتہ چلا تو اس وقت جب پاکستانی دلیر دست بدست لڑائی کے لئے بالکل سامنے کھڑے تھے - عین اس وقت ایک مشین گن نے آگ برسانی شروع کر دی - اور پہلی ہی باڑھ سے پارٹی لیڈر، میجر طفیل جو آگے چلتے ہوئے مہم کی رہنمائی کر رہے تھے سخت زخمی ہو گئے - مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور برابر آگے بڑھتے گئے اور مشین گن کی ایک چوکی کو ختم کر دیا - ایک اور مشین گن سے دھنا دن گولیاں برس رہی تھیں، وہ زخمی ہو گئے - ان کے بعد جو دوسرے کمانڈر تھے وہ شہید ہو گئے - میجر طفیل خود سخت زخمی ہونے کے باوجود رینگتے ہوئے آگے بڑھے اور اس مشین گن کے ٹھکانے پر دستی بم پھینک کر اُسے بھک سے اُڑا دیا - چلنے پھرنے کی سکت تو نہ تھی پھر بھی یہ جیالا سپاہی برابر زمین پر پڑا پڑا اپنے ہمراہیوں کو ہدایات دیتا رہا - اتنے میں دست بدست لڑائی چھڑ گئی - اچانک اس نے دیکھا کہ دشمن کا کمانڈر آگے بڑھ کر ہمارے ایک جوان پر حملہ کرنے ہی والا ہے - میجر طفیل نے اپنی رہی سہی طاقت جمع کر کے اس کمانڈر کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں اڑا کر اسے اپنی فولادی ٹوپی سمیت زمین پر منہ کے بل گرا دیا - اس دوران میں گو ان کا خون زور شور سے بہہ رہا تھا اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، پھر بھی وہ اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھاتے گئے - یہاں تک کہ دشمن پاکستان کی سرزمین چھوڑ کر بھاگ نکلا - اُس کے چار آدمی کھیت رہے اور تین قید ہوئے - میجر طفیل زخموں کی تاب نہ لا سکے - اور انہوں نے اپنی قوم و ملک کی خاطر جان دے دی -

بلاشک میجر طفیل کی موت ایک بڑے ہی منچلے اور دلیر آدمی کی موت تھی - موت نہیں شہادت اور اس کے ذکر سے ہمارے دلوں میں ہمت اور دلیری کے کیا کیا ولولے پیدا نہیں ہوتے - ان کی بہادری وطن سے محبت اور فرض کو پورا کرنے کی ایک شاندار مثال تھی - ایسے وقت میں جبکہ ان کا مقابلہ اپنے سے کہیں زیادہ لوگوں سے تھا - یہی وجہ ہے کہ ان کی عظمت کے سامنے ہمارے سر خود بخود جھک جاتے ہیں - اور ان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے - ایسے باپ پر کسے ناز نہ ہو گا - چنانچہ جب پچھلے سال مرحوم میجر کی کم عمر بیٹی نسیم جان کو صدر پاکستان نے سب سے بڑا قومی اعزاز بخشا تو اس کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں - اس کا جسم فخر سے تن گیا اور اس کی چال میں ایسی آن بان پیدا ہو گئی جیسے وہ کسی بہت بڑے بادشاہ کی بیٹی ہو - اے کاش! ہم سب کا انجام اپنے وطن کے اس جاں نثار سپاہی جیسا ہی شاندار اور فخر کے قابل ہو -

ایک اور مثال لیجئے - ایک اور بہادر سپاہی کپتان ظفر اقبال کا شاندار کارنامہ — ان کے ساتھ کل چار آدمی تھے - پھر بھی وہ ان کے ساتھ بڑھتے بڑھتے دشمن سے چند ہی گز کے فاصلے پر پہنچ گئے اور گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود دشمن کی چوکی پر آٹھ دستی بم پھینکے - بدقسمتی سے ایک سپاہی کو گولی لگ گئی ہمارے ملک کے اس جیالے سپوت نے جھٹ گولیوں کی بوچھاڑ چاروں طرف پھٹتے ہوئے گولوں اور بموں سے بے پروا ہو کر اس کی مرہم پٹی کی اور اُسے اٹھوا کر پرے بھجوا دیا - اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کا ایک اور آدمی سخت زخمی ہو گیا - اس پر کپتان نے وہ کام کیا جو واقعی ایثار اور فرض پورا کرنے کی ایک لاجواب مثال ہے - بشیر دل ہو تو ایسا - وہ فوراً اپنے مرتے ہوئے ساتھیوں کو واپس لانے کے لئے آگے بڑھے ——— اور

اس کوشش میں دشمن کی گولیوں کا شکار ہو گئے!

اب ایک اور منچلے سپاہی کا جیالا پن دیکھیئے۔ یہ تھے محمد شیر۔ ان کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ پل بنانے کا بڑا ضروری سامان اپنے آدمیوں کو پہنچائے۔ اور وہ بھی ایسے علاقے سے جس پر دشمن کے پاؤں بڑے مضبوطی سے گڑے تھے۔ اس جیدار سپاہی نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ خود ہی اپنی پلٹن کو واپس لے جانے کی خدمات بھی پیش کیں۔ راستے میں دشمن کی مشین گن سے اچانک مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے بھی جواباً گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ یہاں تک تو خیر گولیوں سے گولیوں کا مقابلہ تھا۔ مگر دشمن نے اپنے ٹینک بھی چھوڑ دیئے۔ اس دلیر سپاہی نے انھیں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ کوئی اور ہوتا تو حواس باختہ ہو کر بھاگ اٹھتا۔ مگر وہ ایک جوان مرد سپاہی تھا۔ پاکستان کا فوجی جوان اس نے بھاگنا اور دشمن کو پیٹھ دکھانا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے پناہ کے لئے بھاگنا بزدلی سمجھا۔ اور برابر فیر کرتا رہا یہاں تک کہ ٹینکوں نے اسے کچل ڈالا۔ یہ سب اس جری سپاہی نے اس لئے کیا کہ اس کے ساتھی بچ جائیں۔

جب بہادری ہی کی باتیں ہو رہی ہیں تو حوالدار بوستان خان کا ذکر کیسے نہ کیا جائے جس نے استقلال اور ہمت میں حد کر دی۔ پہاڑوں پر بے اندازہ برف گر رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ بے پناہ طوفانی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اس موسم میں یہ ہمت کا دھنی ننگے پاؤں برف سے بھرپور ایک میل لمبے راستے پر، عین دشمن کی نظروں کے سامنے، ان کے پاور ہاؤس کو تباہ کرنے بالکل اکیلا چل نکلا! یہ نہیں کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہو اور پھر مجبوری سے لڑائی پر ڈٹ گیا ہو۔ بلکہ اس نے جان بوجھ کر موت کے منہ میں کودنے کی ٹھانی!

ایسی ہی جان بوجھ کر جان جوکھوں میں ڈالنے اور بہادری کی مثال جمعدار رستم خان کی دلیری کا واقعہ ہے۔ ایک نالے کے پار دشمن کی ایک بڑی مضبوط ہتھیاروں سے لیس چوکی تھی۔ جو کچھ اس طرح اڑے آ رہی تھی کہ ہمارے فوجیوں کا دستہ ایک بہت بڑے ٹھکانے کی طرف آگے بڑھنے سے رکا ہوا تھا۔ جمعدار رستم خاں نے اپنے ساتھ صرف ۲۶ آدمی لئے۔ بھاری گولوں اور گولیوں کی اندھا دھند بوچھاڑ کی پروا نہ کرتے ہوئے رسیوں کی مدد سے نالہ پار کر گیا! دوسری طرف پہنچ کر اس نے برف سے ڈھکی گھاٹی پر لپک لپک کر چڑھنا شروع کیا۔ اس چوکی کی طرف جس میں اس کے جوانوں سے تین گنا زیادہ سپاہی پوری طرح بندوقیں اور بم لئے جم کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر سے دشمن کے ہوائی جہازوں نے انہیں دیکھ لیا۔ اور ان پر گولہ باری شروع کر دی۔ پہاڑی پر ہر کہیں برف ہی برف تھی۔ اس لئے چھپنے کی جگہ کہاں ملتی۔ ادھر آسمان سے گولہ باری، ادھر زمین سے! مگر یہ بھی بلا کے دل والے تھے۔ ذرا نہ گھبرائے۔ اور دشمن ان کی بے جگری دیکھ کر اس قدر گھبرا اٹھا کہ چوکی چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جمعدار رستم خاں نے ان کا پیچھا کر کے ۹۲ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ محض کارنامہ ہی نہیں، کرشمہ ہے کہ جن لوگوں کو بھاگنا چاہیئے تھا وہ نہیں بھاگے اور جنھیں نہیں بھاگنا چاہیئے تھا وہ بھاگ نکلے! یہ اسی ابتدائی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ہم دشمن کے زیادہ بڑے ٹھکانے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ایسی کتنی ہی اور کہانیاں ہیں۔ کہانیاں کیا بہادری کے کارنامے۔ ان کو پڑھ کر جی چاہتا ہے میں بھی اپنے وطن کا ایسا ہی سپاہی بن جاؤں اور ملک و قوم کی خدمت میں ایسی ہی بہادری دکھاؤں۔ بلکہ ہمارے پاک وطن کا بچہ بچہ قوم کا ایسا ہی سچا خادم اور جاں نثار سپاہی بن جائے۔ اور جیسے شروع سے لے کر اب تک مشکل وقت پر ہمارے سپاہی برابر کام آتے رہے ہیں اسی طرح ہم بھی کام آئیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے سپاہی، فیلڈ مارشل ایوب خاں، نے ہمارے وطن کا نام تمام دنیا میں روشن کر دیا ہے۔ اور اس کی دھاک دنیا کی تمام قوموں پر بٹھا دی ہے ●

تصوریہ:

"کھیل لڑکوں کا ہوا"

قاضی یوسف حسین صدیقی

(دورِ انقلاب میں قومی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کا جذبہ جس طرح ترقی کر رہا ہے اس کا ایک عمدہ ثبوت وہ دلچسپ کھیل ہیں جو پچھلے دنوں کراچی ہیلتھ کونسل کے زیرِ اہتمام یہاں کے کئی زنانہ مدارس کی طالبات نے صحت و صفائی کا احساس پیدا کرنے کے لئے پیش کئے تھے۔ اربابِ نظر شاید اس پُرلطف افسانوی پیشکش میں اس حقیقت کی جھلک دیکھ سکیں (مدیر)

مجھے اپنے دیدۂ بینا پر اعتماد ہے۔ پورا پورا اعتماد ——— اس لئے میں اسے واہمہ تو بہرحال نہیں کہوں گا۔ اس کے پس پردہ کوئی حقیقت ضرور تھی۔ جانی پہچانی، محسوس و مرئی جسے مجھ جیسے گوشت پوست کے انسان دیکھ سکتے ہوں۔ خیر جانے دیجئے ـــ یہ محض خیال ہی سہی خواب ہی سہی۔ خواب! مگر میں تو خواب دیکھنے کا عادی نہیں۔ کیا میں بھی شاعر ہوں جو خواب دیکھتا رہوں؟ نہیں یہ تو کچھ اور ہی چیز تھی۔ بڑی دلچسپ بڑی دلآویز اور بڑی سبق آموز۔ جیسے میں اپنا دیدۂ بینا لئے ہوئے خواب اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا تھا اور بڑے ذوق و شوق سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں سوچ میں کھو گیا۔ کھیل، تماشہ، ناٹک، سوانگ، وہم و گمان۔ آخر اسے کیا کہوں۔ چھوڑئیے خواب ہی سہی خیال ہی سہی۔ تھا تو کچھ۔ بہت دلچسپ جسے دیکھنے کو جی چاہے۔ اور بول اٹھے "کاش ایسا ہو! کاش ایسا ہی ہوا کرے"! ہم کیا، ہم سے ایک بہت بڑا کہہ گیا ہے کہ:

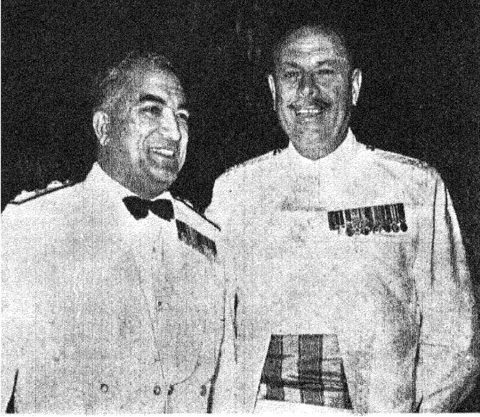
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

وہ منظر، وہ نقشے، اول تو میں سمجھا جیسے "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" سج گیا ہے ——— ناگہاں دیکھا کہ اک پیرکہن سال آئے ـ ـ گر یہ کوئی پیرکہن سال تو نہ تھا۔ بلکہ ایک ماں اپنی بچی کے سرہانے غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ لب پر آہیں، ہونٹوں پر نالے! اس کی اکلوتی بچی ٹی بی جیسے موذی مرض کی شکار جیسے کہ جانے کتنے ہی اور ہیں۔ اور پھر ستم یہ کہ اس بدنصیب ملک میں جاہل ان پڑھ لوگ علاج معالجہ کے لئے بھروسہ بھی کرتے ہیں تو کن پر ــ وہی نیم حکیم خطرۂ جان ـــ اچھا اس سوانگ میں سارے کچھ سوانگ ہی کہتے بن پڑتی ہے۔ یہ نیم حکیم صاحب بڑا ہی انوکھا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان حضرت کا وہ بے ہنگم ناچ کہ انسان ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جائے۔ آخر ناچتے ناچتے وہ بیچاری بچی کے گرد ایک بھیانک بھوت کو خر مستیاں کرنے اپنے ہاتھ پاؤں کے ڈراؤنے پنجے بڑھاتے اور خوفناک دانت پیستے چھوڑ جاتے ہیں۔ موسیقی اور بھی دردناک اور کرب آفریں ہوتی جاتی ہے۔ دکھیا ماں بے آس ہو کر خدا کے حضور دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور رحم کی بھیک مانگتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور ایک بڑی ہی پیاری گڑیا جیسی موہنی صورت آسمان سے نیچے اترتی ہے۔ ایک فرشتۂ رحمت نہیں نہیں یہ تو اور ہی کچھ ہے۔ ابھی ابھی ہمارے ملک میں ایک دور دیس کی رانی آئی تھی۔ اس لئے فضا اسی سے رَسی بسی معلوم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ذہن بھی۔ اس لئے تخیل بڑے ہی ڈرامائی طور پر سوچ بچار کے سارے مرحلے طے کر لیتا ہے۔ یہ ہنستی کھیلتی، چلبلی، ہشاش بشاش تندرست جیتی جاگتی خوبصورت گڑیا بھلا صحت کی رانی کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ صحت اور اس کے ساتھ ہی حسن کی رانی بھی۔ کیونکہ صحت اور حسن تو لازم و ملزوم ہیں۔ اور ہونے چاہئیں۔ اس رانی کے جادو کی چھڑی لہراتے ہی مسکراہٹیں بکھیرتی چھوٹی چھوٹی پیاری

"بود سپاه منظم حصار پاکستان"
(ملک الشعرا بہار مرحوم)

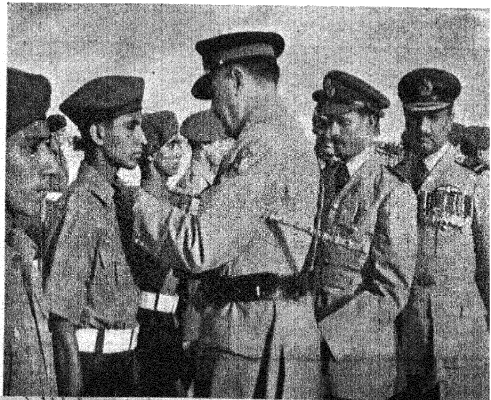


سربراہ ملی افواج : زمیں جن سے حریف آسماں ہے



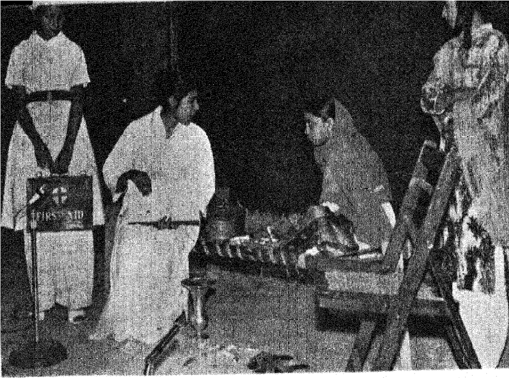
ملت کے دو محکم ستون : صدر پاکستان اور کمانڈر انچیف بحریۂ پاکستان

فضائیہ کے ذو پر و بال شاہیں : بلندیوں کے حریف



سطوت کے نشان پائیدار : قومی و بحری پرچم





"جاگ اٹھا ہے شعور"

کراچی ہیلتھ کونسل کی دل آویز پیشکش

دور انقلاب کے حیات افروز اثر سے ملی شعور نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں نئی نئی سرگرمیوں کا ثبوت دیا ہے، وہاں قومی مسئلوں سے نبٹنے کے لئے بھی نئی نئی تدبیریں سوچی ہیں اور حیات کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے ہنر و فن کی سحرکاریوں سے کام لیا ہے۔ ڈرامے اور اداکاری، صحت و صفائی کی مہم میں جادو کا اثر رکھتے ہیں - جن کا ثبوت ان نقوش سے ملتا ہے

بے احتیاطی: بیماری کو سب سے بڑی دعوت



پھوڑپن: بیماری کا پیش خیمہ اور اس کا علاج

اک تماشہ ہوا- مرض نہ ہوا!



"جس ڈھب سے کوئی سمجھے"

قومی صحت و صفائی کی مہم کا ایک دلچسپ پہلو، کراچی کے زنانہ مدارس کی طالبات کا پر لطف مظاہرہ۔

مچھروں، مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں کا دلچسپ مشاعرہ جس میں وہ اپنے "کارنامے" بیان کرتے ہیں اور انجان لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کیسی بلائے جان ہیں اور ان سے کیسے بچنا چاہئے۔

پیاری پریوں کی ایک قطار چلی آتی ہے۔ موسیقی کی دھن یکلخت بدل جاتی ہے اور جہاں پہلے غمناک ماتمی صدائیں بلند ہو رہی تھیں وہاں ہشاش بشاش چلبلی صداؤں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ اور پل بھر میں سب کچھ رقص ہی رقص بن جاتا ہے۔ حقیقی معنوں میں رقص — صحت تندرستی اور بشاشت کا رقص جس سے دل کے کنول خود بخود کھل جائیں۔ وہ اگلے دنوں کے پھاگن میں ہولیوں کے رنگا رنگ پروگرام تو نقشہ پارینہ ہو چکے۔ ہنسی خوشی کے ناچ کا اب تو اور نقشہ ہے۔ بہار آنے پر اب تو زندگی آتی ہے۔ جس کی بیّن علامت ہے صحت و حسن کی رانی — ایک کھلکھلاتی، اٹکھیلیاں کرتی ہوئی حور تھی اور اس کے وہ معصوم پیارے پیارے ساتھی متعدد پریاں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ناچ ایک سنگت بن جاتا ہے وہ پریاں ناچتی ہیں، رانی ناچتی ہے اور ماں بھی — بچی کے پھر سے پلٹ کر زندگی کی طرف آنے پر خوشی کی ترنگ میں خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے والہانہ رقص کرتی ہے! اور اس طرح ساری کی ساری ٹولی ناچنے لگتی ہے۔

یہ دیکھتے ہی دیکھتے ذہن کچھ اور راہوں پر ہو لیا۔ کچھ اور بھی سوچنے لگا۔ کیا کھیل ہے — کھیل کا کھیل اور کام کا کام۔ مشغلہ کا مشغلہ اور فائدہ کا فائدہ۔ اگر زندگی اور فن کا یوں تال میل ہو جائے تو کیا کہنے — اور یہ سچ پوچھئے تو ان میں فصل بھی کیا ہے۔ ان کا ساتھ تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ تو وہ بڑے بڑے ٹھس شاعر، فن کار یا فلسفی ہیں جو ان کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور یونہی فن اور افادیت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ آخر فن کسی نہ کسی رنگ میں پیدائشی ہی تو ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اسے کوئی ایسی چیز معلوم نہ ہونے دیا جائے۔ کوئی بات ہو اسے سلیقہ سے پیش کر دیجئے، وہ فن ہے۔ اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ اسے ٹھیک طرح پیش کیا جائے۔ اب یہ صحت و حسن کی رانی کا جو نقشہ پیش کیا گیا۔ اس سے زیادہ پر لطف چیز اور کیا ہو گی؟ خدا کرے ہمارے ملک میں ایسی لاکھوں پریاں آئیں تاکہ اس میں ہر جگہ خوشی اور مسرت ہی کا رقص نظر آئے۔

اور ایسے نکتے، ایسی باتیں کیا کچھ نہیں جن کو فن کے جادو سے کچھ کا کچھ بنا دیا جائے۔ دیکھنے والوں کو بہت کچھ سمجھا یا بھی جائے اور راہ پر بھی لایا جائے یہ فن اور تمثیل تو وہ چیز ہے جو خاک کے ڈھیر کو بھی اکسیر بنا دیتی ہے۔ معمولی سے معمولی بات میں وہ جادو جگا دیتی ہے کہ کیا کہنے۔

ہوں! میں بھی ان ٹھس فیلسوفوں کی طرح کن سوچوں میں جا پھنسا۔

مگر چیرہ تماشہ دیکھئے:۔

پردہ گرنے کے بعد پھر اٹھا اور بات بدل گئی۔ اور بات کے ساتھ نقشہ بھی۔ یہ رہا "وہم" — وہ نامراد چیز جو بڑوں بڑوں کو لے بیٹھتی ہے۔ مراق، مالیخولیا جس سے ارسطو اور فلاطون بھی نہ بچ سکے! ٹھیک ہی کہا تھا کسی نے۔ ع

بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

دیکھئے وہم احساس کے شکار وہمی کے کرشمے۔ اپنی اور سب کی زندگی حرام کر دی ہے اور پھر ساری بات کس سلیقے سے ادا کی گئی ہے کہ ہم پارٹ ادا کرنے والوں کے کمال کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے — آخر یہی تو فن ہے جس کا ڈھنڈورا ہمارے نقاد پیٹتے ہیں۔ اور غلط طور پر پیٹتے ہیں۔ فن تو محض ہنر مندی کا دوسرا نام ہے۔ کوئی کام اچھی طرح ڈھب سے کیا جائے تو وہی فن ہے۔

لو یہ تو کی بات بنانا تو میں بھول ہی گیا۔ یہ سب کیا دھرا لڑکوں کا نہیں لڑکیوں کا ہے۔ اس لئے کھیل لڑکیوں کا کہئے۔ یہ سب بھیس بھرنے بہروپ اختیار کر لے اور فن کو زندگی کے ڈھرے پر لگانے اس کے کام میں لانے کا دلچسپ خیال۔ آخر صنفِ نازک ہی کے چونچال لطیف ذہن اور لطیف دل و دماغ ہی کو سوجھا جو خدمت خلق کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ یہ رہی ایک اسکول کی لڑکیاں اور ہیضہ کا سوانگ۔ اگر اب بھی سمجھنے والے نہ سمجھیں اور ہیضہ بھی شرم سے پانی میں جا کر ڈوب مرے تو افسوس ہے۔!

خیر اب زکام کی بھی گت بنتے دیکھ لیجئے۔ جو ہمیشہ ہم انسانوں ہی کی گت بناتا ہے۔ پھر لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ مونچھوں ڈاڑھی سے آراستہ پیراستہ تاکہ کسی نہ کسی طرح اتنے بڑے شاعر کی لاج رکھ لیں جس کا نام ہی غالب تھا — اور لڑکیاں ہوتے ہوئے بھی کھیل کو لڑکوں کا کھیل بنا دیں۔ بعض ڈاکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ مونچھ لگانے والی نے کس طمطراق سے مونچھ لگائی ہے کہ دھوکہ ہو اور بھرپور دھوکا۔ بڑی بی کا حال اور پوشاک در پوشاک کے ساتھ ہی ساتھ اس کے گھر کا نقشہ بھی دیکھتے جائیے۔ اگر ایسے میں گھر گھر بیماری نہ پھیلے تو اور کیا ہو۔ ہم لوگوں نے بھی تھوکنے کو ایک فنِ لطیف کا درجہ دے رکھا ہے۔ جہاں دیکھئے سادہ دپر کار یعنی سادہ تھوک اور پان کی رنگین تھوک کی پچکاریوں پر پچکاریاں جن سے یادش بخیر ہولیوں کی رنگ آرائیاں اور گلکاریاں بھی مات ہو جائیں — اب اور نہیں تو

ان ہونہار لڑکیوں نے جابجا تھوکتے پھرنے کی جو درگت کی ہے اس سے سبق حاصل کر کے اس عادت کو خیرباد کہہ دیں جو ہم سب کے ہاتھوں پر کلنک کا ٹیکہ ہے ۔ خدا کے لئے اب اگر آپ کو ہمارے اس کہنے پر غصّہ بھی آئے تو مت تھوکئے ۔۔۔ !

اگر ان چونچال اور ہونہار لڑکیوں نے تپ دق، ہیضہ، زکام وغیرہ کو یوں دھتا بتائی اور اپنے یہاں کے بڑے صاحبوں، بڑے بھائیوں اور بڑی بیوں کو سمجھ مت دی اور تمیز یا سگھڑاپا سکھایا۔ تو پھر "تاتارانی" کو کیوں چھوڑا جائے ۔۔۔ لگے ہاتھوں اس کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ ہو جانے چاہئیں جبھی بات بنتی ہے۔ یہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کسی نے اس کو یوں آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

یہ تو ہے: مگر کون ہے جو اس دلچسپ مشاعرے کی داد نہ دے ۔۔۔ اگر اس کھیل یا تفریح کو جو ایک قومی شغل اختیار کر چکا ہے فن کے مصرف میں نہ لایا جاتا تو یہ ان ذہین لڑکیوں کے فہم رسا میں بہت بڑی کمی ظاہر کرتا مگر ان کو داد دینی چاہئے کہ قومی خدمت کی خاطر اس اہم ذریعہ سے کام لینا نہیں بھولیں۔ واللہ! کیا مشاعرہ تھا۔ وہ داد دہ داد کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے ۔ اور اگر ہمارے کاشانۂ فن کی چھتیں بہت ہی مضبوط نہ ہوتیں تو وہ کبھی کی اڑ چکی ہوتیں۔ اور داد شاید بے داد کی صورت اختیار کر لیتی جیسی کہ ان کیڑے مکوڑوں کے سلسلے میں اس نے واقعی اختیار کی ۔۔۔ یہ مچھر یہ مکھیاں یہ پسّو، بھی کیا یاد کریں گے کہ کبھی یہ انسان بنے تھے ۔ اور شاید اب آئندہ کے لئے "انسان" بن جائیں گے اور اپنے ساتھ سچ مچ کے انسانوں کو بھی "انسان" بنا دیں گے ۔ کیونکہ وہ ان کیڑے مکوڑوں کی چال ڈھال، طور طریق اور کام کاج کو سمجھ کر صحیح روش اختیار کریں گے ۔ کیا خوب کہا حضرت مچھر جن کی شبیہ مبارک اعلان کے خطرہ کی علامت کے طور پر ایک بھیس بھرنے والی لڑکی کی دو پلی ٹوپی پر نقش تھی :

ہیں غضب میری جنگ کی چالیں
کام کیا دیں لحاف کی ڈھالیں

میں نے تن تن کرتے ہوئے تار کے ساتھ پتنگوں کے اس تان سین کا بھن بھن کرتا ہوا راگ ۔۔۔ یا کھٹراگ سنا اور اب تک اس کا نقشہ نظروں میں گھوم رہا ہے ۔ اس کی بھنبھناتی راگنی کانوں میں گونج رہی ہے ۔ کیا آپ اسے "جیون ناٹک" کا کمال نہیں ؟

تو میں یہ خواب نما نقشہ یہ ناٹک دیکھتا ہی رہ گیا اور سوچتا ہی رہا بلکہ اب تک سوچتا رہا ہوں۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ایسی باتیں ہوں اور سچ مچ ہوں۔ یہ کھیل یہ تماشہ ۔ لڑکوں کے تماشے ہی سہی ۔۔۔ جو ہمارے کام آئیں ہماری زندگی کو بہتر بنائیں اور ہمارے ملک کو ایک سچ مچ کی جنت؟ اگر فن کو اس طرح حیات کا ساتھی اور ساجھی بنا دیا جائے تو کیا کہنے۔ اس تجربہ کو اس حکمت عملی یا خواب و خیال کی بات کو نہیں نہیں چھوڑ دینا چاہئے ۔ بلکہ اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہئے ۔۔۔ اور آگے، اور آگے۔ ہاں یاد آیا۔ اس کھیل میں کچھ دلچسپ بڑے بڑے پوسٹروں کی بھی جھلک دکھائی دی۔ جنھوں نے ناٹک میں تصویروں اور کارٹونوں کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ بھی خوب ہے ۔ مشغلہ کا مشغلہ اور فائدہ کا فائدہ۔ وہی بات آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ اور اگر اس مقصد کے لئے جابجا اچھے اچھے ادارے قائم ہوں جو بے لوث و غرض کام کریں اور ایسے مفید کھیل تماشوں کا اہتمام کریں تو پھر کیا چاہیئے کہنے والے چاہے کچھ کہیں ہم تو یہی کہیں گے کہ ۔۔۔ اللہ کرے جوشِ عمل اور زیادہ۔

حق یہ ہے کہ صحت اور صفائی کسی ایک شخص کے فائدے کی چیز نہیں، ہم سب کے سانجھے فائدے کی چیز ہے۔ جتنا گڑ ڈالو اتنا ہی میٹھا۔ اس میں چھوٹوں بڑوں، عورتوں مردوں، افراد کنبوں، قوم سب کو مل کر حصّہ لینا چاہئے ۔ اور پھر اس قدر بنیادی اہمیت رکھنے والے کام میں تاجر، صنعت کار، اہل تعلیم، قانون و انصاف، نظم و نسق یہ سب پرے کیوں ہٹے رہیں؟ یہ کیوں نہ اس میں حصّہ لیں اور زیادہ سے زیادہ حصّہ لیں؟ اس حرکت میں تو زیادہ سے زیادہ برکت ہے۔ کیوں نہ دودھ بیچنے والا کھرا دودھ دے۔ اور ایسے ہی اپنے طور پر زندگی کو بہتر بنانے میں حصّہ لے جو اس کی اپنی بھلائی اور خوشحالی کا باعث بھی ہے۔

اب آپ اسے خواب سمجھئے یا حقیقت ۔۔۔ سچ مچ کی بیتی ہوئی چیز کا آنکھوں دیکھا حال یا ایسی چیز کا تصور جو ممکن ہے۔ آپ کے حسن تصور پر موقوف ہو۔ بہرکیف کھیل اور دیدۂ بینا کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی کا فیضان

(ترقیاتی جائزہ)

ایم، ایچ، مسعود بٹ

ہمارے ملک کے اقتصادی اور معاشی انتظام کو جس نئے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آئندہ چل کر ہمارا ملک ترقی کی اس شاہراہ پر آجائے گا جہاں دُنیا والے کسی ملک کی طاقت کا اندازہ آبادی یا رقبہ سے نہیں لگاتے بلکہ دھوئیں کے ان اٹھتے ہوئے بادلوں سے لگاتے ہیں جو کارخانوں ملوں اور فیکٹریوں سے اٹھتا ہے یا اس تیل اور پٹرول سے جو ان ملکوں کے کارخانوں کی مشینوں کو حرکت میں لاتا ہے یا برقی قوت کی فراوانی سے جس سے ایندھن کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ ان ماہروں، سائنسدانوں، انجینئروں، مشین سازوں، مستریوں اور مزدوروں کی کثرت سے لگاتے ہیں جن کے بغیر نہ کارخانے چل سکتے ہیں نہ ریل گاڑیاں، پُل، سڑکیں یا عمارتیں تعمیر ہو سکتی ہیں اور نہ آلاتِ حرب بن سکتے ہیں۔

پاکستان کی صنعتی ترقی کے پچھلے تیرہ برس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض مرتبہ ایسے حوصلہ شکن حالات رونما ہوئے جن سے ترقی کی رفتار رکتی ہوئی نظر آئی اور بعض دفعہ سازگار حالات میں ترقی کی رفتار میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ مگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہم نے بڑی حد تک اطمینان بخش کام کیا ہے۔ کیونکہ ملک میں نئی نئی صنعتیں قائم ہوئیں اور آج ملک کے دونوں حصوں میں کئی کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں کپڑا بنانے، سیمنٹ تیار کرنے، دیا سلائی بنانے، کاغذ تیار کرنے، جوٹ بیلنے، چائے تیار کرنے، انجینئرنگ کا سامان بنانے، برقی قوت فراہم کرنے اور پٹرول اور گیس کی نکاسی کے لئے دن رات کام کر رہی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کپاس بیلنے کے چند کارخانوں اور شکر تیار کرنے، کپڑا بننے اور سیمنٹ تیار کرنے کے ایک ایک دو دو کارخانوں کے علاوہ جو پاکستانی علاقے میں تھے باقی تمام کارخانے، فیکٹریاں اور ملیں ہندوستان میں واقع تھیں۔ پاکستانی علاقوں کی یہ خطرناک پسماندگی انگریزی حکومت کی اس عیارانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی جس سے برطانوی افواج کے لئے سپاہی حاصل کرنا مقصود تھا حالانکہ سندھ اور پنجاب کے ان حصوں میں جو آج مغربی پاکستان میں شامل ہیں اور مشرقی پاکستان میں تمباکو، نیشکر اور چمڑہ بہ افراط ہوتے ہیں۔

دراصل حکومتِ برطانیہ کا منشا ہی یہ تھا کہ مسلمان اکثریت کے یہ علاقے زرعی پیداوار کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں۔ بیشتر صنعتی کارخانے پاکستانی حدود سے باہر قائم کئے گئے، تاکہ یہ لوگ ہمیشہ دستِ نگر رہیں اور ان کی محنت کا ثمر دوسرے اٹھائیں۔ چنانچہ ہندوستان میں کپاس کی کل ۱۵۴ فیکٹریاں تھیں جن میں سے سولہ پاکستان کے حصہ میں آئیں۔ جوٹ کے ۹۱ کارخانوں میں سے ایک بھی ہمارے حصہ میں نہ آیا۔ شکر سازی کے ۱۶۰ کارخانوں میں سے صرف ۹ ہمارے ان علاقوں میں تھے۔ لوہے اور فولاد کے ۳۵ چھوٹے بڑے کارخانوں میں سے ایک بھی پاکستان کے حصہ میں نہ آیا۔ سیمنٹ کے ۱۸ کارخانے تھے جن میں سے صرف پانچ ہمارے حصہ میں آئے۔ کاغذ سازی کے ۱۲ کارخانوں میں سے ہمارے حصہ میں کوئی نہ آسکا۔ شیشہ سازی کے ۱۴۵ کارخانوں میں صرف چار پاکستانی علاقے میں تھے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان ۹۲۱ فیکٹریوں میں سے صرف ۳۴ فیکٹریاں مل سکیں۔ ان تمام فیکٹریوں میں مزدوروں کی تعداد ۱۱ لاکھ ۳۶ ہزار تھی لیکن پاکستانی مزدوروں کی تعداد ½ ۲۹ ہزار کے لگ بھگ تھی بہت سی ایسی صنعتیں بھی تھیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔

بڑی صنعتوں کی حالت بہت خراب تھی لیکن چھوٹی صنعتوں کی حالت قدرے بہتر تھی کیونکہ ۱۴۵۶۹ فیکٹریوں میں سے ۱۴۰۶ فیکٹریاں پاکستان کے حصہ میں آئیں جن میں ۲۰ ہزار مزدور کام کر رہے تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں جب ملک ایسے بحران سے گذر رہا تھا ملک کی تعمیری اساس پر غور و خوض شروع ہوا۔ منصوبہ بندی کا دور آیا اور زراعت پر خاص توجہ دی گئی۔ ملک کے معدنی ذخائر کا جائزہ لینے کے لئے تجاویز زیرِ غور آئیں۔ پن بجلی کے ترقیاتی منصوبے بنائے گئے تاکہ ایندھن کی کمی کو پورا کرنے کی کوئی نئی راہ تلاش کی جائے۔ ریلوے، ٹیلی فون، تار اور اسلحہ کو بھی مدنظر

رکھا گیا۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ میں دس ارب اسّی کروڑ روپیہ کی لاگت کا عظیم پروگرام مرتب کیا گیا جس سے سوتی کپڑوں کی صنعت نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ ترقی کی رفتار کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۵۹ء تک اس صنعت پر ایک ارب روپیہ صرف کیا گیا، جس میں ڈیڑھ لاکھ افراد کام کرتے تھے۔ ہمارے سوتی کارخانوں میں ۸۰ کروڑ پونڈ کپڑا تیار ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء کے مالی سال میں بیس کروڑ روپے کی لاگت کا سوتی دھاگہ اور کپڑا دساور بھیجا گیا جس سے زرِ مبادلہ مہیا کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ ملک بھر میں ۳۸۰۰۰ پاور لوم کام کر رہے تھے جو فیکٹریوں اور کارخانوں میں دن رات کپڑا بن رہے تھے۔

بہرحال کھڈیوں کی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے جس سے نہ صرف ہم خود کفیل ہو رہے ہیں بلکہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے بعد کافی کپڑا دوسرے ممالک بھیجنے کے قابل ہو جائیں گے۔

پچھلے برسوں میں اونی کپڑا ہمیشہ دساور سے منگایا جاتا تھا لیکن اب کئی کارخانے کام کر رہے ہیں چنانچہ پچیس ہزار سات سو تکلے ۳۵ لاکھ پونڈ مال تیار کر رہے ہیں۔ اگر ان کارخانوں کو اچھی طرح چلایا جائے تو ۵۳ لاکھ پونڈ مال تیار ہو سکتا ہے۔ ملکی ضروریات کے لئے چالیس لاکھ پونڈ مال کی ضرورت پڑتی ہے۔ پہلے ہماری کچی اون کی پیداوار تقریباً ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ سالانہ تھی۔ ۶۰ لاکھ پونڈ کچا اون قبائلی مہیا کرتے تھے پہلے یہ اون دساور بھیجا جاتا تھا لیکن اب ملک کے سترہ اونی کارخانوں میں کمبل بنانے، اونی کپڑا بننے اور دوسری ضروریات پوری کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اب ہم ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اونی کپڑے کو بیرونی ممالک میں بھیج سکیں۔

اسی طرح آرٹ سلک کی صنعت کو بھی فروغ حاصل ہوا چنانچہ اس وقت ۲۸۶ فیکٹریاں کام کر رہی ہیں جن میں آٹھ ہزار لوم کپڑا تیار کرتے ہیں۔ اس صنعت کو اکثر دھچکا لگتا ہے کیونکہ اس کے لئے تمام مال دساور سے منگایا جاتا ہے۔ پارچہ بافی کی اس صنعت کے علاوہ کئی اور چھوٹی موٹی صنعتیں ہیں جن میں قالین سازی اور ہوزری قابلِ ذکر ہیں۔ اس صنعت کی ترقی میں پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کو بہت اہم حیثیت حاصل ہے۔

زرِ مبادلہ کمانے کے لئے پٹ سن کی صنعت ہماری سب سے زیادہ نفع بخش صنعت ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت اگرچہ مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ پٹ سن ہوتا تھا لیکن وہاں ایک بھی ایسا کارخانہ نہ تھا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ دیکھتے ہوئے پاکستان کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے کافی کارخانے قائم کئے چنانچہ اب چودہ فیکٹریاں ہیں جن میں آٹھ ہزار چالیس لوم کام کر رہے ہیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ۳۵ ہزار ٹن کے لگ بھگ سامان تیار ہوا لیکن ۱۹۵۸ء میں ایک لاکھ بہتّر ہزار ٹن سامان بنایا گیا اور ۱۹۵۹-۶۰ء میں دو لاکھ پچاس ہزار ٹن سامان تیار ہوا جس میں سے دو لاکھ ٹن کے لگ بھگ باہر کے ملکوں کو فراہم کیا گیا۔

ملک کی تعمیر میں سیمنٹ کا بڑا حصہ ہے مغربی پاکستان میں جہاں چونے کا پتھر، جپسم اور قدرتی گیس میسر آتی ہے، سیمنٹ کے کارخانے قائم ہوئے ان سے سیمنٹ کی مقدار میں اضافہ ہوا اور ۱۹۵۴ء میں چھ لاکھ بہتّر ہزار ٹن سیمنٹ تیار کیا گیا۔ ترقی کی اس رفتار کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں دس لاکھ ٹن سیمنٹ تیار ہوا۔ جوں جوں ملک میں تعمیری منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں سیمنٹ کی کھپت بڑھتی جا رہی ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد پٹرول کی صرف دو کمپنیاں کام کر رہی تھیں۔ حکومت نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی، میسرز ایچ ای ہنٹ، ڈبلیو ایچ ہنٹ، سی ایچ ہنٹ، بہار ہنٹ اور پاکستان شیل آئل کمپنی لمیٹڈ سے معاہدے کئے۔ اور تیل، پٹرول اور گیس کے ذخائر کا پتہ چلانے کے لئے کام ہونے لگا۔ سوئی گیس اور سلہٹ گیس سے مغربی پاکستان اور پاکستان کے صوبوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ اس طرح ایندھن کی کمی کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوا بلکہ کارخانوں کو چلانے اور برقی قوت کو فراہم کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ مغربی پاکستان میں سوئی گیس کے ذخائر کا اندازہ چھ ہزار ارب مکعب فٹ ہے۔ ماڑی کے مقام پر یہ ذخیرہ ساڑھے تین ہزار ارب مکعب فٹ کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں اوچھ کے مقام پر ساڑھے دو ہزار ارب مکعب فٹ، ڈھوڈک میں ایک ہزار سات سو ارب مکعب فٹ، خیرپور میں دو سو پچاس ارب مکعب فٹ، کھانڈکوٹ میں دو سو ارب مکعب فٹ، زین میں ایک سو ارب مکعب فٹ اور ایک مقام مزارانی میں تیس ارب مکعب فٹ قدرتی گیس کے ذخائر موجود ہیں۔

چائے کی صنعت مشرقی پاکستان میں سلہٹ، چٹاگانگ اور سنڑا کے پہاڑی علاقوں میں ہوتی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک چائے کی سالانہ پیداوار پانچ کروڑ چالیس لاکھ پونڈ تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۶۵ء تک یہ مقدار بڑھ کر ساڑھے چھ کروڑ پونڈ ہو جائیگی۔

شکر سازی کی صنعت کا انحصار صرف آٹھ کارخانوں پر تھا ان میں تین مغربی پاکستان اور پانچ مشرقی پاکستان میں بحیثیت مجموعی سالانہ ۲۵ ہزار ٹن کے لگ بھگ پیدا کرتے تھے۔ جب نئے کارخانے کھلے تو یہی مقدار بڑھ کر د

لاکھ ۳۵ ہزار ٹن ہوگئی۔ آج ان کارخانوں میں دو لاکھ ٹن سے زیادہ شکر بنانے کے منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔ یہ صنعت بڑی تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہی ہے اور قوی امید ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب یہ ملک کی ضروریات کی کفیل ہو جائے گی۔

تمباکو کی صنعت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ ۱۹۵۵ء میں چار ارب ستر کروڑ سگریٹ تیار کئے گئے اور ۶۰-۱۹۵۹ء میں نو ارب۔ اسی طرح سمندری نمک، بناسپتی گھی، کاغذ سازی، جہاز سازی، لکڑی کے کام، چمڑہ سازی، ربڑ کی مصنوعات، کیمیاوی سامان، رنگ سازی، تیل صاف کرنے، ظروف سازی، انجنیئرنگ کے سامان تیار کرنے، بجلی کا سامان بنانے، ذرائع نقل و حمل کا سامان تیار کرنے، پٹ سن بیلنے، کپاس بیلنے، کھیلوں کا سامان تیار کرنے، فن جراحی کا سامان بنانے، زرعی آلات تیار کرنے کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی صنعتوں کی داغ بیل پڑی۔ اس سلسلہ میں ہمارے پنج سالہ منصوبہ کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

انقلابی حکومت سے ماقبل دور کا سرسری جائزہ لیا جائے تو بعض ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جن سے ملک کی تعمیر کے وہ ارادے جن کی اساس صنعتی منصوبوں پر تھی، ناکامیوں کے دلدل میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعمیر کا وہ جذبہ جس نے پاکستان کو وجود میں لانے کی کوشش کی تھی، سرد پڑتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ہماری موجودہ حکومت نے ایسی چنگاری کا کام کیا جس سے ایک دفعہ پھر وہ حوصلے جو پست ہو رہے تھے نئی امنگوں اور نئے ارادوں سے ہم کنار ہوئے اور آج ملک کے اقتصادی و معاشی نظام کو نئے قالب میں ڈھالنے کے لئے جہاں قوم جذبات کو عمل و دخل ہے وہاں دوسرا پنجسالہ منصوبہ کئی ایک باتوں کے باوجود ملکی معیشت میں ایک نئی روح پھونکتا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ ۱۹۶۵ء تک سات ہزار نئے پاور لوم لگائے جائینگے تاکہ کپڑا ملک کی ضروریات سے زیادہ پیدا ہو سکے، پٹ سن کی صنعت میں کافی ترقی کی جائیگی اور مصنوعات کی پیداوار بڑھ کر تین لاکھ اسی ہزار ٹن ہو جائیگی تاکہ دو لاکھ نوے ہزار ٹن دوسرے ملکوں کو بھیج کر زرِ مبادلہ فراہم کیا جا سکے۔ آرٹ سلک اور دیگر کپڑے کی صنعتوں میں ترقی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

چمڑہ سازی، لکڑی کے کاموں، کاغذ کی صنعت اور چمڑے کی دیگر مصنوعات کی ترویج و ترقی میں دوسرے پنج سالہ منصوبہ میں کافی گنجائش موجود ہے۔ رنگ بنانے کے لئے ایک فیکٹری داؤد خیل میں تین سو ٹن سلفر بلیک اور ڈھائی سو ٹن کا نگو ریڈ تیار کر رہی ہے جس سے ایک سو تیس ٹن دیگر اقسام کے رنگ بھی تیار کئے جائینگے۔ نوشہرہ میں بھی رنگ سازی کا ایک کارخانہ زیرِ تعمیر ہے جس میں دو سو پچاسی ٹن کے لگ بھگ رنگ تیار ہونگے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایک کارخانہ بنانے کا انتظام کیا جا رہا ہے تاکہ ملک کا یہ حصہ بھی اپنی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔

ادویات کے کارخانے بھی زیرِ تعمیر ہیں تاکہ بیماریوں کا استیصال اور وباؤں کی روک تھام کی جا سکے۔ تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ کراچی میں زیرِ تکمیل ہے۔ سیمنٹ کی پیداوار میں بھی اضافہ کیا جائیگا۔ کیونکہ تعمیر و ترقی کے تمام شعبوں میں اس کی بڑی ضرورت ہے۔ فولاد کے کارخانے بھی بنائے جائینگے تاکہ پلوں کی تعمیر، منصوبوں کی تکمیل اور عمارات بنانے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ جہاز سازی، انجنیئرنگ کا سامان بنانے، کھیلوں کے سامان تیار کرنے، فن جراحی کا سامان، فلمی صنعت، کھاد تیار کرنے، کوئلہ نکالنے، معدنیات کو زمین سے کھود کر نکالنے، پرزے بنانے غرضیکہ ملک کو استحکام بخشنے اور عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے منصوبوں پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

انقلابی حکومت کے دو سالہ دور میں صنعتی و معاشی امور میں جس تیزی سے کام ہو رہا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ پاکستانی صنعت ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ آج ہماری ملوں کا کپڑا انگلستان اور یورپ کی منڈیوں میں نہ صرف اپنا مقام حاصل کر چکا ہے بلکہ پٹ سن کی مصنوعات مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ہر دلعزیز ہو رہی ہیں۔ کھیلوں کا سامان جہاں دنیا کی مختلف منڈیوں میں پہنچتا ہے وہاں فن جراحی کا سامان انگلستان میں خاص طور پر مقبول ہے۔ اس ترقی کے باوجود دوسرے پنج سالہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی محنت ہی نہیں بلکہ غیر ملکی سرمایہ کی بھی ضرورت ہے جس کے بغیر ممکن ہے ہمارے وہ ارادے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں پھر بھی بظاہر بہت بہتر نتائج کی توقع ہے۔ یقین ہے کہ جس سرگرمی و مستعدی سے کاروبار ملک کو سرانجام دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اس سے ہمارا اقتصادی اور معاشی نظام جلد ہی ایک ایسی راہ اختیار کرے گا جس پر ہماری آئندہ نسلیں فخر کر سکیں۔



لندن
جنیوا
روم
بیروت
تہران
کراچی

PIA

BOEING 707 Intercontinental

پی-آئی-اے-ترقی کی راہ پر

پی-آئی-اے بوئنگ ۷۰۷ انٹرکانٹیننٹل کے کمانڈر دنیا کے پہلے غیر امریکی پائلٹ
ہیں جو فیڈرل ایوی ایشن ایجنسی امریکہ کے سند یافتہ ہیں۔
نہایت قلیل عرصہ میں پی-آئی-اے کی سروس کا معیار اتنا بلند ہوگیا ہے کہ تجربہ کار
بین الاقوامی مسافر بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔
پی-آئی-اے کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی وجہ صرف ہماری کارگزاری ہی نہیں ہے
بلکہ اس میں آپ کا تعاون بدرجہ اتم شامل ہے اور ہم آپ دونوں کے لئے
یہ باعث فخر کارنامہ ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

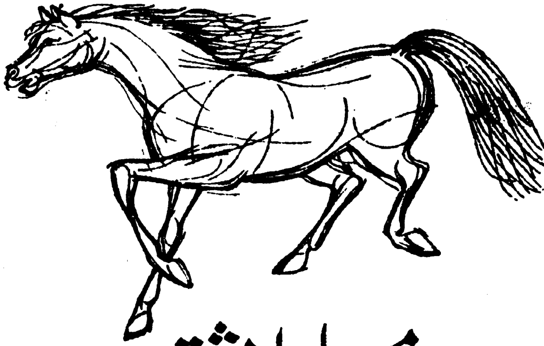
تفصیلات اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی-آئی-اے کلب روڈ-کراچی سے دریافت فرمائیے۔ ٹیلیفون نمبر ۵۱۰۹۱/دس لائنیں۔
کارگو کا دفتر- سیفی ہاؤس کچہری روڈ-کراچی- ٹیلیفون نمبر ۳۰۵۵۱-۱/تین لائنیں۔



لہو ترنگ : ——— بقیہ صفحہ ۱۸

ملکہ عالیہ: سالہا سال کی دوری کے گلے دُور ہوئے
زخم بھرنے لگے تنہائی کے، مجبوری کے
قوم آزاد ہوئی، صاحبِ اقبال ہوئی
عالیہ کی آواز: کشورِ پاک جو زندہ ہے تو ہم زندہ ہیں
پہلی آواز: کشورِ پاک یہ نوخیز، یہ نوکار، وطن
اپنے خوابوں کا امیدوں کا جہاں ہے گویا
کوئی عفریت: اب آئیگا ان شہروں میں
اب نہ وہ سحر زدہ لوگ نہ ویران قریے
سانس لینے لگی اللہ کی محبوب زمیں
ملکہ عالیہ: زندگی کچے گھروندوں میں جنم لیتی ہے
چاند لہراتا ہے پدما کی حسیں لہروں میں
کتنا پُرنور نظر آتا ہے اپنا ڈھاکہ!
سراج الدولہ: سامنے کون چلا آتا ہے؟
ملکہ عالیہ: عالیہ دیکھ تو یہ کون ہے آہستہ خرام
عالیہ: خوں میں ڈوبا ہوا پیراہن ہے!
سراج الدولہ: کوئی میدان پلاسی کا جگر دار نہ ہو
کوئی خوش بخت شہید
ملکہ عالیہ: میرے سرتاج انہیں بڑھ کے ملیں

عالیہ: آج آزاد ہیں سرور ہیں اپنی روحیں
سراج الدولہ: عالیہ تم انہیں پہچانو تو
عالیہ: سرو قد، برق نظر، خستہ بدن
ملکہ عالیہ: فخرِ دنیا، فخرِ دیں، فخرِ وطن!
(دور سے آواز آتی ہے) آپ کا خادم دیرینہ، مدن
سراج الدولہ: میر جی آئیے نا، آئیے ———
ملکہ عالیہ: چچا جان پاس ادب سے نہیں آگے آتے
سراج الدولہ: میر جی آئیے، یہ آپ ہی کی بیٹیاں ہیں
آپ سے پردہ نہیں
میر مدن: آج سرکار کدھر آنکلے؟
سراج الدولہ: یونہی آوارہ خرامی کے لئے
چاندنی رات میں سیرِ دریا
بازدید درو بامِ ڈھاکا
میر مدن: زندگی آئی گئی اب تو کنارِ دریا
سراج الدولہ: گیت مانجھی کا سنیں آپ ذرا
(پس منظر میں مانجھی کی آواز ابھرتی ہے)
نیا باندھو رے کنارِ دریا
نیا باندھو رے کنارِ دریا




رسوئی



سحر کے جلو میں : بقیہ صفحہ ۵۰

اور پھانسی کی تاریخ مقرر کر دی گئی : ۲۵ مارچ ۱۹۵۶ء۔

شیر خاں اور راجو اسے آخری بار ملنے آئے۔ شیر خاں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ لیکن راجو کا اعتماد ویسے ہی غیر متزلزل رہا۔ اور وہ یہی کہتی رہی کہ میرا ویر زندہ رہے گا"

راجہ کے لئے یہ فقرہ اب جھوٹی تسلی سے بڑھ کر کیا معنی رکھتا تھا۔ دادرسی کے تمام معلومہ دروازے بند ہو چکے تھے اور تیسری صبح اسے پھانسی دی جانے والی تھی۔ وہ ہاری ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو "میری بہن! اب تو موت دہلیز پہ آ بیٹھی ہے، صرف تین روز باقی ہیں" لیکن راجو کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرے پر ذرہ بھر تبدیلی نہیں تھی۔ بولی "پروردگار کی ذات اتنی بے رحم تو نہیں ....." شیر خاں ملاقات کے دوران راجہ کا ہاتھ پکڑ کے روتا ہی رہا۔

دوسرے ہی دن زنداں کی فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ کیسی دھما چوکڑی تھی۔ ہر کوئی خوش، نہال نہال تھا۔ سرکاری اطلاع آگئی تھی کہ قیام جمہوریہ کی خوشی میں قیدیوں کی نصف سزائیں معاف کر دی گئی ہیں اور سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی ہے!

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کی صبح راجہ کو پھانسی کی کوٹھڑی سے نکال لیا گیا اور اس کی عمر قید شروع ہو گئی۔ وہ سزا کے ساڑھے تین سال پھانسی کی کوٹھڑی میں ہی گزار چکا تھا۔ اسی سال سیلاب کے سلسلے میں قیدیوں کو باہر بھیجا گیا جن میں راجہ بھی تھا۔ ان قیدیوں کی سزاؤں میں معافیوں پر معافیاں ملتی رہیں۔ اس نے جیل میں کئی بار خون بھی دیا تھا جس کے عوض اسے ایک اور معافی ملی۔ پھر وہ کھلاڑی بھی تھا اور خاص طور پر ٹھیک رہا۔ ان تمام باتوں نے اسے اور معافیاں دلائیں۔

جون ۱۹۵۹ء کی دوپہر تھی جب راجہ مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے میرے زانو پہ زور سے ہاتھ مار کر کہا "یہ تھا ایک معجزہ۔ اب میری زندگی میں ایک اور معجزہ رونما ہوگا۔ میری عمر قید بھی ختم ہو جائے گی۔ جب سے مارشل لا نافذ ہوا ہے مجھے دوسرا معجزہ نظر آنے لگا ہے۔"

اور یہ معجزہ بھی رونما ہو کر رہا!

خبر گرم تھی کہ انقلابی حکومت قیدیوں کو عام معافی دینے پر غور کر رہی ہے کیونکہ سیاست دانوں نے ایسی فضا پیدا کر رکھی تھی کہ بہت سے بیگناہ جیلوں میں پڑے سسک رہے تھے۔ ان کی نجات کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ تمام قیدیوں کو فیاضانہ معافی دے دی جائے۔ گو ان افواہوں کی کوئی سرکاری تصدیق نہیں ہو رہی تھی۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء کا پچھلا پہر تھا کہ جیل کی فضا قیدیوں کے نعروں سے گونج اٹھی، ہر طرف ایک ہڑبونگ سی تھی، ہر کوئی خوشیاں منانے کے موڈ میں تھا۔ جیل میں سرکاری چٹھی آگئی تھی کہ انقلابی حکومت کی پہلی سالگرہ کی خوشی میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی صبح جن قیدیوں کی سزائیں (معافی ملا کر) نصف پوری ہو جائیں انہیں رہا کر دیا جائے اور سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی جائے!

راجہ کی قید کا حساب لگایا گیا تو وہ بھی معافی ملا کر رہا ہونے والوں کے زمرے میں شامل تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں اور شیر خاں کو اطلاع بھیج دی کہ وہ ۲۷ اکتوبر کو رہا ہو رہا ہے۔

میں بھی اسی صبح رہا ہو رہا تھا۔ ایک طویل اور بھیانک رات کے بطن سے وہ صبح طلوع ہوئی جس کے حسن اور نکھار میں فرشتوں کی مسکراہٹ کا پرتو تھا۔ ادھر سلامی کی توپیں دَغ رہی تھیں جن کی گونج شہر کے کونے کونے میں پہنچ رہی تھی۔ ادھر جیلوں کے دروازے یوں کھل گئے جیسے ضربِ کلیم نے ان دروازوں کو توڑ دیا ہو جنہوں نے نہ جانے کتنے ہی بے گناہوں کو نگل لیا تھا۔

قیدیوں کا ہجوم نعرے لگاتا ہوا باہر نکلا۔ راجہ کے استقبال کو شیر خاں (جواب حوالدار تھا)، اس کی بیوی راجو، ان کے دو بچے اور راجہ کی اپنی بیوی اور بچے آئے ہوئے تھے۔ شیر خاں نے ایک بوڑھی سی گھوڑی کی لگام تھام رکھی تھی جس کے سارے جسم پر روپوں، اٹھنیوں اور چونیوں کے ہار چمک رہے تھے۔ راجہ نے بھاگ کر سب سے پہلے گھوڑی کو چوما۔ پیشتر اس کے کہ میں اس خوبصورت منظر کو اچھی طرح دیکھ سکتا میں خود اپنے عزیزوں کے بازوؤں اور سینوں میں گم ہو چکا تھا!

حکمتِ عملی : بقیہ صفحہ ۱۷

سے بھیگ گئی ہے۔ تب ماچس کی تلاش میں وہ اس گھر میں آتا ہے
تو وہاں اسے ایک لڑکی ملتی ہے۔ نوجوان بہت دیر تک اس لڑکی سے
اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ (خاموش ہو جاتا ہے)

عائشہ :- پھر ؟

نوجوان :- بس صرف اتنی سی بات تھی۔ میرا ڈائرکٹر کہتا ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک اجنبی اتنی دیر ایک نوجوان لڑکی سے باتیں کر سکے۔ اس کا خیال تھا لڑکی فوراً شور مچا دے گی اور دوسرے لوگوں کو جمع کرے گی۔ لیکن میں کہتا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ اور آج جب بارش شروع ہوئی تو میں گھر سے نکل پڑا تاکہ ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر سکوں۔ آپ کی کھڑکی میں روشنی دیکھ کر میں نے چپکے سے اندر جھانکا اور سچ کہتا ہوں آپ کو اور اس کمرے کو دیکھ کر مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ہی ڈرامہ کا کمرہ ہے۔ میں کھڑکی کے راستے چپکے سے اندر آگیا۔ (نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور رسالہ اوڑھ لیتا ہے) میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا دریچہ کھولا۔ اس طرح (کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے) اور پھر اوپر چڑھ گیا اس طرح (کھڑکی پر چڑھ جاتا ہے)۔

(عائشہ مضطرب سی ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے) اور پھر آپ کے کمرہ میں کود گیا۔ اس طرح (نوجوان باہر اندھیرے میں کود جاتا ہے)

عائشہ :- سنئے (وہ بے چینی سے ایک لمحہ وسط میں کھڑی رہتی ہے، پھر کود کر بک شیلف پر چڑھ جاتی ہے اور باہر اندھیرے میں جھانکنے لگتی ہے)
اپنا نام تو بتاتے جایئے۔ آپ کا نام کیا ہے ؟
(دروازہ کھلتا ہے اور ممدو داخل ہوتا ہے)

نوجوان :- (باہر سے) "اسمر" (دور ہوتے ہوئے) خدا حافظ !
(ممدو حیرت سے تک رہا ہے)

عائشہ :- خدا حافظ !

(وہ بڑی بے دلی سے نیچے اترتی ہے، ممدو کی طرف گھور کر دیکھتی ہے، وہ ایک دم گھبرا جاتا ہے اور جلدی سے ٹرے اٹھا کر بھاگ جاتا ہے
عائشہ مسہری پر پڑا ہوا رسالہ اٹھا لیتی ہے اور اسی طرح مسہری پر لیٹ جاتی ہے۔ جیسے منظر کی ابتدا میں لیٹی تھی۔

اسمر :- ڈرامہ نگار ۔۔۔ اسمر ۔۔۔ ماچس ۔۔۔ اور چور ۔۔۔

(پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

دوسری کہانی : بقیہ صفحہ ۷۷

"خاک!" جیراں گنگناتی ہوئی کہنے لگی۔ "فیروزاں اور چاچی کے پاؤں کو مہندی لگا کر یونہی بہانے سے نکلی ہوں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ آتیں۔ ابھی جیناں ساتھ آئی ہے۔ پر انھیں کیا پتہ کہ جیناں میری پکی سہیلی ہے۔" جیراں مسکرائی۔ "بڑی اچھی ہے بیچاری۔ سب عورتوں کے پاؤں میں مہندی لگا کر باہر نکلنے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔"

"مگر تم تو اکیلی آئی تھیں۔" چھیلا گھبرا کر بولا۔

"اکیلی کیسے آسکتی تھی چن جی ؟ جیناں کے ساتھ آئی ہوں ۔۔۔ جیناں کے ساتھ۔ چاچے نورے کے کنوئیں پر جو باڑھ ہے نا۔ وہاں کھڑا کر آئی ہوں اسے۔ بس تو جلدی بول، کیا کہنا ہے۔"

"کہنا کیا تھا۔" چھیلا اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے بولا "بس نکاح کی مبارک دینی تھی۔"

"بس کہو۔ خواہ مخواہ تنگ کیا ہے مجھے۔"

"اری پگلی تو نہیں۔ برسوں کی محبت اور انتظار کے بعد آج تمہیں پایا ہے۔ ساری منت وصول ہو گئی ہے سمجھو۔ سچی خوشی بھی آج محسوس کر رہا ہوں پہلے تو ملاقات پر خوشی کے بجائے دکھ ہوا کرتا تھا۔ سوچتا تھا، ممکن ہے تمہیں اور کوئی چھین کر لیجائے۔"

"اور کون ؟" جیراں نے بات کاٹ دی۔

"بڑی بھولی ہو۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔" چھیلا برجستہ بولا۔ "کتنے ہی اچکوں سے تمہیں جیت کر لایا ہوں۔ سردارے سے تو شرط بھی لگ گئی تھی۔ پھر دین محمد اور کالے اور کھوجی ذیلدار کا۔ ان کے بارے میں تو تو خود بھی جانتی ہے۔ کیا کچھ نہ کیا ہوگا ان کمبخوں نے"

"لیکن سردارا تو ان جیسا نہیں۔" جیراں نے فوراً کہا۔ "اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں چکوری بن کر بچپن سے تمہیں پوج رہی ہوں تو وہ کبھی شرط نہ لگاتا۔"

"ہاں" چھیلا آہستہ سے بولا۔ "آدمی دل گردے کا ہے اور یاروں کا یار۔"

سردارے کا نئی بنی ہوئی چارپائی کی طرح تنا ہوا بدن یک لخت ڈھیلا پڑ گیا۔ جیسے کسی نے ایکا ایکی دوائن کھینچ لی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش آگئی۔ اور جسم میں بھرے ہوئے انگاروں پر برف کی تہہ جم گئی ہو۔ اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور کندھے پر جمی ہوئی بندوق پہلو پر لٹک آئی تھی۔ بندوق کو دیوار کے ساتھ ٹکرا کے اس نے اپنی انگلیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی پوروں کو یوں آنکھوں پر رکھ لیا جیسے نہ رکھتا تو وہ پتھرا جاتیں۔ چند لمحوں کے بعد چھیلے نے گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز سنی جو سناٹے کو چیرتی چلی جا رہی تھی۔

وہ بھاگ کر چار دیواری سے باہر آیا۔ میرپور جانے والی پگڈنڈی پر کوئی گھڑ سوار سرپٹ اڑا چلا جا رہا تھا۔

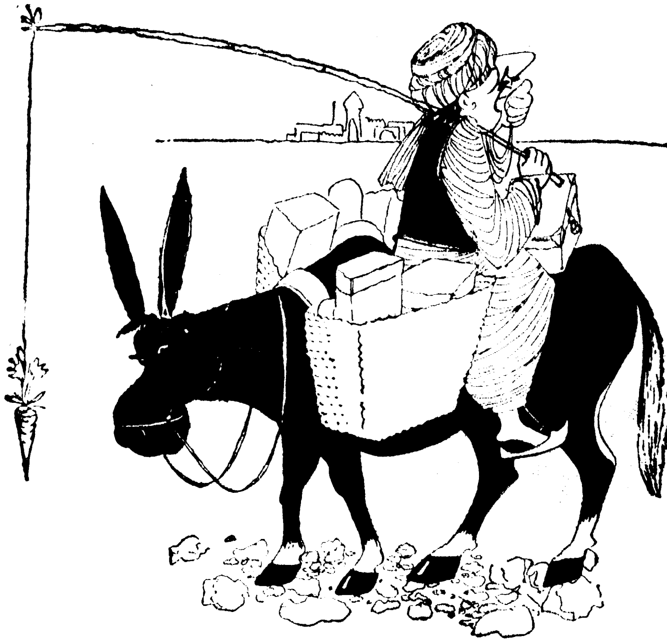
"کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا!" :——— بقیہ صفحہ ۲۱

کے معنی ہیں احیائے علوم و فنون، اور توہم پرستی اور خالی خولی زہد و ریاضت کے خلاف بغاوت ۔ برق رفتار مواصلات نے دنیا ہی بدل ڈالی ہے ۔ گویا انسان کے اندرونی سوتے بے تحاشا پھوٹ پڑے ہیں ۔ نیکی، حسن، علم ہر قسم کی اچھائیاں ہمارا بیش از بیش مطمح نظر بنتی جا رہی ہیں ۔ ساتھ ہی آزادی فکر و عمل، ذمہ داری اور نظم و ضبط کا بھی بول بالا ہو رہا ہے ۔ تن اب من کا حریف نہیں رہا بلکہ دونوں میں ساجھا ہے ۔ دونوں ایک ہی منزل ترقی کے پُر شوق رہ نورد ہیں ۔

ہماری اس نشاۃ الثانیہ کے اہم عنصر دو ہیں ۔ نجات اور آزادئ اظہار ۔ صدر پاکستان نے بار بار آزادئ اظہار کا یقین دلایا ہے اور حال ہی میں انہوں نے دوسری بار پاکستان رائٹرز گلڈ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر جو پیغام دیا ہے ۔ اس میں اسی بات پر زور دیا ہے ۔ ان تمام باتوں کا لب لباب ہے: "آزادئ بشر — ظلم و تشدد اور تعصب سے آزادی ۔ غریبی، بیماری، پست حالی سے نجات ۔ لاعلمی و جہالت سے نجات اور اُن تمام رسموں ریتوں روایتوں سے نجات جو انسانوں کو نشو و نما سے باز رکھتی ہیں ۔ اس لئے اب ہر پاکستانی کیلئے شاداں و فرحاں، پُر امید، دلیر و بے باک، مستعد و سرگرم اور قوم و وطن کا سچّا خیر خواہ ہونے کی معقول وجہ موجود ہے ۔

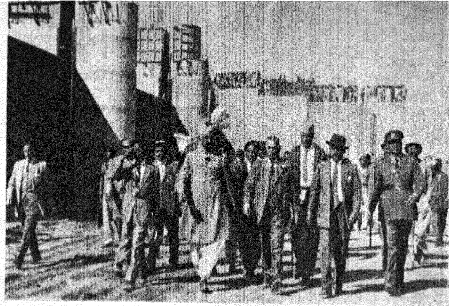
دوسری بڑی نمایاں بات ہے اظہار ۔ اب ہمارے لوگ اپنی خودی سے پوری طرح آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بھی ۔ انہوں نے گذشتہ دو سوا دو سال میں بے شمار کانفرنسیں، مذاکرے، مباحثے، نمائشیں کی ہیں، تعمیر و ترقی کے ادارے قائم کئے ہیں ۔ اور رفاہ و بہبود کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا ہے ۔ گویا ہم اپنے دل کی باتیں کھلم کھلا زبان پر لا رہے ہیں، اپنی تمناؤں اور آدرشوں کو پیغام نمو دے رہے ہیں ۔ اور اگر یہی عالم رہا تو ہم انشاء اللہ دنوں میں عروج و ترقی کی حدوں کو چھو لیں گے ۔ اور اسی پر میری اس حضور کے بجائے غیب کی، صیغۂ واحد متکلم میں تقریر ختم ہوتی ہے ۔ وہی بات ۔ خود بخود بانگ زنم خود بخود آوا شنوم ——— بہت اچھا ہے جو یہ جوشِ خطابت تقریر کے بجائے تحریر کے پیرائے میں خاص و عام تک پہنچ جائے ۔ وما علینا الا البلاغ ۔



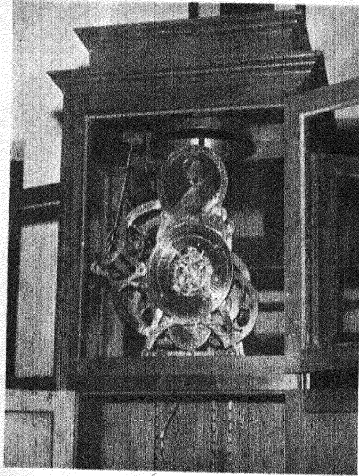


"المنظر" - "المہران"

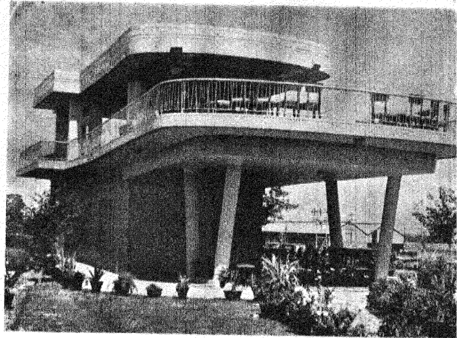
(بلوچستان : سندھ)



"ترقی کا قدم تیز" : گدو بیراج، آب پاشی اور زراعت کی ترقی کا عظیم الشان سرچشمہ

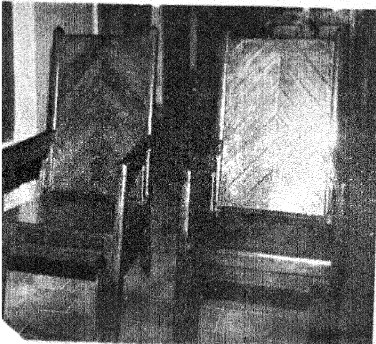


طلسم ؟ : صناعی کا ایک نادر نمونہ، جیکب کلاک جو گھنٹے، منٹ، سیکنڈ، کے علاوہ قمری اور عیسوی تاریخیں بھی بتاتا ہے - اوپر پیتل کا چاند جو آسمانی چاند ہی کے ساتھ ساتھ طلوع و غروب ہوتا اور اسی کی طرح گھٹتا بڑھتا ہے



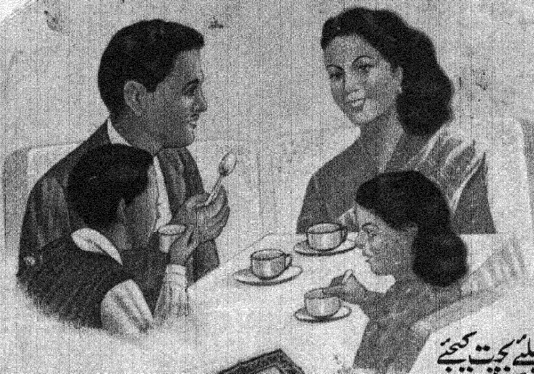
مقام است اینجا ؟ : "المنظر" جہاں سے غلام محمد بیراج اور اس کے نہری سلسلوں کا بہشت دید نظارہ کیا جا سکتا ہے

قدیم یا جدید ؟ : آج یا ایک صدی پہلے کی نفیس کرسیاں؟



صلح یا جنگ ؟ : جہد آزادی کی یادگار، ایک صدی پہلے کے وہ ہتھیار جو بلوچ مجاہد انگریزوں کے خلاف استعمال کرتے تھے

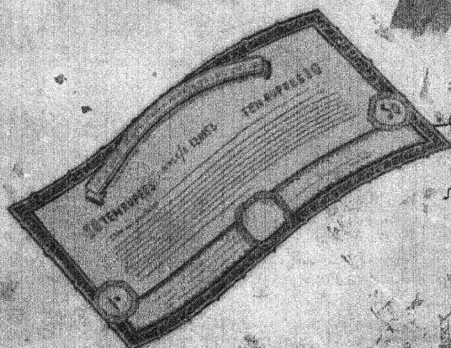




اپنے گھر کی خوشحالی کیلئے بچت کیجئے
آپکا وطن بھی آپکا گھر ہے

خوشحالی کا سارا دارو مدار بچت پر ہے۔ جو کچھ آپ اپنے کنبے کے لئے پس انداز کریں وہی ہماری قومی بچت ہے۔ یہ بچت سیونگ سرٹیفکٹ کی صورت میں محفوظ کرلی جائے تو آپ کے لئے بھی اچھا ہے اور پاکستان کے لئے بھی۔

ہم ایک بہتر اور زیادہ روشن مستقبل کی اُمید رکھتے ہیں جس کا خاکہ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر یہ جبھی ممکن ہوگا کہ سب مل کر زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔





روپیہ بچایئے اور **قومی بچت کے سرٹیفکیٹ** میں لگایئے

united

۶ فیصدی منافع انکم ٹیکس سے مبرا ۔ تمام ڈاک خانوں سے مل سکتے ہیں

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ، کراچی ۔ مدیر رفیق خاور